



یہ کتاب برقی شکل میں نشر ہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسینین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

تفسیر نمونہ جلد پانزدہم

تفسیر نمونہ، آیہ اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی (مدظلہ العالی) کی ۱۵ سالہ زحمات کا نتیجہ ہے جس کو معظم لہ نے اہل قلم کی ایک جماعت کی مدد سے فارسی زبان میں تحریر فرمایا، اس کا اردو اور عربی زبان میں ترجمہ ہو کر شایع ہو چکا ہے۔

تعداد جلد: ۱۵ جلد

زبان: اردو

مترجم: مولانا سید صفدر حسین نجفی (رح)

تاریخ اشاعت: ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

مقدمہ

لغت میں ”تفسیر“ کا معنی ہے چہرے سے نقاب ہٹانا۔

تو کیا قرآن پر جو نور کلام مبین اور تمام مخلوق کی ہدایت کے لئے حق تعالیٰ کی واضح گفتگو ہے کوئی پردہ اور نقاب پڑا ہوا ہے۔ جسے ہم ہٹانا چاہتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔

قرآن کے چہرے پر تو کوئی نقاب نہیں ہے یہ تو ہم جن کے چہرے پر سے نقاب ہٹانا چاہیے اور ہماری عقل و ہوش کی نگاہ سے پردہ اٹھنا چاہیے تاکہ ہم قرآن کے مفاہیم کو سمجھ سکیں اور اس کی روح کا ادراک کر سکیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن کا صرف ایک چہرہ نہیں۔ اس کا وہ چہرا جو سب کے لئے کھلا ہے وہ نور مبین ہے اور ہدایت خلق کی رمز ہے عمومی چہرا ہے۔

رہا اس کا دوسرا پہلو تو اس کا ایک چہرا بلکہ کئی چہرے اور ہیں۔ جو صرف غور و فکر کرنے والوں، حق کے پیاسوں، راستے کے متلاشیوں اور زیادہ علم کے طلب گاروں پر آشکار ہوتے ہیں۔ اس میں سے ہر ایک کو اس کے اپنے ظرف، خلوص اور کوشش سے حصہ ملتا ہے۔

ان چہروں کو احادیث کی زبان میں ”بطون قرآن“ کہتے ہیں۔ چونکہ ہر شخص ان کی تجلی نہیں دیکھ پاتا بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہر آنکھ انہیں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی لہذا تفسیر آنکھوں کو توانائی دیتی ہے اور پردوں کو ہٹاتی ہے اور ہمارے اندر دیکھنے کی اہلیت پیدا کرتی ہے۔ جتنا کہ ہمارے لئے ممکن ہے۔

قرآن کے کئی چہرے ایسے ہیں جن سے زمانہ گزرنے اور انسانی لیاقت و استعداد میں اضافے اور مالیدگی سے پردہ اٹھتا ہے۔ مکتب علی علیہ السلام کے ہونہار شاگرد ابن عباس اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

القرآن یفسرہ الزمان

زمانہ قرآن کی تفسیر کرتا ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر ایک مشہور حدیث کے مطابق:

القرآن یفسر بعضہ بعضاً۔

قرآن خود اپنی تفسیر بیان کرتا ہے اور اس کی آیات ایک دوسرے کے چہرے سے پردہ اٹھاتی ہیں۔

قرآن کا نور اور کلام مبین ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ یہ ایک اکیلا ہے اس طرح کہ دوسرے سے پیوستہ بھی ہے اور ایک ایسا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتا اور یہ سارے کا سارا نور اور کلام مبین ہے اگرچہ اس کی بعض آیات کچھ دیگر آیات کے چہرے سے پردہ اٹھاتی ہیں۔

یہ کوشش کب شروع ہوئی اور کہاں تک پہنچی

اس میں شک نہیں کہ قرآن کی تفسیر اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے خود پیغمبر کے زمانے سے اور آنحضرت کے پاکیزہ دل پر اس کی اولین آیات کے نازل ہونے سے شروع ہوئی اور پھر اس علم کے بزرگ اور عظیم لوگ اپنی سندوں کا سلسلہ پیغمبر کے شہر علم کے در تک لے جاتے ہیں۔

تفسیر قرآن کے سلسلے میں اب تک سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں جو مختلف زبانوں میں اور مختلف طرز و طریقہ کی ہیں۔ بعض ادبی ہیں اور بعض فلسفی، کچھ کی نوعیت اخلاقی ہے اور کچھ احادیث کی بنیاد پر لکھی گئیں ہیں۔ بعض تاریخ کے حوالے سے رقم کی گئیں اور بعض علوم جدیدہ کی اساس پر لکھی گئی ہیں۔ اس طرح ہر کسی نے قرآن کو ان علوم کے زاویے سے دیکھا ہے جن میں وہ خود تخصص رکھتا ہے۔

پھولوں سے لدے ہوئے اس باغ سے کسی نے دل انگیز اور شاعرانہ مناظر حاصل کئے، کسی نے علوم طبیعی کے استاد کی طرح برگ گل، پھول، شاخوں اور جڑوں کے اصول تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، کسی نے غذائی مواد سے استفادہ کیا ہے اور کسی نے دواؤں کے خواص سے، کسی نے اسرار آفرینش سے یہ سب شگوفے اور رنگ گل چنے ہیں اور کوئی اس فکر میں ہے کہ کون سے گل سے بہترین عطر کشید کرے اسی طرح کوئی ایسا بھی ہے جس نے فقط شہد کی مکھی کی طرح گل چوسنے اور اس سے انگبین حاصل کرنے کی جستجو کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ راہ تفسیر کے راہبوں میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک مخصوص آئینہ تھا جس سے انہوں نے قرآن کی ان نبیائیوں اور اسرار کو منعکس کیا۔ لیکن یہ واضح ہے کہ یہ سب چیزیں باوجودیکہ قرآن کی تفسیریں ہیں ان میں سے کوئی بھی قرآن کی تفسیر نہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک قرآن کے ایک رخ سے پردہ ہٹاتی ہے نہ کہ تمام چہروں سے اور اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو پھر بھی وہ قرآن کے چند چہروں کی نقاب کشائی ہوگی نہ کہ تمام چہروں کی۔

قرآن حق تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کے لامتناہی علم کی تراوش ہے اور اس کا کلام اس کے علم کا رنگ اور اس کا علم اس کی ذات کا رنگ رکھتا ہے۔ اور وہ سب لامتناہی ہیں۔ اس بنا پر یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ نوع انسانی قرآن کے تمام

چہروں کو دیکھ لے۔ کیونکہ دریا کو کوزے میں بند نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہماری فکر و نظر کا ظرف جس قدر وسیع ہوگا اتنا ہی زیادہ ہم اس بحر بیکراں کو اپنے اندر سما سکیں گے۔

اس لئے تمام علماء اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ کسی زمانے میں بھی ناتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھ جائیں۔ قرآن مجید کے زیادہ سے زیادہ حقائق کے انکشاف کے لئے اپنی پے درپے مخلصانہ سعی و کوشش جاری رکھیں۔ قدامت اور گذشتہ علماء (خداوند عالم کی رحمتیں ان کی ارواح پاک پر ہوتی رہیں) کے ارشادات سے فائدہ اٹھائیں لیکن انہی پر قناعت نہ کریں کیونکہ پیغمبر اکرم فرماتے ہیں: لا تحصى عجائبه ولا تبلى غرائبہ

قرآن کی خوبیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی اور اس کی عجیب و غریب نئی باتیں کبھی پرانی نہ ہوں گی۔

ایک خطرناک غلطی

تفسیر قرآن کے سلسلے میں یہ روش بہت زیادہ خطرناک ہے کہ انسان مکتب قرآن میں شاگردی اختیار کرنے کی بجائے اس عظیم آسمانی کتاب کے مقابلہ میں استاد بن بیٹھے یعنی قرآن سے استفادہ کرنے کی بجائے اس پر اپنے افکار کا بوجھ ڈال دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اپنے ماحول، تخصیص علمی، مخصوص مذہب اور اپنی ذاتی رائے کو قرآن کے نام پر اور قرآن کی صورت میں پیش کرنے لگے اور یوں قرآن ہمارا امام پیشوا، رہبر، قاضی اور فیصلہ کرنے والا نہ رہے بلکہ الٹا وہ ہمارے اپنے نظریات کی مسند نشینی اور ہمارے اپنے افکار و نظریات کی جلوہ نمائی کا ذریعہ بن جائے۔ قرآن کی تفسیر کا یہ طریقہ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں قرآن کے ذریعہ اپنے افکار کی تفسیر کا یہ ڈھنگ اگرچہ ایک گمراہی میں رائج ہے جو کچھ بھی ہے خطرناک ہے اور ایک دردناک مصیبت ہے جس کا نتیجہ راہ حق کی طرف ہدایت کے حصول کی بجائے صراط مستقیم سے دوری اور غلطیوں اور شبہات کو پختہ کرنے والی بات ہے۔

قرآن سے اس طرح فائدہ اٹھانا تفسیر نہیں ہے بلکہ تحمیل ہے۔ ای سے فیصلہ لینا نہیں بلکہ اس کے اوپر حکم چلانا ہے۔ یہ ہدایت نہیں بلکہ ضلالت و گمراہی ہے۔ اس طرح تو ہر چیز دگرگوں ہو جاتی ہے۔

ہماری کوشش ہے کہ اس تفسیر میں ہم انشاء اللہ یہ روش اختیار نہ کریں اور واقعاً قرآن کے سامنے دل و جان سے زانوئے تلمذتہ کریں اور بس۔

تقاضے اور احتیاج

ہر زمانے کی کچھ خصوصیات، ضرورتیں اور تقاضے ہوتے ہیں جو زمانے کی بدلتی ہوئی کیفیت، تازہ مسائل اور منشاء مشہود پر آنے والے نئے معانی و مفاہیم سے ابھرتے ہیں۔ اسی طرح ہر دور کی اپنی کچھ مشکلات اور پیچیدگیاں ہوتی ہیں اور یہ سب معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی تبدیلیوں کا لازمہ ہوتا ہے۔

کامیاب افراد اور صاحبان توفیق وہ ہیں جو ان ضروریات اور تقاضوں کو سمجھ سکیں جنہیں ”عصری مسائل“ کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو ان مسائل کے ادراک سے عاری ہیں یا ادراک تو رکھتے ہیں لیکن وہ خود کسی دوسرے ماحول اور زمانے کی پیداوار ہیں جس میں یہ مسائل نہ تھے اس لئے وہ سرد مہری اور لاپرواہی سے ان مسائل کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ وہ ان مسائل کو بے کار کاغذوں کی طرح ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو پے در پے شکستوں کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

ایسے افراد ہمیشہ زمانے کی وضع و کیفیت کا شکوہ کرتے رہتے ہیں، زمین و آسمان کو برا کہتے ہیں اور گزرے ہوئے سنہرے اور خواب و خیال کے زمانے کی یادیں غزدہ، افسردہ اور پر حسرت رہتے ہیں۔ ایسے لوگ روز بروز زیادہ بد ظن، بد بین اور مایوس ہوتے رہتے ہیں اور آخر کار معاشرے سے دوری اور گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ وہ زمانے کے تقاضوں اور مشکلات کو سمجھ نہیں پاتے یا وہ ایسا چاہتے ہی نہیں۔ ایسے لوگ ایک تاریکی میں زندگی بسر کرتے ہیں اور چونکہ حوادث کے علل و اسباب اور ان کے نتائج کی تشخیص نہیں کر پاتے اس لئے ان کے مقابلہ میں گھبراتے ہوئے وحشت زدہ، بے دماغ اور بغیر کسی منصوبہ بندی کے رہتے ہیں ایسے لوگ چونکہ تاریکی میں محو گردش ہوتے ہیں اس لئے ہر قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں اور کیا خوب کہا ہے سچے پیشوانے:

جو شخص اپنے زمانے کے حالات و کوائف سے آگاہ ہے وہ اشتباہات اور غلطیوں سے بچا رہتا ہے

۱۔ امام صادق علیہ السلام سے ایک مشہور حدیث میں یہ مضمون یوں منقول ہے: العالم بزمانہ لا تحجم علیہ

اللوایس۔

ہر زمانے کے علماء اور دانشوروں کے لئے یہ پیغام ہے کہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ پوری چابکدستی سے ان مسائل، تقاضوں، احتیاجات اور روحانی کمزوری اور اجتماعی خالی نقاط کا ادراک کریں اور انہیں صحیح شکل و صورت میں پرکریں تاکہ وہ دوسرے امور سے پر نہ ہو جائیں کیونکہ ہماری زندگی کے محیط محال میں خلاء ممکن نہیں ہے۔

مایوس اور منفی فکر حضرات کے گمان کے برخلاف جن مسائل کو میں نے اپنی سمجھ کے مطابق واضح طور پر معلوم کیا ہے اور سمجھا ہے ان میں سے ایک نسل نو کی مفہیم اسلام اور مسائل دینی جاننے کی پیاس ہے بلکہ یہ پیاس فقط سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ انہیں چکھنے، چھونے اور آخر کار ان پر عمل کرنے کی ہے۔

ان مسائل نے نسل نو کی روح اور وجود کو بے قرار کر رکھا ہے لیکن یہ فطری امر ہے کہ یہ سب استفہام کی صورت میں ہے۔ ان خواہشات اور تقاضوں کا جواب دینے کے لئے پہلا قدم میراث علمی اور اسلامی تہذیب و تمدن کو عصر حاضر کی زبان میں ڈھالنا اور عالی مفہیم کو موجودہ دور کی زبان میں موجودہ نسل کی روح، جان اور عقل میں منتقل کرنا ہے اور دوسرا قدم یہ ہے کہ اس زمانے کی مخصوص ضرورتوں اور تقاضوں کو اسلام کے اصولوں سے استنباط کمر کے پورا کیا جائے۔

یہ تفسیر انہی دو اہداف و مقاصد کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔

کس تفسیر کا مطالعہ کرنا بہتر ہے

یہ ایسا سوال ہے جو بارہا مختلف طبقوں خصوصاً نوجوان طبقے کی طرف سے ہمیں کیا گیا ہے۔ یہ وہ ہیں جو خلوص سے ملی ہوئی پیاس کے ساتھ قرآن کے صاف و شفاف چشمے کے جویا ہیں اور اس محفوظ آسمانی وحی سے سیراب ہونا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب کے سوال میں یہ جملہ پوشیدہ ہے کہ ہمیں ایسی تفسیر چاہئے جو تقلید کے حوالے سے نہیں بلکہ تحقیق کے حوالے سے ہمیں عظمت قرآن سے روشناس کرا سکے اور دور حاضر میں ہماری ضرورتوں، دکھوں اور مشکلوں میں راہنمائی کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر طبقے کے لوگوں کے لئے مفید بھی ہو اور جس میں پیچیدہ علمی اصطلاحات اس کی صاف و شفاف راہوں اور شاہراؤں میں ناہمواریاں پیدا نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ فارسی زبان میں آج ہمارے پاس کئی ایک تفاسیر موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ وہ تفاسیر ہیں جو ہمارے قدامت بزرگوں کی میراث میں یا بعد میں عصر حاضر کے علماء نے انہیں تحریر کیا ہے اور کچھ ایسی ہیں جو چند صدیاں پہلے لکھی گئی تھیں اور ان کی مخصوص نشر علماء و ادباء سے مخصوص ہے۔

موجود تفاسیر میں بعض اس سطح پر ہیں کہ صرف خواص کے طبقے کا حصہ ہیں اور دیگر طبقات ان سے استفادہ نہیں کر سکتے اور بعض قرآن کے خاص گوشوں کو بیان کرتی ہیں۔ ان کی مثال ایک گلدستہ کی سی ہے جسے کسی تروتازہ باغ سے چننا گیا ہو جس میں باغ کی نشانیاں تو ہیں لیکن باغ نہیں ہے۔

اس طرح اس بار بار کے سوال کا کوئی ایسا جواب نہ مل سکا یا بہت کم ملا کہ جو قانع ہو، وجدان کو مطمئن کرے اور پیاسے متلاشی کی تشنگی روح کو سیراب کر سکے۔

اس پر ہم نے فیصلہ کیا کہ اس سوال کا جواب عمل سے دینا چاہئے کیونکہ اس وقت اس کا صرف زبانی جواب ممکن نہیں ہے لیکن مشکلات اور روز افزوں مشاغل کے ہوتے ہوئے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن ایک ایسا بیکراں سمندر ہے جس میں آسانی سے اور ساز و سامان، تیاری وقت اور کافی غور و فکر کے بغیر داخل نہیں ہوا جاسکتا اور یہ وہ بحر ناپیدا کنار ہے جس میں بہت سے لوگ غرق ہوئے اور ڈوب چکے ہیں۔ حسرت و اندوہ کے عالم میں اس دریا کے کنارے کھڑا میں اس کی امواج فروشاں کا نظارہ کر رہا تھا کہ ایسے میں اچانک ایک بجلی سی فکر میں کوند گئی۔ امید کا دریچہ کھلا اور مسئلے کی راہ حل سمجھائی دینے لگی اور وہ تھی گروپ سسٹم میں کام کرنے کی سوچ اور پھر دس فاضل، مخلص، محقق، آگاہ اور باخبر نوجوان جو ”عشرہ کاملہ“ کے مصداق میں میرے رفیق راہ بن گئے۔ ان کی شبانہ روز پر خلوص کوششوں سے مختصر سی مدت میں یہ پودا ثمر آور ہو گیا اور توقع سے بھی جلدی اس کی پہلی جلد چھپ گئی۔

اس بناء پر کہ کوئی نکتہ عزیز قارئین کے لئے مبہم نہ رہنے پائے ہم اپنے طریقہ کار کی بھی اجمالاً تشریح کئے دیتے ہیں۔ پہلے آیات قرآنی مختلف، حصوں میں ان محترم علماء میں تقسیم کر دی جاتی تھیں (ابتداء میں دو دو افراد کے پانچ گروپ تھے)۔ ضروری ہدایات و راہنمائی کی روشنی میں وہ ان مختلف تفاسیر کا مطالعہ کرتے جو اس تفسیر کا منبع اور اصلی کتب ہیں جنہیں اس فن کے عظیم محققین نے سپرد قلم کیا ہے۔ چاہے وہ محققین سنی ہوں یا شیعہ سب کا مطالعہ کیا جاتا۔ ہمارے زیر نظر رہنے والی تفاسیر میں سے بعض یہ ہیں:

تفسیر مجمع البیان، تالیف شیخ المفسرین محقق عالی قدر جناب طبرسی

تفسیر انوار التنزیل، تالیف قاضی بیضاوی۔

تفسیر الدر المنثور، تالیف جلال الدین سیوطی۔

تفسیر بہان، تالیف محدث بحرانی۔

تفسیر المیزان، تالیف استاد علامہ طباطبائی۔

تفسیر المنار، محمد عبده مصری۔

تفسیر فی ظلال، تالیف مصنف معروف سید قطب

اور تفسیر مراغی، تالیف احمد مصطفیٰ مراغی۔

اس کے بعد وہ معلومات اور ماحصل جو موجودہ زمانے کے احتیاجات اور تقاضوں پر منطبق ہوتے انہیں رشتہ تحریر میں لایا جاتا۔ بعد ازاں اس گروپ کی اجتماعی نشستیں ہفتے کے مختلف دنوں میں منعقد ہوتیں اور یہ تحریریں پڑھی جاتیں اور ان کی اصلاح کی جاتی۔ ان نشستوں میں ہی قرآن کے بارے میں جن نئی معلومات کا اضافہ ضروری ہوتا وہ کیا جاتا۔ پھر اصلاح شدہ تحریروں کو صاف کر کے لکھا جاتا۔ صاف کر کے لکھنے کے بعد ان سب تحریروں کو ان میں سے چند منتخب علماء پھر سے پڑھتے اور انہیں منضبط کرتے۔ آخری شکل دینے کے لئے آخری میں میں خود پورے اطمینان سے اس کا مطالعہ کرتا اور بعض اوقات اسی حالت میں محسوس ہوتا کہ اس میں چند پہلوؤں کا مزید اضافہ کیا جانا چاہئے اور پھر یہ کام انجام دیا جاتا۔ ضمنی طور پر آیات کارواں ترجمہ بھی میں اسی موقع پر کر دیتا تھا۔

عام مطالب (آیات کے ذیلی ترجمہ اور بعض پہلوؤں کے علاوہ جن کا یہ حقیر اضافہ کرتا) چونکہ ان محترم حضرات کے قلم سے ہوتے تھے اور فطری طور پر مختلف ہوتے تھے اس لئے میں ان تحریروں کو ہم آہنگ کرنے کے لئے بھی ضروری کاوش انجام دیتا تھا اور ان تمام زحمات و مشقات کا ثمر یہ کتاب ہے جو عزیز قاری کی نظر سے گزر رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ تمام لوگوں کے لئے عمدہ، مفید اور سودمند ثابت ہوگی۔

گفتار مترجم

اردو میں قرآن حکیم کے بہت سے تراجم اور تفاسیر موجود ہیں۔ اہل تشیع کے ہاں آج بھی مولانا فرمان علی اور مولانا مقبول احمد کے تراجم و حواشی زیادہ مشہور ہیں۔ ایک عرصہ تک تفسیر عمدة البیان کو شہرت حاصل رہی ہے۔ اب لے دے کہ تفسیر انوار النجف ہی ہے۔ دیگر مکاتب فکر کے ہاں بھی متعدد قابل ذکر تفاسیر موجود ہیں لیکن کوئی تو مغربی دنیا کی مادی ترقی کے سامنے دفاعی کوشش معلوم ہوتی ہے اور کوئی اصل معانی و مآخذ ہی سے ہٹتی ہوئی ہے اور ناروا جدت پسندی کا شکار ہے۔ ایک آدھ کو اسلامی رنگ دینے کی کوشش تو کی گئی ہے لیکن وہ بھی ذہنی ناپختگی اور مذہبی تعصب کے اثرات سے نہیں بچ سکی۔ البتہ آزاد اور رواں قرحے اور جدید اردو لہجے میں لکھی جانے والی تفاسیر کو کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہے۔

قرآن کے بارے میں کی جانے والی ہر کوشش سے کچھ نہ کچھ فوائد تو ضرور حاصل ہوئے ہیں لیکن قرآن مجید تمام علوم کی جامع کتاب ہے، اس کے تمام موضوعات کو اس طرح سے بیان کرنا کہ ہر علم کا تشنہ سیراب ہو جائے اس نظر سے دیکھا جائے تو نہ فقط پاکستان میں شیعوں کے پاس کچھ نہیں بلکہ دیگر مکاتب فکر کا بھی یہی حال ہے۔

ایران کے عظیم الشان اسلامی انقلاب نے ہمارے نوجوانوں میں قرآن شناسی کے لئے ایک نئی تڑپ پیدا کر دی ہے اور ان دلوں میں ایک تازہ جوت جگادی ہے۔ اکثر نوجوان پوچھتے کہ قرآن فہمی کے لئے ہم کس تفسیر کا مطالعہ کریں تو ہمارے پاس اس کا جواب نہ ہوتا۔ شدت سے احساس ہوا کہ اردو میں کوئی مفید قرین اور جامع تفسیر لکھی جائے جو دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو اور تمام عالمی افکار و نظریات اور علوم و کمالات کے سامنے اسلامی عظمت اور قرآنی سر بلندی و بالاتری کا حقیقی مظہر ہو اور جس کے ذریعے قرآنی مفاہیم سے آشنائی بھی ہو اور اس الہی و الہامی کتاب سے حقیقی عشق بھی پیدا ہو سکے۔ چند ایک علماء کرام سے اس ضرورت کا تذکرہ کیا لیکن کسی نے حامی نہ بھری۔ خود اپنی کم مائیگی کا احساس جرات نہیں دلاتا تھا۔

اسلامی فکر کو نظر اور علوم و معارف کا اصل سرمایہ عربی اور فارسی میں موجود ہے۔ تفسیر کا بیش بہا خزانہ بھی انہی زبانوں میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ یکجا تو نہیں ہے۔ وسیع مطالعے اور اجتماعی کوششوں کے بغیر اس سے بھی خاطر خواہ فائدہ ممکن نہیں۔

فرمائیں، تقاضے اور سوالات بڑھتے رہے۔ اس پر سیٹھ نوازش علی صاحب سے تذکرہ ہوا۔ وہ کہنے لگے آپ خود یہ کام کیوں نہیں کرتے۔ میں نے اپنی کم علمی کے علاوہ کچھ مجبوریاں بھی ان کے گوش گزار کیں، مگر انہوں نے ہمت بڑھائی۔ اس بات پر اتفاق ہوا کہ عربی فارسی میں موجود کسی ایسی تفسیر کو اردو کے قالب میں ڈھالا جائے جو ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہو۔ آخر ہم دونوں نے ایران کا سفر اختیار کیا۔ وہاں مختلف علماء کرام سے اس بات پر مشورہ کیا کہ اس وقت کونسی تفسیر دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور روزمرہ کے سوالات کا آسان اور مناسب جواب مہیا کرتی ہے۔ ہمارے لئے یہ خوشگوار حیرت کی بات تھی کہ سب نے بالاتفاق تفسیر نمونہ کا نام لیا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اسی تفسیر کا ترجمہ کیا جائے گا۔

ترجمے کے کٹھن مراحل میں بالعموم لفظی ترجمے کا اسلوب اپنایا گیا ہے اگرچہ بعض مقامات پر قارئین کی سہولت اور عبارت کی روانی کے لئے ازاد ترجمے کا طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے ہم مفہوم مفہوم کو منتقل کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے اس سوال کا جواب قارئین ہی بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔

اس تفسیر کے سلسلے میں سب سے زیادہ تعاون کرنے والے اور اس کے لئے ہر طرح کی سہولیات فراہم کرنے والے میرے عزیز دوست سیٹھ نوازش علی ہیں۔ خداوند عالم انہیں بھائیوں، اولاد اور دیگر اعزاء و اقارب کے ساتھ خوش و خرم رکھے، ان کے اموال میں برکت دے، انہیں زیادہ سے زیادہ خدمت دین کی توفیق عطاء فرمائے اور ان کی عاقبت بخیر کرے۔ ترجمے کی نوک پلک دیکھنے، دوبارہ لکھنے اور اشاعت کے مراحل میں عزیز ثاقب نقوی گمران قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ عزیز محمد امین کی خدمات بھی اس ضمن میں قابل قدر ہیں۔ پروفیسر مشکور حسین یاد، اور دیگر بہت سے اجاب بھی اس کار خیر میں تعاون پر تعریف و تشکر کا حق رکھتے ہیں۔

خدایا! ہمیں توفیق دے کہ ہم صرف تیری رضا کے لئے کام کریں، جیسے تیرے بندے اصل تفسیر سے استفادہ کر رہے ہیں اس کے ترجمے سے بھی صحیح طور پر فائدہ اٹھائیں۔ اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر کرتے ہوئے اپنی راہ میں اس کام کو ہماری آخرت کے لئے بہترین ذخیرہ قرار دے۔

اللهم صل علی محمد و عترته المعصومین و عجل فرجهم

صفدر حسین نجفی

اس تفسیر کی خصوصیات

اس بناء پر کہ عزیز و محترم قارئین زیادہ بینش و آگہی کے ساتھ اس تفسیر کا مطالعہ کر سکیں اس تفسیر کے مطالب کا ذکر یہاں ضروری ہے شاید ان میں سے کچھ ان کے گمشدہ مطالب ہوں:

۱۔ قرآن چونکہ کتاب زندگی ہے۔ اس لئے آیات کی ادبی و عرفانی وغیرہ تفسیر کے زندگی کے مادی، معنوی، تعمیر نو کرنے والے، اصلاح کنندہ، زندگی سنوارنے والے اور بالخصوص اجتماعی مسائل کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ اور زیادہ تر انہی مسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے جو فرد اور معاشرے کی زندگی سے نزدیک تعلق رکھتے ہیں۔

۲۔ آیات میں بیان کئے گئے عنوانات کو ہر آیت کے ذیل میں چچی تلی اور مستقل بحث کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سود، غلامی، عورتوں کے حقوق، حج کا فلسفہ، قمار بازی کی حرمت کے اسرار، شراب، سور کا گوشت، جہاد اسلامی کے ارکان و اہداف وغیرہ کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے تاکہ قارئین اس ایک اجمالی مطالعے کے لئے دوسری کتب کی طرح رجوع کرنے سے بے نیاز ہو جائیں۔

۳۔ کوشش کی گئی ہے کہ آیات ذیل میں ترجمہ رواں، سلیس منہ بولتا لیکن گہرا اور اپنی نوع کے لحاظ سے پرکشش اور قابل فہم ہو۔

۴۔ لا حاصل ادبی بحثوں میں پڑنے کے بجائے خصوصی توجہ اصلی لغوی معانی اور آیات کے شان نزول کی طرف توجہ دی گئی ہے کیونکہ قرآن کے دقیق معانی سمجھنے کے لئے یہ دونوں چیزیں زیادہ موثر ہیں۔

۵۔ مختلف اشکالات، اعتراضات اور سوالات جو بعض اوقات اسلام کے اصول و فروع کے بارے میں کئے جاتے ہیں ہر آیت کی مناسبت سے ان کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کا چچا تلا اور مختصر سا جواب دیدیا گیا ہے۔ مثلاً شبہ اکل و ماکول (وہ جانور جو دوسرے جانوروں کو کھا جاتے ہیں)، معراج تعداد ازواج، عورت اور مرد کی میراث کا فرق، عورت اور مرد کے خون بہا میں اختلاف، قرآن کے صروف مقطعات، احکام کی نسوخی، اسلامی جنگیں اور غزوات، مختلف الہی آزمائشیں اور ایسے ہی بیسیوں سوالوں کے جوابات اس طرح دیئے گئے ہیں کہ آیات کا مطالعہ کرتے وقت محترم قاری کے ذہن میں کوئی استفہامی علامت باقی نہ رہے۔

۶۔ ایسی پیچیدہ علمی اصطلاحات جن کے نتیجے میں کتاب ایک خاص صنف سے مخصوص ہو جائے، سے دوری اختیار کی گئی ہے۔ البتہ ضرورت کے وقت علمی اصطلاح کا ذکر کرنے کے بعد اس کی واضح تفسیر و تشریح کر دی گئی ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس راہ میں ہماری مخلصانہ کوشش نتیجہ بخش ثابت ہوں گی اور تمام طبقوں کے لوگ اس تفسیر کے ذریعہ اس عظیم آسمانی کتاب سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوں گے جس کا نام بعض دوستوں کی تجویز پر تفسیر نمونہ رکھا گیا ہے۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ، قم

تیر ماہ، ۱۳۵۲ بمطابق جمادی الثانی ۱۳۹۳۔

سورہ تکویر

سورہ تکویر کے مضامین

یہ مکی سوروں میں سے ہے اور مختلف قرائن اس کی گواہی دیتے ہیں، یہ سورہ اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ کج فہم اور ہٹ دھرم دشمن پیغمبر اسلام پر پر جنون کی تہمت لگاتے تھے اور یہ صورت حال زیادہ تر پیغمبر اسلام کے مکہ کے قیام کے زمانے میں تھی اور ابتدائی تبلیغ میں یہ کیفیت تھی۔ دشمنوں کی کوشش تھی کہ آپ کی باتوں کو سنجیدہ نہ سمجھیں اور ان پر زیادہ توجہ نہ دیں۔ بہر حال یہ سورہ دو محوروں کے گرد گھومتا ہے پہلا محور اس سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں جو قیامت کی نشانیوں، اس جہان کے آخر میں عظیم تبدیلیوں اور قیامت کے آغاز کو بیان کرتی ہیں۔

دوسرے محور میں قرآن کے لانے والے کی عظمت اور قرآن کی نفوس انسانی میں تاثیر کی گفتگو ہے۔ اس حصہ میں دل ہلادینے والی اور بیدار کرنے والی قسمیں ہیں۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی اہمیت اور تلاوت کے بارے میں کئی حدیثیں منقول ہیں، من جملہ ان دیگر احادیث کے علاوہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے مروی ہے کہ ”من قراء سورة اذا الشمس كورت اعاذ الله تعالى ان يفضحه حين تنشر صحيفة“ جو شخص ”اذا الشمس كورت“ کو پڑھے خدا اسے اس وقت ہر رسوائی سے محفوظ رکھے گا جب اعمال نامہ کھولیں^(۱)

ایک اور حدیث میں آنحضرت ہی سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ”من احب ان ينظر الى يوم القيامة فليقرأ اذا الشمس كورت“۔ جو شخص چاہتا ہے قیامت میں میرا دیدار کرے تو سورہ ”اذا الشمس كورت“ کی تلاوت کرے^(۲)

یہ حدیث ایک اور طرح سے بھی نقل ہوئی ہے: من سره ان ينظر الى يوم القيامة (كانه رأى عين) فليقرأ ”اذا الشمس كورت“ و ”اذا السماء انفطرت“ و ”اذا السماء انشقت“۔ جو شخص دوست رکھتا ہے کہ قیامت میں مجھے دیکھے (گویا آنکھ سے دیکھے) (تو وہ سورہ ”اذا الشمس“ اور ”اذا السماء انفطرت“ اور ”اذا السماء انشقت“ کی تلاوت کرے اس لئے کہ ان سوروں میں قیامت کی نشانیاں اس طرح بیان ہوئی ہیں کہ تلاوت کرنے والے کو گویا صحیحہ قیامت سے دوچار کر دیتی ہے۔^(۳)

ایک اور حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ پیغمبر اسلام سے لوگوں نے عرض کیا کہ آپ پر اس قدر جلد کیوں بڑھاپے کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں تو آپ نے فرمایا: شیبی ود و الواقعة و المرسلات و عم يتساء لون و اذا الشمس كورت۔ ”سورہ ہود، واقعہ، مرسلات، عم اور اذا الشمس کورت نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ اس لئے کہ قرآن کے ہولناک حوادث کی ان میں اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے کہ ہر بیدار انسان کو جلد بوڑھا کر دیتی ہے۔“ (۴)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی ایک حدیث مروی ہے کہ جو شخص سورہ ”عبس و تولى“ او ”اذا الشمس كورت“ کو پڑھے تو پروردگار کے لطف و کرم کے زیر سایہ وہ جنت جاوداں میں ہوگا اور خدا کے نزدیک یہ کوئی اہم چیز نہیں ہے کہ وہ ارادہ کر۔ (۵)

جو تعبیریں مندرجہ بالا آیتوں میں آئی ہیں وہ بتاتی ہیں کہ مراد ایسی تلاوت ہے کہ آگاہی اور ایمان و عمل کا سرچشمہ قرار پائے۔

۱۔ مجمع البیان، ج ۱۰ ص ۴۴۱

۲۔ مجمع البیان، ج ۱۰ ص ۴۴۱

۳۔ تفسیر قرطبی، جلد ۱، صفحہ ۷۰۱۷۔ اس حدیث کے معنی کا سابقہ حدیث میں بھی احتمال ہے

۴۔ تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۱۳

۵۔ ثواب الاعمال مطابق نقل نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۱۲

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾

۲۔ ﴿وَ اِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ﴾

۳۔ ﴿وَ اِذَا الْجِبَالُ سَوَّيَتْ﴾

۴۔ ﴿وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ﴾

۵۔ ﴿وَ اِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ﴾

۶۔ ﴿وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ﴾

۷۔ ﴿وَ اِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ﴾

۸۔ ﴿وَ اِذَا الْمَوْءِدَةُ سُئِلَتْ﴾

۹۔ ﴿بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾

ترجمہ

اس خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

۱۔ جس وقت سورج کو لپیٹا جائے گا۔

۲۔ اور جس وقت ستارے بے نور ہو جائیں گے۔

۳۔ جس وقت پہاڑ چلنے لگیں گے۔

۴۔ جس وقت زیادہ قیمتی مال فراموش کر دیا جائے گا۔

۵۔ جس وقت وحوش کو جمع کیا جائے گا۔

۶۔ جس وقت دریا جوش مارنے لگیں گے۔

۷۔ جس وقت ہر شخص اپنے جیسے کا قرین قرار پائے گا۔

۸۔ جس وقت زندہ درگور لڑکیوں سے سوال کیا جائے گا۔

۹۔ کہ ان کو کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا ہے؟

جس دن کائنات کے دفتر کو لپیٹ دیا جائے گا

اس سورہ کے آغاز میں جیسا کہ ہم نے کہا ہے، مختصر، ہیجان انگیز اور دل ہلا دینے والے اشاروں کے ساتھ اس جہاں کے اختتام اور قیامت کی ابتداء کے ہولناک حوادث سے ہمارا آئنا سامنا ہے۔
یہ حوادث ہمیں عجیب و غریب جہانوں کی سیر کراتے ہیں، پروردگار عالم ان نشانیوں میں سے آٹھ نشانیوں کو بیان کرتا ہے۔ پہلے ارشاد فرماتا ہے:

”اس وقت جب سورج کا دفتر لپیٹ دیا جائے گا“ ﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾۔

”کورت“، ”تکویر“ کے مادہ سے اصل میں کسی چیز کے لپیٹنے اور جمع کرنے کے معنی میں ہے۔ (مثلاً سر پر عمامہ لپیٹنا) یہ ایسا مفہوم ہے جو لغت و تفسیر کی بہت سی کتب سے معلوم ہوتا ہے کبھی کسی چیز کے پھینک دینے اور تاریک ہونے کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں معانی اسی اصلی مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

بہر حال یہاں مراد سورج کی روشنی کا بجھ جانا ہے، اس کا تاریک ہونا، یعنی اس کے وجود کا ختم ہو جانا ہے، ہمیں معلوم ہے کہ فی الحال سورج ایک کرہ ہے، حد سے زیادہ گرم اور جلتا ہوا، اس قدر کے اس کا تمام مواد تہہ بہ تہہ گیس کی شکل میں نکل آیا ہے اور اس کے ارد گرد جلانے والے شعلے موجود ہیں جن کی بلندی لاکھوں میٹر ہے۔ اگر کرہ زمین ان میں سے کسی شعلے کی دیریاں الجھ جائے تو ایک ہی لمحہ میں خاک ہو کر تھوڑی سی گیس میں تبدیل ہو جائے لیکن اس جہان کے آخر میں قیامت کی ابتداء پر جو حرارت ختم ہو جائے گی اور شعلے بجھ جائیں گے، اس کی روشنی بھی ختم ہو جائے گی اور اس کے حجم میں کمی ہو جائے گی۔

تکویر کے یہ معنی ہیں۔ اسی لئے لسان العرب میں آیا ہے:

(کورت الشمس جمع ضوء ا ولف کما تلف العمامہ) سورج کی تکویر کے یہ معنی ہیں کہ اس کی روشنی سمٹ جائے

گی اور لپیٹ دی جائے گی جس طرح عمامہ کو پیٹتے ہیں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی موجودہ علم بھی تائید کرتا ہے۔ سورج کی روشنی آہستہ آہستہ تاریکی کی طرف جارہی ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

”اور جس وقت ستارے بے نور ہو کر غائب ہو جائیں گے“ ﴿وَ اِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ﴾۔

”انکدرت“، ”انکدار“ کے مادہ سے گرنے اور پراکندہ ہونے کے معنی میں ہے اور کدورت کی اصل کے پیش نظر تیرگی اور تاریکی کے معنی میں ہے۔ زیر بحث آیت میں ان دونوں کا جمع ہونا بھی ممکن ہے اس لئے کہ آغاز قیامت میں ستارے اپنی روشنی کھو بیٹھے گے، منتشر ہو جائیں گے اور گر پڑیں گے اور عالم بالا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا جیسا کہ سورہ انفطار کی آیت ۲ میں آیا ہے:

﴿وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ﴾ ”اور جب ستارے گر کر منتشر ہو جائیں گے“ اور جیسا کہ سورہ مرسلات کی آیت ۸ میں آیا ہے ﴿فَالنَّجْمُ ظَمُتٌ﴾ اور جب ستارے مٹ جائیں گے اور تاریک ہو جائیں گے ”قیامت کی تیسری نشانی کے سلسلہ میں فرماتا ہے:

”اور جب پہاڑ چلنے لگیں گے“ اذالجبال سیرت۔“ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ قرآن کی مختلف آیتوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آغاز قیامت میں پہاڑ مختلف مراحل طے کریں گے۔

پہلا مرحلہ یہ کہ چلنے لگیں گے اور آخری مرحلہ میں غبار میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں مزید تشریح اسی جلد میں سورہ نبا کی آیت ۲۵ میں ملاحظہ فرمائیں)۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”جس وقت نہایت قیمتی مال فراموشی کے حوالہ ہو جائیں گے“ ﴿إِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ﴾۔

”عشار“ جمع ”عشراء“ کی جو دراصل حاملہ اونٹنی کے معنی میں ہے جس کے حمل کو دس ماہ گزر چکے ہوں اور وہ بچہ جننے کے قریب ہو یعنی زیادہ وقت نہ گزرے گا کہ وہ ایک اور اونٹ کو جنم دے گی۔ اور بہت زیادہ دودھ اس کے پستانوں میں ظاہر ہو گا۔

جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں تو عرب میں اس قسم کے اونٹنی بہت قیمتی شمار ہوتی تھی۔

”عطلت“ تعطیل کے مادہ سے سرپرست اور چرواہے کے بغیر چھوڑ دینے کے معنی میں ہے، مراد یہ ہے کہ اس دن ہولناکی اس قدر شدید ہوگی کہ ہر انسان اپنے نفیس ترین مال کو فراموش کر دے گا۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں نقل کرتے ہیں کہ بعض مفسرین نے عشار کو بادل کے معنی میں لیا ہے اور ”عطلت“ بارش کے معطل ہو جانے کے معنی میں ہے۔ یعنی اس دن آسمان پر بادل تو ظاہر ہوں گے لیکن برسیں گے نہیں۔ (ہو سکتا ہے یہ بادل مختلف گیسوں سے ہوں، یا اسٹمی بادل ہوں، یا گرد و غبار کے تودے جو پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے سے آغاز قیامت میں ظاہر ہوں گے)۔

لیکن طبرسی مزید کہتے ہیں کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ عشار کی تفسیر بادلوں سے کرنا ایسی چیز ہے جو لغت عرب میں معروف نہیں ہے لیکن اس مطلب کی طرف توجہ سے جو ”طریحی“ نے مجمع البحرین میں نقل کیا ہے کہ ”عشار“ اصل میں حاملہ اونٹنی کے معنی میں ہے اور اس کے بعد بار بردار کو کہا گیا ہے۔

ممکن ہے بادلوں پر بھی اس اطلاق عام طور پر پانی کا بوجھ اٹھانے کی وجہ سے ہو اگرچہ ہو بادل جو آغاز قیامت میں نمودار ہوں گے بار بردار نہیں ہوں گے (غور کیجئے)

بعض مفسرین نے ”عشار“ کی تفسیر گھروں اور زرعی زمینوں سے کی ہے جو عرصہ محشر میں پیکار ہو جائیں گے اور ساکنوں اور زراعت کرنے والوں سے محروم ہوں گی۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مشہور ہے۔ بعد میں آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے :

”اور جس وقت وحشی جانور اکٹھے کئے جائیں گے“ ﴿وَإِذَا الْوَحُوشُ حَشُرَتْ﴾۔ وہی جانور جو عام حالات میں ایک دوسرے سے ڈرتے تھے عرصہ قیامت کے حولناک حوادث کی وحشت کی شدت ایسی ہو گی کہ ان کو ایک دوسرے کے گرد جمع کر دے گی اور وہ ہر چیز کو بھول جائیں گے، گویا وہ چاہیں گے کہ اپنے اس اجتماع سے اپنے خوف و وحشت میں کمی کریں۔

دوسرے لفظوں میں جس وقت وہ حولناک مناظر وحشی جانوروں سے ان کے مخصوص خواص چھین لیں گے تو انسانوں سے کیا سلوک کریں گے۔ لیکن بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت قیامت کی عدالت میں وحشی جانوروں کو جمع ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ بھی اپنے عالم میں اور اپنی آگاہی اور شعور کے حدود میں رہتے ہوئے جواب دہی کے پابند ہیں اور گراں گزشتہوں نے ایک دوسرے پر ظلم و ستم کیا ہو گا تو وہاں ان سے بدلہ لیا جائے گا۔

اس آیت کی سورہ انعام کی آیت ۳۸ کے ساتھ مشابہت ہے کہ جو کہتی ہے کہ:

﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَلَكُمْ مَا فَرَطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ﴾

کوئی زمین میں چلنے والا اور کوئی پرندہ جو پانے پروں سے پرواز کرتا ہے موجود نہیں مگر یہ کہ وہ تمہاری طرح امتیں ہیں۔ ہم نے کسی چیز کو اس کتاب میں چھوڑا نہیں ہے، اس کے بعد تم اپنے پروردگار کی طرف محشور ہو گے۔

(جانوروں کے حشر و نشر اور حساب و کتاب کے سلسلہ میں تفصیلی بحث سورہ انعام کی اسی آیت کے ذیل میں جلد ۳ ص ۳۶۹ تا ۳۷۲ ہم کر چکے ہیں)۔

جو کچھ یہاں کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زیر بحث آیات دنیا کے اختتام اور آخرت کے آغاز کی ہولناک نشانیوں کے سلسلہ میں بحث کر رہی ہیں، لہذا پہلی تفسیر مناسب ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:-

”جس وقت دریاؤں میں آگ لگ جائے گی“ ﴿وَإِذَا الْبَحَارُ سُجِّرَتْ﴾۔

”سجرت“۔ ”تسجیر“ کے مادہ سے جلانے اور آگ کے ہیجان میں آنے کے معنی میں ہے۔ اور اگر قرآن کی یہ تعبیر گزشتہ زمانے میں مفسرین کے لئے عجیب و غریب تھی تو اس وقت ہمارے لئے باعث تعجب نہیں ہے اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ پانی دو عناصر، ہیڈروجن اور آکسیجن، سے مرکب ہے جو دونوں شدید طور پر قابل اشتعال ہیں۔

بعید نہیں کہ عرصہ قیامت میں دریا اور سمندروں کا پانی اس طرح دباو اور فشار میں آجائے کہ انکا تجزیہ ہو جائے اور یہ آگ پکڑ جائیں۔

بعض نے اس لفظ کے پر ہونے کے معنی میں تفسیر کی ہے جیسا کہ آگ سے پر تنور کو مسجّر کہا جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ عرصہ محشر کے زلزلے اور پہاڑوں کا انتشار دریاؤں اور سمندروں کے پر ہونے کا سبب بنے یا آسمانی پتھروں کے گرنے سے وہ پر ہو جائیں اور ان کا متلاطم پانی خشکیوں کی سطح پر جاری ہو اور ہر چیز کو غرق کر دے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

”اور جس وقت ہر شخص اپنے جیسے کا قرین ہو جائے گا“ ﴿وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ﴾۔ صالحین صالحین کے ساتھ، اور بدکار بدکار لوگوں کے ساتھ، اصحاب الیمین اصحاب الیمین کے ساتھ اور اصحاب الشمال اصحاب الشمال کے ساتھ، اس دنیا کے برعکس جہاں سب ملے جلے ہیں، کہیں مومن کا ہمسایہ مشرک ہے اور کہیں صالح اور نیک کا ہمسایہ غیر صالح ہے۔ لیکن قیامت کے جو یوم الفصل یعنی جدائی کا دن ہے، اس میں یہ صفتیں مکمل طور پر الگ الگ اور ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گی۔

اس آیت کی تفسیر میں دوسرے احتمالات بھی پیش ہوئے ہیں من جملہ ایک یہ ہے کہ ارواح ابدان میں پلٹ آئیں گی یا جتنی روحوں کے ساتھ جہنمی نفوس شیاطین کے پا ہو جائیں گے یا یہ کہ ہر انسان اپنے دوست یا رفیق کے قریب ہوگا بعد میں اس کے کہ موت ان کے درمیان جدائی ڈال دے گی یا ہر انسان اپنے اعمال کا قرین ہوگا۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ سورہ واقعہ کی آیات ۷ سے ۱۱ تک اس کی گواہ ہیں:

﴿وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً فَأَصْحَابُ الْمِينَةِ مَا أَصْحَابُ الْمِينَةِ وَاصْحَابُ امْشِئَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَشْئَةِ وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ﴾

اس دن تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ پہلا گروہ اصحاب ینہ کا ہے۔ کیا کہنا اصحاب میمنہ کا۔ دوسرا گروہ اصحاب شمال کا ہے وہ کیا ہی منحوس گروہ ہے اور تیسرا گروہ سبقت کرنے والوں کا ہے اور سبقت کرنے والے ہی مقربین ہیں۔

حقیقت میں یہ آیت ایسی تبدیلیاں جو قیامت کی تمہید ہیں، ان کے ذکر کے بعد اس عظیم دن کے ہر اول دستے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ ایسا دن ہے جس میں ہر شخص اپنے قرین کے ہمراہ ہو جائے گا۔
اس کے بعد قیامت کے ایک حادثہ کو موضوع بناتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

”جس وقت زندہ درگور لڑکیوں سے سوال کیا جائے گا“ ﴿وَإِذَا الْمَوْءِدَةُ سُئِلَتْ﴾۔ ”کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی ہیں“ ﴿بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾۔

”موءدہ“۔ ”وَأَد“ (بروزن رد) اس کی لڑکی کے معنی میں ہے جسے زندہ دفن کر دیا گیا ہو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی ثقل، بوجھ اور سنگینی کے ہیں اور چونکہ ان لڑکیوں کو قبر میں دفن کرتے تھے اور ان پر مٹی ڈال دیتے تھے اس لئے یہ تعبیر ان کے لئے استعمال کی گئی ہے۔

بعض روایات کے نتیجہ میں اس آیت کی تفسیر کو وسعت دی گئی ہے یہاں تک کہ ہر قسم کے قطع رحم یا مودۃ اہل بیت کو قطع کرنا اس میں شامل ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جس وقت اس آیت کی تفسیر کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا (من قتل فی مودتنا) اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہماری محبت کی راہ میں قتل کر دیئے گئے ہیں۔^(۱)

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ اس بات کی گواہ آیت قربیٰ ہے ﴿قُلْ لَا اسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اجْرًا اَلَا الْمَوْدَةُ فِی الْقُرْبٰی﴾ ”کہہ دے میں تبلیغ نبوت کے سلسلہ میں تم سے کسی قسم کا اجر نہیں چاہتا سوائے اپنے اہل بیت کی مودۃ کے“ (سورہ شوریٰ ۲۳۔)^(۲) البتہ آیت کا ظاہری مفہوم وہی پہلی تفسیر ہے لیکن اس میں اس قسم کے مفہوم کی صلاحیت ہے۔

۱۔ تفسیر برہان جلد ۴ ص ۴۳۲، حدیث ۱۱۰۷۔ ۲۔ تفسیر برہان جلد ۴ ص ۴۳۲، حدیث ۱۱۰۷۔

۱۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا

عربوں کے زمانہ جاہلیت کے دردناک ترین اور نہایت وحشیانہ مظاہر میں سے ایک مظہر لڑکی کا زندہ درگور کر دینا ہے جس کی طرف قرآن مجید میں بارہا اشارہ ہوا ہے۔ اگر بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ قبیح رسم عربوں میں عام تھی۔ صرف قبیلہ کنده یا بعض دوسرے قبائل میں تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اقدام کچھ عجیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ قرآن اس بارے میں اتنی تاکید کے ساتھ بار بار گفتگو نہ کرتا۔

بہر حال یہ کام اس قدر وحشت ناک تھا کہ اس کا کبھی کبھی ہونا بھی نہایت قبیح امر ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ عربوں کے زمانہ جاہلیت میں جس وقت عورت کے وضع حمل کا وقت قریب آتا تو زمین میں ایک گڑھا کھود دیتے اور اس کے اوپر بیٹھ جاتے اگر نوزائیدہ بچہ لڑکی ہو تو اس کو اس گڑھے میں پھینک دیتے اور اگر لڑکا ہوتا تو اسے زندہ رہنے دیتے۔ اسی لئے ان کے شعراء میں سے ایک شاعر اس سلسلہ میں فخریہ لہجہ میں کہتا ہے:

سمیتھا اذا ولدت تموت و القبرصھو ضامن ذمیت

میں نے اس نوزائید لڑکی کا نام اس کی ولادت کے وقت تموت رکھا (جس کے معنی مر جائے گی) اور قبر میرا داماد ہے جس نے اسے اپنی بغل میں لے لیا اور اسے خاموش کر دیا۔^(۱)

اس جرم کے مختلف اسباب و عوامل تھے

زمانہ جاہلیت میں عورت کا ایک انسان کے لحاظ سے بے قدر و قیمت ہونا اس شدید فقر و فاقہ کی کیفیت کا نتیجہ تھا جو اس معاشرہ میں مسلط تھا۔ لڑکیاں نہ تو کچھ کما کر دے دے سکتی تھیں نہ ڈاکہ ڈالنے میں شرکت کر سکتی تھیں۔ ایک سبب اور بھی اور وہ یہ کہ اس بات کا امکان تھا کہ مختلف جنگوں میں گرفتار ہو کر لڑکیاں قید ہو جائیں اور ان کی عزت و ناموس دوسروں کے قبضہ میں چلی جائے گی جس کے نتیجہ میں بے غیرتی کا دھبہ متعلقین کے دامن پر لگ جائے گا۔

یہ چند عوامل لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کا سبب بنے، انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زمانہ موجود میں بھی یہ رسم کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اور کچھ نہیں تو اسقاط حمل کی آزادی کی صورت میں بہت سے متمدن ممالک میں رواج پائے ہوئے۔ اگر زمانہ جاہلیت کے عرب نوزائیدہ بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے تو ہمارے زمانہ متمدن

انسان انھیں شکم مادر میں قتل کر دیتے ہیں اس کی مزید تشریح جلد ۶ ص ۳۷۲ پر سورہ نحل کی آیت ۵۹ کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں۔

۲۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس اقدام کو اس قدر قبیح اور قابل نفرت قرار دیا ہے کہ روز قیامت دوسرے اعمال کی پریش سے پہلے اس داد خواہی کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قانون اسلام کی رو سے عام انسانوں خصوصاً بے گناہ انسانوں کے خون کی بہت شدید گرفت کی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں عورت کی کتنی قدر و منزلت ہے۔

۳۔ ایک اور نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن میں نہیں کہا کہ قاتلوں سے سوال کریں گے بلکہ کہتا ہے کہ ان معصوم بچیوں سے سوال ہو گا کہ تمہارا کیا گناہ تھا کہ اس بے رحمانہ طریقہ پر تم کو قتل کیا گیا۔ گویا قاتل اس قابل بھی نہیں ہیں کہ ان سے ان کے جرم کے بارے میں پریش بھی کی جائے بلکہ تنہا ان مقتولین کی گواہی کافی ہے۔

آیات ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴

۱۰۔ ﴿وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾

۱۱۔ ﴿وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ﴾

۱۲۔ ﴿وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِرَتْ﴾

۱۳۔ ﴿وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ﴾

۱۴۔ ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ﴾

ترجمہ

۱۰۔ جس وقت اعمال نامہ کھول دیئے جائیں گے۔

۱۱۔ اور جس وقت آسمان سے پردہ ہٹا دیا جائے گا۔

۱۲۔ اور جس وقت دوزخ دہک اٹھے گا۔

۱۳۔ اور جس وقت جنت قریب کر دی جائے گی۔

۱۴۔ اس وقت ہر انسان جان لے گا کہ اس نے کیا کیا ہے۔

اس دن معلوم ہو گا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔

اس بحث کے بعد کہ جو گزشتہ آیتوں میں قیامت کے مرحلے یعنی اس جہان کی ویرانی کے موضوع پر آئی تھی زیر بحث آیتوں میں اس کے دوسرے مرحلہ یعنی دوسرے عالم کے ظہور اور نامہ اعمال کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے: ”جس روز اعمال نامہ کھول دئے جائیں گے“ ﴿وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾۔ ”صحف“ صحیفہ کی جمع ہے۔ یہ اس چیز کے معنوں میں ہے جو صفحہ رخ کی طرح وسیع ہو۔ اس کا اطلاق ان تختیوں اور کاغذوں پر ہوا ہے جن پر کچھ مطالب لکھتے ہیں۔ قیامت میں اعمال ناموں کے کھلنے سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے وہ اعمال انجام دئے ہیں ان کے سامنے اعمال ظاہر ہو جائیں گے تاکہ وہ اپنا حساب کتاب دیکھ لیں جیسا کہ سورہ اسراء کی آیت چار میں آیا ہے: ﴿اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا﴾ اور ان اعمال ناموں کا دوسروں کے سامنے واضح ہونا بھی نیکو کاروں کے لئے ایک تشویق کا عنوان ہے اور بدکاروں کے لئے تشویق و سزا و رنج اور تکلیف ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”اور جس وقت آسمان کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا جائے گا“۔ ﴿وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ﴾۔ ”کشطت“ (بروزن کشف) کے مادہ سے اصل میں،

جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے، جانور کی کھال اتارنے کے معنی میں ہے اور ابن منظور کے بقول ”لسان العرب“ میں کسی چیز کے رخ سے پردہ ہٹانے کے معنی میں بھی آیا ہے، لہذا جس وقت بادل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں تو یہ تعبیر استعمال ہوتی ہے۔

زیر بحث آیت میں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ پردے جو اس دنیا میں عالم مادہ اور عالم بالا پر پڑے ہوئے ہیں یعنی لوگ فرشتوں کو یا دوزخ و جنت کو نہیں دیکھ سکتے، وہ ہٹ جائیں گے اور انسان علم ہستی کے حقائق کو دیکھ سکیں گے۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں آئے گا کہ جہنم شعلہ ور ہوگا اور جنت انسانوں کے نزدیک ہو جائے گی جی ہاں قیامت کا دن یوم البروز ہے۔ چیزوں کی ہیئت اس دن آشکار ہو جائے گی اور آسمان کے چہرے سے پردہ ہٹ جائے گا۔ اس تفسیر کے مطابق و مندرجہ بالا آیت قیامت کے دوسرے مرحلہ کے حوادث یعنی انسانوں کی حیات تازہ کے مراحل کی گفتگو کرتی ہے۔ قبل و بعد کی آیات بھی انہی چیزوں کے حامل ہیں اور یہ بہت سے مفسرین اس آیت کو آسمانوں کے لپیٹے جانے اور قیامت کے پہلے مرحلہ یعنی اس عالم کی فنا سے متعلق سمجھا ہے، یہ بہت بعید نظر آتا ہے اور نہ یہ مفہوم قبل و بعد کی آیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے، اس لئے بعد والی آیات میں مزید فرماتا ہے ”اور جس وقت جہنم شعلہ ور ہوگا“ ﴿وَإِذَا الْجَحِيمُ سَعُرَتْ﴾۔ ﴿وَإِنْ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ﴾۔ ”بیشک دوزخ کافروں کا احاطہ کئے ہوئے ہے“ (توبہ / ۴۹)

کے مطابق جہنم اب بھی موجود ہے لیکن اس دنیا کے حجابات اس کے مشاہدہ کی راہ میں حائل ہیں۔ جیسا کہ بہت سی آیات قرآنی کے مطابق جنت بھی ان پرہیزگاروں کے لئے تیار ہے۔ اسی بناء پر بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ”اور جس وقت جنت ہیزگاروں کے نزدیک کر دی جائے گی“ ﴿وَإِذَا الْجَنَّةُ أُنْفِلَتْ﴾۔ یہی معنی سورہ شعراء کی آیت ۹۰ میں بھی اس فرق کے ساتھ آئے ہیں کہ یہاں متقین کے نام کی تصریح نہیں ہوئی۔ ”انفلفت“۔ ”زلف“ (بروزن صرف) اور ”زلفی“ (بروزن کبریٰ) کے مادہ سے نزدیکی کے معنوں میں ہے ہو سکتا ہے اس سے مراد قرب مکانی ہو یا قرب زمانی یا اسباب و مقدمات کے لحاظ سے یا پھر یہ سب امور ہوں یعنی جنت مکان کے لحاظ سے بھی مومنین کے نزدیک ہو جائے گی اور زمان و رود کے اعتبار سے بھی اور اس کے اسباب و علل بھی وہاں سہل و آسان ہوں گے۔ قابل توجہ یہ ہے کہ یہ نہیں فرماتا کہ نیکو کار جنت کے نزدیک ہو جائیں گے بلکہ فرماتا ہے جنت کو ان کے نزدیک کر دیں گے اور یہ بہت ہی محترم تعبیر ہے جو اس سلسلہ میں ممکن ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے جنت اور جہنم دونوں اس وقت موجود ہیں لیکن اس دن جنت زیادہ تر نزدیک اور دوزخ ہر زمانہ کی نسبت زیادہ بھڑک رہا ہوگا۔ آخری زیر بحث آیت میں جو فی الحقیقت تمام گزشتہ

آیتوں کی تکمیل کرتی ہے اور تمام شرطیہ جملوں کی جزا ہے جو گزشتہ بارہ آیتوں میں آئے ہیں، فرماتا ہے: ”اس وقت ہر شخص جان لے گا کہ اس نے کیا کچھ حاضر کیا ہے“ ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا حَضَرَتْ﴾۔ اور تعبیر اچھی طرح بتاتی ہے کہ انسان کے تمام اعمال وہاں حاضر ہو گئے اور وہاں انسان کا علم مشاہدہ لئے ہوگا۔ یہ حقیقت قرآن کی متعدد آیات میں آئی ہے۔ سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں ہم پڑھتے ہیں (و وجدوا ما عملوا حاضراً) ”جو کچھ انہوں نے اعمال کئے ہیں وہ اسے حاضر پائیں گے“۔ اور سورہ زلزال کی آخری آیات میں آیا ہے: (فمن يعمل مثقال ذرة خيراً يره ومن يعمل مثقال ذرة شراً يره) جس شخص نے ذرہ برابر نیک عمل کیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا۔ یہ آیت بھی اعمال کی تجسیم کو بیان کرتی ہے اور یہ کہ انسانوں کے اعمال جو اس جہاں میں بظاہر نابود ہو جاتے ہیں، وہ حقیقتاً نابود نہیں ہوتے۔ اس دن مناسب شکلوں اور صورتوں میں مجسم ہو گئے اور عرصہ محشر میں حاضر ہو گئے۔

۱۔ نظم آیات

زیر بحث آیتوں میں اور گزشتہ آیتوں میں مسئلہ قیامت کے رابطہ سے بارہ احادیث کی طرف اشارہ ہوا ہے جن سے چھ دوسرے حوادث چھ دوسرے مرحلہ یعنی موت کے بعد کی نئی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

پہلے حصہ میں سورج کے تاریک و سیاہ ہو جانے، ستاروں کے بے نور ہونے، پہاڑوں کے تزلزل اور حرکت میں آجانے، سمندروں میں آگ لگ جانے، اموال کو بھول جانے اور جانوروں کے وحشت زدہ ہو جانے کے بارے میں گفتگو ہے۔

دوسرے مرحلہ میں انسانوں کے الگ الگ صفوں میں محصور ہونے، بے گناہ زندہ درگور لڑکیوں سے سوال کئے جانے، نامہ اعمال کے کھلنے، آسمانوں سے جبابات کے ہٹ جانے، جہنم کی آگ کے بھڑک اٹھنے، جنت کے نزدیک ہونے اور آخر میں انسان کے اپنے اعمال سے مکمل طور پر آگاہ ہونے کی بات ہوئی ہے۔

یہ آیات، باوجود اختصار، اس قدر پر معنی اور دل ہلانے دینے والی ہیں کہ ہر انسان کے وجود کو متزلزل کر دیتی ہے اور اسے غور و فکر پر اس طرح مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اس دنیا کے انجام اور قیامت کی کیفیات کو مختصر عبارتوں میں اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم دیکھنے لگتا ہے۔ کس قدر زیبا، خوبصورت، اور اثر کرنے والی یہ آیات قرآن ہیں اور کس قدر پر معنی اور الہام بخش ان کے نکات ہیں۔

۲۔ کیا نظام شمسی ختم ہو جائے گا اور ستاروں کے چراغ گل ہو جائیں گے؟

ہر چیز سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ہمارے نظام شمسی کا یہ حیات بخش مرکز جسے ہم سورج کہتے ہیں آسمان کے باقی رہنے ستاروں کی بہ نسبت اگرچہ یہ متوسط ستارہ ہے لیکن اپنی ذات کی حد تک اور کرہ زمین کی نسبت بہت بڑا ہے۔ ماہرین کی تحقیق اور ان کے مطالعوں کے مطابق اس حجم کا ایک ملین اور تین کروڑ گنا زمین کے مقابلہ میں ہے البتہ یہ چونکہ ہم سے تقریباً ایک سو پچاس ملین کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے لہذا وہ موجود حجم میں نظر آتا ہے۔

سورج کی عظمت و وسعت کی تصویر کشی کے لئے یہی مقدار کافی ہے کہ اگرچاند اور زمین کو اس فاصلہ کے ساتھ جو اس وقت ان دونوں کے درمیان ہے سورج کے اندر منتقل کر دیں تو چاند آسانی کے ساتھ زمین کے گرد گردش کر سکتا ہے بغیر اس کے کہ وہ سورج کی سطح سے خارج ہو۔

سورج کی سطح کی حرارت چھ ہزار سینٹی گریڈ سے زیادہ ہے اور اس کے عمق کی حرارت کئی ملین درجوں سے زیادہ ہے۔ اگرچہ ہم چاہیں کہ سورج کے وزن کو ٹنوں کے حساب سے بیان کریں تو ضروری ہے کہ ہم دو کا عدد لکھیں اور ستائیس صفر اس کے آگے لگائیں یعنی دو ارب ارب ارب ٹن۔

سورج کی سطح سے شعلہ بلند ہوتے ہیں جنکا ارتفاع کبھی تو ایک سو ساٹھ ہزار کلومیٹر ہوتا ہے اور کرہ زمین اس کے اندر آسانی سے گم ہو سکتا ہے، چونکہ زمین قطرہ بارہ ہزار کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے، باقی رہا سورج کی نورانی روشنی دینے والی طاقت کا سرچشمہ، اس کے برعکس جو بعض ماہرین نے طے کر رکھا ہے، وہ چلنے سے پیدا نہیں ہوتا۔

جارج گاموف اپنی کتاب ”سورج کی پیدائش اور اس کی موت“ میں لکھتا ہے کہ اگر سورج کا جسم خالص پتھر کے کونلے سے بنا ہوتا اور مصر کے پہلے فرعون کے زمانے میں اسے آگ لگائی گئی ہوتی تو ضروری تھا کہ وہ اب تک سب جل چکا ہوتا اور خاک کے سوا کوئی چیز باقی نہ بچی ہوتی اور کسی قسم کے دوسرا جلنے والا مادہ اگر پتھر کے کونلے کی جگہ ہم فرض کریں تو وہ بھی یہی اشکال رکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جلنے کا مفہوم سورج پر صادق نہیں آتا۔ اس میں جو کچھ ہے وہ ایٹمی تجربوں سے حاصل شدہ طاقت ہے ہم جانتے ہیں کہ یہ طاقت (انرجی) بہت زیادہ اور بڑی ہے اس بناء پر سورج کے ایٹم انرجی کی تبدیلی میں مصروف ہیں

جو ماہرین کے حساب کے مطابق ہر سیکنڈ میں چار ملین ٹن کم ہو جاتے ہیں مگر سورج کا حجم اتنا بڑا ہے کہ ہزار ہا سال گزرنے کے باوجود اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اس کیفیت و وضع میں معمولی سا تغیر بھی واقع نہیں ہوتا۔

لیکن جاننا چاہیے کہ یہی چیز ایک مدت دراز کے بعد سورج کے فنا ہو جانے کا سبب بنے گی اور آخر کار یہ جرم عظیم لاغر، کمزور، پتلا اور بے نور ہو جائے گا۔ اور یہی چیز ستاروں پر بھی صادق آتی ہے۔^(۱)

اس بناء پر جو کچھ اوپر والی آیات میں سورج کے تاریک ہونے اور ستاروں کے بکھر جانے کے سلسلہ میں آیا ہے وہ ایسی حقیقت ہے جو موجودہ زمانے کے علم کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور قرآن نے اس وقت ان حقائق کو بیان کیا ہے جب نہ صرف جزیرۃ العرب کے ماحول میں بلکہ اس زمانے کی علمی دنیا کی محفلوں میں بھی ان مسائل کی کوئی خبر نہیں تھی

۱۔ اقباس از کتب ”پیدائش و مرگ خورشید“ و نجوم بی تلکوب“ اور ”ساختمان خورشید

آیات ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵

- ۱۵۔ ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِالْخَنَسِ﴾۔
- ۱۶۔ ﴿الْجَوَارِ الْكُنَّسِ﴾۔
- ۱۷۔ ﴿وَالْيَلِ إِذَا عَسْعَسَ﴾۔
- ۱۸۔ ﴿وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ﴾۔
- ۱۹۔ ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾
- ۲۰۔ ﴿ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ﴾
- ۲۱۔ ﴿مَطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ﴾
- ۲۲۔ ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ﴾
- ۲۳۔ ﴿وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأَفْقِ الْمُبِينِ﴾
- ۲۴۔ ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾
- ۲۵۔ ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ﴾

ترجمہ

- ۱۵۔ قسم ہے ان ستاروں کی جو پلٹ آتے ہیں۔
- ۱۶۔ چلتے ہیں اور نگاہوں سے چھپ جاتے ہیں۔
- ۱۷۔ اور قسم ہے رات کی جب وہ پشت پھیرے اور آخر کو پہنچ جائے۔
- ۱۸۔ اور صبح کی جب وہ تنفس کرے۔
- ۱۹۔ کہ یہ قرآن با عظمت بھیجے ہوئے کا کلام ہے (جبرائیل امین)۔
- ۲۰۔ جو صاحب قدرت ہے اور صاحب عرش خدا کے ہاں بلند مقام کا حامل ہے۔
- ۲۱۔ فرمانروا اور امین ہے۔
- ۲۲۔ اور تمہارا ساتھی (پیغمبر) دیوانہ نہیں ہے۔
- ۲۳۔ اس نے اُس کو (جبرائیل کو) روشن افق میں دیکھا۔

۲۴۔ وہ اس کے بارے میں جسے اس نے وحی سے حاصل کیا ہے بخیل نہیں ہے۔

۲۵۔ یہ قرآن شیطانِ رجیم کا قول نہیں ہے۔

وحی الہی اس پر نازل ہوئی

پروردگار عالم گذشتہ آیتوں کے بعد، جو قیامت و معاد اور اس کے مقدمات اور محشر کے عظیم دن کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، ان آیتوں میں قرآن کی حقانیت اور پیغمبر اسلام کی گفتار کے سچ ہونے کی بحث کو پیش کرتا ہے اور معاد کے بارے میں جو کچھ گزشتہ آیات میں آیا، حقیقت میں اس کی تائید کرتا ہے اور آگاہی بخشنے والی قسموں کے ساتھ ان مطالب کی تائید کرتا ہے، پہلے فرماتا ہے:

”قسم ہے ستاروں کی جو لوٹتے ہیں“ ﴿فَلا اقسام بالخنس﴾^(۱) اور نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں“ ﴿الجوار

الخنس﴾۔

”خنس“۔ ”خانس“ کی جمع ہے ”خنس“ (بروزن شمس) کے مادہ سے اصل میں انقباض، بازگشت اور پنہاں ہونے کے معنی میں ہے۔ اور شیطان کو اس لئے خناس کہتے ہیں کہ وہ خود کو چھپائے رکھتا ہے اور جب خدا کا نام لیا جائے تو وہ منقبض ہو جاتا ہے۔

جیسے کہ حدیث میں آیا ہے: (الشیطان یوسوس الی العبد فاذا ذکر اللہ خنس) شیطان ہمیشہ خدا کے بندوں کو وسوسہ میں ڈالتا ہے لیکن جس وقت خدا کو یاد کریں تو پلٹ جاتا ہے۔^(۲)

”جوار“۔ ”جاریہ“ کی جمع ہے جس کے معنی تیز رفتار کے ہیں۔ ”کنس“ کانس کی جمع ہے۔ ”کنس“ (بروزن شمس) کے مادہ سے چھپ جانے کے معنی ہیں۔ اور کناس (بروزن پلاس) پرندوں کے گھونسلوں، ہرنوں اور دوسرے وحشی جانوروں کے چھپنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

یہ کہ ان قسموں سے کیا مراد ہے بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے نظام شمسی کے پانچ ستاروں کی طرف اشارہ ہے جو دور بین کے بغیر دیکھے جاسکتے ہیں۔ (عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل) اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر ہم پے در پے چند راتوں کو آسمان پر نگاہیں لگائیں رکھے تو اس حقیقت کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ آسمان کے ستارے اجتماعی طور پر بتدریج طلوع ہوتے ہیں اور اکٹھے ہی غروب ہوتے ہیں بغیر اس کے ان کے فاصلوں میں کوئی تبدیلی رونما ہو۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسے مروارید ہیں جو ایک سیاہ پارچہ پر معین و مقرر فاصلوں پر ٹا کے گئے ہیں۔
اس پارچہ کو ایک طرف سے اوپر لے جاتے ہیں اور دوسری طرف سے نیچے کھینچتے ہیں، صرف پانچ ستارے ہیں جو
اس قانون کلی سے مستثنیٰ ہیں دوسرے ستاروں کے درمیان چلتے پھرتے رہتے ہیں، گویا پانچ مروارید ٹکے ہوئے نہیں ہیں

اور پارچے پر آزاد قرار دئے گئے ہیں اور وہ لوٹے پوٹے رہتے ہیں۔

یہ وہی مذکورہ بالا پانچ ستارے ہیں جو نظام شمسی کے خاندان کے ارکان ہیں اور ان کی حرکت قریب ہونے کی وجہ
سے ہمیں محسوس ہوتی ہے ورنہ آسمان کے تمام ستارے ہی اس قسم کی حرکات کے حامل ہیں۔
لیکن چونکہ وہ ہم سے دور ہیں لہذا ہم ان کی حرکات کو محسوس نہیں کرتے۔

پھر اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ علماء یسٹ نے ان ستاروں کا نام ”نجوم متحیرہ“ رکھا ہے۔ اس لئے
کہ ان کی حرکات خط مستقیم پر نہیں ہے اور اس طرح نظر آتا ہے کہ ایک مدت تک سیر کرتے ہیں پھر تھوڑا سا واپس پلٹتے
ہیں، دوبارہ اپنی سیر شروع کر دیتے ہیں جس کے اسباب کے بارے میں علم یسٹ میں بہت سے مباحث ہیں۔

مندرجہ بالا آیات ہو سکتا ہے اس طرف اشارہ ہوں کہ یہ ستارے حرکت رکھتے ہیں ﴿الجوار﴾ اور اپنی سیر و حرکت
میں رجوع و بازگشت رکھتے ہیں۔ ﴿الخنس﴾ اور انجام کار سورج کے طلوع کے وقت پنہاں ہو جاتے ہیں، ان ہرنوں کی
طرح جو راتوں میں میانوں میں اپنی غذا تلاش کرنے کے لئے پھرتے رہتے ہیں اور صبح کے وقت شکاریوں اور وحشی
جانوروں کے خوف سے اپنا کناس اور غاریں مخفی ہو جاتے ہیں۔ ﴿الکنس﴾

یہ احتمال بھی ہے کہ کنس سے مراد سورج کی شعاؤں میں پوشیدہ ہونا ہے اس اعتبار سے سورج کے گردش کرتے وقت
کبھی اس نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ سورج کے قریب ہو جاتے ہیں اور پھر بالکل نظر نہیں آتے جسے علماء نجوم احتراق سے
تعبیر کرتے ہیں اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے جو ان ستاروں کی وضع کیفیت کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے۔

بعض مفسرین کو ان ستاروں کے آسمان کے برجوں میں قرار پانے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

جو ہرنوں کے اپنے ٹھکانوں میں پنہان ہونے سے مشابہت رکھتا ہے البتہ یہ معلوم ہے کہ نظام شمسی کے سیارے
صرف ان پانچ تک محدود نہیں ہیں اور تین دوسرے سیارے اور انوس، پلوٹوں اور نپٹون بھی موجود ہیں جو صرف

صرف ان دور بینوں سے دیکھے جاسکتے ہیں جو ستاروں کو دکھاتی ہیں اور وہ کمرہ ارض کے ساتھ مل کر نظام شمسی کے نویسیاروں کو تشکیل دیتے ہیں (البتہ یہ نویسیارے ایک یا کئی چاند رکھتے ہیں جن کا حساب اس جمع سے الگ ہے)۔

”جواری“ جو جاریہ کی جمع ہے اور جس کے معنی وہ کشتیاں جو چل رہی ہوں، ایک لطیف تعبیر ہے جو ان ستاروں کی آسمان کے سمندر میں حرکت اور چلنے کو کشتیوں کے سمندروں اور دریاؤں میں چلنے سے تشبیہ دیتی ہے۔

بہر حال قرآن مجید گویا یہ چاہتا ہے کہ ان پر معنی اور ایک قسم کے ابہام کی آمیزش رکھنے والی قسموں کے ساتھ افکار انسانی کو بیدار کرے اور انہیں آسمان کے ستاروں کی عظیم فوج اور دستوں کے درمیان جو ان سیاروں کی مخصوص اور استثنائی وضع و کیفیت ہے اس کی طرف متوجہ کرے تاکہ ان اجرام فلکی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کے بعد دماغ انسانی اس عظیم دستگاہ کو عالم وجود میں لانے والے کی عظمت سے آشنا ہو۔

بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیات کی کچھ اور تفسیریں بھی کی ہیں لیکن چونکہ وہ قابل ملاحظہ نہیں لہذا ان کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں جو امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے، آیا ہے کہ آپ نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا: (ی خمسة انجم زحل والمشتري و المريخ و الزهره و عطارد) وہ پانچ ستارے ہیں زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد۔^(۳)

پس دوسری مرتبہ قسم کھا کر فرماتا ہے: ”قسم ہے رات کی جب وہ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ﴾“ عسّس۔ ”عسّسہ“ کے مادہ سے اصل میں دقیق اور ہلکی تاریکی کے معنی میں ہے اور چونکہ رات کی ابتداء اور انتہا میں تاریکی زیادہ ہلکی ہوتی ہے لہذا یہ معنی رات کے پشت پھیرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اور لفظ ”عسّس“ کا طلاق رات کو گردش کرنے والے ملازمین پر بھی اسی مناسبت سے ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے اگرچہ لفظ مکمل طور پر دو مختلف معانی رکھتا ہے لیکن یہاں بعد میں آنے والی آیت کے قرینے کے پیش نظر جو صبح کی بات کرتی ہے مراد رات کا اختتام ہی ہے اور حقیقت میں اس قسم کے مشابہ ہے جو سورہ مدثر

آیت ۳۳ میں آئی ہے ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا اَدْبَرَ﴾

اصولی طور پر رات جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ہے جو جسم اور روح کے آرام و سکون کا باعث بھی ہے اور حرارتِ آفتاب کے اعتدال اور موجودات کی زندگی کے جاری رہنے کا سبب بھی ہے لیکن

اختتام شب پر انحصار ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ وہ روشنی اور نور کی طرف رخ کئے ہوئے ہے اس سے قطع نظر پروردگار سے مناجات اور عبادت کرنے کے لئے بہترین وقت ہے اور عالم زندگانی کے آغاز و حرکت کا لمحہ ہے۔

آخر کار تیسری اور آخری قسم کی جانب رخ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”قسم ہے صبح کی جب وہ سانس لے“ ﴿وَالصُّبْحُ إِذَا تَنَفَّسُ﴾۔ کیا عمدہ اور جاذب توجہ تعبیر کی ہے۔ صبح زندہ موجود سے تشبیہ دی ہے کہ اس کے تنفس یعنی سانس لینے کی ابتداء طلوع سپیدہ سحری سے ہوتی ہے وہ تمام موجودات میں روح حیات پھونکتی ہے، گویا ایک کالے حبشی لشکر کے ہاتھ اور پاؤں کے نیچے اس کا سانس رک گیا تھا اور نور و روشنی کی پہلی شعاع کے چمکنے سے اس سے چنگل سے آزاد ہو کر تازہ سانس لینے لگی ہے۔

یہ تعبیر اس تعبیر کے مشابہ ہے جو سورہ مدثر میں رات کی قسم کے بعد آئی ہے جس میں فرماتا ہے: (وَالصُّبْحُ إِذَا اسْفَرُ) ”قسم ہے صبح کی جب وہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹائے“ گویا رات کی تاریکی سیاہ نقاب کے مانند ہے جو صبح کے چہرے پر پڑی ہے۔ سپیدہ سحر کے وقت نقاب ہٹا کر اپنا نورانی اور حیات افزا چہرہ جو زندگی کی نشانی ہے ساری دنیا کو دکھاتی ہے۔

بعد والی آیت میں اس چیز کو جس کی خاطر یہ ساری قسمیں کھائی گئیں ہیں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”یقیناً یہ قرآن صاحب عزت اور عظیم بھیجے ہوئے کا کلام ہے۔ (جبرائیل امین) جسے وہ خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر کی طرف لایا ہے“ ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾۔ یہ ان لوگوں کا جواب ہے جو پیغمبر پر اتہام لگاتے تھے کہ قرآن انہی کا بنایا ہوا ہے اور اس کو خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

اس آیت میں اور بعد والی آیت میں جبرائیل امین، جو خدا کے پیک وحی ہیں، ان کے پانچ اوصاف بیان ہوئے ہیں، جو ہر جامع الشرائط بھیجے جانے والے کے لئے لازمی ہیں۔

اس کی پہلی توصیف کریم ہونا ہے جو اس کے وجود کی قدر و قیمت کی طرف اشارہ ہے، جی ہاں! وہ خداوند بزرگ کی طرف سے ہے اور قیمتی وجود جا حامل ہے۔

اس کے بعد کے دوسرے اوصاف پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: ”وہ صاحب قدرت ہے اور عرش والے خدا کی بارگاہ میں بلند مقام کا حامل ہے“۔ ﴿ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي عَرْشٍ مُّكِينٍ﴾ (۴)

ذی العرش خدا کی پاک ذات کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ وہ تمام عالم ہستی کا مالک ہے لیکن چونکہ عرش چاہے وہ اس عالم کے معنی میں ہو جو ماورائے طبیعت ہے، یا خدا کے علم مکنون کے مقام کے معنی میں ہو بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے لہذا صاحب عرش کہہ کر اس کی تعریف کی گئی ہے۔

”ذی قوۃ“ (صاحب قدرت) کی تعبیر جبرائیل کے بارے میں اس بنا پر ہے کہ اس قسم کے عظیم پیغام کے حصول اور اس کے باریک بینی پر مبنی ابلاغ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی رسالت کے حدود میں صاحب قدرت ہو اور بالخصوص ہر قسم کی فراموشی سے مبرا ہو جو ابلاغ کی راہ میں حائل ہو۔

لیکن اس شخص کے معنوں میں ہے جو صاحب منزلت و مکانت ہو، بنیادی طور پر ضروری ہے کہ رسول کی شخصیت عظیم ہو تاکہ خدا کی رسالت اور نمائندگی کا فریضہ انجام دے سکے اور مقرب بارگاہ الہی ہو، اور یہ مسلم ہے کہ عند کی تعبیر حضور مکانی کے معنوں میں نہیں ہے، وہ اس لئے کہ خدا کوئی مکان نہیں رکھتا۔ اس سے مراد حضور معنوی ہے۔

چوتھی اور پانچویں توصیف میں کہتا ہے ”وہ فرشتوں کا فرمانروا اور مطاع ہے“ ﴿مطاع ثم امین﴾۔ ثم کی تعبیر جو اشارہ بعید کے لئے استعمال ہوتی ہے اس حقیقت کو پیش کرتی ہے کہ پیک وحی الہی عالم فرشتگان میں مورد اطاعت ہے اور ان تمام چیزوں سے قطع نظر پیام الہی کے ابلاغ میں انتہائی امین ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی جبرائیل امین قرآن کے پہنچانے کے سلسلہ میں فرشتوں کے ایک عظیم گروہ کے ہمراہ آتے تھے اور یقیناً ان کے درمیان مطاع تھے، یعنی سب فرشتے ان کی اطاعت کرتے تھے اور ایک رسول و سفیر کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تمام ہمراہی اس کی اطاعت کرتے ہوں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ان آیات کے موقع پر پیغمبر اکرم نے جبرائیل امین سے فرمایا:

ما احسن انثنی علیک ربک : ﴿ذی قوۃ عند العرش مکین مطاع ثم امین﴾ فما کانت قوتک؟ وما کانت امانتک؟

تیرے پروردگار نے تیری کیا ہی عمدہ تعریف کی ہے کہ فرمایا ہے صاحب قدرت ہے اور صاحب عرش خدا کے ہاں قرب رکھتا ہے اور وہاں فرمانروا ہے اور امین ہے۔

لہذا اپنی قدرت و امانت کا نمونہ پیش کر۔

تو جبرائیل نے جواب میں عرض کیا ”میری قدرت کا نمونہ یہ ہے کہ میں قوم لوط کے شہروں کی تباہی پر مامور ہوا وہ چار شہر تھے اور ہر شہر میں چار لاکھ جنگجو افراد موجود تھے ان کی اولاد اس کے علاوہ تھی میں نے ان شہروں کو اٹھایا اور میں

انہیں آسمان کی طرف لے گیا یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے ان کے جانوروں کی آواز سننے لگے۔ پھر انہیں زمین کی طرف لایا اور انہیں زیر و زبر دکرایا۔

”باقی رہا میری امانت نمونہ تو یہ ہے کہ کوئی حکم ایسا نہیں کہ جو مجھے دیا گیا ہو اور اس میں میں نے معمولی سا تجاوز بھی کیا ہو۔“ (۵)

اس کے بعد لوگ وہ ناروا نسبت، جو پیغمبر کی طرف دیتے تھے، اس کی نفی کرتے ہوئے فرماتا ہے:

تمہارا صاحب دیوانہ نہیں ہے ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ﴾۔

”صاحب“ کی تعبیر جو ہمیشہ ساتھ رہنے والے رفیق، دوست اور ہم نشین کے معنی میں ہے علاوہ اس کے کہ پیغمبر تمام لوگوں کے ساتھ اخلاق و تواضع سے پیش آتے تھے اور کبھی کسی کے مقابلہ میں برتری کا دعویٰ نہیں رکھتے تھے۔ اس بات کی طرف اشارہ کہ آپ نے ساہا سال تمہارے درمیان زندگی گزاری اور تمہارے ہم نشین رہے ہیں اور تم نے انہیں عاقل و امین دیکھا ہے اور سمجھا ہے تو اب کس طرح ان کی طرف جنون کی نسبت دیتے ہو، سوائے اس کے کہ وہ بعثت کے ساتھ ایسی تعلیمات اپنے ہمراہ لائے ہیں جو تمہارے تعصبات، ہوا و ہوس اور کورانہ تقلید کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔

لہذا اس خیال سے کہ تم اپنے کو ان کے قوانین اور احکامات کی اطاعت سے بچائے رکھو، اس قسم کے اتہام ان پر لگاتے ہو۔، جنون کا الزام ان تمام الزامات میں سے ایک ہے جو، آیات قرآن کے مطابق، خدا کی طرف سے آئے ہوئے پیغمبروں پر ہٹ دھرم دشمنوں کی طرف سے لگائے گئے۔

﴿وَكَذَٰلِكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرًا وَّ مَجْنُونًا﴾

بات اس طرح ہے کہ ان سے پہلے کوئی پیغمبر کسی قوم کی طرف نہیں بھیجا گیا مگر یہ کہ اس نے کہا کہ یہ ساحر اور جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ (ذاریات - ۵۲)۔

ان کی منطق میں عاقل وہ شخص تھا جو فاسد ماحول میں گھل مل جائے اور ویسی ہی خواہشات کی پیروی کرے۔ جدھر کی ہوا ہو ادھر کو چلے اور ہر اصلاحی و انقلابی تحریک سے بے تعلق رہے۔ اس معیار اور ضابطے کے مطابق دنیا پرستوں کی تاریک نگاہ میں تمام پیغمبر دیوانے تھے۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام نے جبرائیل امین سے ارتباط کی تاکید کے لئے مزید فرماتا ہے: ”اس نے یقینی طور پر جبرائیل کا واضح اور آشکار افق میں مشاہدہ کیا ہے،،۔ ﴿وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأَفْقِ الْمُبِينِ﴾۔

افق مبین سے مراد وہی افق اعلیٰ اور فرشتوں کو آشکار کرنے والا افق ہے جس میں پیغمبر اکرم نے جبرائیل کا مشاہدہ کیا۔

بعض مفسرین نے سورہ نجم کی آیت ۷ کو جس میں ہے ﴿وَهُوَ بِالْأَفْقِ الْأَعْلَى﴾ اس تفسیر پر شاہد سمجھا ہے لیکن جیسا کہ سورہ نجم کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

کہ یہ آیت اس سورہ کی باقی آیات کی طرح ایک دوسری حقیقت کو بیان کرتی ہے جو اس کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہوگی۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ پیغمبر نے جبرائیل امین کا ان کی اصلی شکل و صورت میں دوبارہ مشاہدہ کیا۔ ایک دفعہ آغاز بعثت میں کہ جبرائیل آنحضرت کے سامنے افق بالا پر ظاہر ہوئے اور تمام مشرق و مغرب کو ڈھانپ لیا اور دوسری مرتبہ معراج میں کہ پیغمبر نے انھیں اوپر والے آسمان میں ان کی اصلی صورت میں دیکھا اور مفسرین زیر بحث آیت میں اسی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے خدا کی مراد ایسا مشاہدہ ہو جو شہود باطنی کے لحاظ سے ہو۔ مزید وضاحت کے لئے جلد ۲۲، ص ۴۸۶ سے آگے سورہ نجم کی آیت ۵ تا ۱۳ کی طرف رجوع فرمائیے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”پیغمبر اس چیز کے بارے میں جو اس نے بطریق وحی عالم غیب سے حاصل کی ہے بخیل نہیں ہے۔“

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾۔ ہر چیز بے کم و کاست بندگان کے اختیار میں دے دیتا ہے۔

وہ بہت سے دوسرے لوگوں کے مانند نہیں کہ جب کسی اہم حقیقت پر دسترس حاصل کر لیتے ہیں تو اس کو چھپانے پر اصرار کرتے ہیں

اور اکثر اس کے بیان پر بخل سے کام لیتے ہیں اور بسا اوقات ان معلومات کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاتے ہیں۔

پیغمبر ایسے نہیں ہیں وہ پورے جود و سخا کے ساتھ، جو کچھ حاصل کرتے ہیں اسے تمام ضرورت مندوں کے سامنے بیان کر دیتے ہیں حتیٰ کہ انھیں بھی بتا دیتے ہیں جو بلندی اور قرب کے قائل ہی نہیں ہیں اس امید پر کہ شاید ہدایت حاصل کریں اور راہ حق کو حاصل کریں۔

”ضنین“۔ ”ضنّہ“ (بروزن منّہ) نفیس اور قیمتی اشیاء کے بارے میں بخل کرنے کے معنی میں ہے اور ایہ ایک عیب ہے جو کبھی کسی پیغمبر میں نہیں ہوتا۔ اور اگر دوسرے افراد اپنے علوم کے بارے میں ایسے عیب کا شکار ہیں تو ہوا کریں۔ پیغمبر، جس کے علم کا سرچشمہ علم خدا کا بیکراں سمندر ہے، اس قسم کی باتوں سے مبرا ہے

پرورگارِ عالم مزید فرماتا ہے: ”اور وہ شیطان رجیم کی کہی ہوئی بات نہیں ہے“ ﴿وما هو بقول شیطان الرجیم﴾۔

یہ آیات قرآنی ہرگز کاہنوں کی باتوں کی طرح نہیں ہیں جو شیاطین سے تعلق کی وجہ سے معلوم کر لیتے تھے، اور پھر اس حقیقت کی نشانیاں اس کے کلام سے ظاہر ہیں۔

اس لئے کہ کاہنوں کی باتیں جھوٹی ہوتی تھیں۔ ان میں بہت سے شبہات ہوتے تھے اور وہ غلطیوں کی آمیزش سے ملوث ہوتی تھیں، اور شیطانی میلانات و خواہشات کے گرد گھومتی تھیں، اس چیز کا قرآن مجید سے کوئی تعلق نہیں یہ حقیقت میں ان کی تہمت کا جواب ہے۔ مشرکین کہتے تھے کہ پیغمبر (معاذ اللہ) کاہن ہیں اور جو کچھ وہ ملائے ہیں انھوں نے شیاطین سے لیا ہے، حالانکہ شیطانی باتیں گمراہ کن ہوتی ہیں اور قرآنی آیات سراسر نور ہدایت اور روشنی ہیں اور یہ حقیقت قرآنی آیات کو دیکھتے ہی ثابت ہو جاتی ہے۔

لفظ ”رجیم“ اصل میں رجم اور ”رجام“ (بروزن لجام) کے مادہ سے پتھر کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اس کے بعد قسم کے بعد ہر قسم کے دور کرنے کے معنی میں آیا ہے اور شیطان رجیم سے مراد یہاں یہی معنی ہیں، یعنی وہ شیطان جو بارگاہ خداوندی سے نکالا گیا ہے

۱۔ یہ کہ لا اقسام میں ”لانا فید ہے یا زائد اور تاکید کے لئے ہے مفسرین نے اس سلسلہ میں کئی بحثیں کی ہیں اور چونکہ سورہ قیامت کی ابتداء میں اسی جلد میں اس عنوان پر ہم بحث کر چکے ہیں لہذا تکرار کی ضرورت نہیں۔

۲۔ لساب العرب مادہ خضس۔ ۳۔ مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۴۶۔

۴۔ ”ملکین“۔ ”مکانت“ کے مادہ سے مقام و منزلت کے معنوں میں ہے اور جیسا کہ راغب کے مفردات میں کلمات سے اور دوسرے مفسرین سے معلوم ہوتا ہے یہ اصل میں کون کے مادہ سے اسم مکان ہے، اس کے بعد کثرت استعمال کی بنا پر اسے مادہ فعل کے برابر قرار دیا گیا ہے اور تمکن اس سے مشتق ہوا ہے، تمسکن کی طرح جو سکون کے مادہ سے ہے۔ ۵۔ مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۴۶۔ یعنی مضمون تفسیر در المنثور میں بھی زیر بحث آیات کے ذیل میں آیا ہے۔

رسول کی شائستگی کی شرطیں رسول کی شائستگی کی شرطیں

پانچ صفتیں جو مندرجہ بالا آیات میں جبرائیل امین کے لئے پیغمبر گرامی اسلام کی طرف خدا کے بھیجے ہوئے قاصد کے عنوان کے ماتحت آئی ہے، ان میں سے دو صفتیں ایسی ہیں جو ہر رسول اور فرستادہ خدا میں سلسلہ مراتب کو نظر میں رکھتے ہوئے پائی جانی ضروری ہیں۔

پہلی صفت کرامت اور عمدہ صفات نفسی کا حامل ہونا ہے جو اس کو رسالت جیسے اہم کام کا اہل بنا دے۔
دوسری صفت قدرت کا حامل ہونا ہے تاکہ اپنے اثر رسالت کو قاطعیت اور توانائی کے ساتھ وہ آگے بڑھیں اور ہر قسم کے ضعف و کمزوری سے دور ہوں۔

اس کے بعد اس ہستی کی بارگاہ میں مقام و منزلت رکھنا جس کی رسالت کو اس نے قبول کیا ہے (مکین) تاکہ پیغامات کو اچھی طرح حاصل کرے اور اگر جواب کی ضرورت ہو تو بغیر کسی خوف و خطر کے اس کا ابلاغ کرے۔
چوتھی صفت یہ کہ اگر امر رسالت اہمیت رکھتا ہو تو اس کے معاون ہونے چاہیئے جو اس کی مدد کریں۔ ایسے معاون جو اطاعت گزار اور فرمانبردار ہوں۔ (مطاع)

آخری اس کا امانتدار ہونا تاکہ وہ لوگ جو اس رسول سے پیغام لیں اس پر اعتماد کریں اور اس کی گفتگو بے کم و کاست اس کا کلام شمار ہو جس کی طرف سے وہ آیا ہے

جب یہ پانچوں اصول پورے ہوں تو پھر حق رسالت و پیغمبری ادا ہوگا۔ اسی لئے ہم پیغمبر اسلام کے حالات و آپ کی تاریخ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ آپ اپنے بھیجے ہوئے ایلیچوں کو احتیاط کے ساتھ، ان افراد میں سے جو ان صفات کو حامل ہوتے تھے، منتخب کرتے تھے۔ جس کا ایک زندہ نمونہ جناب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ذات ہے اور پیغمبر کی طرف سورہ برأت کی ابتدائی آیات کی مشرکین مکہ کے سامنے ان خاص حالات میں تبلیغ ہے جس کی تفصیل سورہ برأت میں آچکی ہے۔

حضرت فرماتے ہیں: (رسولک ترجمان عقلک و کتابک ابلاغ ما ینطق عنک) تیرا بھیجا ہوا تیری عقل کو نمایاں کرتا ہے اور تیرا خط تیری بات کا نہایت پرگو ناطق ہے۔^(۱)

آیات ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹

۲۶۔ ﴿فَإِنْ تَذَهَبُونَ﴾۔

۲۷۔ ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ﴾۔

۲۸۔ ﴿لَنْ يَشَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ﴾۔

۲۹۔ ﴿وَمَا تَشَاءُ وَنْ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾۔

ترجمہ

۲۶۔ پس تم کہاں جا رہے ہو۔

۲۷۔ یہ قرآن عالمین کے لئے صرف نصیحت ہے۔

۲۸۔ ان لوگوں کے لئے جو چاہتے ہیں کہ نصیحت حاصل کریں۔

۲۹۔ اور تم نہیں چاہتے مگر وہ جو عالمین کا پروردگار چاہے۔

اے غافلو! کہا جا رہے ہو؟

گذشتہ آیات میں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے اس لئے کہ اس کے مضامین سے ہویدا ہے کہ یہ شیطانی کلام نہیں ہے بلکہ رحمن کا کلام ہے جو پیک وحی الہی کے ذریعہ، قدرت و امانتِ کلی کے ساتھ اس پیغمبر پر، جو انتہائی طور پر اعتدال عقلی کا حامل ہے، نازل ہوا ہے، ایسا پیغمبر جس نے تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور جو کچھ اسے تعلیم دی گئی ہے اس نے اسے بے کم و کاست بیان کیا ہے۔

پروردگار عالم زیر بحث آیات میں مخالفین کو اس عظیم کلام کی پیروی نہ کرنے کی وجہ سے مستحقِ سرزنش قرار دیتا ہے اور ایک استفہام توہین کے ساتھ فرماتا ہے:

”ان حالات میں تم کہاں جا رہے ہو“ ﴿فَإِنْ تَذَهَبُونَ﴾۔ کیوں راہِ راست کو چھوڑ کر بے راہ روی اختیار کرتے ہو اور کیوں اس چراغِ فروزاں سے منہ موڑ کر تاریکی کی طرف رواداں ہو۔ کیا تم اس سعادت و سلامتی کے دشمن ہو؟ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

”یہ قرآن تمام لوگوں کے لئے نصیحت ہی نصیحت ہے“۔ ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ﴾۔

سب کو نصیحت کرتا ہے تاکہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں اور چونکہ ہدایت و تربیت کے لئے فاعل کی صرف فاعلیت ہی کافی نہیں ہے بلکہ قابل کی قابلیت درکار ہے، لہذا بعد میں آنے والی آیت میں مزید فرماتا ہے:

”قرآن ان لوگوں کے لئے ہدایت کا باعث ہے جو تم میں سے چاہتے ہیں کہ صراطِ مستقیم اختیار کریں“

﴿لَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ اَنْ يَسْتَقِيمَ﴾۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ گذشتہ آیت میں فرمایا ہے کہ قرآن تمام لوگوں کے لئے نصیحت و بیداری کا سبب ہے اور اس آیت میں صرف ایک گروہ کا ذکر کرتا ہے وہ لوگ جو ہدایت کو قبول کرنے اور راہِ راست اختیار کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔

یہ فرق اس بنا پر ہے کہ گذشتہ آیت فیضِ الہی کی عمومیت کو بیان کرتی ہے اور یہ آیت اس فیض سے فائدہ اٹھانے کی شرط کو قبول کرتی ہے، تمام مواہب اور نعمتیں اسی طرح ہیں کہ اصل فیض عام ہیں لیکن اس سے فائدہ اٹھانا ارادہ کی پختگی سے مشروط ہے۔

انہی معانی کو لئے ہوئے سورہ بقرہ کی آیت ۲ بھی آئی ہے ﴿ذَالِكِ الْكِتَابِ لَارِيبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ اس کتاب میں کوئی شک و تردد نہیں ہے اور یہ پرہیزگاروں کے لئے سبب ہدایت ہے۔

بہر حال یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو بتاتی ہیں کہ خدا نے انسان کو آزاد و مختار پیدا کیا ہے اور راہِ حق و باطل کو طے کرنے کا آخری فیصلہ اس کے اختیار میں ہے۔

یستقیم کی تعبیر جاذبِ توجہ اور عمدہ ہے جو بتاتی ہے کہ اسے راہِ مستقیم پر چلائیں اور اگر افراط و تفریط، شیطانی و سو سے اور گمراہی کرنے والے پروپیگنڈے درمیان میں نہ ہوں تو انسان ندائے فطرت کے ذریعہ اس صراطِ مستقیم پر قدم رکھ سکتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ خطِ مستقیم ہمیشہ مقصد کی نزدیک ترین راہ ہوتا ہے لیکن چونکہ اس بات کا امکان ہے کہ انسان کا ارادہ یہ تو ہم پیدا کرے کہ آدمی اس طرح آزاد ہے کہ اس راستے کو طے کرنے میں الہی توفیق کی کوئی احتیاج نہیں رکھتا تو بعد میں آنے والی آیت میں، جو اس سورہ کی آخری آیت ہے، فرماتا ہے:

”ارادہ نہیں کرتے مگر یہ کہ عالمین اور تمام جہانوں کا پروردگار ارادہ کرے“

﴿وَمَا تَشَاءُ وَاَنْتَ اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾۔ درحقیقت ان دونوں آیات کا مجموعہ اس دقیق و ظریف مسئلہ امر بین

الامرین کو بیان کرتا ہے۔ ایک طرف کہتا ہے ارادہ کی پختگی تمہارے اپنے اختیار میں ہے اور دوسری طرف کہتا ہے

جب تک خدا نہ چاہے تم ارادہ نہیں کر سکتے۔ یعنی اگر تمہیں مختار و آزاد پیدا کیا گیا ہے تو یہ اختیار و آزادی بھی خدا کی جانب سے ہے۔ اس نے چاہا ہے کہ تم ایسے رہو۔

انسان اپنے اعمال میں نہ مجبور ہے نہ سو فیصدی آزاد ہے نہ طریقہ جبر صحیح ہے نہ طریقہ تفویض بلکہ جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ جسم و ہوش، عقل و توانائی، ارادہ کی پختگی کی قوت، وہ سب خدا کی جانب سے ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو ہمیشہ سے ایک طرف تو خالق کا محتاج و نیاز مند بناتی ہے اور دوسری طرف اس کی آزادی اور اختیار کے تقاضے کی بنا پر اسے ذمہ داری سونپتی ہے۔

”رب العالمین“ کی تعبیر اچھی طرح بتاتی ہے کہ مشیت الہی بھی انسان اور تمام عالمین کی تربیت، تکامل اور ارتقاء کی راہ میں دخل رکھتی ہے وہ کبھی بھی نہیں چاہتا کہ کوئی گمراہ ہو اور گناہ کر کے اس کے جوار رحمت سے دور ہو۔ وہ اپنے ربوبیت کے تقاضے سے ان تمام لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہے کہ راہ ارتقاء میں قدم رکھیں۔

تجرب کی بات یہ ہے کہ مسلک جبر کی طرفدار صرف دوسری آیت سے چمٹے ہوئے ہیں جب کہ ممکن ہے کہ تفویض کے طرفدار بھی پہلی آیت سے متوسل ہوں۔ آیات کو ایک دوسرے سے جدا کرنا جو عام طور پر پہلے کئے ہوئے غلط فیصلوں کا معلول ہے گمراہی کا سبب ہے۔

آیات قرآن کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر ان کے مجموعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ قابل توجہ یہ امر ہے کہ بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جب پہلی آیت ”لمن شاء منکم ان یستقیم“ نازل ہوئی تو ابو جہل نے جو عملی طور پر نظریہ تفویض کا حامی تھا، کہا بڑا اچھا ہو کہ تمام اختیارات ہمیں دے دئے گئے ہیں۔ یہی موقع تھا کہ دوسری آیت نازل ہوئی۔

﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (۱)

خدا وندا! ہم جانتے ہیں کہ راہ مستقیم کو طے کرنا تیری توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ہمیں اس راہ کو طے کرنے کی توفیق عطا فرما۔ پروردگار! ہماری خواہش ہے کہ ہم راہ ہدایت پر چلیں تو بھی ارادہ فرما کہ اس راہ میں ہماری دستگیری فرمائے۔ بار الہا! محشر کا منظر اور تیری داد گاہ عدل و انصاف بہت ہولناک ہے اور ہمارا نامہ اعمال حسنات سے خالی ہے ہمیں اپنے عضو و فضل کی پناہ میں جگہ دے، نہ کہ میزان عدل و انصاف کے سامنے۔ آمین یا رب العالمین۔

سورہ تکویر کا اختتام

سورہ انفطار

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اس میں ۱۹ آیتیں ہیں۔

سورہ انفطار کے مضامین

یہ سورہ قرآن مجید کے آخری پارے کی بہت سی سورتوں کی مانند قیامت سے متعلق مسائل کے بارے میں ہے اور اس کی آیتوں میں مجموعی طور پر اس تعلق کے پانچ موضوعات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

- ۱۔ اشراط الساعۃ یعنی وہ عظیم حوادث جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کی ابتدا پر رونما ہوں گے۔
- ۲۔ انسان کی توجہ خدا کی نعمتوں کی طرف جنہوں نے اس کے سارے وجود کو گھیر رکھا ہے، اور اس کے غرور کو توڑنے کی جانب، تاکہ وہ اپنے کو معاد کے لئے تیار کرے۔
- ۳۔ ان فرشتوں کی طرف اشارہ جو انسانوں کے اعمال کو ثبت کرنے پر مامور ہیں۔
- ۴۔ قیامت میں نیک و بد لوگوں کی سرنوشت۔
- ۵۔ اس عظیم دن کی سختیوں کا ایک گوشہ۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ (من قراء هاتین السورتین ” اذا السماء انفطرت“ و اذا السماء انشقت“ و جعلهما نصب عینہ فی صلوة الفریضة و النافلة لم یحجبه من اللہ حجاب و لم یحجزہ من اللہ حاجز و لم یزل ینظر الی اللہ و ینظر اللہ الیہ حتی یفرغ من حساب الناس)

جو شخص ان دو سورتوں (سورہ انفطار اور سورہ انشقاق) کی تلاوت کرے اور دونوں کو نماز فریضہ و نافلہ میں اپنا نصب العین بنالے تو کوئی اسے خدا سے محبوب نہیں کر سکے گا اور کوئی چیز اس کے اور خداوند متعال کے درمیان حائل نہیں ہوگی۔^(۱) یقیناً سب سے بڑی نعمت بارگاہ خداوندی میں حضوری ہے اور بندہ کے اور خدا کے درمیان سے حجابوں کا ہٹ جانا اس کے لئے ہے جو ان دونوں سورتوں کو اپنے دل و جان کی گہرائیوں میں جگہ دے اور اپنی اس بنیاد پر اصلاح کمرے، نہ یہ کہ صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا کرے۔

۱۔ مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۴۷۔ نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۲۰ (از کتاب ثواب الاعمال)

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ﴾

۲۔ ﴿وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ﴾

۳۔ ﴿وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ﴾

۴۔ ﴿وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ﴾

۵۔ ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَآخَرَتْ﴾

ترجمہ

خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

۱۔ جس وقت (کراتِ آسمانی) پھٹ جائیں گے۔

۲۔ جس وقت ستارے پراکندہ ہو کر گر پڑیں گے۔

۳۔ اور جس وقت سمندر ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔

۴۔ اور جس وقت قبریں زیر و زبر ہوں گی۔ (اور مردے خارج ہوں گے)۔

۵۔ اس وقت ہر شخص جان لے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا ہے اور پیچھے کیا چھوڑا ہے۔

جس وقت جہان کا نظام زیر و زبر ہو جائے گا۔

ہم پھر اس سورہ کے آغاز میں بعض ایسے وحشت ناک حوادث کا سامنا کر رہے ہیں جو آغازِ قیامت میں سارے جہان کو گھیر لیں گے۔ پہلے فرماتا ہے:

”جس وقت آسمان میں شکاف پڑ جائیں گے“۔ ﴿إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ﴾۔ اور جس وقت ستارے پراکندہ ہو کر گرنے لگیں گے۔

﴿وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ﴾۔ عالم بالا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور ہولناک دھماکے سارے آسمان کے کمرے کے گھیر لیں گے تمام منظومے اپنے نظام کھو بیٹھیں گے۔ اور ستارے اپنے مدار سے نکل جائیں گے، اور شدید تصادم

کی وجہ سے ادھر ادھر بکھر جائیں گے۔ اس جہان کی عمر ختم ہو جائے گی اور عام چیزیں ویران ہو جائیں گی تاکہ ان کی ویرانی سے آخرت کا جہاں آباد ہو جائے۔

”انفطرت“ انفطار کے مادہ سے شگافتہ ہونے کے معنوں میں ہے۔ اس تعبیر کی نظیر بہت سی آیات میں آئی ہے۔ منجملہ دیگر تعبیرات کہ سورہ انشقاق کی آیت ۱ میں پڑھتے ہیں ﴿اِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ﴾ اور سورہ مزمل کی آیت ۱۸ میں فرماتا ہے: ﴿السَّمَاءُ منفطرہ﴾

”انتثرت“ اصل میں مادہ نثر (بروزن نصر) سے پراکندہ کرنے اور ہونے کے معنی میں ہے اور چونکہ ستاروں کا پراکندہ ہونا (گلوبند کی طرح جس کا دھاگہ ٹوٹ جائے) سبب بنتا ہے کہ ہر ایک کسی گوشہ میں جا گرے۔ بعض مفسرین نے ستاروں کے سقوط اور ان کے گرنے سے تفسیر کی ہے اور یہ پراکندگی کے معنی کا لازمہ ہے۔ ”کواکب“ کوکب کی جمع عربی زبان میں بہت سے معانی میں آتی ہے دوسرے ستارے بطور عام اور زہرہ ستارہ بطور خاص۔

وہ سفیدی جو آنکھ میں ظاہر ہوتی ہے، بلند گھاس، درخت کا شگوفہ، فولاد کی چمک، زیبا و خوبصورت نوجوان، تلوار، پانی اور کسی جمیعت کا رئیس۔

لیکن ظاہری طور پر اس کے حقیقی معنی وہی درخشاں اور فروزاں ستارہ ہیں۔ باقی معانی مجازی شمار ہوتے ہیں جن میں اصلی معانی کی مشابہت پائی جاتی ہے۔

یہ کہ ستاروں کا پراکندہ ہونا اور آسمانی کواکب کا انفجار اور پھٹنا اور ان کے نظام کا درہم برہم ہونا کن عوامل و اسباب کے زیر اثر رونما ہوگا۔ کیا فطرت کا اعتدال درہم برہم ہو جائے گا یا کوئی عظیم مرموز قوت اسے اپنے تحت الشعاع قرار دے گی یا عالم کا عظیم تدریجی انبساط اور پھیلاؤ موجودہ زمانے میں ماہرین کے نقطہ نظر سے اثبات کے درجہ کو پہنچ گیا ہے یہاں تک ہو جائے گا کہ جس کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوگا۔ کوئی شخص ٹھیک طرح نہیں جانتا۔

لیکن ہمیں اتنا معلوم ہے کہ جس وقت یہ عظیم آسمانی کمرے اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہو گئے تو اس وقت کمزور، ضعیف انسان کا جو حال ہوگا وہ ظاہر ہے۔

یہ سب کچھ اس جہان کے فنا ہونے کے بارے میں انسان کو خبردار کرنا ہے اور اسے تنبیہ کرنا ہے تاکہ وہ اس دنیا کو ایسا جاودانی گھر نہ سمجھ بیٹھے جس میں اسے ہمیشہ رہنا ہے، اس سے دل نہ لگائے اور اس کے لئے ہزار ہا گناہوں سے آلودہ نہ ہو۔

اس کے بعد آسمان سے ہٹ کر زمین کو موضوع بناتا ہے اور فرماتا ہے:

”جس وقت سمندر اور دریا آپس میں مل جائیں“ ﴿اِذَا الْبَحَارُ فَجُرَتْ﴾۔ اگرچہ اس وقت بھی روئے زمین کا سمندر، سوائے کچھ چھوٹے دریاؤں کے، ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں لیکن یوں نظر آتا ہے کہ ابتدائے قیامت میں شدید زلزلوں کی بنا پر یا پہاڑوں کے پراکندہ ہونے اور سمندریں گر پڑنے کی وجہ سے سمندر اس طرح پر ہو جائیں گے کہ پانی تمام خشکیوں کو گھیر لے گا اور سارے دریا ایک وسیع تر سمندر کی شکل اختیار کر لیں گے جیسا کہ سورہ تکویر کی آیت ۶ ﴿وَ اِذَا الْبَحَارُ سُجِّرَتْ﴾ کی ایک یہ بھی تفسیر ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

دوسرا احتمال جو اس آیت کی تفسیر میں اور اسی طرح سورہ تکویر کی آیت ۶ کی تفسیر میں پیش کیا گیا ہے، یہ ہے کہ فجرت اور سحرت وہی انفجار یعنی پھٹنا اور جلنا ہے جو تمام سمندروں اور دریاؤں کو آگ کے ایک عظیم ٹکڑے میں تبدیل کر دے گا۔

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے پانی دو عناصر سے تشکیل پاتا ہے جو دونوں شدید طور پر قابل احتراق یعنی جلنے کے قابل ہے، اب اگر سمندروں کے پانی کا تجزیہ ہو اور وہ کچھ عوامل و اسباب کے زیر اثر آکسیجن اور ہیڈروجن میں تبدیل ہو جائے تو ایک ہی شعلہ کے زیر اثر سب آگ میں تبدیل ہو جائیں۔

اس کے بعد قیامت کے دوسرے مرحلے کے بارے میں جو اس جہاں کی تجدید حیات اور مردوں کی زندگی کی تجدید کا مرحلہ ہے فرماتا ہے:

”اور جس وقت قبریں زیر و زبر ہوں“ ﴿وَ اِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ﴾۔ اور مردے باہر آکر حساب کتاب کے لئے آمادہ ہوں۔

”بعثت“ کے معنی زیر و زبر ہونا اور منتشر ہونا ہے، راغب مفردات میں بعید نہیں سمجھا کہ یہ لفظ دو الفاظ سے مرکب ہو ”بعث“ اور ”اثرت“ اسی لئے دونوں کے معنی اپنے اندر لئے ہوئے ہیں اور نتیجہ زیر و زبر ہونے کے معانی کی صورت میں نکلا ہے۔ (مثل بسملہ کے جو بسم اللہ سے لیا گیا)۔

بہر حال جو اوپر والی آیات میں آیا ہے اس چیز کے مشابہ ہے جو ہم سورہ زلزال میں پڑھتے ہیں: ﴿وَاخْرَجَتِ الْاَرْضُ

اثْقَالَهَا﴾ ”زمین اپنے ذخائر باہر نکالے گی“ (اس بنا پر اس سے مراد زمین دفن شدہ مردے ہوں گے جو اس آیت کی مشہور تفاسیر میں سے ایک ہے)۔ یا اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ نازعات کی آیت ۱۳ اور ۱۴ میں آئی ہے۔ ﴿اِغْمَاهِي زَجْرَةً وَاحِدًا فَاِذَا هُمْ بِالسَّاحِرَةِ﴾ ”صرف ایک ہی صحیفہ ہوگا جس کے بعد اچانک سب کے سب صفحہ زمین پر ظاہر ہوں گے۔

یہ سب تعبیریں بتاتی ہیں کہ مردوں کا زندہ ہونا اور قبروں سے خارج ہونا نہایت تیزی سے ناگہانی طور پر صورت پذیر ہوگا۔ ان نشانیوں کو بیان کرنے کے بعد جو قیامت سے قبل اور اس کے بعد صورت پذیر ہوں گی آخری بات کو اس طرح بیان کرتا ہے:

”اس دن ہر شخص جانتا ہے کہ اس نے آگے کیا بھیجا ہے اور پیچھے کیا رکھا ہے“ ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاٰخِرَتْ﴾۔ جی ہاں! اس دن حجابات ہٹ جائیں گے، غرور اور غفلت کے پردے چاک ہو جائیں گے اور حقائق جہاں چاک ہو جائیں گے اور حقائق جہاں آشکار ہو جائیں گے۔ اور چونکہ وہ دن یوم البروز ہے لہذا ہر چیز ظاہر ہو جائے گی اور یہ وہی وقت ہے کہ انسان اپنے تمام اعمال کو دیکھے گا اور اپنے نیک و بد سے آگاہ ہوگا، کون سے اعمال وہ آگے بھیج چکا ہے اور کون سے کام ہیں جن کے آثار ان کے بعد دنیا میں باقی رہ گئے ہیں اور اس کے نتائج اس تک پہنچے ہیں۔

خیرات اور صدقہ جاریہ کے مثل۔ اور وہ تعمیرات و آثار جو مقاصد رحمانی یا مقاصد شیطانی کے لئے اس نے بنائی ہیں اور پیچھے جھوڑ گیا ہے یا کتابیں اور دیگر علمی آثار وغیرہ۔ علمی آثار جو نیک و بد مقاصد کے لئے اس نے اپنے بعد چھوڑے ہیں اور وہ دوسروں کے لئے استفادہ کا باعث بنے ہیں۔ ایسے نیک و بد سنن و طرق جنہوں نے اقوام و ملل کو اپنی طرف کھینچا ہے یہ ہیں ان کاموں کے نتائج انسان کے بعد اس تک پہنچے ہیں اور جو اوپر والی آیت ہیں ”اخترت“ کا مصداق ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان اس دنیا میں بھی اجمالی طور پر اپنے اعمال سے باخبر ہے لیکن بھول جانا اور اپنے اعمال کی پرستش کرنا عام طور پر مانع ہوتا ہے کہ انسان ان سب کو اپنے دل میں جگہ دے اور اپنے اعمال کے آثار کی گہرائی اور عمق سے واقف ہو۔

لیکن اس دن ہر چیز میں انقلاب برپا ہوگا تو انسان کی روح اور جان بھی اس قسم کے انقلاب سے متاثر ہوگی یہ وہ جگہ ہوگی جہاں انسان اپنے تمام اعمال کا تفصیلی علم حاصل کرے گا بلکہ سورہ آل عمران کی آیت ۳۰ ﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا

عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ﴾ سب کو اپنے سامنے حاضر پائے گا۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے لئے اور تفاسیر بھی بیان کی ہیں۔ منجملہ دیگر تفاسیر سے مراد وہ کام ہیں جنہیں ابتدائے عمر میں مقدم رکھنا تھا اور وہ کام جو اواخر عمر کے لئے چھوڑ رکھے تھے۔ لیکن پہلی تفسیر ہر جہت سے زیادہ مناسب ہے۔ نفس سے مراد یہاں نفسوس انسانی میں سے ہر فرد ہے اور اس میں تمام افراد بشر شامل ہیں۔

وہ آثار جو انسان کے بعد باقی رہ جاتے ہیں

علاوہ اس چیز کے جو اوپر والی آیات میں آئی ہے اسلامی روایت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کچھ آثار انسان کے بعد باقی رہ جائیں جن کی برکتیں یا برے نتائج سا لہا سال تک حتیٰ کہ قیامت تک اس شخص کو پہنچتے رہیں۔ ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

﴿لِیْسَ یَتَّبِعَ الرَّجُلَ بَعْدَ مَوْتِهِ مِنَ الْاَجْرِ اِلَّا ثَلَاثُ خِصَالٍ : صَدَقَہٗ اَجْرَہَا فِی حَیَاتِہٖ فَہِیْ بَعْدَ مَوْتِہٖ وَ سُنَّۃٌ ہَدٰی سَنَّہَا فَہِیْ تَعْمَلُ بِہَا بَعْدَ مَوْتِہٖ وَوَلَدٌ صَالِحٌ یَسْتَغْفِرُ لَہٗ﴾

انسان کی موت کے بعد اس کے اعمال کی کتاب بند ہو جاتی ہے اور سزا یا جزا اسے نہیں ملتی لیکن تین طریقوں سے اجر یا سزا مل سکتی ہے۔ عمارتیں یا مفید چیزیں جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے وہ اپنی طرف سے بطور یادگار چھوڑ گیا ہے، جو اس کے بعد باقی ہیں، دوسرے ہدایت کرنے والی سنت جسے وہ وجود میں لایا ہے اور اس کی موت کے بعد اس پر عمل ہو رہا ہے اور تیسرے وہ نیک اور صالح بیٹا جو اس کے لئے استغفار کرتا ہے۔^(۱)

ایک دوسری روایت میں یہ چھ امور بیان کئے گئے ہیں جو مومنین کی حالت کے لئے ان کی موت کے بعد مفید ہیں، نیک بیٹا، وہ قرآن جس کی وہ تلاوت کرتا تھا، وہ کنواں جو اس نے کھودا تھا، وہ درخت جو اس نے بویا تھا، پانی مہیا کرنا سنت حسنہ جو اس کے بعد رہ جائے اور مورد توجہ قرار پائے۔^(۲)

بعض روایات میں اس علم و دانش پر جو کسی کی جانب سے لوگوں میں رہ جائے انحصار کیا گیا ہے۔^(۳) ”جو شخص کوئی نیک سنت جاری کرے اور دوسرے اس کی پیروی کریں تو وہ اپنا اجر تو رکھتا ہی ہے اس کے علاوہ ان لوگوں کے اجر کے برابر بھی جنہوں نے اس کی پیروی کی ہے، بغیر اس کے کہ ان کی پیروی کرنے والے لوگوں کے اجر میں کوئی کمی ہو، اور جو شخص بری سنت جاری کرے اور لوگ اس کی پیروی کریں تو اس کا اپنا گناہ تو ہے ہی، اس کے علاوہ جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے ان کے گناہوں کے برابر بھی اس کا گناہ ہے، بغیر اس کے کہ پیروی کرنے والوں کے گناہوں میں کچھ کمی ہو۔“

یہ وہ مقام تھا جہاں اصحاب پیغمبر میں سے حذیفہ نے آیت (علمت نفس ما قدمت و اخرت) کی تلاوت کی۔^(۴)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

(فکیف بکم لو تناهت بکم الامور و بعثت القبور هنالک تبلوا کل نفس ما اسلفت و ردوا الی اللہ مولاہم

الحق و ضل عنہم ماکانوا یفترون)

تمہارا کیا حال ہوگا جب تمام امور اختتام پذیر ہوں گے، قبریں زیر و زمر ہوں گی اور تم سب کے سب عرصہ محشر میں قیام پذیر ہوں گے وہاں ہر شخص ہر عمل کو جسے اس نے پہلے انجام دیا ہوگا آزمائے گا اور سب کے سب خدا کی طرف پلٹ جائیں گے جو ان کا حقیقی مولا و سرپرست ہے اور جنہیں جھوٹ موٹ اسکی مثل قرار دیا تھا، ان کے دل سے محو ہو جائیں گے۔^(۵)

یہ آیات و روایات انسان کی ذمہ داری کی حدود کو اس کے اعمال کے مقابلہ میں اسلامی نقطہ نظر سے معین کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ کس حد تک ہر انسان اپنے اعمال کے سلسلہ میں جواب دہ ہے، یہاں تک کہ ممکن ہے کہ ہزار ہا سال گزرنے کے بعد اس کے لئے اچھا اجر حاصل کریں یا اس کے لئے اچھا اجر حاصل کریں یا اس پر لعنت و گناہ کا بوجھ ڈالیں۔ اس سلسلہ میں جلد ۱، ص ۲۰۲ تا ۲۰۴ (سورہ نحل کی آیت ۲۵ کے ذیل میں) پر بھی ہم بحث کر چکے ہیں۔

۱۔ بحار الانوار، جلد ۷۱، ص ۲۵۷۔

۲۔ بحار الانوار، جلد ۷۱، ص ۲۵۷۔

۳۔ منیۃ المرید۔ ص ۱۱۔

۴۔ مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۴۹۔

۵۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۶۔

آیات ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲

۶۔ ﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ﴾۔

۷۔ ﴿الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّكَ فَعَدَلَكَ﴾۔

۸۔ ﴿فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ﴾۔

۹۔ ﴿كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالَّذِينَ﴾۔

۱۰۔ ﴿وَأَنْ عَلَيْكُمْ لِحَفَظَتَيْنِ﴾۔

۱۱۔ ﴿كَرَامًا كَاتِبِينَ﴾۔

۱۲۔ ﴿يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ﴾۔

ترجمہ

۶۔ اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے کریم پروردگار کے مقابلہ میں مغرور کر دیا ہے؟

۷۔ وہ خدا جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تجھے درست کیا، پھر تجھے اعتدال پر رکھا۔

۸۔ اور جس شکل میں چاہتا تھا تجھے مرکب کیا۔

۹۔ جیسا تم خیال کرتے ہو ویسا نہیں ہے، بلکہ تم روز جزا کے منکر ہو۔

۱۰۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تم پر نگہبان مقرر کئے گئے ہیں۔

۱۱۔ بلند منزلت والے اور لکھنے والے (تمہارے نیک و بد اعمال کے)۔

۱۲۔ وہ جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو۔

اے انسان تجھے کس چیز نے مغرور کر دیا ہے؟

گذشتہ آیتوں کے بعد جو قیامت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں زیر بحث آیتوں میں انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اور اس کو خدا کے سامنے اس کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پہلے اسے مخاطب کیا ہے اور تیز وائٹ ڈپٹ کے ساتھ جس میں ایک طرح کا لطف و کرم بھی ملا ہوا ہے، فرماتا ہے:

”اے انسان تجھے کس چیز نے تیرے کریم پروردگار سے غافل کیا ہے اور اس کے مقابلہ میں مغرور کیا ہے؟“ ﴿يَا أَيُّهَا

الانسان ما غرك ربك الكريم﴾۔

یہاں انسان کا اس کی انسانیت کے لحاظ سے جس میں اس جہان کے باقی موجودات کے مقابلہ میں تمام امتیازات کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، مخاطب کیا ہے، اس کے بعد اس سے اس خدا کے سامنے پیش کیا ہے جو رب بھی ہے اور کریم بھی ہے، جس نے اپنی ربوبیت کے تقاضے سے ہمیشہ اسے اپنی رحمت سے نوازا ہے اور اس کی تربیت و تکامل و ارتقاء کا ذمہ لیا ہے اور اپنے تقاضائے کرم سے اپنے خوانِ نعمت پر جگہ دی ہے۔ اور اپنی تمام مادی اور معنوی نعمتوں سے سرفراز کیا ہے بغیر اس بات کے کہ اس سے کوئی توقع رکھتا ہو اور ان تمام نعمتوں کا اجر اس سے طلب کرے، حتیٰ کے اس کی خطاؤں سے بھی چشم پوشی کرتا ہے اور اپنے لطف و کرم سے اسے موردِ عفو و بخشش قرار دیتا ہے۔

کیا یہ مناسب ہے کہ قسم کا وجود ایسے پروردگار کے مقابلہ میں جسارت و غرور سے کام لے لیا یا ایک لمحہ کے لئے بھی اسے غافل ہو اور اس کے فرمان کی انجام دہی میں جو خود اس کی سعادت کا ضامن ہے، قصور و کوتاہی کا ارتکاب کرے

-

اسی لئے ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے مروی ہے کہ آپ نے اس آیت کی تلاوت کے موقع پر فرمایا: (غزہ جھلہ) اس کی جہالت و نادانی سے اسے مغرور و جاہل بنایا ہے۔^(۱)

یہاں واضح ہو جاتا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ اپنی ربوبیت و کرم پر انحصار کرتے ہوئے وہ انسان کے غرور و غفلت کو ختم کرے۔ اس طرح سے جیسا کہ بعض نے خیال کیا ہے کہ مقصود کلام یہ ہے کہ آدمی کو تلقین کی جائے کہ خدا سے عذر خواہی کے سلسلہ میں وہ جواب میں کہے ”تیرے کرم نے مجھے مغرور کیا ہے۔“

نیز جو کچھ فضل بن عیاض سے نقل ہوا ہے کہ اس سے سوال کیا گیا کہ اگر تجھے خدا قیامت کے دن اپنے حضور میں طلب کرے اور تجھ سے سوال کرے۔ ”ما غرک بربک الکریم“ تو جواب میں تو کیا کہے گا۔ اس نے کہا میں جواب میں کہوں گا ”غرنی ستورک المرخاة“ جو پردے تو نے میرے گناہ پر ڈالے ہوئے تھے انہوں نے مجھے غافل و مغرور کیا ہے۔

یہ سب مفہوم آیت کے ساتھ سازگار نہیں ہے بلکہ آیت کے مفہوم کے تضاد سے تعلق رکھتا ہے اس لئے کہ مقصود آیت غرور کو ختم کرنا ہے اور خواب غفلت سے بیدار کرنا ہے، نہ یہ کہ نیا پردہ غفلت کے پردوں پر ڈالنا ہے اس بنا پر مناسب نہیں ہے کہ آیت کو اس کے مقصد سے دور لے جائیں اور اس کی متضاد کیفیت سے نتیجہ کلام اخذ کریں۔

”غرک“ غرور کے مادہ سے اصل میں بیداری کے موقع پر غفلت کے معنی میں ہے دوسرے لفظوں میں ایسے مقام پر غفلت سے کام لینا جہاں غفلت کرنا بالکل نامناسب ہے ہو، اور چونکہ غفلت بعض اوقات جسارت یا احساس برقراری کا

سبب بنتی ہے لہذا غرور کے لفظ کی ان معانی سے بھی تفسیر ہوئی ہے اور شیطان کو اسی وجہ سے غرور (مروزب شرور) کہتے ہیں وہ انسان کو اپنے وسوسوں سے فریب دیتا ہے اور اسے غافل و مغرور کر دیتا ہے۔

”کریم“ کی تفسیر میں مفسرین نے انواع و اقسام کی تعبیریں پیش کی ہیں، بعض نے کہا ہے کہ کریم وہ بخشنے والا ہے جس کے تمام افعال احسن ہیں اور وہ کبھی اتنی بخشش کے ہوتے ہوئے نفع و نقصان کا خیال نہیں کرتا۔

بعض نے کہا کہ کریم وہ شخص جو طلب سے زیادہ بخش دے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کریم وہ شخص ہے جو تھوڑی سی متاع کو قبول کر لیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں زیادہ قیمت دیتا ہے لیکن حقیقت میں یہ سب چیزیں کریم کے مفہوم میں شامل ہیں۔

خدا کے کرم کے سلسلہ میں بس اتنا کافی ہے کہ وہ صرف گناہگاروں کو معاف کر کے راضی نہیں ہوتا بلکہ شائستہ افراد کے گناہوں کو حسنات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اس آیت کی تفسیر میں عجیب و غریب جملہ ارشاد فرماتے ہیں:

یہ آیت سننے والے کے سامنے بہت مضبوط دلیل ہے اور ایسے شخص کے سامنے جسے جہالت و نادانی نے مغرور کر دیا ہو قاطع عذر ہے۔ خدا فرماتا ہے:

”اے انسان تجھے کس چیز نے گناہ کرنے پر جرأت دلائی ہے اور کس چیز نے تجھے تیرے پروردگار کے مقابلہ میں مغرور کر دیا ہے اور کس چیز نے اپنی ہلاکت کے ساتھ تعلق پیدا کر دیا ہے؟ کیا تیری اس بیماری کے لئے صحت مند ہونا نہیں ہے، تیرے اس خواب کے لئے بیداری نہیں ہے۔ تو خود پر کم از کم اتنا تو رحم کر جتنا تو دوسروں پر کرتا ہے۔

تو جب کسی کو جلانے والے سورج کی دھوپ میں دیکھے تو اس پر سایہ کرتا ہے، جب کسی بیمار کو دیکھے کہ درد و تکلیف نے اسے سخت نالاں کر دیا ہے تو تو اس پر رحم کھا کر آسو بہاتا ہے تو وہ کیا شے ہے جس نے اپنی بیماری پر تجھے ایک طرح کا صبر کرنے والا بنا دیا ہے اور اپنی مصیبت پر مطمئن کر دیا ہے اور خود پر گریہ کرنے سے بعض رکھا ہے۔

حالانکہ تیرے نزدیک عزیز ترین افراد میں سے تو خود ہے تو پھر کس طرح رات کو نزولِ بلا کے خوف نے تجھے بیدار نہیں کیا حالانکہ گناہ و مصیبت میں تو غوطہ زن ہے اور اس کے غلبہ سے باہر بھی نہیں ہے۔

آ اور اس غفلت کی بیماری کا عزمِ صمیم کی دوا سے علاج کمر اور اس خواب غفلت کو جس نے تیری آنکھوں کو گھیر رکھا ہے۔ بیداری سے برطرف کر۔ آخدا کا مطیع و فرمانبردار بن جا اور اس کی یاد سے مانوس ہو۔

اچھی طرح سے جان لے کہ تیرے خدا سے غفلت کرنے کے موقع پر وہ نعمتیں دینے پر تجھ سے عنایت کرتا ہے اور تجھے اپنے عفو و کرم کی طرف بلاتا ہے اور اپنی برکتوں کے زیر سایہ تجھے دیکھنا چاہتا ہے حالانکہ تو نے اس کی طرف پشت کر رکھی ہے اور دوسرے کی طرف رخ کر رکھا ہے۔

بزرگ و عظیم ہے وہ خدا جو باوجود اس عظیم قدرت کے کریم ہے لیکن تو باوجود اس ضعف و حقارت کے اس مصیبت پر کس قدر جری ہے۔ (۲)

اس کے بعد اس غافل انسان کو بیدار کرنے کے لئے اپنے لطف و کرم کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتا کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”وہ خدا جس نے تجھے پیدا کیا ہے پھر تیرے وجود کی دستگاہ کو منظم کیا اور تجھے اعتدال بخشا“ ﴿الذی خلقک فسوّاک فعدلک﴾۔ (۳)

اور اس طرح خلقت کے چار مرحلوں کو یعنی اصل خلقت، پھر اس کی تنظیم، پھر اس میں اعتدال، آخر میں ترتیب بندی کو چار مختصر سی پر معنی عبارتوں میں بیان کرتا ہے۔

پہلے مرحلے میں اصل خلقت انسانی قرار پائی ہے کہ اسے ناچیز و حقیر نطفہ سے رحم کے ظلمت کدے میں خلق کیا۔ بعد کے مرحلے میں جو تسویہ و تنظیم کا مرحلہ ہے اس کے پیکر کے اعضاء میں ہر عضو کو تنظیم کے ساتھ موزوں کیا۔ آنکھ، کان، دل، رگیں اور باقی اعضاء جن میں سے اگر انسان ہر ایک کی ساخت، بناوٹ اور نظام پر غور و فکر کرے اور خدا کے لطف و کرم کو ان میں سے ایک ایک میں دیکھے تو علم و قدرت اور لطف و کرم کی ایک دنیا اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم دیکھے گا۔

وہ نعمتیں کہ ہزار ہا سال گزرے نے کے بعد بھی ماہرین علوم طبعی ان کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں لیکن ابھی آغاز کار ہے اور وہ ابھی تحقیق کی ابتداء ہی میں ہیں۔

اس کے بعد ایک تیسری نعمت کو موضوع گفتگو بناتا ہے اور وہ اعضاء جسم انسانی کے درمیان اعتدال و ہم آہنگی ہے جسم انسانی دو حصوں پر بنی پیدا کیا گیا ہے جو دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، استخوان، عروق و اعصاب و عضلات جسم کے دونوں حصوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے والے اور ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔

علاوہ از این مختلف اعضاء بھی ایک دوسرے کے کام کی تکمیل کرتے ہیں۔ مثلاً سانس لینے کا نظام گردش خون کی مدد کرتا ہے اور گردش خون کا نظام تنفس کے ساتھ کر کے غذا کے لقمے کو نگلنے کے لئے اور دانت، زبان، لعاب دہن کے غدود اور اطراف دہن کے عضلات اور گلا یہ سب ایک دوسرے کے دست بدست کام کرتے ہیں، یہاں تک لقمہ ہاضمہ کے نظام میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد بھی بہت سی ہم آہنگیاں صورت پذیر ہوتی ہیں تاکہ غذا جبرو بدن ہو سکے اور قوت و حرکت و سعی کو شش کو پیدا کرے۔

یہ سب ”فعلدک“ کے جملہ میں پنہاں ہیں۔ بعض اس جملہ کو تمام انواع حیوانات میں سے انسان کے سیدھے قد کی طرف، جو اس کے بہت ہی فضیلت کا باعث ہے، اشارہ سمجھتے ہیں۔ یہ معانی بعد والے مرحلے کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں لیکن پہلے معانی زیادہ جامع ہیں۔

انجام کار آخری مرحلہ، دوسرے موجودات کے مقابلہ میں اس کی ترکیب اور صورت پذیری کا آن پہنچتا ہے۔ جی ہاں! خدا نے نوع انسان کو دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں موزوں قربنایا ہے اور اسے عمدہ شکل عنایت کی ہے اور ایسی سیرت دی ہے جس میں زیبائی و خوبصورتی کے ساتھ فطری بیداری بھی ہے اور ایسی ترکیب جو علم، آگاہی، تعلیم و تربیت کو قبول کرنے پر آمادہ ہے۔

اس سے قطع نظر افرادِ انسانی کی صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور جیسا کہ سورہ روم کی آیت ۲۲ میں آیا ہے: ”تمہارے رنگوں اور زبانوں کا اختلاف خدا کی آیات میں سے ہے۔“ ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ

اختلاف السننکم و اللوانکم﴾ اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو نوعِ بشر کی اجتماعی زندگی کا نظام معطل ہو جاتا۔

اس اختلافِ ظاہری کے علاوہ استعداد، ذوق اور سلیقے کے اختلاف قرار دیئے ہیں۔ اور ان کی دو صورتیں بنائیں جن کا اس کی حکمت تقاضا کرتی تھی تاکہ ان کے مجموعہ سے ایک صحیح و سالم معاشرہ وجود میں آئے جو اپنی تمام ضرورتوں کو پورا کرے اور انسانوں کے ظاہری و باطنی قوہ ایک دوسرے کے تکمیل کنندہ بنیں۔ اور مجموعی طور پر، جیسا کہ سورہ (تین) کی آیت ۴ میں آیا ہے۔ ”لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ“ خدا نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان آیتوں میں اور بہت سی دوسری قرآنی آیات کی طرح خدا اس بھلا دینے والے اور مغرور انسان کو اپنی معرفت کی راہ دکھاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ رحم مادر سے لیکر اپنے پیدا ہونے تک کے زمانے کا اور اس وقت سے لیکر

مکمل نشوونما کی منزل تک پہنچنے کے عہد کا بغور مطالعہ کرے اور یہ دیکھے کہ منعم حقیقی کی جانب سے ہر قدم پر ایک نئی نعمت اس کے پاس آئی ہے۔ اس طرح اس کو معلوم ہوگا کہ وہ دوسرے پیر تک خالق کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے، اس کو چاہیے کہ غرور و غفلت کو خیر باد کہے اور پروردگار عالم کی محبت کا طوق اپنی گردن میں ڈالے۔

اساس کے بعد قرآن ان کے غرور و غفلت کو موضوع گفتگو بنا کر کہتا ہے: ”جیسا کہ تم گمان کرتے ہو ایسا نہیں ہے تم روز جزا کے منکر ہو“ ﴿کَلَّا بَلْ تَكْذِبُونَ بِالْذِّينِ﴾۔ ”نہ تو خدا کا کرم تمہارے غرور کا سبب ہے اور نہ اس کی نعمتوں کا سلسلہ بلکہ اس کا اصلی سبب تمہارا روز قیامت پر ایمان نہ لانا۔“^(۱)

۱۔ کلا حرف ردع ہے اور پہلے سے ذکر شدہ یا تو ہم شدہ مطلب کے انکار کے لئے ہے اور یہ ”کَلَّا“ اس آیت میں کس چیز کی نفی کرتا ہے، اس سلسلہ میں مفسرین نے کئی احتمال پیش کئے ہیں۔ سبب سے پہلے وہی احتمال ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے یعنی یہاں کَلَّا غرور و غفلت کے تمام سرچشموں کی نفی کرتا ہے سوائے قیامت کی تکذیب اور انکار کے جس کا ”بل“ کے بعد ذکر ہوا ہے۔ راغب نے مفردات میں (بلکہ مادہ کے سلسلے میں) ان معانی کو منتخب کیا ہے اور اوپر والی آیت بیان کرنے کے بعد کہتا ہے ﴿كَانَ قِيلَ لَيْسَ هَهُنَا مَا يَقْضَىٰ اِنْ يَغْرَهُمْ بِهِ تَعَالَىٰ وَلَكِنْ تَكْذِيبُهُمْ هُوَ الَّذِي حَمَلَهُمْ عَلٰی مَا ارْتَكَبُوْهُ﴾ گویا کہا گیا ہے کہ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں جو انہیں اللہ کے مقابلہ میں مغرور کرے لیکن ان کا تکذیب کرنا وہ ہے جس نے اس کا ارتکاب کیا ہے۔

جی ہاں اگر مغرور اور غافل افراد کی حالت پر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اصلی سبب یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے افراد کی روح کی گہرائیوں میں قیامت کے بارے میں شک یا اس کا انکار پوشیدہ ہے، اور باقی امور تو صرف بہانے ہیں۔ لہذا اگر ان کے دلوں میں قیامت پر ایمان پیدا ہو جائے تو یہ غرور اور غفلت سب ختم ہو کر رہ جائے۔ دین دین سے مراد یہاں جزا اور روز جزا ہے اور یہ بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ یہاں مراد دین اسلام ہے بعید نظر آتا ہے اس لئے کہ ان آیتوں میں گفتگو کا جو محور ہے وہ معاد و قیامت ہے اس کے بعد اسباب غرور و غفلت کو ختم کرنے اور قیامت پر ایمان تقویت دینے کے لئے مزید کہتا ہے: ”اس میں شک نہیں ہے کہ تم پر نگراں مقرر کئے گئے ہیں“ ﴿وَ اِنَّ عَلَیْكُمْ لِحَافِظِیْنَ﴾

ایسا سیسے نگران و نگہبان جو پروردگار کی بارگاہ میں مقرب و محترم ہیں اور وہ ہمیشہ تمہارے اعمال کو تحریر کرتے ہیں ﴿کراماً کاتبین﴾۔ اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو اس سے آگاہ ہیں اور سب کچھ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ﴿يعلمون ما تفعلون﴾

”حافظین“ سے مراد یہاں وہ فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال کی کی نگرانی پو مامور ہیں، اس سے قطع نظر کہ اعمال اچھے ہوں یا برے۔ ان فرشتوں کو سورہ ق کی آیت ۱۸ میں رقیب و عتید سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿ما يلفظ من قول الا لديه رقيب عتيد﴾ انسان کوئی بات نہیں کرتا مگر یہ کہ اس کے پاس فرشتہ ہے جو نگرانی کا فرض انجام دینے کے لئے مستعد ہے۔ اسی سورہ ق کی اس سے پہلے کی آیت میں فرماتا ہے:

﴿اذيتلق المتلقيان عن اليمين و عن الشمال قعيد﴾ ”یادکر اس وقت کو جب وہ دو فرشتے جو دائیں بائیں سے تجھے پکڑے ہوئے ہیں، تیرے اعمال ثبت کرتے ہیں۔“ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی ان فرشتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جو نگران اعمال ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا ہر شخص سے پہلے اور ہر شخص سے بہتر اعمال انسانی کا شاہد و ناظر ہے لیکن اس نے مزید تاکید کے لئے اور زیادہ احساس ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے نگران فرشتے مقرر کئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور نگران بھی ہیں جو انسان کو ہر طرف سے گھیر ہوئے ہیں جن سب کا قیامت کی دادگاہ کے گواہوں کے عنوان کے ماتحت سات حصوں میں جلد ۱۱ کے صفحہ ۴۰۵ تا ۴۱۰ پر ہم نے ذکر کیا ہے (سورہ حم سجدہ) کی آیت ۲۰ اور ۲۱ کے ذیل میں) یہاں کی طرف فہرست وار اشارہ کیا جاتا ہے۔

پہلا گواہ خدا ہے جو فرماتا ہے: ”جو عمل انجام دیتے ہو ہم اس کے ناظر و شاہد ہیں“ (یونس - ۶۱)۔

”۱“ اس بعد انبیاء و اوصیاء ہیں“ (نساء - ۴۱)۔ اس کے بعد ”زبان، ہاتھ، پاؤں اور پیکر انسان کے تمام اعضا و جوارح“ (نور - ۲۴) ایک گواہ جسم کی کھال ہے (حم سجدہ - ۲۱)۔ اور گواہ فرشتے ہیں (ق - ۲۱) اور زیر بحث آیت اس کے بعد وہ زمین جس پر انسان زندگی بسر کرتا ہے اور اس پر اطاعت کی جاتی ہے اور گناہ ہوتے ہیں (زلزال - ۴) اور آخر میں وہ وقت و زمانہ جس میں اعمال انجام پاتے ہیں (سفینۃ البحار جلد ۲ مادہ یوم)۔

احتیاج طبری میں ہے ایک شخص نے امام صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ انسانوں کے نیک و بد اعمال تحریر کرنے پر جو فرشتے مامور ہیں ان کا کیا سبب ہے جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ خداوند عالم السر وما ہو اخفی ہے یعنی وہ ہر چیز جس سے زیادہ پوشیدہ کوئی چیز نہیں ہے وہ اسے جانتا ہے تو امام نے جواب میں فرمایا:

استعبدہم بذالک و جعلہم شہوداً علی خلقہ لیکون العباد ملازمتمہم ایا ہم اشد علی طاعة اللہ مواظبة و عن معصية اشد انقباضاً و کم من عبدیہم بمعصية فذکر مکاتہما فادعوی و کف فیقول ربی یرانی و حفظنی علی بذالک تشهد و ان اللہ برأفتہ و لطفہ و کلہم بعبادہ یذبون عنہم مردۃ الشیاطین و هو ام الارض و افات کثیرة من حیث لا یرون باذن اللہ الی ان یجی ء امر اللہ عزوجل۔

خدا نے فرشتوں کو اپنی عبادت کے لئے بلایا اور انہیں اپنے بندوں پر گواہ قرار دیا تاکہ بندے ان کی نگرانی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ خدا کی اطاعت کریں اور اس کی نافرمانی سے انہیں زیادہ سے زیادہ پریشانی اور دکھ ہو۔ بہت ایسے بندے ہیں جو گناہ کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں اور پھر اس فرشتے کو یاد کرتے ہیں اور اپنے آپ کو گناہ سے باز رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں دیکھتا ہے اور نگران فرشتے بھی گواہی دیں گے۔ اس کے علاوہ خدا نے ہمیں اپنی رحمت اور مہربانی سے انہیں بندوں پر مامور کیا ہے تاکہ حکم خدا نے سرکشی کرنے والے شیاطین کو ان سے دور رکھیں اور زمین کے جانوروں اور بہت سی آفات و بلیات کو جنہیں بندے اس وقت تک نہیں دیکھتے جب تک حکم خدا یعنی ان کی موت نہ آجائے۔

اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ تحریر اعمال کی ذمہ داری کے علاوہ ناگوار حادثوں، مصیبتوں اور شیاطین کے وسوسوں سے انسانوں کو محفوظ رکھنے پر بھی مامور ہیں (خدا کے فرشتوں کی مختلف ذمہ داریوں کے بارے میں ایک تفصیلی بحث جلد ۱۰ ص ۱۶۸ تا ۱۷۲ سورہ فاطر کی آیت ۱ کے ذیل میں آچکی ہے)۔

قابقابل توجہ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات ان فرشتوں کی تعریف و توصیف میں کہتی ہیں وہ کریم اور بزرگ فرشتے پروردگار کی بارگاہ میں بلند مقام کے حامل ہیں تاکہ انسان اپنے اعمال پر زیادہ توجہ دیں، اس لئے کہ انسان کے اعمال کی نگرانی کرنے والا جس قدر بلند شخصیت رکھتا ہے انسان اس کا زیادہ لحاظ کرتا ہے اور گناہ کے انجام دینے سے زیادہ شرمندہ ہوتا ہے،۔ کاتبین کی تعبیر در حقیقت اس بات کی تاکید ہے کہ وہ حافظہ پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ باریک بینی کے ساتھ لکھتے ہیں، اس انداز سے کہ کبھی کوئی چیز اس سے نظر انداز نہیں ہوتی اور ہر وہ چھوٹے بڑے عمل کو ضبط تحریر میں لاتے ہیں ﴿یعلمون ما تفعلون﴾ ”جو کچھ تم انجام دیتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔“

یہ اس حقیقت پر ایک مزید تاکید ہے کہ وہ تمہارے اعمال سے بغیر استثناء آگاہ ہے اور ان کا لکھنا اسی آگاہی کی بنیاد پر ہے۔ یہ تمام تعبیریں انسان کے اختیار اور ارادے کی آزادی کو بیان کرتی ہیں اس لئے کہ اگر انسان کو کوئی اختیار حاصل نہ ہوتا تو اعمال کے تحریر کرنے والے فرشتوں کے مقرر کرنے کا اور ان سب تنبیہوں کا کوئی صحیح مفہوم نہ ہوتا۔
 < اور پھر یہ سب چیزیں اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ حساب و کتاب کا ہونا اور جزا و سزا کا ملنا قطعی اور حتمی ہے، اس لئے کہ خدا نے اسے حد سے زیادہ اہمیت دی ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ اور اس پر ایمان اس مقصد کے لئے ہے کہ انسان کی تربیت کرے اور اسے اس کی ذمہ داریوں سے آشنا کرے اور غلط کاموں پر حد سے زیادہ روکنے والا اثر ڈالے۔

۱۔ مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۴۹۔ یہی حدیث در المنثور، روح البیان، روح المعانی اور قرطبی میں بھی زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہے

۲۔ خطبہ البلاغہ، ۳۔ ”ما شاء“ میں مازائدہ ہے، بعض مفسرین نے پیش کیا ہے کہ ماشرطیہ ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

۴۔ بعض مفسرین روح البیان اور روح المعانی کے مولف نے کہا ہے کہ ”واو یہاں حالیہ ہے لیکن استینافیہ کا احتمال زیادہ مناسب ہے۔“

۵۔ نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۲۲۔

ثبت اعمال کے مامورین

نہ صرف اوپر آیات میں بلکہ بہت سی دوسری قرآنی آیات میں اور اسلامی روایات میں ان معانی کی طرف اشارہ ہو ہے کہ خدا نے ہر انسان پر نگہبان و نگران مقرر کئے ہیں جو اس کے اعمال قطع نظر اس کے کہ وہ اچھے ہوں یا برے، تحریر کرتے ہیں اور اس کا اعمال نامہ روز جزا کے لئے تیار کرتے ہیں۔

ان فرشتوں کی خصوصیات کے بارے میں معنی خیز اور خبردار و ہشیار کرنے والی تعبیریں اسلامی روایات میں وارد ہوئی ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ کسی شخص نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے سوال کیا کہ جو انسان کے اعمال تحریر کرنے پر مامور ہیں کیا وہ انسان کے ارادہ اور نیک یا بد کام کرنے کے باطنی عزم سے بھی باخبر ہوتے ہیں تو امام نے جواب میں فرمایا:

”کیا بچے کچھے اور گندے پانی کے کنویں کی بو اور عطر کی خوشبو ایک جیسی ہوتی ہے“۔ راوی نے عرض کیا نہیں۔ تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

”کہ جب انسان کوئی اچھا کام کرنے کی نیت کرتا ہے تو اس کا سانس خوشبودار ہو جاتا ہے تو وہ فرشتہ جو دائیں طرف ہے (اور حسنات کے ثبت کرنے پر مامور ہے) بائیں طرف والے فرشتے سے کہتا، اٹھ کھڑا ہو کہ اس نے نیک کام کا ارادہ کیا ہے اور جب وہ اس کام کو انجام دیتا ہے تو اس انسان کی زبان اس فرشتے کا قلم بن جاتی ہے اور لعاب دہن سیاہی بن جاتا ہے، لیکن جب انسان گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا سانس بدبودار ہو جاتا ہے، اس وقت بائیں طرف کا فرشتہ دائیں طرف والے فرشتے سے کہتا ہے، اٹھ کھڑا ہو کہ اس نے معصیت و نافرمانی کا ارادہ کیا ہے اور جب وہ نافرمانی انجام دیتا ہے تو اس کی زبان اس فرشتے کا قلم اور لعاب دہن سیاہی بن جاتا ہے اور وہ اسے لکھ دیتا ہے۔“ (۱)

یہ حدیث اچھی طرح بتاتی ہے کہ انسان کی نیت اس کے وجود پر اچھی طرح اثر انداز ہوتی ہے اور فرشتے اس کے اندرونی اسرار سے باہر کے آثار کے ذریعہ آگاہ ہو جاتے ہیں اور اگر آگاہ نہ ہوں تو انسان کے اعمال کو اچھی طرح ضبط تحریر میں نہیں لاسکتے، اس لئے کہ نیت کی کیفیت عمل کی آلودگی اور خلوص کے سلسلہ میں حد سے زیادہ موثر ہوتی ہے یہاں تک کہ پیغمبر اسلام نے مشہور حدیث میں فرمایا ہے:

﴿انما الاعمال بالنيات﴾ - اعمال نیتوں سے وابستہ ہیں، دوسرے یہ کہ فرشتہ خود انسان سے لیتے ہیں اور اسی پر خرچ کرتے ہیں۔ ہماری زبان انکا قلم اور ہمارا لعاب دہن ان کی سیاہی ہے۔

۲۔ وہ مامور ہیں کہ جب انسان نیک کام کی نیت کرے تو اسے ایک نیکی کی حیثیت سے تحریر کریں اور جس وقت اسے انجام دیدے تو دس نیکیاں لکھ دیں۔ لیکن جب انسان گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو جب تک عمل نہ کرے کوئی چیز اس کے خلاف نہیں لکھتے اور گناہ کے ارتکاب کے بعد بھی صرف ایک ہی گناہ لکھتے ہیں۔^(۲)

یہ تعبیر انسان پر خدا کے انتہائی لطف و کرم کو بیان کرتی ہے کہ گناہ کی نیت کو وہ بخش دیتا ہے اور فعل گناہ کی عدل کے مطابق سزا دیتا ہے نہ کہ میزان عدل کے مطابق اور یہ نیک اعمال کی تشویق ہے۔

۳۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ان دونوں فرشتوں کے موجود ہونے اور دس گنا حسنات کی سزا لکھنے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا:

جب انسان کسی برے کام کو انجام دیتا ہے دائیں طرف کا فرشتہ بائیں طرف کے فرشتے سے کہتا ہے اس گناہ کے لکھنے میں جلدی نہ کر شاید اس کے بعد کوئی نیک کام انجام دے جو اس کے گناہ پر پردہ ڈال دے جیسا کہ خدائے عظیم فرماتا ہے: ﴿ان الحسنات يذهبن السيئات﴾ ”نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں“۔

یا یہ کہ توبہ و استغفار کرے اور (گناہ کا اثر ختم ہو جائے)۔ گناہ کا فرشتہ سات گھنٹہ تک گناہ کے لکھنے سے رکا رہتا ہے، اگر اس گناہ کے بعد کوئی استغفار یا نیک کام نہ ہو تو پھر حسنات والا فرشتہ سینات والا فرشتہ سے کہتا ہے کہ اس بد بخت محروم کا گناہ لکھ دے۔^(۳)

۴۔ ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب مومنین کسی خصوصی مجلس میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں تو محافظین اعمال ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ ہم ان سے دور ہو جائیں۔ شاید ان کا کوئی راز ہے جسے خدا نے پوشیدہ رکھا ہے۔^(۴)

۵۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے خطبہ میں جس میں لوگوں کو تقویٰ اور خوفِ خدا کی دعوت دیتے ہیں، فرماتے ہیں کہ: ”اے بندگانِ خدا! جان لو کہ خود تم میں سے کچھ نگرانِ تم پر مقرر کئے گئے ہیں، وہ تمہارے بدن کے اعضاء ہیں اور یہ بھی جان لو کہ سچے حساب کرنے والے تمہارے اعمال کو لکھتے ہیں یہاں تک کہ تمہارے سانسوں کی تعداد کو محفوظ کر لیتے

ہیں۔ نہ شبِ تاریک کی سیاہی تمہیں ان سے پوشیدہ رکھ سکتی ہے اور نہ محکم اور بند دروازے۔ اور آج کل کس قدر قریب ہے۔ (۵)

۱۔ اصول کافی، جلد ۲ باب من یتہم بالحسنۃ والسیئۃ حدیث ۳۔

۲۔ اصول کافی، جلد ۲ باب من یتہم بالحسنۃ والسیئۃ حدیث ۳۔

۳۔ اصول کافی، جلد ۲ باب من یتہم بالحسنۃ والسیئۃ حدیث ۴۔

۴۔ اصول کافی مطابق نقل نو الثقلین، جلد ۵ ص ۱۱۰۔

۵۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۷۔

آیات ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹

- ۱۳۔ ﴿إِنَّ الْآبِرَارَ لَفِي نَعِيمٍ﴾ -
 ۱۴۔ ﴿وَأَنَّ الْفَجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ﴾ -
 ۱۵۔ ﴿يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ﴾ -
 ۱۶۔ ﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ﴾ -
 ۱۷۔ ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ﴾ -
 ۱۸۔ ﴿ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ﴾ -
 ۱۹۔ ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ﴾ -

ترجمہ

- ۱۳۔ یقیناً نیک افراد نعمت فراوان میں ہیں -
 ۱۴۔ اور بدکار دوزخ میں ہیں -
 ۱۵۔ جزا کے روز اس میں وارد ہوں گے اور جلیں گے -
 ۱۶۔ اور کبھی بھی اس سے غائب اور دور نہیں ہوں گے -
 ۱۷۔ تو کیا جانے کہ قیامت کا دن کیا ہے -
 ۱۸۔ پھر تو کیا جانے کہ قیامت کا دن کیا ہے -
 ۱۹۔ ایسا دن ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے حق کے میں کسی کام کے انجام دینے پر قدرت نہیں رکھتا اور اس

دن

سب امور اللہ سے مخصوص ہیں -

وہ دن جس میں کوئی شخص کسی کے لئے کوئی کام انجام نہیں دے گا -
 اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں فرشتوں کے ذریعہ انسانوں کے اعمال کے ثبت و ضبط کے سلسلہ میں آئی ہے ان آیتوں میں اس حساب و کتاب کے نیچے اور نیکیوں اور بروں کی جو رہگذر ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار عالم فرماتا ہے:

”یقیناً نیک اور صالح افراد خدا کی عظیم نعمت میں ہیں“ ﴿ان الابرار لفی نعیم﴾۔ ”اور بدکار یقیناً جہنم میں ہیں“ ﴿ان الفجار لفی جحیم﴾۔

”ابرار“۔ ”بار“ اور ”بر“ (بروزن حق) کی جمع ہے جس کے معنی نیکو کار شخص کے ہیں۔ اور ”بر“ (ب کے زیر کے ساتھ) ہر قسم کی نیکی کے معنی میں ہے۔ یہاں اچھے عقائد بھی مراد ہیں اور اچھی نیتیں اور اچھے اعمال بھی۔

”نعیم“ مفرد ہے اور نعمت کے معنی میں ہے اور یہاں بہشت جاودانی کے معنی میں ہے اور نکرہ کی صورت میں آیا ہے اس نعمت کی اہمیت، وسعت اور عظمت کے بیان کے لئے ہے، خدا کے علاوہ کوئی اور اس کی وسعت و عظمت سے واقف نہیں ہے۔

”نعیم“ جو یہاں صفت مشبہ ہے یہاں اس کی نعمت کی بقا اور اس کے استمرار کی تاکید کے لئے ہے۔ یہ مفہوم عام طور پر صفت مشبہ میں چھپا ہوتا ہے۔

”فجار“ فاجر کی جمع ہے۔ اصل میں فجر کے معنی وسیع طور پر شگاف کرنے کے ہیں اور طلوع صبح کو اس لئے فجر کہتے ہیں گویا رات کا سیاہ پردہ سپید سحری کے ہاتھوں کلی طور پر شگافتہ ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر فجر کا لفظ ان لوگوں کے اعمال کے بارے میں دستیاب ہوتا ہے جو پاکدامنی اور تقویٰ کا پردہ چاک کرتے ہیں اور گناہ کے راستے میں قدم رکھتے ہیں۔

”جحیم“۔ ”ححم“ (بروزن فہم) کے مادہ سے آگ بھڑکانے معنی ہے۔ اس وجہ جحیم بھڑکتی ہوئی آگ کو کہتے ہیں۔ قرآنی تعبیر میں یہ لفظ عام طور پر دوزخ کے معنی میں آیا ہے اور یہ جو فرماتا ہے:

’نیکو کار جنت میں اور بدکار دوزخ میں ہیں‘ ممکن ہے اس معنی میں ہو کہ وہ ابھی سے جنت اور دوزخ میں وارد ہو گئے ہیں اور اس دنیا ہی میں جنت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب نے انہیں گھیر رکھا ہے جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیت ۵۴ میں پڑھتے ہیں: ﴿و ان جہنم لمحیطۃ بالکافرین﴾۔ ”دوزخ نے کافروں کا احاطہ کر رکھا ہے“۔

لیکن ایک جماعت نے کہا کہ اس قسم کی تعبیریں حتمی اور یقینی طور پر مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس لئے کہ ادب عربی میں حتمی اور یقینی مستقبل اور متحقق الوقوع مضارع کو حال کی شکل میں اور کبھی ماضی کی شکل بیان کرتے ہیں۔

(آیت کے پہلے معنی طاہر کے ساتھ سازگار ہیں لیکن مناسب دوسرے معنی ہیں)۔

بعد کی آیت میں فاجروں کی سرنوشت کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: ”وہ روز جزا اور دوزخ میں داخل ہوں گے اور اس کی آگ میں جلیں گے۔“ ﴿يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ﴾۔

جب گذشتہ آیت کے معنی ایسے ہوں کہ وہ ابھی سے دوزخ میں داخل ہیں تو پھر یہ آیت بتاتی ہے کہ روز قیامت اس جلانے والی آگ میں ان کا داخلہ اور شدید ہوگا اور آگ کے اثر کو وہ اچھی طرح محسوس کریں گے۔

”یصلون“۔ ”صلی“ (بروزن سعی) کے مادہ سے آگ میں داخل ہونے، جلنے، بھن جانے اور اس کے درد و تکلیف کو برداشت کرنے کے معنی میں ہے۔ اور اس بنا پر، کہ فعل مضارع ہے، استمرار پر دلالت کرتا ہے، مزید تاکید کے لئے فرماتا ہے

”وہ اس آگ سے کبھی دور اور مفقود نہیں ہیں“ ﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ﴾۔ بہت سے مفسرین نے اس جملہ کو فجار پر جو عذاب ہوگا اس کے جاودا ہونے کی دلیل کے طور پر لیا ہے اور اس طرح نتیجہ نکالا ہے کہ فجار سے مراد ان آیات میں کفار ہیں، اس لئے کہ خلود اور ہمیشگی ان کے مورد کے علاوہ وجود نہیں رکھتی۔ اس آیت کی تعبیر زمانہ حال کی شکل میں اس چیز کی مزید تاکید ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ اس قسم کے افراد دنیا میں بھی کلی طور پر جہنم سے دور نہیں ہیں۔ ان کی زندگی خود دوزخ ہے۔ اور مشہور حدیث کے مطابق ان کی قبر جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے اور اس طرح دنیا کی دوزخ اور برزخ کی دوزخ اور قیامت کی دوزخ تینوں ان کے لئے موجود ہیں۔

مندرجہ بالا ضمنی طور پر اس حقیقت کو بھی بیان کرتی ہے کہ دوزخیوں کے عذاب میں کسی قسم کا وقفہ نہیں ہے، یہاں تک کہ ایک لمحہ کا وقفہ بھی نہیں ہوگا۔

اس کے بعد اس عظیم دن کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے کہتا ہے: ”تو کیا جانے کہ روز جزا کیا ہے“ ﴿وَمَا ادْرَاكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ﴾۔

”پھر تو کیا جانے کہ روز جزا کیا ہے“۔ ﴿ثُمَّ مَا ادْرَاكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ﴾۔

جب پیغمبر اسلام قیامت کے بارے میں اس وسیع آگاہی اور علم کے باوجود اس پر حکومت کرنے والے حوادث، اضطراب اور عظیم وحشت کو اچھی طرح نہیں جانتے تو باقی کا معاملہ واضح ہے۔

یہ گفتگو اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ قیامت کے ہولناک حوادث اس قدر وسیع و عظیم ہیں کہ جو قالبِ بیان میں نہیں سما سکتے اور جس طرح ہم عالم خاک کے اسیرِ جنت کی بے نمایا نعمتوں سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہیں جہنم کے عذاب اور اس کے حوادث سے کس طرح آگاہ ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد ایک مختصر اور پر معنی جملہ میں اس دن کی ایک اور خصوصیت جس میں درحقیقت تمام چیزیں چھپی ہوئی ہیں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”وہی دن جس دن کوئی شخص کسی دوسرے کے حق میں کوئی کام انجام نہیں دے سکے گا اور اس دن تمام امور خدا سے مختص ہیں“ ﴿یوم لا تملک نفس لنفس شیئا و الامر یومئذ للہ﴾

کام تو اس جہان میں بھی سب اسی کے دستِ قدرت میں ہیں اور سب لوگ اسی کے نیازمند ہیں لیکن پھر بھی یہاں کبھی کبھی بہر حال مجازی مالک و حاکم اور فرماں روا موجود ہیں جن میں سطحی نگاہ رکھنے والے افراد مستقل مبدا۔ قدرت خیال کرتے ہیں لیکن اس دن یہ مجازی مالکیت و حاکمیت بھی ختم ہو جائے گی اور خدا کی حاکمیت مطلقہ ہر زمانہ کی بہ نسبت زیادہ واضح ہوگی۔

یہ چیز قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی آئی ہے ﴿لن الملک الیوم للہ الواحد القہار﴾۔ ”آج کے دن حکومت کس کے لئے ہے غالب و یکتا خدا کے لئے ہے“۔ (مومن - ۱۶)۔

اصولی طور پر اس دن ہر شخص اس قدر اپنے آپ میں گرفتار ہوگا کہ اگر بالفرض اس میں قوت ہوتی بھی تب بھی دوسروں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ ﴿لکل امریٰ منہم یومئذ شأن یغنیہ﴾۔

اس دن ان میں سے ہر ایک اس طرح بتلا ہوگا جو اس کے لئے کافی ہوگا۔ (عبس - ۳۷)۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

﴿ان الامر یومئذ و الیوم کلمہ اللہ اذا کان یوم القیامۃ بادت الحکام فلم یبق حاکم الا اللہ﴾

”اور آج اس دن تمام کام اللہ کے اختیار میں ہیں لیکن جب قیامت کا دن ہوگا تو تمام حاکم تباہ و برباد ہو جائیں گے اور خدا کی حکومت کے علاوہ کوئی حکومت باقی نہیں رہے گی۔“^(۱)

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ تعبیر انبیاء، اولیاء اور فرشتوں کی شفاعت کے سلسلہ سے متصادم نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب ان مباحث سے جو ہم مسئلہ شفاعت کے سلسلہ میں تحریر کر چکے ہیں واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ

قرآن مجید متعدد آیات میں تصریح کر چکا ہے کہ شفاعت خدا کے اذن اور اجازت سے ہوگی اور روز جزا کے شفیع اس کے رضا کے بغیر کسی کی شفاعت نہیں کریں گے۔ ﴿وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ﴾ (انبیاء - ۲۸)۔

خداوند! اس ہولناک دن کے بارے میں سب کی نظریں تیری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ہم ابھی سے تیری طرف نظریں لگائے ہوئے ہیں۔

پروردگار! ہمیں اس جہان میں اور اس جہان میں اپنے بے پایاں لطف و کرم سے محروم نہ کیجو۔
بار الہا! ہر حالت میں حاکم مطلق تو ہے ہمیں وادی شرک میں محسور ہونے سے بچالے اور دوسروں کی پناہ لینے سے محفوظ رکھ۔

آمین یا رب العالمین

سورہ انفطار کا اختتام

سورہ مطففین

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اس میں ۳۶ آیتیں ہیں

سورہ مطففین کے مضامین کا دائرہ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہو ایامینہ میں اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ شان فزول بتاتی ہے کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات جن کا موضوع کم تولنا ہے، ان لوگوں سے متعلق ہیں جو مدینہ میں اس قبیح کام میں مشغول تھے۔ لیکن دوسری آیات کا لب و لہجہ مکی سورتوں کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے جس میں مختصر اور پر جلال آیات میں پروردگار عالم قیامت اور حوادث قیامت کی خبر دیتا ہے خصوصاً اس سورہ کی آیات جو مسلمانوں کا مذاق اڑانے کے بارے میں کفار کو موضوع بناتی ہیں۔

یہ آیتیں مکہ کے ماحول کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہیں۔ وہاں مومنین اقلیت میں تھے اور کافروں کی قطعی اکثریت تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین سورہ کے ایک حصہ کو مکی اور دوسرے حصہ کو مدنی سمجھتے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ سورہ مکی سورتوں سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے، بہر حال اس سور کے مباحث پانچ محوروں کے گرد گھومتے ہیں۔

- ۱۔ کم تولنے والوں کے بارے میں شدید تنبیہ و تہدید۔

- ۲۔ اس مفہوم کی طرف اشارہ کہ بڑے بڑے گناہوں کا سرچشمہ قیامت کے بارے میں پختہ یقین نہ ہونا ہے۔

- ۳۔ اس عظیم دن فجار کی سرنوشت کا ایک حصہ۔

- ۴۔ جنت میں نیکوکاروں کو ملنے والی عظیم اور روح پرور نعمتوں کا ایک حصہ۔

- ۵۔ کفار کا مومنین سے جاہلانہ مذاق اور اس کے برعکس قیامت کے ہونے کا بیان۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے (من قراء سورة المطففين سقاه الله من الرحيق المختوم يوم القيامة)۔

جو شخص سورہ مطففین پڑھے خدا اسے خالص شراب سے جو کسی کو مسیر نہیں ہوتی قیامت میں سیراب کرے گا۔^(۱)

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

من قرأ فی الفرائضہ ”ویل للمطففین“ اعطاه الا من یوم القيامة من النار و لم تره ولم یرھا

جو شخص اپنی فریضہ نمازوں میں سورہ مطففین پڑھے، خدا قیامت میں اسے عذاب جہنم سے محفوظ رکھے گا نہ جہنم کی آگ اسے دیکھے گی، اور نہ وہ جہنم کی آگ کو دیکھے گا۔^(۲)

یہ سب ثواب فضیلت اور برکت اس شخص کے لئے ہے جو اس کے پڑھنے کو عمل کی تمہید اور مقدمہ قرار دے۔

۱- مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۵۱۔

۲- ثواب الاعمال، مطابق نقل از نور الثقلین جلد ۵،

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ﴾

۲۔ ﴿الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ﴾۔

۳۔ ﴿وَإِذَا كَالَهُمْ أَوْ زَنَوْهُمْ يُخْسِرُونَ﴾۔

۴۔ ﴿أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ﴾۔

۵۔ ﴿لِيَوْمٍ عَظِيمٍ﴾۔

۶۔ ﴿يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾۔

ترجمہ

۱۔ وائے ہے کم تولنے والوں پر۔

۲۔ وہ جب خود لیتے ہیں تو اپنا حق پورا لیتے ہیں۔

۳۔ لیکن جب چاہتے ہیں کہ دوسروں کے لئے تولیں تو کم تولتے ہیں۔

۴۔ کیا وہ باور نہیں کرتے کہ وہ اٹھائیں جائیں گے۔

۵۔ عظیم دن۔

۶۔ جس روز لوگ رب العالمین کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے۔

شان نزول

ابن عباس کہتے ہیں جس وقت پیغمبر اکرم مدینہ میں داخل ہوئے تو بہت سے لوگ کم تولنے کے مرض میں مبتلا تھے تو خدا نے ان آیتوں کو نازل کیا اور انہوں نے قبول کیا اور کم تولنا ختم کر دیا۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ بہت سے اہل مدینہ تاجر تھے اور کم تولنے کے عادی تھے اور وہ بہت سے حرام کام کرتے

تھے تو ایسی صورت میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ پیغمبر اسلام نے یہ آیتیں اہل مدینہ کو سنائیں اس کے بعد آپ نے فرمایا

(خمس بخمس) پانچ چیزیں پانچ چیزوں کے مقابلہ میں ہیں،۔ انہوں نے عرض کیا ”اے خدا کے رسول کو نسی پانچ

چیزیں پانچ چیزوں کے مقابلہ میں ہیں۔“ تو آپ نے فرمایا:

(ما نقض قوم العهد الا سلب الله عليهم عدوهم و ما حكموا بغير ما انزل الله الا فشافيهم الفقر ما ظهرت فيهم الفاحشة الا فشافيهم الموت ولا طففوا الكيل الا منعوا النبات و اخذوا بالسنين و لامنعوا الزكاة الا حبس عنهم المطر)

کسی قوم نے عہد شکنی نہیں کی مگر یہ کہ خدا نے اس کے دشمنوں کو اس پر مسلط کر دیا اور کسی جمیعت نے حکم خدا کے خلاف حکم نہیں دیا مگر یہ کہ ان میں فقر و فاقہ زیادہ ہو گیا۔ کسی ملت کے درمیان فحاشی اور برائیاں ظاہر نہیں ہوئیں مگر یہ کہ موت کا وقوع ان میں زیادہ ہو گیا۔ کسی قوم نے کم نہیں تو لا مگر یہ کہ ان کی زراعت ختم ہو گئی اور قحط سالی نے انہیں گھیر لیا اور کسی قوم نے زکاة نہیں روکی مگر یہ کہ بارش سے محروم ہو گئے۔^(۱)

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں ان آیتوں کی شان نزول کے سلسلہ میں نقل کیا ہے کہ مدینہ میں ایک شخص تھا جس کا نام ابو جہنہ تھا جس کے پاس دو چھوٹے بڑے پیمانے تھے۔ خریدتے وقت بڑا پیمانہ استعمال کر کے فائدہ اٹھاتا اور بچتے وقت چھوٹے پیمانے سے دیتا۔ (تویہ سورہ نازل ہوا اور اسے خبردار کیا)۔

کم تولنے والوں پر وائے ہے

ان آیات میں ہر چیز سے پہلے کم تولنے والوں کو شدید عذاب کا مستحق ٹھہرا کر فرماتا ہے: ”وائے ہے کم تولنے والوں پر“ ﴿وَلِلْمُطَفِّفِينَ﴾۔ یہ حقیقت میں خدا کی جانب سے ان ظالم، ستمگر اور گندے لوگوں کے خلاف اعلان جنگ ہے جو بزدلوں کی طرح لوگوں کا حق پامال کرتے ہیں۔

”مطففین“۔ ”تطفیف“ کے مادہ سے اصل میں ”طف“ سے لیا گیا ہے جو کسی چیز کے کناروں کے معنی میں ہے اور یہ جو سر زمین کربلا کو وادی طف کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فرات کے کنارے پر واقع ہے۔

اس کے بعد ہر کم چیز پر طفیف کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ پیمانہ جو لبریز نہ ہو، وہاں بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ لفظ کم تولنے کے لئے استعمال ہوا ہے خواہ وہ کسی شکل و صورت کا ہو۔

”ویل“ یہاں شر، و غم اندوہ، ہلاکت یا دردناک عذاب یا جہنم کی سخت جلانے والی وادی کے معنوں میں ہے عام طور پر یہ لفظ نفرین کرنے اور کسی چیز کی قباحت کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، یا یہ کہ ایک مختصر سی تعبیر ہے جو بہت سے مفہیم کو چاہتی ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ خدا نے لفظ ویل قرآن میں کسی شخص کے لئے استعمال نہیں کیا مگر یہ کہ اس کو کافر کہا ہے ﴿فویل للذین کفروا من مشهد یوم عظیم﴾
 ”وائے ہے کافروں پر عظیم دن کے مشاہدہ سے“^(۱) (مریم - ۳۷)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کم تولنے سے کفر کی بو آتی ہے۔ اس کے بعد مطففین یعنی کم تولنے والوں کے کام کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے لئے تولتے ہیں تو اپنا حق مکمل طور پر وصول کرتے ہیں“ ﴿و الذین اذا اکتلوا علی الناس یستوفون﴾^(۲)

لیکن جب وہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کے لئے تولیں تو کم تولتے ہیں ﴿و اذا کالوہم او وزنوہم یخسرون﴾۔
 مفسرین کی ایک جماعت نے مندرجہ بالا آیات سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ مطفف سے مراد وہ شخص ہے جو خریدتے وقت اپنا حق زیادہ لیتا ہے اور بچتے وقت مقابل کو اس کے حق سے کم دیتا ہے۔
 اسی لئے خدا نے دونوں پہلوؤں کے پیش نظر ان پر ویل رکھی ہے۔

لیکن یہ ایک اشارہ ہے اور غلط ہے کیونکہ ”یستوفون“ کا مفہوم یہ ہے کہ اپنا حق مکمل طور پر وصول کرتے ہیں اور ایسا پہلو جس میں اپنے حق سے زیادہ لینے کی بات ہو اس عبارت میں موجود نہیں ہے اور یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدا نے ان کی مذمت کی ہے ان دو حالتوں کے ایک دوسرے سے تقابل کی شکل میں ہے کہ خریدتے وقت پورا پورا حق لیتے ہیں اور بچتے وقت کمی کرتے ہیں۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ہم کسی کی مذمت میں کہتے ہیں ”جب کسی سے اس کو کوئی چیز لیننی ہوتی ہے تو وعدہ کے مطابق (جو وقت مقرر ہو عین اسی وقت) لیتا ہے لیکن کسی کو کچھ دینا ہو تو مہینوں تاخیر کرتا ہے“۔ حالانکہ اپنی طلب کا وعدہ کے مطابق لینا کوئی بری بات نہیں ہے، لیکن ان دونوں کے تقابل کا جائزہ لینے کے نتیجے میں بری بات ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ حق لینے کے معاملہ میں گفتگو کیل کے بارے میں ہے لیکن دینے کے معاملہ میں گفتگو کیل و وزن دونوں کے حوالے سے ہے۔ تعبیر کا یہ فرق ہو سکتا ہے کہ، ذیل کی دو وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر ہو:-

پہلی وجہ یہ کہ خریدار عام طور پر پہلے زمانے میں کیل سے استفادہ کرتے تھے اس لئے کہ بڑی ترازو جو زیادہ وزن تول سکے اس زمانے میں موجود لیکن بڑے پیمانہ آسانی سے مل سکتے تھے۔

(”کر“ کے بارے میں بھی علماء نے کہا کہ یہ لفظ اصل میں ایک بڑے پیمانہ کا نام ہے) بچتے وقت وہ تھوک کا کاروبار کیل سے کرتے تھے اور وزن کے ذریعہ خوردہ فروشی کرتے تھے۔

دوسرے یہ حق لینے کے وقت پیمانے سے زیادہ استفادہ مناسب ہے کیونکہ اس میں دھوکہ کا امکان بہت کم ہے، لیکن کم تولنے کے لئے وزن کا ذریعہ زیادہ مفید ہوتا ہے اس لئے کہ اس میں دھوکہ دینے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات اگرچہ صرف کیل و وزن کے حوالے سے کم تولنے کی بات کرتی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے اور اس کا اطلاق کم تولنے کے سلسلہ میں ان چیزوں پر بھی ہے جن کا لین دین گن کر ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بھی بعید نہیں کہ آیت اپنے مفہوم کی گہرائی کے اعتبار سے موعودہ خدمت میں کمی کرنے کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لے۔

مثال کے طور پر کوئی کاریگر یا مزدور اپنا کام صحیح طور پر مکمل نہیں کرتا تو وہ بھی مطففین کا مصداق ہے یعنی کم تولنے والوں کی صف میں ہے، جن کی یہ آیتیں سختی سے مذمت کر رہی ہیں۔

بعض مفسرین اس آیت کو اور زیادہ وسیع معانی کا حامل سمجھتے ہیں اور حدود خداوندی سے ہر قسم کا تجاوز اور اجتماعی و اخلاقی روابط میں کمی کو بھی اس کے مفہوم میں شامل سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اس آیت کے الفاظ سے ان معانی کا استفادہ واضح نہیں ہے، لیکن غیر مناسب بھی نہیں ہے۔

اس لئے مشہور صحابی رسول عبد اللہ بن مسعود سے منقول ہے کہ نماز میں ایک معقول پیمانہ ہے جو شخص اس کا کیل مکمل طور پر ادا کرے تو خدا اس کا اجر مکمل دے گا اور جو شخص اس میں کمی کرے تو اس کے بارے میں وہی کچھ جاری ہوگا جو خدا نے مطففین یعنی کم تولنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے۔^(۲)

اس کے بعد پروردگار عالم ایسے لوگوں کو تنبیہ یعنی استفہام تو نبی کے ذریعہ متنبہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”کیا وہ باور نہیں کرتے کہ قبروں سے اٹھائے جائیں“ ﴿الَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنھُمْ مَبْعُوْثُوْنَ﴾۔

”عظیم دن“ ﴿لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ﴾۔ وہ دن جس کا حساب عذاب اور اس کی ہولناکی اور سب عظیم ہیں۔ ”وہ دن جب لوگ

قبروں سے اٹھیں گے اور رب العالمین کے بارہ گاہ میں حاضر ہوں گے“۔ ﴿یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾۔

یعنی وہ اگر قیامت کو باور کرتے اور جانتے کہ حساب کتاب ہونا ہے اور تمام اعمال ایک عظیم عدالت میں محاکمہ کے لئے پیش ہوں گے جس شخص نے سوئی کی نوک کے برابر اچھایا یا برا کام کیا ہے اس کا نتیجہ وہ اس عظیم دن دیکھے گا، پھر وہ

کبھی اس قسم کا ظلم و ستم نہ کرتے اور لوگوں کے حقوق پامال نہ کرتے۔ بہت سے مفسرین ”لظن“ کو جو ظن کے مادہ سے ہے یہاں یقین کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ اس تعبیر نظر قرآن مجید میں موجود ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۹ ﴿قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مَّلَاقُوا اللَّهَ كَم مِّنْ فِتْنَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِتْنَةُ كَثِيرَةٍ ۖ بَاذَنَ اللَّهُ﴾ جو مانتے تھے کہ خدا سے ملاقات کریں گے (اور وہ قیامت کے دن پر بھروسہ رکھتے تھے) ”انہوں نے کہا کہ چھوٹے گروہ تھے جو حکم خدا سے بڑے گروہ کے مقابلہ میں کامیاب ہوئے“ (توجہ رکھیں کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے ایک گروہ کے بارے میں ہے جس نے ایمان و استقامت کا مختلف مراحل میں مظاہرہ کیا تھا۔

اس بات کی شاہد و ناطق وہ حدیث ہے جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے آیہ ﴿الْإِظْنُ أَوْلَنُكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ کی تفسیر میں فرمایا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ﴿الْيَسَّ يَوْفَنُونَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ﴾؟ کیا انہیں یقین نہیں ہے کہ وہ قبروں سے اٹھیں گے؟^(۵)

انہی حضرت سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ظن کی دو قسمیں ہیں، ظن تردید اور ظن یقین۔ جو قرآن میں معاد اور قیامت کے بارے میں آیا ہے وہ ظن یقین ہے اور جو کچھ دنیا کے بارے میں آیا ہے وہ ظن شک ہے۔^(۶)

ایک جماعت کی طرف سے یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ ظن سے یہاں مراد موجودہ دور کے مشہور معانی گمان کئے گئے ہیں جو اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کی جان اور روح میں قیامت کی طرف توجہ کرنا اس طرح اثر کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کا گمان بھی کرتا ہو اور اس کو ایک دن کا احتمال بھی ہو تو وہ برے کاموں سے اجتناب کرے چہ جائیکہ اس کا یقین رکھتا ہو۔ یہ وہی چیز ہے جو علماء کے درمیان دفع غرر مظنون یا دفع ضرر محتمل کے عنوان سے مشہور ہے۔

اب اس بات کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ بے پرواہ اور بے باک گناہگار نہ صرف یہ کہ قیامت کا یقین نہیں رکھتے، بلکہ اس کا گمان بھی نہیں رکھتے، لیکن پہلی تفسیر، ان وجوہ کی بنا پر، جو بیان کی گئی ہیں مقدم ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ لفظ ظن راغب کے مفردات کی رو سے اصل میں اس حالت کا نام ہے جو چند قرائن کے ہونے کی وجہ سے فکر انسانی کو حاصل ہوتی ہے اگر نشانیاں قوی ہوں تو علم و یقین لے آتی ہے اور اگر نشانیاں کمزور ہوں تو پھر وہ گمان کی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔^(۶)

اس بنا پر مذکورہ لفظ، اس کے برخلاف جو ہمارے زمانہ میں مشہور ہے، وسیع، مفہوم رکھتا ہے جس میں علم اور گمان دونوں شامل ہیں اور دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱، ص ۸۸۔

۲۔ اصول کافی مطابق نقل نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۲۷۔

۳۔ یہاں علی الناس کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ لوگوں پر وہ کوئی حق رکھتے ہیں اور تقدیر اذاکا لواء علی الناس تھی اور اصولاً ”کال علیہ“ وہاں کہا جاتا ہے جہاں کیل کا مقصد حق لینا ہوتا ہے باقی رہا ”کالہ“ اور ”کال لہ“ اس جگہ سے مربوط ہے جہاں

۴۔ مجمع البیان جلد ۱۰ صفحہ ۲۵۲

۵۔ تفسیر برہان، جلد ۴، ص ۳۸۔

۶۔ نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۲۸۔

۷۔ مفردات، مادہ ظن۔

کم تولنا فساد فی الارض کا ایک سبب ہے

قرآن مجید کی آیات میں کئی مرتبہ کم تولنے کی مذمت کی گئی۔ کبھی حضرت شعیب کے واقعہ میں جہاں وہ قوم کو خطاب کر کے کہتے ہیں

﴿اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ وَزِنُوا بِالْقِسْطِ الْمُسْتَقِيمِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مَفْسَدِينَ﴾

”پیمانے کے حق کو ادا کرو اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ وزن صحیح ترازو میں کرو اور لوگوں کے حق میں کمی نہ کرو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔“ (شعراء۔ ۱۸۱ تا ۱۸۳)۔

اس طرح وزن کرتے وقت اور چیز کو پیمانے سے ناپتے وقت تولنے کو اور انصاف کو نظر انداز کرنے کو فساد فی الارض بتایا گیا ہے اور یہ کام اجتماعی مفاسد میں سے ایک ہے۔

سورہ رحمن کی آیت ۸/۷ میں وزن کرتے وقت انصاف سے کام لینے کو عالم ہستی کے نظام تخلیق میں عدالت کا فرما ہے، اس کے برابر قرار دیا گیا ہے، فرماتا ہے:

﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۚ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ﴾ ”خدا نے آسمان کو بلند کیا اور ہر چیز میں میزان و حساب رکھا تاکہ تم وزن و حساب میں طغیان و سرکشی سے کام نہ لو۔“

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ناپ تول میں عدل کی رعایت کا مسئلہ کم اہم نہیں ہے بلکہ حقیقت میں اصل عدالت ہے اور سارے نظام ہستی پر حاکم نظم کلی ک ایک جز ہے۔

اسی بنا پر عظیم آئمہ اسلام نے اس مسئلہ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے، یہاں تک کہ اصبح بن نباتہ کی مشہور روایت میں آیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی علیہ السلام سے سنا کہ آپ منبر پر فرما رہے تھے:

(یا معاشر التجار! الفقہ ثم المتجر) اے گروہ تجار پہلے فقہ کی تعلیم حاصل کرو اس کے بعد تجارت کرو۔“ اس بات کی امام نے تین بار تکرار کی اور اس کلام کے آخر میں فرمایا:

﴿التَّاجِرُ وَالْفَاجِرُ فِي النَّارِ ۖ إِلَّا مَنْ أَخَذَ الْحَقَّ وَاعْطَى الْحَقَّ﴾ ”تجارت کمرنے والا فاجر ہے اور فاجر دوزخی ہے

سوائے اس کے جو صرف اپنا حق لوگوں سے لے اور لوگوں کا حق ادا کرے۔“ (۱)

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جس وقت امیر المومنین علی علیہ السلام کوفہ میں تھے تو آپ ہر روز صبح کے وقت کوفہ کے بازاروں میں آتے اور ایک ایک بازار میں گشت کرتے اور تازیانہ آپ کے کاندھے پر ہوتا ہر بازار کے وسط میں کھڑے ہو جاتے اور بلند آواز سے کہتے اے گروہ تجار! خدا سے ڈرو۔

جس وقت حضرت علی علیہ السلام کی پکار کو سنتے جو کچھ تاجروں کے ہاتھوں میں ہوتا رکھ دیتے اور پورے خلوص کے ساتھ آپ کی باتوں کو سنتے۔ اس کے بعد آپ فرماتے:

قدموا الاستخارة وتبرکوا بالسهولة و اقتربوا من المتعاین و تزينوا بالحلم و تناهوا عن اليمين وجانبوا الكذب وتحافوا عن الظلم و انصفوا المظلومين ولا تقربوا الربا و اوفوا الكيل و الميزان ولا تبخسوا الناس اشياء هم و لاتعتثوا فى الارض مفسدين)

”خدا سے خیر طلب کرو اور لوگوں کے ساتھ معاملہ آسان کر کے برکت چاہو اور خریداروں کے پاس جاؤ، حلم و بردباری کو اپنی زینت قرار دو، قسم کھانے سے پرہیز کرو، جھوٹ بولنے سے اجتناب کرو، ظلم سے بچو اور مظلوموں کا حق ظالموں سے لے کر دو، سود کے قریب نہ جاؤ، پیمانے اور وزن کے معاملہ میں پورے پورے انصاف سے کام لو، لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اور زمین میں باعث فساد نہ بنا کرو۔

اس طرح کہ آپ کوفہ کے بازاروں میں گردش کرتے، اس کے بعد دار الامارۃ کی طرف پلٹ آتے اور لوگوں کی داد خواہی اور ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے بیٹھ جاتے۔ (۲)

اور جیسا کہ ان آیات کی شان نزول میں بھی آیا ہے کہ پیغمبر اکرم فرماتے ہیں: ”جو گروہ کم تولے گا خدا اس کی زراعت اس سے چھین لے گا اور اسے قحط سالی میں مبتلا کر دے گا، جو کچھ اوپر کہا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گزشتہ اقوال کی بربادی اور ان پر عذاب نازل ہونے کے عامل یہ ہے کہ وہ کم تولتے تھے۔ ان کا یہ اقدام ان کی اقتصادی بد حالی اور نزول عذاب خدا کا سبب بنا۔

یہاں تک اسلامی روایت میں آداب تجارت کے سلسلہ میں آیا ہے کہ مومنین کم لئے بہتر ہے کہ پیمانے بھرتے اور وزن کرتے وقت زیادہ دیں اور لیتے وقت اپنا حق کچھ کم لیں ﴿ان لوگوں کے کام کے بالکل برعکس جن کی طرف مندرجہ بالا آیات میں اشارہ ہوا ہے کہ وہ اپنا حق تو پورا پورا وصول کرتے تھے لیکن دوسروں کا حق کم دیتے تھے﴾ (۳)

دوسرے، جیسا کہ ہم نے اوپر والی آیت کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے کم تولنے کا مسئلہ بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق وسیع معانی کا حامل ہے، جو ہر قسم کے اجتماعی و انفرادی اور خدا سے تعلق رکھنے والی ذمہ داریوں کے انجام دینے کے سلسلہ میں کمی ہو سکتی ہے، اس کو بھی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

۱۔ کافی، جلد ۵، باب آداب التجارة حدیث ۱۔

۲۔ کافی، باب آداب التجارة حدیث ۳ (تھوڑے سے اختصار کے ساتھ)

۳۔ وسائل الشیخ، جلد ۱۲، ابواب التجارة باب ۷، ص ۲۹۰ سے رجوع فرمائیے۔

آیات ۷، ۸، ۹، ۱۰

۷۔ ﴿كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفَجَّرِ لَفِي سَجِّينٍ﴾۔

۸۔ ﴿وَمَا اَدْرَاكَ مَا سَجِّينٌ﴾۔

۹۔ ﴿كُتِبَ مَرْقُومٌ﴾۔

۱۰۔ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ﴾۔

ترجمہ

۷۔ اس طرح نہیں ہے (جیسا کہ وہ قیامت کے بارے میں خیال کرتے ہیں) یقیناً فاجروں کا نامہ اعمال سَجِّین میں ہے

۸۔ تو کیا جانے سَجِّین کیا ہے؟

۹۔ رقم زدہ نامہ اور سرنوشت ہے۔

۱۰۔ والے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں پر۔

تو کیا جانے سَجِّین کیا ہے؟

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں کم تولنے والوں کے بارے میں اور قیامت کے دن کے بارے میں گناہ اور ایمانِ راسخ نہ ہونے کے رابطہ کے سلسلہ میں آئی تھی، ان آیتوں میں اس روز بدکاروں اور فاجروں کا جو حال ہوگا، اس کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، پہلے فرماتا ہے:

”اس طرح نہیں جیسا وہ قیامت کے بارے میں خیال کرتے ہیں کہ حساب و کتاب نہیں ہوگا بلکہ فاجروں کا نامہ اعمال سَجِّین میں ہے“ ﴿كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفَجَارِ لَفِي سَجِّينٍ﴾۔ ”تو کیا جانے سَجِّین کیا ہے“۔ ﴿وَمَا اَدْرَاكَ مَا سَجِّينٌ﴾ ایک مہر زدہ تحریر اور نامہ ہے“ (کتاب مرقوم)۔

ان آیات کے سلسلہ میں دو عمدہ نظریے ہیں:

۱۔ کتاب سے مراد انسان کا وہی اعمال نامہ ہے۔ کوئی چھوٹا یا بڑا ایسا کام نہیں ہے جس کا اس میں شمار نہ کیا گیا ہو۔ تمام باتیں بے کم و کاست اس میں درج ہیں۔

اور سَجِّین سے مراد ایک جامع کتاب ہے جس میں تمام انسانوں کے نامہ ہائے اعمال جمع کئے گئے ہیں۔

سادہ اور عام تعبیروں میں وہ ایک ایسے مکمل رجسٹر کے مانند ہے جس میں ہر ایک قرض خواہ مقروض کا حساب علیحدہ اور مستقل صفحہ پر تحریر ہے۔

البتہ ان آیات اور بعد کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام بدکاروں کے اعمال سچین نامی کتاب میں ہیں اور تمام نیک افراد کے اعمال ایک دوسری کتاب میں درج ہیں، جس کا نام علیین ہے۔

”سچین“ سچن کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی زندان کئے ہیں۔ اس کے مختلف معانی ہیں۔ سخت و شدید زندان، محکم موجود، قعر جہنم میں ایک بہت ہی ہولناک وادی، وہ جگہ جہاں بدکاروں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں، اور جہنم کی آگ۔^(۱)

طریحی مجمع البحرین میں سچن کے مادہ کے بارے میں کہتا ہے:

و فی التفسیر ہو کتاب جامع دیوان الشر دَوَّنَ اللہ فیہ اعمال الکفرۃ و الفسقۃ من الجن و الجنس)

تفسیر میں آیا ہے کہ سچین ایک کتاب ہے جو برائیوں کے دیوان کا جامع ہے جس میں خدا نے جن و انس میں سے کافروں اور فاسقوں کے اعمال کو مدون کیا ہے طریحی نے واضح نہیں کیا کہ اس تفسیر سے مراد کونسی تفسیر ہے، آیا معصوم سے منقول ہے یا کسی غیر سے۔

جو قرائن ان معانی کی تائید کرتے ہیں وہ درج ذیل سے عبارت ہیں

ایک قرآن مجید میں اس قسم کے موقع پر کتاب کی تعبیر عام طور پر نامہ اعمال کے معنوں میں ہے۔

۲۔ آخری آیت جو سچین کی تفسیر کی شکل میں بیان ہوئی ہے کہتی ہے: ”وہ کتاب ہے جو مہر زدہ اور یہ جو بعض نے آیات کو سچین کی تفسیر کے طور پر قبول نہیں کیا، یقیناً ظاہر کے برخلاف ہے۔

۳۔ بعض نے کہا کہ سچین اور سجیل کے ایک ہی معنی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ سَجَل (سین اور جیم کے زیر اور لام پر تشدید کے ساتھ) بہت بڑی کتاب کے معنی میں ہے۔^(۲)

۴۔ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال چند کتابوں میں منضبط ہوتے ہیں، تاکہ حساب کے وقت کسی قسم کا عذر یا بہانہ کسی شخص کے لئے باقی نہ رہے۔

ایک شخصی اعمال نامے ہیں جو قیامت میں متعلقہ افراد کے ہاتھوں میں دئے جائیں گے۔ نیکو کاروں کو دلائل ہاتھ میں اور بدکاروں کا بائیں ہاتھ میں۔ آیات قرآنی میں اس کی طرف بہت اشارہ ہوا ہے۔

دوسری کتاب وہ ہے جسے امتوں کے نامہ اعمال کا نام دیا جاسکتا ہے، جس کی طرف وہ سورہ جاثیہ کی آیت ۲۸ میں اشارہ ہوا ہے۔ ﴿کُلُّ اُمَّةٍ تَدْعٰی اِلٰی کِتَابِهَا﴾ ”قیام کے دن ہر امت کو اس کے نامہ اعمال کی طرف پکارا جائے گا۔

تیسری اعمال نامہ عمومی ہے۔ وہ تمام نیکو کاروں اور بدکاروں کا نامہ اعمال ہے جس کا زیر بحث آیات اور آنے والی آیات میں سچین اور علیین کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس تفسیر کے مطابق سچین وہی دیوان کل ہے جس میں تمام بدکاروں کے نامہ اعمال جمع ہوں گے۔ اس کو سچین اس لئے کہا گیا کہ اس دیوان کے مشتملات ان کے جہنم میں زندانی اور مقید ہونے کا سبب ہوں گے نیکو کاروں کی کتاب کے برعکس جو اعلیٰ علیین بہشت میں ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ سچین اسی مشہور و معروف معنی، یعنی دوزخ کے لئے استعمال ہوا ہے جو تمام بدکاروں کے لئے بہت بڑا زندان ہے، یا دوزخ میں ایک سخت جگہ ہے۔

اور کتاب فجار سے مراد وہی سرنوشت ہے، جو ان کے لئے تحریر ہوئی ہے اس بنا پر اس آیت میں معنی یہ ہوں گے ”مقرر و مسلم سرنوشت بدکاروں کی جہنم میں ہے“۔

اور لفظ کتاب کے استعمال قرآن میں اسی معنی میں بہت مقامات پر ہیں۔ مثلاً سورہ نساء کی آیت ۲۴، بعد اس کے فرماتا ہے:

”شوہر دار عورتیں تم پر حرام ہیں“ مزید کہتا ہے:

﴿کِتَابَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ﴾ یہ حکم (اور اس سے پہلے کے احکام) ایسے ہیں جو خدا نے تمہارے لئے مقرر کر دیئے ہیں۔“

اور سورہ انفال کی آیت ۷۵ میں ہم پڑھتے ہیں:

﴿وَاُولٰٓئِہٖ اِلَاحِرَامٌ بَعْضُہُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِی کِتَابِ اللّٰہِ﴾

”رشتہ دار ایک دوسرے کی بہ نسبت ان احکام میں، جو خدا کے لئے مقرر کئے ہیں، (دوسروں سے) زیادہ سزاوار اور

حق دار ہیں۔“

وہ مطلب جو اس آیت کی تائید کرتا ہے، یہ کہ سچین اپنے اسی معنی میں ہیں جو اخبار و آثار اسلامی میں بیان ہوا ہے، یعنی اس کی تفسیر جہنم کی گئی ہے۔

تفسیر علی ابن ابراہیم میں آیا ہے کہ ”انّ کتاب الفجار لفی سجن“ کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ان کے لئے عذاب مقرر کیا گیا ہے وہ سجن (دوزخ) میں ہے۔

ایک حدیث امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ (السجن الارض السابعة و علیون السماء السابعة) سجن ساتویں زمین اور علیین ساتواں آسمان ہے (سب سے نچلی اور سب سے اوپر والی جگہ کی طرف اشارہ ہے۔^(۱)) متعدد روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعمال جو قرب خدا کے لائق نہیں ہیں ساقط ہو جائیں گے اور سجن میں قرار پائیں گے، جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے:

ان الملك لیصعد بعمل العبد مبتہجاً فاذا صعد بحسناته یقول اللہ عز وجل اجعلوها فی سجن انہ لیس ایای اراد فیہا۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ بندہ کے عمل کو خوشی خوشی آسمان کی طرف لے جاتا ہے تو خداوند عزوجل فرماتا ہے اسے سجن میں قرار دو، اس لئے کہ اس کا مقصد میری رضا نہیں تھا۔

ان تمام روایات کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سجن جہنم میں ایک بہت ہی پست جگہ ہے جس میں بدکاروں کے اعمال یا نامہ اعمال رکھے جائیں گے۔

یا ان کی سرنوشت یہ ہے کہ وہ اس زندان میں گرفتار رہیں گے۔ اس تفسیر کے مطابق (کتاب مرقوم) کا جملہ تاکید ہے ”ان کتاب الفجار لفی سجن“ کے جملے کی (نہ یہ کہ سجن کی تفسیر ہے) یعنی یہ ان کے لئے لکھی ہوئی حتمی اور قطعی سزا ہے۔

”مرقوم“ رقم (بروزن زخم) واضح خط (تحریر) کے معنی میں ہے اور چونکہ خطوط یا تحریریں ابہام سے خالی ہوتی ہیں لہذا ممکن ہے کہ یہ تعبیر ابہام سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہو، وہ چیز جو نہ کبھی محو ہوتی ہے نہ فراموش ہوگی۔ یہ دونوں تفسیریں بھی صحیح ہو سکتی ہیں اس لئے کہ پہلی تفسیر میں سجن بدکاروں کے کل اعمال کے دیوان کے معنی میں ہے اور دوسری تفسیر میں دوزخ کی گہرائی اور گڑھے کے معنوں میں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔

یعنی جس وقت انسان کا نامہ اعمال بدکاروں کے کل اعمال کا دیوان قرار دیا گیا تو یہی سبب بنے گا کہ اسے پست ترین مقام یعنی دوزخ کے گڑھے میں کھینچ کر لے جائیں گے۔

آخری اور زیر بحث آیت میں ایک دل ہلادینے والے جملے سے منکرین معاد قیامت کی منحوس عاقبت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں پر“ ﴿وَبَلَّ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ﴾۔

وہ تکذیب جو انواع و اقسام کے گناہوں کا سرچشمہ ہے، جن میں سے ایک کم تولنا ہے۔
پہلی آیت میں فرماتا ہے:

﴿وَبَلَّ لِلْمُطَفِّفِينَ﴾ اور یہاں فرماتا ہے: ﴿وَبَلَّ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ﴾، وہ تعبیر جو مختصر ہونے کے باوجود انواع اقسام کے دردناک عذابوں اور ہولناک مصائب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

قابل توجہ یہ کہ پہلی آیت میں گفتگو کم تولنے والوں کے بارے میں ہے اس کے بعد بدکاروں کی بات ہے، اور آخری آیت میں منکرین قیامت کا ذکر ہے اور اچھی طرح بتاتا ہے کہ اس اعتقاد اور ان اعمال کے درمیان قریبی رابطہ ہے جو آنے والی آیات میں زیادہ واضح طور پر منعکس ہوا ہے۔

۱۔ لسان العرب، مادہ سجن۔

۲۔ روح المعانی جلد ۳۰، ص ۷۰ اور مجمع البحرین مادہ سجن۔

۳۔ نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۳۰ حدیث ۱۵۔

آیات ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷

- ۱۱۔ ﴿الَّذِينَ يَكْذِبُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ﴾ -
- ۱۲۔ ﴿وَمَا يَكْذِبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ وَاثِمٍ﴾ -
- ۱۳۔ ﴿إِذَا تَتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ -
- ۱۴۔ ﴿كَأَلَّا بَل رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ -
- ۱۵۔ ﴿كَأَلَّا أَنَّهُمْ عَنْ رَحْمٍ يَوْمَئِذٍ لِّمُحْجُوبُونَ﴾ -
- ۱۶۔ ﴿ثُمَّ أَنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ﴾ -
- ۱۷۔ ﴿ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ﴾ -

ترجمہ

- ۱۱۔ وہی جو قیامت کے دن کا انکار کرتے ہیں۔
- ۱۲۔ صرف وہی لوگ اس کا انکار کرتے ہیں جو گناہگار اور تجاوز کرنے والے ہیں۔
- ۱۳۔ وہی شخص کہ جب اسے ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ گزشتہ لوگوں کے افسانے ہیں۔
- ۱۴۔ اس طرح نہیں جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں بلکہ ان کے اعمال ان کے دلوں پر زنگ کی طرح ہیں۔
- ۱۵۔ ایسا نہیں جیسا وہ خیال کرتے ہیں بلکہ وہ اس دن اپنے پروردگار سے محبوب ہوں گے۔
- ۱۶۔ اس کے بعد وہ یقیناً جہنم میں وارد ہوں گے۔
- ۱۷۔ پھر ان سے کہا جائے گا یہ وہی چیز ہے جس کی تم تکذیب کرتے تھے۔

گناہ دلوں کا زنگ ہے

گزشتہ آیات کی آخری آیت مکذبین اور جھٹلانے والوں کی منحوس سرنوشت کی طرف واضح اشارہ تھا۔ زیر بحث آیات سے پہلے ان افراد کا تعارف کراتی ہیں اور کہتی ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جو روز جزا کا انکار کرتے ہیں ﴿الَّذِينَ يَكْذِبُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ﴾ - اور اس کے بعد مزید کہتا ہے:

”صرف وہ لوگ جو روز جزا کی تکذیب کرتے ہیں جو متجاوز اور گناہگار ہیں“ ﴿وَمَا يَكْذِبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ وَاثِمٍ﴾ - یعنی انکار قیامت کا اصلی سبب منطق، استدلال اور تفکر نہیں ہے، بلکہ جو افراد چاہتے ہیں کہ زیادتیاں کمرتے رہیں اور گناہ

کرتے رہیں وہ قیامت کا انکار کر دیتے ہیں۔ (توجہ فرمائیں کہ اٹیم صفت مشبہ ہے جو استمرار اور گناہ کو رکھنے پر دلالت کرتی ہے)۔

وہ چاہتے ہیں کہ کسی قسم کے احساس ذمہ داری کے بغیر اپنے گمان کے مطابق انتہائی آزادی کے ساتھ اور ہر قسم کے دباو اور ذہنی پریشانی کے بغیر اپنی برائیوں اور قباحتوں کو جاری رکھیں اور کسی قانون کو قانون نہ سمجھیں۔

یہ چیز اس چیز کے مانند ہے جو سورہ قیامت کی آیت پانچ میں آئی ہے ﴿بل یرید الانسان لیفجر امامہ﴾ ”بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اپنی آئندہ عمر میں مسلسل فسق و فجور کی راہ اختیار کئے رہے“، اس لئے وہ قیامت کی تکذیب کرتا ہے۔ بعد والی آیات میں قیامت کا انکار کرنے والوں کی تیسری صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

”جب ہماری آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں: ’یہ گزشتہ لوگوں کے بے بنیاد مطالب اور افسانے ہیں‘۔ ﴿اذا تتلىٰ علیه آياتنا قال اساطیر الاولین﴾۔

یہ لوگ علاوہ اس کے کہ تجاوز کرنے والے (متعدد) اور گناہ گار ہیں، آیات الہی کا مذاق اڑاتے ہیں، انہیں کہانیاں اور موبہوم قصے بتاتے ہیں، ایسے قصے کو انسان کے نادانی کے زمانے کی یادگار ہیں۔^(۱)

اور اس بہانے سے چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو ان آیات کی سماعت سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس سے بچالیں۔ نہ صرف اس سورہ میں بلکہ قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ جسارت کرنے والے مجرم دعوتِ خدا وندی سے منحرف ہونے کا یہی بہانہ کرتے تھے۔

قرآن مجید کی نو آیتوں میں یہی مضمون واضح کیا گیا ہے کہ مشرکین قرآن مجید کی آیتوں کے مقابلہ میں اسی بہانہ سے کام لیتے تھے ﴿قالوا اساطیر الاولین اکتبھا فھی تملىٰ علیه بکرۃ و اصیلاً﴾ ”انہوں نے کہا یہ قرآن گزشتہ لوگوں کے

افسانوں اور قصے کہانیوں کا مجموعہ ہے، جسے اس نے لکھا ہے اور صبح و شام اسے لکھا یا جاتا ہے“۔ (فرقان-۵)۔ سورہ احقاف کی آیت ۱۷ میں ایک سرکش جوان کی زبانی جو اپنے مہربان اور مومن ماں باپ کے مقابلہ پر کھڑا ہو جاتا ہے ہم اس طرح سنتے ہیں کہ اپنے ماں باپ کی تمام نصیحتوں کا یہ کہہ کر مذاق اڑاتا ہے کہ ﴿ما هذا اساطیر الاولین﴾ یہ باتیں جو کرتے ہو گزشتہ لوگوں کی بے بنیاد باتوں اور افسانوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

بعض مفسرین نے کہا کہ زیر بحث آیت نضر بن حارث بن کلدہ، پیغمبر اسلام کی خالہ کے بیٹے کے بارے میں، جو کفر و ضلالت کے سرغنوں میں سے تھا، نازل ہوئی ہے۔

لیکن واضح رہے کہ آیت کا نزول کسی خاص مورد اس سے مانع نہیں کہ دوسروں کے بارے میں بھی صادق آئے، بہر حال سرکش لوگ وجدان کی تنبیہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے اور حق پسند لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کے لئے ہمیشہ فضول قسم کے بہانے بناتے رہتے ہیں تاکہ خود اس طرح سکون حاصل کریں۔

تعب کی بات یہ ہے کہ وہ عام طور پر ایک ہی انداز سے بات کرتے تھے گویا تاریخ کے طویل دور میں ایک دوسرے کے کان میں کہہ جاتے تھے سحر، کہانت جنون اور افسانہ وغیرہ۔ لیکن قرآن اس کے بعد آنے والی آیت میں ایک مرتبہ پھر ان کی سرکشی کے اصل سبب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے:

ایسا نہیں جیسا وہ خیال کرتے ہیں، بلکہ ان کے برے اعمال ان کے دل پر زنگ بن کر لگے ہوئے ہیں اور وہ حقیقت کے ادراک سے محروم ہو گئے ہیں۔ ﴿کَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾۔ عجیب دل ہلا دینے والی تعبیر ہے ان کے اعمال نے ان کے دلوں پر زنگ لگا دیا ہے اور وہ نور جو خدا دادِ قطرت کی بنا پر تھا سلب کر لیا ہے، اس وجہ سے حقیقت کا چہرہ جو آفتابِ عالم تاب کی درخشاں ہے ان کے دلوں پر ہرگز روشنی نہیں ڈالتا اور نورِ وحی کا پر تو منعکس نہیں ہوتا۔

”ران“۔ ”رین“ (بروزن عین) کے مادہ سے، جیسا کہ راغب نے کہا ہے، وہی زنگ ہے جو قیمتی چیزوں کو لگ جاتا ہے۔ اور بعض دوسرے ارباب لغت کے بقول سرخ رنگ کا چھلکا ہے جو ہوا کی رطوبت کے زیر اثر لوہے اور دوسری اسی قسم کی چیزوں پر چپک جاتا ہے جسے فارسی میں زنگ یا زنگار کہتے ہیں اور عام طور پر وہ اسی دھات کے پرانے اور بوسیدہ ہونے کی نشانی ہے اور طبعی طور پر اس کی شفاعت اور درخشندگی کے ختم ہونے کی علامت ہے۔

کبھی اس لفظ کی ایک چیز سے دوسری چیز پر غلبہ حاصل کرنے، یا کسی چیز میں اس طرح گرنے سے جس سے بچا نہ جا سکے، تفسیر کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ سب چیزیں ان اصلی معانی کا لازمہ ہیں۔^(۲)

دل کی نورانیت کو ختم کرنے کے سلسلہ میں گناہ کے تباہ کن اثرات پر ہم بحث کریں گے جسے نکات کے عنوان کے ماتحت ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

اس سے اگلی آیت میں فرماتا ہے: ”ایسا نہیں ہے جیسا وہ خیال کرتے ہیں بلکہ اس دن وہ اپنے پروردگار سے محبوب ہوں گے“۔ ﴿کَلَّا اَنَّهُمْ عَنِ رَحْمٍ یَوْمَئِذٍ لَّحُجُوبُونَ﴾۔ اور یہ کہ ان کی زیادہ دردناک سزا ہے۔ یہ اس بالاتر اور زیادہ لذت

بخش نعمت کا بالکل تضاد ہے جو نیک لوگوں کو پروردگار عالم کی معنوی ملاقات اور اس کی بارگاہِ قرب میں حضور سے حاصل ہوگا۔

کلا عام طور پر اس بات کی نفی کے لئے آتا ہے جو پہلے سے بیان شدہ ہو اور یہاں مفسیرین نے کئی احتمال تجویز کئے ہیں۔ پہلا یہ کہ کلا اس کی تاکید ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے یعنی اس طرح نہیں ہے کہ جس طرح انہوں نے قیامت کے دن کا افسانے اور کہانی کے طور پر تعارف کرایا ہے۔

یہ کہ اس طرح نہیں کہ وہ زنگ جو ان کے دلوں پر لگ چکا ہے وہ اتر جائے۔ وہ اس جہان میں جمال حق کے مشاہدہ سے محروم ہیں اور دوسرے جہان میں بھی۔

یہ کہ جس طرح قرآن کی دوسری آیات میں آیا ہے کہ وہ مدعی تھے کہ اگر بالفرض قیامت ہو بھی، تب بھی وہ خدا کی انواع و اقسام کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں گے۔^(۳)

اس طرح نہیں جس طرح وہ خیال کرتے ہیں بلکہ وہ شدید ترین عذابوں اور سخت ترین شکنجوں میں گرفتار ہوں گے۔ جی ہاں! آخرت انسان کے اس دنیا کے اعمال کا عکس اور عظیم تجسم ہے۔ وہ لوگ جو یہاں مشاہدہ حق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ان کے اعمال زنگ بن کر ان کے دلوں پر لگے ہوئے ہیں، وہاں بھی پروردگار سے محبوب ہوں گے اور جمال حق کے مشاہدہ کی طاقت ان میں نہیں ہوگی اور محبوب حقیقی کے لقائے معنوی سے محروم رہیں گے۔

اس کے بعد وہ یقیناً جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے ﴿ثُمَّ اَنھُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ﴾۔ یہ جہنم میں ورود پروردگار سے محبوب ہونے کا نتیجہ ہے اور ایک اثر ہے جو اس سے جدا نہیں ہے اور بحیثیتِ مسلم دیدار حق سے محرومیت کی آگ جہنم سے بھی زیادہ جلانے والی ہے۔ اور آخری آیت میں فرماتا ہے:

”پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جس کی تم تکذیب کرتے تھے“ ﴿ثُمَّ یَقَالُ ھٰذَا الَّذِیْ کُنْتُمْ بِہِ تَکْذِبُوْنَ﴾۔ یہ بات ان سے بطور توبیخ و ملامت و سرزنش کہی جائے گی اور یہ اس بیوقوف اور ہٹ دھرم گروہ کے لئے ایک روحانی عذاب ہے۔

۱۔ ”اساطیر“، ”اسطوره“ کی جمع ”سطر“ کے مادہ سے عام طور پر موبہوم قصوں اور جھوٹی باتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے

۲۔ تفسیر رازی در ذیل آیہ زیر بحث اور المنجد مادہ رین کی طرف رجوع فرمائیں۔

۳۔ سورہ کہف کی آیت ۳۶ میں آیا ہے (وما اظن الساعة قائمة و لن رددت الی ربی لاجدن خیراً منها منقلباً) میں بالکل باور نہیں کرتا کہ قیامت برپا ہوگی اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹوں بھی اور قیامت بھی ہو، پھر بھی اس جگہ سے بہتر جگہ وہاں پاؤں گا (ان معانی کی نظر سورہ فصلت کی آیت ۵۰ میں بھی آئی ہے)۔

۱۔ دل کے لئے گناہ کیوں زنگ ہے

نہ صرف اس سورہ کی آیت میں دل کو تاریک کرنے پر گناہ کی تاثیر کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے بلکہ قرآن مجید کی بہت سی دوسری آیتوں میں بھی ان معانی کی کئی مرتبہ تکرار کی گئی ہے اور بری صراحت کے ساتھ انھیں قابل توجہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے:

﴿كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبٍ مُّتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ﴾ ”اسی طرح خدا ہر متکبر جبار اور سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے“ (مومن - ۳۵)۔ ایک دوسری جگہ ہٹ دھرم اور عناد رکھنے والے گناہگاروں کے گروہ کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَ عَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَ عَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾

”خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگادی اور اسی طرح ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے“۔ (بقرہ ۷)۔ اور سورہ حج کی آیت ۴۶ میں ہم پڑھتے ہیں: ﴿فَاَنهَا لَا تَعْمَىٰ الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَىٰ الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ ظاہری آنکھیں نابینا نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل ہے جو سینوں میں اندھے اور نابینا ہو جاتے ہیں۔

جی ہاں! گناہ اور اس کو جاری رکھنے کا بدترین اثر دل کا تاریک ہو جانا ہے اور نورِ عالم اور حس کا ختم ہونا ہے۔ گناہ اعضاء و جوارح سے سرزد ہوتے ہیں لیکن دل کو متاثر کرتے ہیں اور اسے غلیظ و متعفن کیچڑ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان راہ اور چاہ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتا اور عجیب و غریب شہادت کا شکار اور غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے جن سے ہر شخص حیران ہو جاتا ہے وہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارتا ہے اور اپنی خوشبختی کا سرمایہ ہر باد کر دیتا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے (کثرة الذنوب مفسدة للقلب) گناہوں کی فراوانی انسان کے دل کو تباہ کر دیتی ہے۔^(۱)

پیغمبر اسلام وکی ایک اور حدیث ہے (ان العبد اذا اذنب ذنبا نكتت في قلبه نكتة سوداء فان تاب و نزع و استغفر صقل قلبه و ان عاد ذات حتى تعلو قلبه فذلک الدين الذی ذکر الله فی القرآن ﴿كَلاَّ بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾

جس وقت بندہ گناہ کمرے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اگر توبہ کمرے اور گناہ سے دست بردار ہو جائے اور استغفار کرے تو اس کا دل صیقل ہو جاتا ہے اور اگر دوبارہ گناہ کی طرف پلٹے تو سیاہی بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کے پورے دل کو گھیر لیتی ہے اور یہ وہی زنگ ہے جس کی طرف اس آیت ﴿کَلَّا بَلْ اِرَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ﴾ میں اشارہ ہوا ہے۔^(۲)

یہی مفہوم امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی اصول کافی میں مختصر سے فرق کے ساتھ منقول ہے۔^(۳) نیز اسی اصولی کافی میں رسول خدا سے منقول ہے کہ (تذاکر وا و تلاقوا و تحدثوا فان الحديث جلاء للقلوب ان للقلوب لترین كما کما یرین السیف و جلاؤه الحديث)

مذاکرہ کرو اور ایک دوسرے ملاقات کرو اور (دین کے پیشواؤں کی) احادیث نقل کرو اس لئے کہ حدیث دلوں کی جلا کا سبب ہے۔ دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح تلوار کو زنگ لگ جاتا ہے اور قلوب کا صیقل حدیث ہے۔ ۴ اصول نفسیات کی رو سے بھی مفہوم ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کے اعمال کا ہمیشہ اس کی روح پر اثر ہوتا ہے اور وہ اعمال روح کو آہستہ آہستہ اپنی صورت پر لے آتے ہیں، یہاں تک کہ انسان کے سوچنے کے طریقہ اور فیصلہ کرنے کے انداز پر بھی اپنا اثر ڈالتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ انسان گناہ کو جاری رکھنے کے نتیجے میں رفتہ رفتہ روح کی تاریکی میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور ایسی منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کو اپنے گناہ حسنت نظر آتے ہیں یعنی اپنی برائیوں ہی کو اچھائیاں سمجھنے لگتا ہے۔ وہ بعض اوقات اپنے گناہ پر فخر کرتا ہے ایسی منزل پر پہنچ کر اس کے لئے واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا، یہ ایک خطرناک ترین حالت ہے جو ایک انسان کو پیش آتی ہے۔

۲۔ روح و جان کے چہرہ پر عذاب

گر بہت سے مفسرین نے کوشش کی ہے کہ آیت ﴿کَلَّا اَنھَم عَنْ رَّحْمٰی یَوْمَئِذٍ لَّحْجُوْا یٰوْنَ﴾ میں کسی چیز کو مقدر قرار دیں اور کہیں کہ یہ گناہ گار خدا کی رحمت سے محبوب ہوں گے یا اس کے احسان، کرامت اور ثواب سے محبوب ہوں گے، لیکن بظاہر آیت کسی تقدیر کی محتاج نہیں ہے۔

وہ واقعاً پروردگار سے محبوب ہوں گے جب کہ نیک اور پاک افراد قربِ خداوندی کی منزل پر فائز ہوں گے اور دیارِ محبوب اور اس کے شہودِ باطنی سے بہرہ مند ہوں گے۔

یہ بے ایمان اور گناہگار دوزخی ہیں جو اس فیضِ عظیم اور نعمتِ بے نظیر سے محروم ہیں۔ بعض پاک دل مومن اس جہان میں بھی اس دیدار سے فیضیاب ہوتے ہیں جبکہ کورِ دل مجرم اس جہان میں بھی اس فیض سے محروم ہوں گے۔ پاک دل ہمیشہ حضورِ خداوندی میں ہیں اور یہ بے بصیر تاریک دل اس سے دور ہیں۔

وہ اس کی مناجات سے اس قدر لذت حاصل کرتے ہیں جو کسی بیان کی محتاج نہیں ہے جبکہ یہ گناہگار اپنے گناہوں کی نحوست میں اس قدر غرق ہیں کہ ان کے لئے کوئی راہِ نجات نہیں ہے۔

تو کز سرائے طبیعت نمی روی بیرون کجا بکوائے حقیقت گزرتوانی کرد

جمال یار ندارد و حجاب و پردہ دے غبار راہ اشارہ نشان تا نظر توانی کرد

تو مادہ کے گھر سے باہر نہیں نکلتا تو پھر حقیقت کے کوچہ میں تیرا گزر کیسے ہو سکتا ہے۔ محبوب کے جمال پر کوئی پردہ نہیں ہے لیکن غبارِ راہ کو بھٹانا کہ تو دیکھ سکے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام مشہور دعائے کیل میں فرماتے ہیں: ہبنی صبرت علیٰ عذابک فکیف اصبر علیٰ فراقک (بالفرض اگر میں تیرے دردناک عذاب پر صبر کر بھی لو تو تیرے فراق پر کیسے صبر کروں گا۔

۱۔ در المنثور، جلد ۶ ص ۳۲۶۔

۲۔ در المنثور، جلد ۶ ص ۳۲۵۔

۳۔ نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۱ حدیث ۲۲، ۲۳۔

۴۔ نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۱ حدیث ۲۲، ۲۳۔

آیات ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸

- ۱۸۔ ﴿كَلَّا إِنَّ كُتُبَ الْبَارِّ لَفِي عَلَيْنَ﴾۔
 ۱۹۔ ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا عَلَيَّوْنَ﴾۔
 ۲۰۔ ﴿كُتُبُ الْمَرْقُومِ﴾۔
 ۲۱۔ ﴿يَشْهَدُ هَ الْمُقَرَّبُونَ﴾۔
 ۲۲۔ ﴿إِنَّ الْبَارِّ لَفِي نَعِيمٍ﴾۔
 ۲۳۔ ﴿عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ﴾۔
 ۲۴۔ ﴿تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ﴾۔
 ۲۵۔ ﴿يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ﴾۔
 ۲۶۔ ﴿خِتَمُهُ مِسْكَ وَ فِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾۔
 ۲۷۔ ﴿وَ مَزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ﴾۔
 ۲۸۔ ﴿عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ﴾۔

ترجمہ

- ۱۸۔ ایسا نہیں ہے جیسا وہ (قیامت کے بارے میں) خیال کرتے ہیں بلکہ نیک لوگوں کا نامہ اعمال علیین میں ہے۔
 ۱۹۔ اور تو کیا جانے کہ علیین کیا ہے؟
 ۲۰۔ تحریر ہے لکھی ہوئی اور سر نوشت ہے قطعی۔
 ۲۱۔ جس کے شاہد مقربین ہیں۔
 ۲۲۔ یقیناً نیک لوگ انواع و اقسام کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔
 ۲۳۔ جنت کے خوبصورت پلنگوں اور تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے اور جنت کی خوبصورتی کو دیکھ کر رہے ہوں گے۔
 ۲۴۔ ان کے چہروں پر تو نعمت کی طراوت اور نشاط پکھے گا۔
 ۲۵۔ وہ شراب زلال دست نخورده و سر بسته سے سیراب ہوں گے۔

۲۶۔ اس پر جو مہر لگائی گئی ہوگی وہ مشک و کستوری سے ہوگی اور ان جنت کی نعمتوں میں رغبت رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے سبقت لے جانی چاہیئے۔

۲۷۔ یہ شراب (طہور) تسنیم سے مخرج ہوگی۔

۲۸۔ وہی چشمہ جس سے مقربین پئیں گے۔

علین ابرار کے انتظار میں ہے

اس توصیف کے بعد جو گزشتہ آیات میں فاجر لوگوں کے اعمال اور سرنوشت کے بارے میں آئی ہے ان آیات میں اس گروہ کے بارے میں گفتگو ہے جو ان کا مد مقابل ہے یعنی ابرار اور نیکو کار لوگ جن کا امتیاز، افتخار اور اعزاز فاجروں کے مقابلہ میں ملاحظہ کرنے سے دونوں کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

ایسا نہیں ہے جیسا وہ قیامت کے بارے میں خیال کرتے ہیں بلکہ نیک لوگوں کے نامہ ہائے اعمال علین میں ہوں گے۔ ﴿کَلَّا ان کتاب الابرار لفی علین﴾۔

”علین“۔ ”علی“ (بروزن ملی) کی جمع ہے بلند جگہ اور اس پر بیٹھنے والوں کے معنوں میں ہے۔ یہاں پہاڑوں کے بلند ترین حصوں پر رہنے والوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، یہاں مفسرین کی ایک جماعت نے آسمان کی افضل ترین جگہ یا جنت کی بہترین جگہ کے معنی میں اس کی تفسیر کی ہے اور بعض نے کہا کہ اس کا ذکع جمع کے ساتھ جو ہے وہ تاکید کے لئے اور علونی علو بلندی در بلندی کے معنوں میں ہے۔

بہر حال وہ تفسیریں جو گزشتہ آیات میں ہم سچین کے بارے میں کر چکے ہیں ان ہی سے مشابہ تفسیریں ہیں۔ پہلی یہ کہ کتاب الابرار سے مراد نیک، پاک اور مومنین کا نامہ اعمال ہے اور مقصود کلام یہ ہے کہ ان کا نامہ اعمال ایک ایسے دیوان کل میں موجود ہے جو تمام مومنین اعمال کو بیان کرتا ہے۔ وہ دیوان بہت ہی بلند منزلت رکھتا ہے یا یہ کہ ان نامہ اعمال بلند ترین مکان ی اجنت کے فراز پر ہے۔ اور یہ بس معانی بتاتے ہیں کہ خود ان کا مقام بہت ہی بلند و بالا ہے۔

ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ پیغمبر اکرم نے فرمایا کہ علین سے مراد ساتواں آسمان اور عرش خدا کا نچلا حصہ ہے۔

اور یہ نقطہ فجار کا عین نقطہ مقابل ہے جو دوزخ کے طبقوں میں پست ترین جگہ قرار پائی ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد سرنوشت اور حکم قطعی ہے جو نیک لوگوں کو بہشت کے اعلیٰ درجوں میں مقرر کئے ہوئے ہیں۔

ان دونوں تفسیروں میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ ان کا نامہ اعمال ایک دیوان کل میں برقرار ہے اور اس دیوان کا مجموعہ آسمانوں کی بلندی پر ہے اور فرمانِ الہی بھی یہی قرار پایا ہے کہ وہ خود جنت کے بلند ترین مقامات میں ہوں۔

اس کے بعد علیین کی اہمیت و عظمت کو بیان کرنے کے لئے مزید کہتا ہے: ”تو کیا جانے کہ علیین کیا ہے“ ﴿وما ادراک ما علیین﴾ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسا مقام ہے جو خیال و قیاس اور وہم و گمان سے بھی برتر ہے، جسے کوئی بھی حتیٰ کہ پیغمبر اسلام بھی، اس کی عظمت اور حدودِ اربعہ کا ادراک نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد خود قرآن وضاحت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ”علیین ایک لکھی ہوئی کتاب ہے“ ﴿کتاب مرقوم﴾۔ یہ اس تفسیر کی بناء پر جو علیین کو ابرار کے نامہ اعمال کے دیوان کل کے معنی میں پیش کرتی ہے۔

باقی رہی دوسری تفسیر تو پھر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ حتیٰ سرنوشت ہے جس کے بارے میں خدا نے تحریر کیا ہے۔ ان کی جگہ جنت کے افضل ترین درجات میں ہوگی۔ اس بناء پر کتاب مرقوم کتاب ابرار کی تفسیر ہے نہ کہ علیین کی۔ (غور کیجئے)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”یہ ایسی کتاب ہے جس میں یا جسے مقربین مشاہدہ کریں گے، یا اس کی گواہی دیں گے“ ﴿یشہدہ المقربون﴾۔

اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت اس آیت میں مقربون سے مراد فرشتے لیتی ہے جو بارگاہِ الہی میں مقرب ہیں، وہ فرشتے جو نیک لوگوں کے اعمال کے یا یقینی سرنوشت کے ناظر ہیں لیکن بعد کی آیت بتاتی ہے کہ مقربون خاصانِ خدا اور برگزیدہ مومنین کا ایک گروہ ہے جس کا مقام بہت اونچا ہے اور دوسرے نیک افراد کے اعمال پر شاہد ہے جیسا کہ سورہ واقعہ کی آیت ۱۰-۱۱ میں اصحاب المینہ اور اصحاب المشئمہ کے ذکر کے بعد فرماتا ہے:

﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ﴾ اور سبقت کرنے والوں میں سبقت کرنے والے ہی مقربین ہیں۔ اور سورہ نحل کی آیت ۸۹ میں ہم پڑھتے ہیں ﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ﴾ اور یاد کرو اس دن کو جب ہر امت میں سے ایک گواہ اس پر مقرر کریں گے اور تجھے اس پر گواہ قرار دیں گے۔ اس کے بعد نیک لوگوں کے عظیم ثواب کے ایک حصہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”یقیناً ابرار انواع و اقسام کی نعمتوں سے بہریاب ہیں“ ﴿ان الابرار لفی نعیم﴾۔

”نعیم“ کا اصلی مفہوم جو راغب کے بقول بہت زیادہ نعمت کے معنی میں ہے اور نکرہ کی شکل میں اپنے ذکر کے ساتھ یہاں عظمت و اہمیت کی دلیل ہے، یہ بتاتا ہے کہ ابرار اس قسم کی برکتوں اور نعمتوں کے حامل ہیں جو حدود توصیف و تعریف سے باہر ہیں اور یہ جنت کی تمام مادی و معنوی نعمتوں اور برکتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ایک جامع تعبیر ہے۔ اس کے بعد ان میں سے بعض کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”وہ جنت کے خوبصورت پلنگو اور تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ان تمام نعمتوں اور مناظر کو دیکھ رہے ہوں گے اور لذت اٹھا رہے ہوں گے“ ﴿علی الارائک ینظرون﴾۔^(۲)

”ارائک“۔ ”اریکہ“ کی جمع ہے اور خوبصورت تخت کے معنی میں ہے، یا پرزینت پلنگ جو جگہ عروسی میں رکھتے ہیں، یہاں جنت کے بہت ہی خوبصورت تختوں اور پلنگوں کی طرف اشارہ ہے جن پر نیک اور صالح افراد متمکن ہوں گے۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس لفظ کی اصل فارسی ہے اور یہ ”ارگ“ سے لیا گیا ہے جس کے معنی قصر سلطنت کے ہیں۔ (یہ لفظ اس قلعہ کے معنی میں بھی آیا ہے جو شہر کے اندر ہو، اور چونکہ شہر کے اندر والا قلعہ عام طور پر باد شاہوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے، لہذا اس پر اطلاق ہوتا ہے)۔

بعض دوسرے مفسرین ارائک کو مفرد اور فارسی لفظ ”اراک“ یا ”ارایک“ سے ماخوذ جانتے ہیں جس کے معنی شاہی تخت کے ہیں اور پایہ تخت اور اس صوبہ کے معنی میں ہیں جس میں پایہ تخت ہو اور عراق کو اراک کی معرب سمجھتے ہیں جو اس قسم کے صوبہ کے معنی میں ہے اور کہتے ہیں کہ لفظ ارائک اوستا (زرتشت کی مقدس کتاب) میں بھی بارگاہ اور تخت سلطنت کے معنی میں آیا ہے۔

لغت عرب کے بعض علماء اس کی اصل عربی کو سمجھتے ہیں، ان نظریہ ہے کہ یہ لفظ اراک سے لیا گیا ہے جو مشہور درخت کا نام ہے جس سے تخت اور سائبان بنائے جاتے ہیں۔^(۳)

لیکن قرآن مجید میں اس کے موارد استعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس زیبا اور خوبصورت اور مزین تخت کے معنوں میں ہے جس سے صاحبان قدرت و نعمت استفادہ کرتے ہیں۔

﴿ینظرون﴾ دیکھیں گے، کی تعبیر جو سر بستہ شکل میں استعمال ہوئی ہے اس میں یہ نہیں فرماتا کہ کس چیز کی طرف دیکھیں گے تاکہ اس کے مفہوم میں وسعت رہے۔ وہ لطفِ خدا کی طرف دیکھیں گے۔ اسکے بے مثال جمال کی طرف، جنت

کی انواع و اقسام کی نعمتوں کی طرف اور نگاہوں کی خیرہ کرنے والی خوبصورتیوں کی طرف دیکھیں گے، بہشت بریں میں ہوں گے، اس لئے کہ انسانی لذتوں میں سے اہم ترین لذت دیکھنے کی لذت ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

”جب تو ان کے چہروں کی طرف دیکھے تو نعمت کے طراوت خوشی اور نشاط ان میں دیکھے گا“ ﴿تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ﴾۔ جو اس طرف اشارہ ہے کہ نشاط، سرور اور خوشی ان کے چہروں پر جھلک رہی ہوگی اور ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اگر دوزخیوں کے چہرے پر نظر رہے تو ان سے غم و رنج اور اندوہ و بد بختی اور بے چارگی نمایاں ہوگی۔

”نضرة“ جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، ترانازگی اور نشاط کے معنی میں ہے جو اچھی زندگی گزارنے والوں کے چہرے سے عیاں ہوتی ہے، تحت، نظارہ، آرام و سکون و نشاط کی نعمتوں کے بعد ایک اور نعمت یعنی بہشتیوں کی شراب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

”انہیں ایسی پاک و پاکیزہ شراب پلائیں گے جس میں کسی کا ہاتھ نہیں لگا ہوگا“ (يسقون من رحيق مختوم)۔ وہ شراب طہور جو دنیا کی شرابوں کی طرح گناہ پر آمادہ کرنے والی، جنون پیدا کرنے والی شیطانی شراب کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ ہوش و عقل اور نشاط و عشق صفا پیدا کرتی ہے۔

زیادہ مفسرین نے رحيق کو خالص شراب کے معنی میں لیا ہے، ایسی شراب جس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہوگی۔ ”مختوم“ کے معنی مہر لگی ہوئی۔ اس سے بھی اس کے خالص اور پاک و صاف ہونے کا اظہار ہے۔ اسکے علاوہ وہ اس قسم کے برتنوں کا استعمال مہمان کے خاص احترام کی علامت ہے، ایسا ظرف جس کا منہ بند ہے، اس پر مہر لگی ہوئی ہے اور اس کی مہر صرف مہمان کی خاطر تھوڑی جاتی ہے۔ (۴)

اس کے بعد فرماتا ہے: ”اس کی مہر مشک اور کستوری سے لگائی گئی ہے“ ﴿خَتَامُهُ مِسْكٌ﴾۔ دنیا کے منہ بند برتنوں کی طرح نہیں جن کی مہر مٹی سے لگائی جاتی ہے تو مشک اور عطر کی خوشبو فضا میں پھیل جاتی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ آخر میں یعنی اس شراب طہور پینے کے اختتام پر انسان کے منہ سے مشک و عنبر کی خوشبو آئے گی، دنیا کی نجس شرابوں کے برخلاف جن کے پینے کے بعد منہ تلخ اور بدبودار ہو جاتا ہے، لیکن اس تعبیر کی طرف توجہ کمرتے ہوئے جو گزشتہ آیت میں آئی ہے یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے۔ آیت کے آخر میں جنت کی شراب طہور کی طرف رغبت کرنے کے بعد فرماتا ہے: ”ان بہشتی نعمتوں میں اور خصوصیت کے ساتھ اس شراب طہور

کی طرف رغبت کرنے والوں کو ایک دوسرے پر سبقت لے فی چاہئے۔“ ﴿وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾۔
مفسر عظیم ”طبرسی“ ”مجمع البیان“ میں کہتے ہیں:

”تنافس“ کے معنی دو انسانوں کے ایک چیز کے لئے کوشش کرنے کے ہیں جن میں سے دونوں یہ چاہیں گے یہ نفیس چیز میرے پاس ہو

مجمع البحرین میں ہے کہ تنافس کے معنی عظمت و عزت کے ساتھ ایک دوسرے پر سبقت لے جانا ہے۔ راغب مفردات میں کہتا ہے ”منافسہ“ کہ معنی یہ ہیں کہ معزز افراد سے مشابہت پیدا کرنے کے لئے ان سے ملحق ہو جانے کی اس طرح کوشش کرنا کہ دوسرے کو نقصان نہ پہنچے۔

حقیقت میں اس آیت کا مفہوم اُس آیت کے مشابہ ہے جو سورہ حدید کی آیت ۲۱ میں آئی ہے ﴿سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ ”اپنے پروردگار کی مغفرت تک پہنچنے کے لئے اور اس کی جنت تک پہنچنے کے لئے جس کی وسعت آسمان و زمین جتنی ہے، ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ۔“

یا جو کچھ سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۳ میں آیا ہے: ﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ﴾۔ بہر حال اس آیت میں جو تعبیر آئی ہے وہ بہت ہی خوبصورت ہے اور جو ایمان و عمل صالح کے ذریعہ ان بے نظیر نعمتوں تک پہنچنے کے سلسلہ میں انسانوں کو شوق دلانے کا سبب سمجھی جاتی ہے اور قرآن کی فصاحت و بلاغت کو عمدہ انداز میں ظاہر کرتی ہے۔ (۵) (۶)

اس کے بعد آخری نعمت جو اس سلسلہ آیات میں آئی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”یہ شرابِ طہور تسنیم میں ملی ہوئی ہے“ ﴿مَزَاجُهُ مِّن تَسْنِيمٍ﴾۔ ”وہی چشمہ جس سے مقربین پیتے ہیں (عیناً) شرب بھا المقربون)۔“ (۷)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تسنیم جنت کی افضل ترین شرابِ طہور ہے جسے خاص طور پر مقربین پیتے ہیں لیکن عام نیک لوگ اس میں سے ایک مقدارِ حقیقِ مختوم ملا کر پیتے ہیں، جو جنت کی شرابِ طہور کی ایک اور قسم ہے۔ یہ کہ شراب یا یہ چشمہ تسنیم کے نام سے کیوں موسوم ہے (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ تسنیم لغت کے اعتبار سے چشموں کے معنوں میں ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف گر رہا ہو) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ وہ شراب ہے جو بہشت

کے آسمانوں سے گر رہی ہے۔ حقیقت میں جنت کی شراب کی کئی قسم ہے، بعض تو نہروں کی صورت میں بہہ رہی ہیں جن کی طرف قرآن کی متعدد آیات میں اشارہ ہوا ہے۔^(۸)

ان میں سے بعض منہ بند برتنوں میں مہر زدہ صورت میں ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے۔ سب سے زیادہ اہم وہ شراب ہے جو بہشت کے آسمان یا اوپر والے طبقوں سے گرتی ہے اور یہ وہی شراب ہے تسنیم ہے کہ جنت کا کوئی مشروب اس کا ہم پلہ نہیں ہے اور جنتیوں کے جسم و جان میں جو تاثیر فطری طور پر وہ کرتی ہے وہ سب سے بہتر پرکشش اور عمیق ہے۔ اس کے پینے سے جو نشہ حاصل ہوتا ہے وہ تعریف و توصیف سے بالا ہے۔ البتہ اس حقیقت کو ہمیں دوبارہ بیان کرنا چاہیے کہ یہ سب دھندلے نقوش ہیں جو دور سے نظر آتے ہیں ورنہ جنت کی گراں قدر اور بے نظیر نعمتوں کی تعریف و توصیف زبان و قلم کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود قرآن کے بقول اس کی طرف کسی شخص کی فکر اور اس کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ (فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرۃ العین) (الم سجدہ - ۱۷) کوئی نفس نہیں جانتا کہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی کونسی چیزیں ان کے لئے رکھی گئی ہیں۔

۱۔ تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۷۰۵۳ و مجمع البحرین مادہ ”علو“

۲۔ اس جملہ میں بتداء محذوف ہے اور تقدیر میں (هم علی الاراکک بنظرون) ہے اس جملہ بنظرون حال ہے، یا یہ کہ علی الاراکک گزشتہ آیت کے لفظ ”ان“ کی خبر کے بعد خبر ہے۔

۳۔ ”لغت نامہ“۔ ”وہجدا“، کتاب ”دیوان دین“، مفردات راغب“ اور برہان قاطع کی طرف رجوع کیا جائے۔

۴۔ گزشتہ زمانے میں معمول تھا اور موجودہ زمانے میں بھی معمول ہے کہ یہ اطمینان کرنے والے کے لئے کہ اس چیز کو کسی کا ہاتھ نہیں لگا اسکو کسی برتن میں رکھتے اور اس کا منہ بند کرنے کے بعد کسی رسی یا بٹے ہوئے تار سے اس پر گرہ لگادیتے تھے اور اس گرہ پر سخت مٹی یا لاکھ کو پگھلا کر رکھ دیتے اور اس طرح سے مہر لگادیتے کہ برتن برتن کے اندر مہر توڑے بغیر رسائی ممکن نہ ہوتی۔ عرب اس کو مختوم کہتے ہیں۔

۵۔ جو کچھ آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ذالک کا اشارہ جنت کی سات نعمتوں کی طرف ہے خصوصاً مخصوص شراب طہور جس پر کشش اوصاف آیت میں آئے ہیں۔

۶۔ چونکہ ”واو“ اور ”فاء“ (و فی ذالک فلیتنا نفس المتنافسون) کے جملہ میں دونوں عطف کے لئے ہیں تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو حروف یکے بعد دیگرے کیوں آئے ہیں۔ زیادہ مناسب جواب یہ ہے کہ یہاں حرف شرط محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے (وان ارید تنافس فی شیء فلتنافس فی ذالک المتنافسون)۔ اگر کسی چیز میں رغبت ہے تو رغبت کرنے والے اس میں رغبت محسوس کریں۔ اس طرح حرف شرط اور جملہ شرطیہ دونوں محذوف ہیں اور ذالک بھی مقدم رکھا گیا ہے۔ (غور فرمائیے)۔

۷۔ یہ کہ عیناً کیوں منصوب ہے اس کے لئے بہت سی وجوہ بیان ہوئی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ کہ تسنیم کے لئے حال یا اس کی تمیز ہے، یا مدح و اختصاص کے عنوان کے ماتحت ہے اور تقدیر اعنی (میری مراد ہے) اور ”بھا“ کی ”باء“ یا تو زائدہ ہے یا ”من“ کے معنی میں ہے اور دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ ۸۔ سورہ محمد، آیت ۱۵۔

چند نکات

ابرار اور مقربین کون لوگ ہیں؟

قرآن مجید کی آیات میں ابرار، مقربین اور ان کے عظیم اجر و ثواب کے بارے میں بارہا گفتگو ہوئی ہے، یہاں تک کہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۹۳ کے مطابق اولوالالباب (قوی عقل و فکر والے) تقاضا کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کا اختتام ابرار کے ساتھ ہو۔

﴿توفنا مع الابرار﴾ اور سورہ دھر کی آیات میں بھی ان کے لئے بہت اجر و ثواب بیان ہوئے ہیں، (دھر آیت ۵ تا ۲۲) اور سورہ انفطار کی آیت ۱۳ اور سورہ مطفین کے زیر بحث آیت بھی ان کے بارے میں بار بار خدا کی مہربانیوں کو بیان کرتی ہے۔

ابرار، جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، ”بر“ کی جمع ہے یہ وہی لوگ ہیں جو وسیع روح، بلند ہمت، اچھے اعتقاد اور نیک عمل کے حامل ہیں اور مقربین وہ ہیں جو بارگاہ خدا میں قرب مقام کے حامل ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ظاہری طور پر عام و خاص مطلق کی نسبت ہے یعنی سب مقرب افراد ابرار ہیں، لیکن ابرار مقرب نہیں ہیں۔

ایک حدیث امام حسن مجتبیٰ سے منقول ہے کہ (کَلِمَا فِي كِتَابِ اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ قَوْلِهِ إِنَّ الْأَبْرَارَ فَوَّ اللَّهُ مَارَادَ بِهِ إِلَّا عَلِيَّ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ وَ فَاطِمَةَ وَ أَنَا وَ الْحُسَيْنِ) جہاں کہیں قرآن میں اِنَّ الْاَبْرَارَ آيا ہے خدا کی قسم اس پروردگار کی مراد علی ابن ابی طالب، فاطمہ زہرا، میں اور حسین ہیں۔^(۱)

اس میں شک نہیں کہ خمسہ نجباؤں پانچ مقدس نور ابرار و مقربین کے سب سے زیادہ مصداق ہیں اور جیسا کہ ہم نے سورہ دھر میں کہا ہے کہ یہ عظیم سورہ امیر المومنین حضرت علی و فاطمہ اور حسن و حسین کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی اٹھارہ آیات ان کے فضائل کی بحث میں ہیں، اگرچہ ان کے بارے میں آیات کا نزول آیات مفہوم کی وسعت کی راہ میں مانع نہیں ہے۔

۲۔ جنت کی شرابیں

قرآن کی مختلف آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں کئی قسم کی شراب ہائے طہور کئی ناموں اور کیفیتوں کے ساتھ موجود ہیں جو ہر لحاظ سے دنیا کی ناپاک شرابوں سے مختلف ہیں۔ دنیا کی شرابیں عقل کو ختم کرتی ہیں، جنون پیدا کرتی ہیں اور عداوت و خونریزی اور فتنہ و فساد کا سرچشمہ بنتی ہیں۔ بدبودار و بدذائقہ اور نجس و ناپاک ہوتی ہیں۔

لیکن جنت کی شرابیں عقل، نشاط اور عشق پیدا کرتی ہیں۔ خوشبودار معطر اور پاک ہیں اور جو لوگ انہیں پیتے ہیں وہ ناقابل بیان روحانی نشہ سے سرور حاصل کرتے ہیں جس کی دو قسمیں اس صورت میں آچکی ہیں۔

رحیق مختوم اور تسنیم اور اس کی دوسری اقسام سورہ دھر اور قرآن کی دوسری آیات میں بیان ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک کی اس جگہ ہم نے تصریح کی ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ متعدد روایات میں یہ جنت کی شراب ان لوگوں کا اجر قرار دی گئی ہے جو دنیا کی شراب کی طرف توجہ نہ کریں، پیاسوں کو سیراب کریں اور مومنین کے دلوں میں جو غم و اندوہ کی آگ جل رہی ہے اسے بجھادیں۔

پیغمبر اسلام نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: (یا علی من ترک الخمر لله سقاء الله من الرحیق المختوم) اے علی (ع)! جو شخص خدا کی خاطر شراب کو ترک کرے تو خدا اسے جنت کی منہ بند مہر شدہ شراب زلال سے سیراب کرے گا۔^(۱)

زیادہ جاذب توجہ یہ بات ہے کہ ایک اور حدیث میں انہی جناب سے آیا ہے کہ اگر دنیا کی شراب، خدا نہیں، بلکہ غیر خدا کی خاطر بھی ترک کرے تو بھی خدا اسے اس شراب سے سیراب کرے گا۔

حضرت علی علیہ السلام کہتے ہیں ”میں نے عرض کی غیر خدا کے لئے؟ فرمایا ہاں! جو شخص اپنی جان کی حفاظت کے لئے بھی دنیا کی شراب کو چھوڑے تو خدا اسے رحیق مختوم سے سیرات کرے گا۔“^(۲)

جی ہاں وہ افراد جو شراب کو اپنی سلامتی کی حفاظت کی خاطر ترک کرے وہ حقیقت میں اولوالباب ہیں اور جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۹۳ سے معلوم ہوتا ہے اولوالباب بھی ابرار کے زمرہ میں ہیں جو جنت کی شراب ہائے طہور سے بہرہ مند ہوں گے۔

ایک اور حدیث میں علی (ع) بن حسین (ع) سے منقول ہے ﴿من سقى مؤمناً ظمأً سقاه الله من الرحیق المختوم﴾ جس شخص کسی پیاسے شخص کو سیراب کرے خدا اسے رحیق مختوم سے سیراب کرے گا۔^(۳)

ایک اور حدیث میں آیا ہے: ﴿مَنْ صَامَ اللَّهُ فِي يَوْمٍ صَائِفٍ سَقَاهُ اللَّهُ مِنَ الظَّمَاءِ مِنَ الرِّحْقِ الْمَخْتُومِ﴾ جو شخص موسم گرما کے دنوں میں روزہ رکھے تو خدا اسے قیامت کی تشنگی کی حالت میں رحیق سے سیرات کرے گا۔ (۴)

۱۔ نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۴ حدیث ۳۷، ۴۰۔

۲۔ نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۴ حدیث ۳۷، ۴۰۔

۳۔ نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۳۴ (حدیث ۳۵)۔

۴۔ مجمع البیان در ذیل آیات زیر بحث (جلد ۱۰ ص ۴۵۶)۔

آیات ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶

۲۹۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ اجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ﴾۔

۳۰۔ ﴿وَ إِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ﴾۔

۳۱۔ ﴿وَ إِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِم انْقَلَبُوا فَكِهِينَ﴾۔

۳۲۔ ﴿وَ إِذَا رَأَوْهُم قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ﴾۔

۳۳۔ ﴿وَ مَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ﴾۔

۳۴۔ ﴿فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ﴾۔

۳۵۔ ﴿عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ﴾۔

۳۶۔ ﴿هَلْ تَوْبَ الْكُفَّارِ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾۔

ترجمہ

۲۹۔ بدکار دنیا میں ہمیشہ مومنین پر ہنستے تھے۔

۳۰۔ اور جب مومنین کے پاس سے گزرتے ہیں تو اشاروں سے ان کا مذاق اڑاتے۔

۳۱۔ اور جب اپنے خاندان کی طرف پلٹتے تو مسرور پلٹتے۔

۳۲۔ اور جس وقت مومنین کو دیکھتے تو کہتے یہ گمراہ ہیں۔

۳۳۔ حالانکہ وہ مومنین کی نگرانی پر کبھی مامور نہیں رہے اور نہ ان کے متکفل تھے۔

۳۴۔ لیکن آج مومنین کفار پر ہنستے ہیں۔

۳۵۔ جب کہ جنت کے مزین تختوں (پلنگوں) پر بیٹھے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔

۳۶۔ کیا کفار نے اپنے اعمال کا اجر لے لیا ہے؟

شال نزول

مفسرین نے ان آیات کے لئے دو شان نزول نقل کی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایک دن حضرت علی علیہ السلام اور مومنین کی ایک جماعت کفار مکہ کے قریب سے گزری تو وہ حضرت علی (ع) اور ان مومنین پر ہنسنے لگے اور ان کا مذاق اڑایا، تو مندرجہ بالا آیتیں نازل ہوئیں اور ان مذاق اڑانے والے کافروں کی جو قیامت میں حالت ہوگی اس کو واضح کیا۔

حاکم ابو القاسم حسکانی شواہد التنزیل میں ابن عباس سے اس طرح نقل کرتے ہیں ”ان الذین اجرموا“ سے مراد قریش کے منافقین ہیں اور ”الذین امنوا“ سے مراد علی بن ابی طالب ہیں اور ان کے یا اور انصار ہیں۔^(۱)

دوسری شال نزول یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات عمار، صہیب، جناب بلال اور اسی قسم کے دوسرے غریب مومنین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ابو جہل، ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل جیسے مشرکین قریش کے تمسخر کا نشانہ بنے تھے

اس دن وہ مومنین کا مذاق اڑاتے تھے لیکن آج

گذشتہ آیات کے بعد، جو نیک لوگوں کے ملنے والی نعمتوں اور ثواب کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں، زیر بحث آیا ت میں ان مصائب اور زخموں کے ایک گوشہ کی طرف، جس سے اس جہان میں ایمان و تقویٰ کی بنا پر ان کا واسطہ پڑا تھا، اشارہ کرتا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ عظیم اجر و ثواب حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے۔ ان آیات میں کفار کی قبیح اور دل دکھانے والی تنقید اور ان سے آمنہ سامنا ہونے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور کفار کے چار کے رد عمل کو بیان کرتا ہے پہلے فرمایا ہے:

”بدکار اور کفار ہمیشہ مومنین پر ہنستے تھے“ ﴿ان الذین اجرموا کانوا من الذین امنوا یضحکون﴾، تمسخر آمیز اور ہنسی بر حقارت ہنسی، ایسی ہنسی جو سرکشی و تکبر اور غرور و غفلت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور ہمیشہ چھوٹے دماغ کے مغرور افراد، متقی مومنین کے مقابلہ میں اس قسم کی بے وقوفانہ ہنسی سے کام لیتے ہیں۔

ضمنی طور پر ”کفر“ کی بجائے ”اجر مومنین“ کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ کافرو بے ایمان افراد اپنے گناہ آلود اعمال سے پہچانے جاتے ہیں اس لئے کہ کفر ہمیشہ سے عصیان و جرم کا سرچشمہ ہے۔

بعد والی آیت میں ان کے قبیح طرز عمل کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”جس وقت کفار مومنین کی جماعت کے قریب ہوں تو اشاروں سے ان کا مذاق اڑاتے ہیں“

﴿و اذا مَرَّوْهُمْ یَتَغَامَزُونَ﴾، اور اشاروں اشاروں میں کہتے ہیں کہ ان بے سرو پا افراد کو دیکھتے ہو کہ یہ مقربین بارگاہ خدا ہو گئے ہیں۔ ان ننگے پاؤں اور برے حال لوگوں کو دیکھو کہ یہ اپنے اوپر وحی کے نزول کے مدعی ہیں اور نادان لوگوں کو دیکھو کہ یہ کہتے ہیں کہ بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیاں دوبارہ زندگی کی طرف پلٹ آئیں گی اور وہیں وہ اسی قسم کی دوسری کھوکھلی باتیں کرتے ہیں۔

ایسا نظر آتا ہے کہ مشرکین واضح طور پر اس وقت ہنسی اڑاتے تھے جب مومنین کی کوئی جماعت ان کے پاس سے گزرتی تھی اور ان کے تمسخر آمیز اشارے اس وقت ہوتے جب وہ مومنین کی جماعت کے نزدیک سے گزرتے اور چونکہ مومنین کی جماعت کے قریب رہ کر آسانی سے ان کا مذاق نہیں اڑا سکتے تھے، لہذا آنکھوں کے اشاروں سے کام لیتے تھے۔ لیکن جہاں خود ان کا جھگٹا ہوتا اور مومنین ان کے پاس سے گزرتے وہاں وہ زیادہ آزادی اور جسارت سے کام لیتے۔

(۲)

”یتغامزون“ - ”غمز“ (بروزن طنز) کے مادہ سے آنکھ اور ہاتھ سے ایسی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے معنی میں ہے جس سے عیب جوئی کا پہلو نکلتا ہو اور بعض اوقات یہ لفظ ہر قسم کی عیب جوئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، خواہ زبان ہی سے کیوں نہ ہو۔

اور تغامز (باب تفاعل سے) کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سب کے سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر یہ حرکت کرتے تھے اور ہر کوئی اشارہ کر کے دوسرے کو کچھ بتاتا، جس میں مذاق کا پہلو ہوتا۔ یہ تو مومنین سے آئنا سامنا ہونے پر ہوتا تھا۔ خصوصی جلسوں میں بھی یہی طرز کار اختیار کئے رکھتے اور علیحدگی میں بھی اس سلسلہ کو جاری رکھتے، جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے:

”جس وقت وہ اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاتے تو خوش ہوتے اور جو کچھ انجام دیا ہوتا اس پر پھولے نہ سماتے۔“ ﴿وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ﴾، گویا انہیں فتح و کامیابی نصیب ہوئی ہے جس کی وجہ سے فخر و مباہات کر رہے ہیں پھر مومنین سے علیحدگی کی صورت میں بھی اس مذاق کو جاری رکھتے۔

”فکھین“ جمع ہے ”فکھ“ کی، یہ صفت ہے مشبہ (اور بروزن خشن ہے) ”فکاکھ“ (بروزن قبالہ) مذاق اڑانے کے معنی میں ہے اور اصل میں فاکھ سے لیا گیا ہے جس کے معنی پھل کے ہیں۔

گویا یہ شوخیاں پھولوں کے مانند ہیں جس سے وہ لذت حاصل کرتے ہیں۔ اور شیریں اور دوستانہ گفتگو کو فکاکھ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اہل کا لفظ عام طور پر خاندان اور قریبی رشتہ داروں کے معنی میں ہے لیکن ممکن ہے کہ یہاں زیادہ وسیع معنی رکھتا ہو اور قریبی دوستوں کا بھی احاطہ کرے۔

مومنین کے مقابلہ میں ان کا چھوٹا شرارت آمیز طرز عمل یہ تھا کہ جب وہ انہیں دیکھتے تو کہتے یہ گمراہ گمراہ ہیں ﴿وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُونَ﴾، اس لئے کہ وہ بت پرستی اور خرافات، جو کفار میں رائج تھیں، انہیں یہ گمراہ راہ ہدایت

ہدایت خیال کرتے تھے جبکہ مومنین نے انہیں چھوڑ دیا تھا اور توحید کی طرف پلٹ آئے تھے اور کفار کے گمان میں نقدِ دنیا کی لذت کو مومنین نے آخرت کی خاطر ادھار بیچ دیا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر ان مراحل میں ہو جہاں بات مذاق سے آگے بڑھ چکی ہو اور کفار اپنے آپ کو ناچار و مجبور دیکھتے ہوں کہ زیادہ سے زیادہ شدت عمل دکھائیں اس لئے کہ ہمیشہ عظیم پیغمبروں اور نئے دین و آئین کے ظہور کے وقت دشمنوں اور مخالفوں کا یہی طرز عمل ہوتا ہے کہ وہ مذاق اڑاتے تھے۔

گویا وہ نئے دین کو اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ سنجیدگی سے اس کا سامنا کریں۔ لیکن جب دین خدا آمادہ افراد کے دلوں میں نفوذ کر جاتا اور اس کے بہت سے پیروکار ہو جاتے تو کفار خطرہ محسوس کمر کے اس پر سنجیدگی سے اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے اور لڑائی پر شدت سے آمادہ رہتے اور مرحلہ بہ مرحلہ زیادہ شدت اختیار کرتے۔

مندرجہ بالا آیت ان کی انتہائی کوشش کا پہلا مرحلہ ہے جس کی بعد نوبت خوں ریز جنگوں تک پہنچ گئی۔ چونکہ مومنین عام طور پر ایسے افراد میں سے تھے جن کی کوئی اجتماعی حیثیت نہ تھی اور وہ دولت مند بھی نہیں تھے، اس بنا پر کفار انہیں چشمِ حقارت سے دیکھتے تھے اور ان کے ایمان کو بے قیمت شمار کرتے تھے اور ان کے دین کا مذاق اڑاتے تھے، بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے:

”یہ گروہ کفار ان کی زندگی کا (مومنین کی) کبھی بھی محافظ و نگہبان اور متکفل نہیں تھا“ ﴿وَمَا أَرْسَلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ﴾، تو پھر کس حق کی بنا پر اور کونسی منطق کی رو سے ان ہر تنقید و اعتراض کرتے تھے؟

سورہ ہود کی آیت ۲۷ میں ہم پڑھتے ہیں کہ قوم نوح کے دو لتمند اور متکبر لوگوں نے آپ سے کہا ﴿وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا بِادِّئَارِئِهِ الرُّأْيٰی﴾ ”ہم ان لوگوں کو جنہوں نے تیرا اتباع کیا ہے ذلیل اور سادہ لوح ہونے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتے“۔ تو اُن جناب نے کفار کے جواب میں کہا: ﴿وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدَرِيٰ أَعْيُنُكُمْ لَنْ يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِيٰ أَنْفُسِهِمْ﴾ میں بالکل نہیں کہتا کہ وہ لوگ تمہاری نظر میں ذلیل و خوار ہیں، خدا انہیں خیر نہیں دے گا، خدا ان کے دلوں سے زیادہ آگاہ ہے۔“ (ہود۔ ۳۱)۔

یہ حقیقت میں ان خود پرست اور متکبر افراد کا جواب ہے اور انہیں بتایا جا رہا ہے کہ اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ مومنین کس گروہ سے وابستہ ہیں، تم اپنے طور پر روحِ دعوتِ دین اور پیغمبرِ اسلام کے آئین اور ان کے مجموعہ قوانین کو دیکھو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔

قیامت میں صورت حال بالکل برعکس ہو جائے گی جیسا کہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے آج مومنین کفار پر ہنسیں گے “
﴿فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ﴾۔ چونکہ قیامت انسان کے دنیاوی اعمال کا رد عمل ہے اور وہاں عدالت
الہی کا اجر ہونا ہے اور عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں پاک دل مومن ہٹ دھرم اور مذاق اڑانے والے کافروں پر
ہنسیں۔ یہ ان مغرور لوگوں پر ایک قسم کا عذاب ہے۔

بعض روایات میں رسول خدا سے منقول ہے کہ روز جنت کا ایک در کفار کے سامنے کھلے گا اور وہ اس خیال سے کہ
جہنم سے آزادی اور جنت میں ورود کا حکم انہیں دے دیا گیا ہے، اس دروازہ کی طرف چل پڑیں گے۔ جس وقت اس
کے قریب پہنچیں وہ دروازہ اچانک بند ہو جائے گا۔ اور یہ کئی مرتبہ ہو گا اور مومنین جو جنت سے ان کا نظارہ کر رہے ہوں
گے ان پر ہنسیں گے۔ (۳)

لہذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے:

وہ مزین پلنگوں اور تختوں پر بیٹھے ہوئے ہوں گے اور ان مناظر کو دیکھیں گے ﴿عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ﴾۔ وہ کن
چیزوں کی طرف دیکھیں گے، اس آراو سکون و عظمت و احترام کو دیکھیں گے (جو انہیں حاصل ہو گا) اور ان دردناک
عذابوں کی طرف دیکھیں گے جن میں مغرور خود پرست کفار انتہائی ذلت اور زبوں حالی کے ساتھ گرفتار ہوں گے۔
اور پھر اس سورہ کی آخری آیت میں ایک استفہامیہ جملے کی شکل میں فرماتا ہے:

”کیا کفار نے اپنے اعمال کا اجر اور کاموں کا ثواب لے لیا ہے“ ﴿هَلْ ثَوَابُ الْكُفَّارِ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ (۴)

یہ بات چاہے خدا کی جانب سے ہو، یا فرشتوں کی طرف سے، یا مومنوں کی طرف سے، یہ ایک قسم کا طعن و استہزاء
ہے اور مغرور متکبر افراد کے افکار اور دعوؤں پر جنہیں توقع تھی کہ اپنے برے اعمال کے بدلے میں خدا کی طرف سے
انعام و اکرام انہیں ملے گا۔ اس غلط گمان اور خیال خام کے مقابلہ میں فرماتا ہے:

”کیا انہوں نے اپنے اعمال کا ثواب اور اجر لے لیا ہے“۔ بہت سے مفسرین نے اس جملے کو ایک مستقل جملہ
سمجھا ہے جبکہ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ گزشتہ آیت کا حصہ ہے یعنی مومنین مزین تختوں پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے کہ
کیا کفار نے اپنے غلط اعمال کا اجر لے لیا ہے۔

جی ہاں! وہ اگر اجر لیں تو شیطان سے لیں، کیا وہ بے نوا گرفتار انہیں کوئی اجر دے سکتے ہیں۔

”ثوب“ (بروزن جوف) ثوب کے مادہ سے اصل میں کسی چیز کا اپنی پچھلی حالت کی طرف پلٹنا ہے اور ثواب اس اجر کو کہا جاتا ہے جو انسان کو اس کے اعمال کے مقابلہ میں دیتے ہیں، اس لئے کہ اس کے اعمال کا نتیجہ اس کی طرف لوٹتا ہے۔ یہ لفظ اچھی یا بری جزا کے لئے استعمال ہوتا ہے، اگرچہ عام طور پر موردِ خبر میں استعمال ہوتا ہے۔^(۵)

اس لئے اوپر والی آیت ایک قسم کا کفار پر طنز کرتی ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے اس لئے کہ وہ ہمیشہ مومنین اور آیاتِ خدا کا مذاق اڑاتے تھے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس دن اپنے مذاق کی سزا بھگتیں۔

۱۔ مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۵۷۔ حضرت علی h t i t r اور مشرکین مکہ کے بارے میں ان آیات کا نازل ہونا بہت سی کتب تفسیر مثلاً قرطبی، روح المعانی، کشاف اور تفسیر فخر رازی میں آیا ہے۔

۲۔ ”مزوا“ اور ”بھم“ کی ضمیروں کے مرجع کے بارے میں مفسرین نے دو احتمال تجویز کئے ہیں۔ بعض نے پہلی ضمیر پر مشرکین کی طرف اور دوسری مومنین کی طرف پلٹائی ہے اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے۔ لیکن ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے اس کے مطابق پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے

۳۔ درمنثور، جلد ۶، ص ۳۲۸ (مختصر سے فرق کے ساتھ)۔

۴۔ اس آیت میں استفہام تقریری ہے۔

۵۔ ”مفردات“ راغب مادہ ”ثوب“

ایک نکتہ

دشمنانِ حق کا مذاق اڑانے کا بزدلانہ حربہ

انبیاء کی طویل تاریخ میں ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ دشمنانِ خدا کا ایک حربہ مومنین کے مقابلہ میں تمسخر و استہزاء ہوتا ہے اور آیاتِ قرآنی نے اس موضوع کو بارہا پیش کیا ہے۔ اور چونکہ تمسخر و استہزاء عام طور پر ایسے لوگوں سے صادر ہوتا ہے جو مغرور ہوتے ہیں اور خود کو دوسروں سے بہتر و برتر سمجھتے ہیں اور دوسروں کو چشمِ حقارت سے دیکھتے ہیں اور کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ کافر، ظالم، ہٹ دھرم اور خود پرست اہل ایمان کے مقابلہ میں اس قسم کا حربہ استعمال کریں۔ موجودہ زمانے میں بھی یہی صورت حال ہے، دنیا کے افسوس ناک گروہی معاملات میں کئی شکلوں میں طعن و طنز اور مذاق کی صورت حال کو جاری رکھا جاتا ہے۔ اب بھی کوشش کی جاتی ہے کہ حق کے طرفداروں کو اس قدیمی حربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میدان چھوڑنے پر مجبور کریں۔ لیکن مومنین ان کے مقابلہ میں خدائی دعووں کی طرف توجہ کر کے، جن کا ایک نمونہ اوپر والی آیت میں آیا ہے، آرام و سکون محسوس کرتے ہیں اور تاریک دل مخالفوں کے مقابلہ میں مومنین کے دلوں میں روحِ مقاومت پیدا ہوتی ہے۔

اصولی طور پر استہزاء، تمسخر، غمزہ (اشارے) ضحک اور ہنسنا، حق کے مقابلہ میں، جس کی طرف مندرجہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے، یہ سب گناہانِ کبیرہ میں سے ہیں اور جہالت و غرور کی علامت ہیں، ایک فہیم، عاقل اور ہشیار انسان بفرض محال کسی مکتب فکر سے متعلق نہ بھی ہو، کبھی اپنے آپ کو اجازت نہیں دیتا کہ اس قسم کے حربوں سے مقابلہ کرتا ہے۔

خداوند! ہم سب کو غرور و جہالت اور کبر و نخوت سے محفوظ فرما۔

پروردگار! ہمیں حق طلبی، حق جوئی اور تواضع کی روح مرحمت فرما۔

بار الہا! ہمارا نامہ اعمالِ علین میں قرار دے اور سکتیوں کے زمرہ سے خارج کر دے۔

آمین رب العالمین

سورہ مطففین کا اختتام

سورہ انشقاق

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اس کی ۲۵ آیتیں ہیں

سورہ انشقاق کے مضامین

یہ سورہ قرآن مجید کے آخری پارے کی بہت سی دوسری سورتوں کے مانند معاد و قیامت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، شروع میں دنیا کے اختتام اور قیامت کے شروع ہونے کے ہولناک اور دل ہلا دینے والے حوادث کی طرف کچھ اشارے کرتا ہے اور بعد والے مرحلہ میں قیامت، نیکو کاروں اور بدکاروں کے اعمال کا حساب اور ان کی سرنوشت کے مسئلہ کو بیان کرتا ہے۔

تیسرے مرحلہ میں چند ایسے اعمال و عقائد، جو موجب عذاب الہی ہیں، ان کو پیش کرتا ہے اور چوتھے مرحلہ میں چند قسموں کے بعد انسان کی دنیاوی اور اخروی زندگی کے مرحلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور آخر کار پانچویں مرحلہ میں دوبارہ نیک و بد اعمال اور ان کی سزا و جزا کے بارے میں بات کرتا ہے۔

تلاوت کی فضیلت

یہ سورہ قرآن مجید کے آخری پارے کی بہت سی دوسری سورتوں کے مانند معاد و قیامت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، شروع میں دنیا کے اختتام اور قیامت کے شروع ہونے کے ہولناک اور دل ہلا دینے والے حوادث کی طرف کچھ اشارے کرتا ہے اور بعد والے مرحلہ میں قیامت، نیکو کاروں اور بدکاروں کے اعمال کا حساب اور ان کی سرنوشت کے مسئلہ کو بیان کرتا ہے۔

تیسرے مرحلہ میں چند ایسے اعمال و عقائد، جو موجب عذاب الہی ہیں، ان کو پیش کرتا ہے اور چوتھے مرحلہ میں چند قسموں کے بعد انسان کی دنیاوی اور اخروی زندگی کے مرحلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور آخر کار پانچویں مرحلہ میں دوبارہ نیک و بد اعمال اور ان کی سزا و جزا کے بارے میں بات کرتا ہے۔ اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں ایک حدیث پیغمبر اسلام منقول ہے (من قرأ سورة انشقت اعاده الله ان يو تيه كتابه وراء ظهره)، جو شخص سورہ انشقاق کو پڑھے تو خدا قیامت میں اس شر سے اس کو امان میں رکھے گا کہ اس کا نامہ اعمال پس پشت سے دیا جائے۔^(۱)

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

- ۱۔ ﴿إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ﴾۔
- ۲۔ ﴿وَ اذنت لربها وَ حُفَّتْ﴾۔
- ۳۔ ﴿وَ اِذَا الْاَرْضُ مَدَّتْ﴾۔
- ۴۔ ﴿وَ الْقَت مافیہا وَ تَخَلَّتْ﴾۔
- ۵۔ ﴿وَ اذنت لربها وَ حُفَّتْ﴾۔
- ۶۔ ﴿يَا ايها الانسانُ اَنْك كادِخٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلْئِقِيهٖ﴾۔
- ۷۔ ﴿فَاَمَّا مَنْ اَوْتٰى كِتٰبَهٗ بِيَمِينِهٖ﴾
- ۸۔ ﴿فَسَوْفَ يُحٰسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا﴾۔
- ۹۔ ﴿وَيُنْقَلَبُ اِلٰى اٰهْلِهٖ مُسْرُوْرًا﴾۔

ترجمہ

رحمن و رحیم کے نام سے

- ۱۔ جس وقت آسمان پھٹ جائے گا۔
- ۲۔ اور اپنے پروردگار کے فرمان کو تسلیم کرے گا اور سزاوار ہے کہ ایسا ہی ہو۔
- ۳۔ اور جب زمین میں وسعت پیدا ہوگی۔
- ۴۔ اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی۔
- ۵۔ اور اپنے پروردگار کے حکم کو تسلیم کرے گی اور ایسا ہی ہوگا ہونے کے لائق ہے۔
- ۶۔ اے انسان! تورنج و تکلیف اور سعی و کوشش کے ساتھ اپنے پروردگار کے طرف جائے گا اور اس سے ملاقات کرے گا۔
- ۷۔ لیکن وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے۔
- ۸۔ عنقریب اس کے لئے آسان حساب ہوگا۔

۹۔ اور وہ خوشحالی کے ساتھ اپنے گھروں کی طرف پلٹ جائے گا۔

کمالِ مطلق کی طرف رنج آمیز سعی و کوشش

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے مضامین کی تشریح میں کہا ہے، اس سورہ کے آغاز میں ہی عظیم اور عجیب دنیا کے اختتام کے حوادث کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

”جب آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے اور آسمانی اجرام پر اکندہ ہو جائیں گے اور نظام کو اکب درہم و برہم ہو جائے گا

“﴿اِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ﴾۔ (۱)

اس کی نظیر جو سورہ انفطار کی آئی ہے، اس میں فرماتا ہے: ﴿اِذَا السَّمَاءُ انفطرت و اِذَا الْكواكب انشَرت﴾ جس وقت آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے اور ستارے پر اکندہ ہو جائیں گے اور بکھر جائیں۔ (انفطار۔ ۱، ۲)۔ اور یہ اختتام دنیا اور اس کی خرابی و فنا کا اعلان ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

”اور کے پروردگار کا حکم تسلیم کیا جائے گا اور حقیقت میں ایسا ہی ہونا چاہیے“ ﴿و اذنت لربھا و حقت﴾، مبادیہ تصور ہو کہ انسان اس عظمت کے باوجود حکم الہی کا معمولی سا مقابلہ بھی کرے، وہ مطیع و فرمانبردار بندے کی طرح ہے، جس کا اس کے حکم کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم ہے۔

”اذنت“ اصل میں ”اذن“ (بروزن افق) سے جو کان کے معنی میں ہے، لیا گیا ہے اور اس کے معنی کان لگا کر سننا ہے اور یہاں اطاعتِ فرمان کا کنایہ ہے۔ ”حقت“ حق کے مادہ سے شائستہ لائق اور سزاوار کے معنی میں ہے۔ کس طرح ہو سکتا کہ وہ سر تسلیم خم نہ کرے جبکہ لمحہ بہ لمحہ وجود خدا ہی سے اس کو فیض پہنچ رہا ہو۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی یہ رابطہ منقطع ہو جائے تو یہیں ختم ہو کر رہ جائے۔

جی ہاں! آسمان وزمین نہ صرف آغازِ خلقت میں سورہ حم سجدہ کی آیت ۱۱ ﴿قَالَتَا اٰتٰنَا طَاعٰیْنِ﴾ کے مطابق، حق تعالیٰ کے فرمان کے مطابق، حق تعالیٰ کے فرمان کے مطیع تھے، بلکہ عمر کے اختتام میں بھی ایسے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ”حقت“ کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ قیامت کی وحشت اور اس کا خوف ایسا ہے کہ سزاوار ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اور شگافتہ ہو جائیں، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اور بعد والے مرحلہ میں زمین کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”اور جس وقت زمین کھینچی جائے گی اور وسیع کی جائے گی“ ﴿وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ﴾ پہاڑ قرآن کی بہت سی آیات کی شہادت کے مطابق مکمل طور پر پر اکندہ و جائیں گے اور تمام بلندیاں اور پستیاں ختم ہو جائیں گی، زمین صاف و شفاف، وسیع و عریض اور اپنے صحن میں تمام بندوں کے حضور کے لئے آمادہ ہو جائے گی۔

جیسا کہ سورہ طہ کی آیت ۱۰۵ تا ۱۰۷ میں فرماتا ہے: ﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَ لَآمَةً﴾۔ تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دے میرا پروردگار انہیں ہو ایسے اڑائے گا اور برباد کر دے گا پھر زمین کو ہموار اور صاف کرے گا، اس طرح کہ تو اس میں کوئی بلندی و پستی نہیں دیکھے گا اور اس قسم کی دادگاہ و عدالت جس میں اولین و آخرین جمع ہوں، اس کے لئے ایسے میدان کی ضرورت ہے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا ایسی زمین کو قیامت میں اس سے کہیں زیادہ وسیع کر دے گا کہ جس حالت میں اب ہے، تاکہ مخلوق کے حشر کے لئے اس میں زیادہ سے زیادہ آبادی ہو۔^(۲)

تیسرے مرحلہ میں مزید کہتا ہے: ”زمین اس چیز کو جو اس کے اندر ہے، باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی“ ﴿الْقَت مَافِيهَا وَ تَخْلُتْ﴾۔ مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام وہ مردے، جو مٹی اور قبروں میں آرام کر رہے ہیں، اچانک باہر پھینک دیئے جائیں گے اور وہ لباس زندگی زیب تن کریں گے۔

یہ اس کے مشابہ ہے جو سورہ زلزال میں آیا ہے ﴿اُخْرِجَتِ الْاَرْضُ اِنْقَالَهَا﴾۔ زمین اپنے وزنی بوجھ باہر نکالے گی۔ یا جو کچھ سورہ نازعات آیت ۱۳ - ۱۴ میں آیا ہے (فانما هي زجرة واحدة فاذا هم بالسااهرة) صرف ایک ہی صحیحہ ہو گا اور اس کے بعد سب کے سب صفحہ زمین پر ظاہر ہو جائیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا کہ انسانوں کے علاوہ معدنیات اور خزانے جو زمین میں پوشیدہ ہیں، سب کے سب زمین سے باہر آجائیں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ زمین کے اندر پگھلا ہوا مواد ہو لٹاک اور وحشت ناک زلزلوں کی وجہ سے کلی طور پر باہر آکر گرے گا اور وہ تمام پستیوں کو پر کر دے گا اس کے بعد زمین کے اندر کا حصہ بالکل خالی اور ساکن ہو جائے گا۔

ان معانی کے درمیان جمع ہونے میں بھی کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

”اس کے بعد زمین اپنے پروردگار کے سامنے سر تسلیم ختم کر دے گی اور سائنستہ و لائق ہے کہ سر تسلیم خم کرے“ ﴿و اذنت لربھا و حقّت﴾۔ یہ عظیم حوادث، جو تمام موجودات کے سر تسلیم خم کرنے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں، ایک طرف تو اس دنیا کے فنا ہونے کو بیان کرتے ہیں، زمین و آسمان م انسانوں، خزانوں اور گنجینوں کی فنا، اور دوسری طرف عالم آفرینش میں نئے عالم ہستی کے ایجاد کی دلیل ہیں۔ اور تیسرے خداوند عظیم و بزرگ کی ہر چیز خصوصاً معاد و قیامت پر قدرت کی نشانی ہیں۔

جی ہاں! جب یہ حوادث واقع ہوں تو انسان اپنے نیک و بد اعمال کا نتیجہ دیکھ لیتا ہے۔ (یہ ایسا جملہ ہے جو تقدیر میں ہے)۔ اس کے بعد انسان کو مخاطب کرتے ہوئے اور اس راہ میں جو ان کی سر نوشت ہے، ان کے لئے واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”اے انسان تو سعی و کوشش اور رنج و تکلیف کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف بڑھ رہا ہے اور آخر کار اس سے ملاقات کرے گا“ ﴿یا ایہا الانسان انک کادحٌ الیٰ ربک کدحاً فملاقیہ﴾۔

”کدح“ (بروزن مدح) سعی و کوشش کے معنی میں ہے، جو رنج و تعب کے ہمراہ ہو اور جسم و جان پر اثر انداز ہو۔ اسی لئے سخت محنت کرنے والے بیل کو، جس میں کام کرنے کے آثار ظاہر ہوں، ”ثورینہ کدوح“ کہتے ہیں۔ تفسیر کشاف، فخر رازی اور المعانی میں آیا ہے کہ یہ لفظ اصل میں خراش کے معنی میں ہے جو کھال پر لگ جاتی ہے۔ اسی مناسبت سے ان کوششوں پر، جو انسانی پر اثر انداز ہوں، اس کا اطلاق ہوا ہے۔

یہ آیت ایک بنیادی اصل کی طرف اشارہ ہے جو تمام انسانوں کی حیات میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی ہمیشہ زحمت اور رنج و تعب اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ اگر مقصود صرف متاع دنیا تک پہنچنا ہی ہو، تب بھی، چہ جائیکہ مقصود آخرت، سعادت جاوداں اور قرب پروردگار ہو۔

دنیاوی زندگی کی یہ طبیعت اور اس کا یہ مزاج ہے یہاں تک کہ وہ افراد جو انتہائی خوش حالی سے عمر گزارتے ہیں وہ بھی رنج و زحمت اور درد و تکلیف سے بچے ہوئے نہیں۔

پروردگار کی ملاقات کی تعبیر سے یہاں مراد چاہے قیامت کے منظر کا دیکھنا ہو، جو اس کی حاکمیت مطلقہ کا مظہر ہے، یا اس کی جزا و سزا کا آئنا سامنا ہو، شہود باطن کے طریقہ سے خود اس کی ملاقات ہو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رنج و تعب اس دن تک جاری رہے گا اور اس وقت ختم ہوگا جب اس دنیا کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور انسان پاکیزہ عمل کے ساتھ اپنے خدا سے ملاقات کرے گا۔

جی ہاں! رنج و تعب کے بغیر راحت و آرام صرف وہم ہے۔ ”انسان“ کے لفظ سے خطاب، جو ساری نوع انسانی پر حاوی ہے، (انسان کی انسانیت پر انحصار کی طرف توجہ کرتے ہوئے) اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ خدا نے ضروری یہ توانائیاں اس اشرف المخلوقات میں پیدا کی ہیں اور عنوانِ رب پر انحصار اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سعی و کوشش انسانیت کے مکمل و تربیت کے نظام الاوقات کا ایک جز ہے۔

جی ہاں! ہم سب مسافر ہیں جنہوں نے سرحدِ عدم سے رختِ سفر باندھا ہے اور اقلیمِ وجود میں قدم رکھا ہے، ہم سب اس کی راہِ عشق کی راہ رو ہیں اور دوست کے رخِ انور کی مقناطیسی کشش کی بنا پر آئے ہیں۔

اس تعبیر کی نظرِ قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی آئی ہے، مثلاً ﴿و ان الیٰ ربک المنتہیٰ﴾ اور یہ تمام امور تیرے پر وردگار کی طرف لوٹتے ہیں اور تمام خطوط اسی پر منتہی ہوتے ہیں۔ (نجم۔ ۴۲) نیز فرماتا ہے: ﴿و الیٰ اللہ المصیر﴾ ”سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے“ (فاطر۔ ۱۸)۔ اور دوسری آیات سب یہ بتاتی ہیں کہ موجودات کے مکمل کا یہ راستہ خداوند متعال کی طرف جاتا ہے لیکن یہاں تمام انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

”لیکن یہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا، عنقریب اس کا آسان حساب کتاب ہوگا“ ﴿فاما من

اوتی کتابہ بیمینہ فسوف یحاسب حساباً یسیراً﴾۔

اور وہ مسرور ہو کر اپنے اہل خانہ کی طرف پلٹ جائے گا ﴿و ینقلب الیٰ اہلہ مسروراً﴾۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو آفرینش کے مدارِ اصلی میں، وہی مدار جو خدا نے اس انسان کے لئے اس کے سرمایوں، طاقتوں اور توانائیوں کے لئے معین کیا ہے، حرکت کرتے ہیں اور ان کی سعی و کوشش ہمیشہ خدا کے لئے ہے اور ان کی حرکت خدا کی طرف ہے۔

وہاں ان کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیں گے۔ ان کے اعمال کی پاکیزگی، ایمان کی سحت اور قیامت میں نجات کی علامت ہے اور ہل محشر کے مقابلہ میں سرفرازی و سربلندی کا سبب ہے۔

جس وقت میزانِ عدل کے نیچے کھڑے ہوں گے، وہ میزان جو کم سے کم میزان کو تولتی ہے، تو خدا ان کا حساب کتاب آسان کر دے گا، ان کی لغزشوں سے درگزر کرے گا اور ایمان و عملِ صالح کی وجہ سے ان کی سیات کو حسنات میں تبدیل کر دے گا۔

یہ کہ ”حساب یسیر“ سے ملکی امراد ہے، بعض مفسرین نے کہا کہ اس سے مراد سہل و آسان حساب ہے جس میں سخت گیری و دقت نہ ہو، برائیوں سے درگزر اور حسنات کا اجر ہو۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے: (ثلاث من كن فيه حاسبه الله حساباً يسيراً و ادخله الجنة برحمته قالوا و ما هي يا رسول الله ؟ قال تعطي من حرمك و تصل من قطعك و تغفو عمن ظلمك)

تین چیزیں جس شخص میں موجود ہوں خدا اس کے حساب کو آسان کر دے گا، اور اس کو اپنی رحمت سے جنت میں داخل کر دے گا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ کونسی چیزیں ہیں؟ آپ نے فرمایا تو اس کو عطا کر جو تجھے محروم کرے، اس سے صلہ رحم جو تجھ سے قطع رحم کرے اور اس کو معاف کر جو تجھ پر ظلم کرے۔^(۳)

یہ مفہوم روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت میں حساب و کتاب میں دقت و سخت گیری انسانوں کی عقل و دانش کی میزان سے تعلق رکھتی ہے، جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ انما يداق الله العباد في الحساب يوم القيامة على ما اتاهم من العقول في الدنيا ﴾ خدا قیامت میں بندوں کے حساب و کتاب میں اس کی عقل کی مقدار کے مطابق، جو دنیا میں بندہ کو دی گئی ہے، سخت گیری کرے گا۔^(۴)

لفظ اہل کے لئے مندرجہ بالا آیات میں مختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد اس کی بیوی اور ایمان دار اولاد ہے، مومنین جنت میں اس کے پاس پہنچیں گے اور یہ خود ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ انسان جن سے محبت رکھتا ہے، انہیں جنت میں دیکھے اور ان سے قریب رہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے اہل کو جنت کی حوروں کے معنی میں لیا ہے جو مومنین کے لئے معین ہوئی ہیں۔ بعض نے اسے صاحبان ایمان افراد کے معنی میں لیا ہے جس سے وہ دنیا میں محبت کرتا تھا۔ ان تمام معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

۱۔ اذا عرف شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: اذا السماء انشقت لاتي الانسان ربه فحاسبه و جازاه /

۲۔ تفسیر فخر رازی در ذیل آیات زیر بحث۔

۳۔ مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۴۔ نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۳۷۔

چند نکات

۱۔ ایسی حدیث جس میں اعجاز ہے

ایک حدیث میں اذا السماء انشقت کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا (انھا تنشق من الحجرة) (ستارے) کہکشاؤں سے الگ ہو جائیں گے۔^(۱)

یہ حدیث پر معنی اور قابلِ دقت ہے اور علمی معجزات میں شمار ہوتی ہے اور ایسی حقیقت پر سے پردہ اٹھاتی ہے کہ اس زمانہ کے ماہرین علماء میں سے کوئی اس تک نہیں پہنچتا تھا۔ وہ یہ کہ موجودہ زمانے کے ماہرین فلکیات نے اپنے نجوم سے متعلق مشاہدات اور دور بینوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ عالم کہکشاں کا مجموعہ ہے اور ہر کہکشاں شمسی نظاموں اور ستاروں کا مجموعہ ہے اسی بنا پر انہیں ستاروں کے شہر کا نام دیتے ہیں۔

کہ کہکشاں مشہور شہر کا راستہ ہے جو آنکھ سے نظر آسکتا ہے اور نظام ہائے شمسی اور ستاروں کے عظیم مجموعہ اور دائرہ کی مانند ہے، اس کی ایک سمت ہم سے اس قدر دور ہے کہ اس کے ستارے ہمیں سفید بادل کی شکل میں نظر آتے ہیں، لیکن وہ درحقیقت ایک دوسرے سے نزدیک نورانی نقطوں کا مجموعہ ہے۔

وہ سمت جو ہم سے نزدیک ہے اس کے ستارے قابلِ رویت ہیں یہ وہی ستارے ہیں جو رات کے وقت ہم آسمان پر دیکھتے ہیں اور اس طرح ہمارا نظام شمسی سوائے اس کہکشاں کے اور کچھ نہیں ہے۔

مندرجہ بالا روایت کے مطابق حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قیامت کے برپا ہونے کے وقت یہ ستارے جنہیں تم دیکھتے ہو کہکشاں سے جدا ہو جائیں گے اور سب کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اس زمانے میں کون جانتا تھا کہ یہ ستارے جنہیں ہم دیکھ رہے ہیں، واقعی اس کہکشاں کا جز ہیں سوائے اس شخص کے کہ جس کا دل عالم غیب سے مربوط ہو اور علم خدا کے سرچشمہ سے سیراب ہوا ہو۔

۲۔ دنیا رنج و تکلیف اور دکھ درد کا گھر ہے

”کادح“ کی تعبیر مندرجہ بالا آیت میں آئی ہے اور سعی و کوشش کی طرف اشارہ ہے جس میں رنج و زحمت کی آمیزش ہو ، اس طرف توجہ رکھتے ہوئے ، کہ اس کے مخالف تمام انسان ہیں ، اس واقعیت کو پیش کرتی ہے کہ اس جہان کی زندگی کی طبیعت کسی مرحلہ میں بھی مشکلات ، تکالیف اور رنج و مشقت سے خالی نہیں ہے ۔

چاہے یہ مشکلات و تکالیف جسمانی ہوں ، چاہے روحانی اور فکری یا دونوں کسی فرد کو اس سے مفر نہیں ہے ۔ حضرت علی ابن الحسین کی ایک بہت ہی پر معنی حدیث ہے :

(الراحة لم تخلق في الدنيا ولا لاهل الدنيا ، انما خلقت الراحة في الجنة و لاهل الجنة و التعب و النصب خلقا في الدنيا و لاهل الدنيا وما اعطى احد منها جفنة الا اعطى من الحرص مثليها و من اصاب من الدنيا اكثر كان فيها اشد فقيراً لانه يفتقر الى الناس في حفظ امواله و تفتقر الى كل آلة من آلات الدنيا فليس في غنى الدنيا الراحة)

راحت و آرام دنیا میں اہل دنیا کے لئے نہیں ہے ، راحت و آسائش صرف جنت میں ہے اور اہل جنت کے لئے ہے ۔ رنج و تعب دنیا میں ہیں اور اہل دنیا کے لئے پیدا کئے گئے ہیں ۔ اسی وجہ سے جو ایک پیمانہ اس میں سے حاصل کر لیتا ہے تو دگنا لالچ اس کے نصیب میں شامل ہو جاتا ہے اور جس کے پاس مال دنیا کافی ہے وہ زیادہ فقیر ہے ، کیونکہ وہ اپنے مال کی حفاظت کے سلسلہ میں دوسروں کا محتاج ہے اور زیادہ وسائل حفاظت کا محتاج ہے ۔ لہذا دنیا کے مال و دولت میں کوئی راحت و آرام نہیں ہے ۔

اس کے بعد امام نے اس حدیث کے ذیل میں فرمایا: (كلا ما تعب اولياء الله في الدنيا للدنيا بل تعبوا في الدنيا للاحقة) اولياء خدا دنیا میں دنیا کی خاطر رنج و تعب میں نہیں مبتلا ہوتے بلکہ دنیا میں ان کا رنج و تعب آخرت کے لئے ہے ۔

(۱)

آیات ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵

۱۰۔ ﴿وَأَمَّا مَنْ أَوْتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ﴾۔

۱۱۔ ﴿فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا﴾۔

۱۲۔ ﴿وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا﴾۔

۱۳۔ ﴿إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مُسْرورًا﴾۔

۱۴۔ ﴿إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ﴾۔

۱۵۔ ﴿بَلَىٰ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا﴾۔

ترجمہ

۱۰۔ اور رہا وہ شخص جس کو اس کا نامہ اعمال پیچھے کی طرف سے دیا گیا۔

۱۱۔ تو عنقریب اس کی فریاد بلند ہوگی کہ وائے ہو مجھ پر میں ہلاک ہو گیا۔

۱۲۔ اور وہ جہنم کی آگ کے جلانے والے شعلوں میں جلے گا۔

۱۳۔ وہ اپنے گھروں کے درمیان (کفر و گناہ کے سبب) مسرور تھا۔

۱۴۔ وہ گمان کرتا تھا کہ کبھی پلٹ کر نہیں آئے گا۔

۱۵۔ جی ہاں! اس کا پروردگار اس کے مقابلہ میں بینا تھا۔

وہ جو شرم و حیا کے باعث اپنا نامہ اعمال پشت کی طرف سے لیں گے

اس بحث کے بعد، جو گذشتہ آیات میں اصحاب الیمین (وہ مومنین جن کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا) کے بارے میں گزر چکی ہے، ان آیات میں کفار مجرّمین اور ان کے نامہ اعمال کی کیفیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”باقی رہا وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کی پشت کی طرف سے دیا جائے گا“ (و اما من اوتی کتابہ واء ظہرہ)۔ عنقریب وہ فریاد کرے گا کہ وائے ہو مجھ پر کہ میں ہلاک ہو گیا (فسوف یدعوا ثبوراً)۔ ”اور آگ کے جلانے والے شعلوں میں جلے گا“ (ویصلی سعیراً)۔

یہ کہ ان کے نامہ اعمال کس طرح ان کے پس پشت سے دیں گے اور کس طرح یہ آیت اور وہ آیات جو کہتی ہیں کہ ان کے دائیں ہاتھ میں دیں، ایک جگہ جمع ہوں گی، اس سلسلہ میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔ بعض نے کہا کہ ان کے دائیں ہاتھ گردن کے ساتھ زنجیر سے بندھے ہوں گے اور ان کے نامہ ہائے اعمال بائیں اور پشت کے پیچھے سے ملیں گے جو ذلت و خواری کے سرینچے رکھنے اور شرمساری کی علامت ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ ان کے دونوں ہاتھ قیدیوں کے طرح پیچھے باندھ دیئے جائیں گے۔ بعض دوسروں نے کہا ہے کہ سورہ نساء کی آیت ۴۷ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہتی ہے: ﴿مَنْ قَبْلِي اَنْ نَطْمِسَ وُجُوْهُا فَنَرُهَا عَلٰى اَدْبَارِهَا﴾۔ ”اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں اور پشت کی طرف پھیر دیں“ اس طرح گمراہ مجرمین کے منہ عقب کی جانب مڑ جائیں گے اور ضروری ہے کہ وہ اپنے نامہ ہائے اعمال خود پڑھیں۔ لہذا وہ ان کے بائیں ہاتھ میں پشت کی جانب انہیں دیں گے۔

لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ اصحاب الیمین سرفرازی اور فخر و مباہات کے ساتھ اپنا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں لیتے ہوئے پکار کر کہیں گے ﴿هَآؤْ مَ اَقْرَءِ الْكِتٰبِيْهٖ﴾ ”اے اہل محشر آؤ اور میرا نامہ اعمال لے کر پڑھو“ (حاقہ - ۱۹)۔ لیکن گناہگاروں کو ان کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیں گے تو وہ شرمساری اور ذلت سے اپنا ہاتھ پشت کے پیچھے کر لیں گے تاکہ جرم کی سند کم تر دکھی جائے۔

لیکن فائدہ کچھ نہیں ہوگا اس لئے کہ وہاں کوئی چیز پوشیدہ رہنے والی نہیں ہے۔ ﴿يَدْعُوْا ثُبُوْرًا﴾، اس کی تعبیر کی طرف اشارہ ہے جو عرب کس خطرناک حادثہ کے موقع پر کرتے ہیں اور فریاد بلند کرتے ہیں ﴿وَاَنْبُوْا﴾، اے والے کہ میں ہلاک ہو گیا۔

توجہ فرمائیں کہ ”ثبور“ ہلاکت کے معنی میں ہے۔ لیکن یہ آہ نالہ و فریاد کسی کے کان تک نہیں پہنچے گی۔ اس کے بعد ﴿وَيَصْلٰى سَعِيْرًا﴾ ہے یعنی وہ جہنم کے جلانے والی آگ میں داخل ہوگا۔ اس کے بعد اس منحوس سرنوشٹ کی علت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”یہ اس بناء پر ہے کہ وہ اپنے گھروں میں ہمیشہ اپنے (کفر و گناہ کی وجہ سے) خوش رہتا تھا ﴿اِنَّهٗ كَانَ فِىْ اَهْلِهٖ مُسْرِوْرًا﴾، ایسا سرور جس میں غرور کی آمیزش تھی اور ایسا غرور جو غفلت اور خدا سے بے خبری کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے تھا، ایسا غرور جو دنیا کے ساتھ شدید و بستگی اور موت کے بعد والے جہان سے بے پرواہی کی نشانی تھا۔

واضح رہے کہ ذاتی طور پر سرور و خوش حالی مذموم چیز نہیں ہے بلکہ مومن کو چاہیئے کہ لطفِ خدا سے مسرور ہو اور رہنے سہنے کے انداز میں ہشاش بشاش ہو۔ وہ سرور و خوشی مذموم ہے جو انسان کو یاد خدا سے غافل کر دے اور خواہشات کا اسیر بنا کر رکھ دے۔

اس لئے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”یہ اس بنا پر ہے کہ وہ گمان کرتا تھا کہ کبھی واپس نہیں لوٹے گا اور معاد و قیامت کا کوئی امکان نہیں ہے“ ﴿انہ ظن ان لن یحور﴾۔ حقیقت میں اس کی بد بختی کا سبب اصلی اس کا اعتقاد فاسد اور گمان باطل تھا، جس کا دار و مدار انکار قیامت پر تھا۔

یہی اعتقاد اس کے غرور و سرور کا باعث ہوا، اس نے اس کو خدا سے دور کیا اور خواہشات کا اسیر بنا کر رکھ دیا، یہاں تک کہ وہ انبیاء کی دعوت فکر کا مذاق اڑاتا اور جب اپنے گھر والوں کے پاس آتا تو اس مذاق سے خوش ہوتا۔ یہی مفہوم سورہ مطففین کی آیت ۳۱ ﴿و اذا انقلبوا الیٰ اہلہم انقلبوا فکھین﴾ میں بھی آیا ہے۔ اس طرح قارون اس مغرور دولت مند اور خدا سے بے خبر انسان کی داستان میں بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے باخبر افراد اس سے کہتے تھے ﴿لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین﴾

اس قدر متکبرانہ طور پر خوش نہ ہو کیونکہ خدا خوش ہونے والے مغروروں کو دوست نہیں رکھتا (قصص۔ ۷۶) ”لن یحور“ کبھی واپس نہیں لوٹے گا۔ ”یحور“۔ ”حور“ (بروزن غور) کے مادہ سے تردد اور آمد و رفت کے معنی میں ہے، خواہ یہ آمد و رفت عمل ہو یا فکر و نظریں، اسی لئے پانی کے حوض یا تالاب میں گردش کرنے کے سلسلہ میں اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور محور اس کو کہتے جس کے گرد چرخ گھومتا ہے، محاورہ بحث کی آمد و رفت اور رد و بدل کے معنی سے ہے اور ”حوار“ بھی انہی معانی میں ہے اور کبھی اس دار کے معنی میں بھی آتا ہے جو بحث کے آوازن بلند ہوتی ہے اور تحیر بھی کسی مسئلہ میں فکر کی آمد و رفت کا نتیجہ ہے جس کا لازمہ عمل میں سرگردانی ہے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس لفظ کی اصل جشی ہے۔ اور ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ میں قرآن کے اس جملے کے معنی نہیں جانتا تھا، یہاں تک کہ ایک بیابانی عرب سے میں نے سنا کہ وہ اپنی لڑکی سے کہہ رہا تھا ”حوری“ یعنی واپس آجا۔^(۱)

اسے ”حور“ کے مادہ سے دھونے اور سفید کرنے کے معنی میں سمجھا ہے، کیونکہ وہ لوگوں کے دلوں کو شرک و گناہ کے زنگ سے پاک و صاف کرتے تھے، اور جنت کی حوروں کو اسی لئے یہ نام دیا گیا ہے کہ ان کا رنگ سفید ہے، یا ان کی آنکھوں کی سفیدی بہت زیادہ ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ جنت کی حوروں کے لئے اس لئے بولا جاتا ہے کہ وہ اس قدر خوبصورت ہیں کہ آنکھ انہیں دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ لیکن بہر حال یہ لفظ زیر بحث آیت میں بازگشت اور معاد کے معنی میں ہے ”جی ہاں! اس کا پروردگار اس کے بارے میں بیٹا تھا“ ﴿بَلٰی اِنَّ رَبَّہٗ كَانَ بِہٖ بَصِیْرًا﴾ اس کے تمام اعمال کو لکھوایا اور روز حساب کے لئے ایک نامہ اعمال میں انہیں محفوظ کیا۔ اس آیت کی تعبیر گزشتہ آیت (یا ایھا الانسان انک کادح الی ربک کد حافلاً) کی مانند عقیدہ و معاد پر دلیل و حجت شمار ہو سکتی ہے۔

خصوصاً دونوں آیات میں رب یعنی پروردگار کے عنوان پر انحصار ہوا ہے، اس لئے کہ انسان کی سیر ارتقاء یعنی پروردگار تک پہنچنے کا عمل، موت کے آنے پر منقطع نہیں ہوتا اور دنیاوی زندگی ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ خود مقصود تکامل ہو نیز انسان کے اعمال کے بارے میں خدا کا بصیر ہونا اور ان کے اعمال کو تحریر کیا جانا حساب و سزا و جزا کی تہید ہی بن سکتا ہے، ورنہ فضول ہے۔

آیات ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵

- ۱۶۔ ﴿فَلَا اقْسَمْ بِأُشْفُقَ﴾۔
- ۱۷۔ ﴿وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ﴾۔
- ۱۸۔ ﴿وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ﴾۔
- ۱۹۔ ﴿لَتَرْكَبَنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾۔
- ۲۰۔ ﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾۔
- ۲۱۔ ﴿وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ﴾۔
- ۲۲۔ ﴿بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يَكْذِبُونَ﴾۔
- ۲۳۔ ﴿وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ﴾۔
- ۲۴۔ ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾۔
- ۲۵۔ ﴿لَا أَمْنًا وَاعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾۔

ترجمہ

- ۱۶۔ شفق کی قسم۔
- ۱۷۔ اور رات کی قسم جسے وہ جمع کرتی ہے۔
- ۱۸۔ اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ بدر کامل ہوتا ہے۔
- ۱۹۔ تم سب ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتے ہو۔
- ۲۰۔ پس وہ کیوں ایمان نہیں لاتے؟
- ۲۱۔ اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جائے تو سجدہ نہیں کرتے۔
- ۲۲۔ بلکہ کفار ہمیشہ آیات الہی کی تکفیر کرتے ہیں۔
- ۲۳۔ خدا اس چیز کو جسے وہ دل میں چھپائے رکھتے ہیں، اچھی طرح جانتا ہے۔
- ۲۴۔ پس انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے۔

۲۵۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیئے ہیں، تو ان کے لئے ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔

تم ہمیشہ دگرگوں ہوتے رہتے ہو

اس بحث کے بعد جو گشتہ آیات میں خدا کی طرف سے انسان کی سیر تکامل کے بارے میں آئی تھی ان آیات میں ان مفہوم کی تاکید اور مزید توضیح کے لئے فرمایا ہے:

”قسم شفق کی“ ﴿فَلَا اَقْسَمُ بِاشْفَقٍ﴾۔ اور قسم ہے ان پر اکندہ امور کی جنہیں وہ اکھٹا کرتی ہیں ﴿وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ﴾۔ اور قسم ہے چاند کی جب وہ کامل ہوتا ہے اور چودھویں کے چاند کی صورت اختیار کر لیتا ہے ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا اتَسَقَ﴾، کہ تم سب ہمیشہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتے ہو ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾۔

فلا اقسام کے جملہ میں لا کا لفظ، جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے، زائدہ ہے اور تاکید کے لئے ہے۔ اگرچہ بعض کا خیال ہے کہ نفی کے لئے ہو یعنی میں قسم نہیں کھاتا اس بناء پر کہ مفہوم عیاں ہے۔ قسم کی ضرورت نہیں ہے، یا یہ کہ مطلب اس قدر اہم ہے کہ ان قسموں کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کی قسم کھائی جائے۔ لیکن پہلے معنی (زائد اور تاکید کے لئے ہونا) زیادہ مناسب ہے۔

”شفق“ مفردات میں راغب کے بقول دن کی روشنی رات کی تاریکی سے آمیختہ ہونا ہے، اس لئے لفظ اشفاق اس توجہ اور عنایت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس میں خوف کا عنصر پایا جاتا ہو۔ مثلاً اگر کوئی فرد کسی شخص کے لئے محبت کے جذبات رکھتا ہو اور اس کے بارے میں کچھ حوادث سے ڈرتا ہو تو اس حالت کو اشفاق اور ایسے شخص کو مشفق کہتے ہیں۔

لیکن فخر رازی کا نظریہ ہے کہ شفق کا لفظ اصل میں رقت اور نازک ہونے کے معنی میں ہے۔ رقت کے معنی پتلا ہونا ہے۔ اسی لئے بہت ہی نازک اور پتلے لباس کو شفق کہتے ہیں اور شفقت کا لفظ رقت قلب کی حالت کے لئے بولا جاتا ہے (لیکن راغب کا قول زیادہ صحیح نظر آتا ہے)۔

بہر حال شفق سے مراد وہی روشنی ہے جو آغاز شب کی تاریکی کی آمیزش رکھتی ہو اور چونکہ ابتدائے شب میں ایک کم رنگ کی سرخی افق مغرب پر پیدا ہوتی ہے اور پھر اس کی جگہ سفیدی لے لیتی ہے، جو اس میں اختلاف ہے کہ شفق کا اطلاق اس سرخی پر ہے یا سفیدی پر۔

علماء مفسرین کے درمیان مشہور و معروف وہ پہلے معنی ہیں اور اشعار عرب میں بھی اسی پر انحصار کیا گیا ہے اور شفق کو شہیدوں کے خون سے تشبیہ دیتے ہیں اور (دماء الشهداء) کہتے ہیں۔

لیکن بعض مفسرین نے دوسرے معنی کو منتخب کیا ہے جو بہت ضعیف نظر آتے ہیں، خصوصاً یہ کہ اگر اس کی لغوی اصل کے معنی ہم رقت سمجھیں تو پھر اس کم رنگ کی سرخی سے مناسبت رکھتے ہیں جو سورج کی رقیق اور پتلی روشنی اور نور ہے۔

بہر حال چونکہ شفق کا ظہور دنیا میں ایک گہری تبدیلی اور دگرگونی کی حالت کی خبر دیتا ہے اور دن کے اختتام اور رات کے آغاز کا اعلان کرتا ہے، اس کے علاوہ اس میں ایک خاص قسم کا جلدہ زیبائی اور خوبصورتی ہے، اور ان سب سے قطع نظر نماز مغرب کے وقت کی قسم کھائی ہے تاکہ سب لوگوں کو خبردار اور آمادہ کرے کہ وہ اس خوبصورت آسمانی وجود کے بارے میں غور کریں۔

باقی رہا رات کی قسم کھانا تو وہ ان بہت سے آثار و اسرار کی بنا پر ہے جو اس میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس پر ہم پہلے مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔^(۱)

جانوروں، پرندوں، یہاں تک کہ انسانوں کے اپنے گھروں، آشیانوں اور گھونسلوں کی طرف رات کے وقت لوٹنے کی طرف اشارہ ہے جس کا نتیجہ جانوروں کا عمومی آرام و سکون اور آسائش ہے اور یہ رات کے اہم آثار و اسرار میں سے ایک شمار ہوتا ہے جیسا کہ سورہ مو من کی آیت ۶۱ میں ہم پڑھتے ہیں ﴿اللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ لَیْسَکُنُوْا فِیْہِ﴾، خدا وہ ہے جس نے رات کو تمہارے لینے خلق کیا ہے تاکہ تم اس میں آرام و سکون حاصل کرو۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اذا اتسق کی تعبیر اسی مادہ سے ہے اور مختلف وجودوں کے جمع ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں چودھویں رات کے چاند کی روشنی کے کمال کے معنی میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ چاند اس حالت میں بہت ہی خوبصورت لگتا ہے اور ہر دیکھنے والی آنکھ کو دل کش نظر آتا ہے۔

اس کا نور صفحہ زمین کو روشن کرتا ہے۔ اس کے ہلکے رنگ کی روشنی جو رات کے آرام و سکون کو خراب نہیں کرتی۔ رات کے مسافروں کو راستہ دکھاتی ہے اس لئے وہ خدا کی عظیم آیات میں سے ایک آیت ہے۔ اسی بناء پر اس کی قسم کھائی گئی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ چاروں موضوعات جن کی ان آیات میں قسم کھائی گئی ہے (شفق، رات اور وہ موجودات جنہیں رات جمع کرتی ہے اور چودھویں رات کا چاند)۔

یہ سب ایسے جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک ایسے خوبصورت مجموعہ کو تشکیل دیتے ہیں جو انسانی فکر میں تحریک پیدا کرتا ہے تاکہ وہ تخلیق کی عظیم وقت پر غور و فکر کرے اور ان تیز تبدیلیوں سے وقوعِ قیامت اور قدرتِ خدا کے بارے میں آشنائی حاصل کرے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مختلف امور کا یہ حصہ ایسے حالات اور تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے جو عالمِ آفرینش میں ایک دوسرے کے ساتھ رونما ہوتی ہیں۔

سورج چہرے پر نقاب ڈالتا ہے تو شفق ظاہر ہو جاتی ہے جو اس کے نور کا بقیہ ہے۔ انسان، پرندہ، چرند بڑی تیزی سے اپنے ٹھکانوں اور آشیانوں کی طرف لوٹتے ہیں اور چاند بدرِ کامل کی شکل میں بلند ہوتا ہے۔

توجہ فرمائیں کہ چودھویں کا چاند رات کے اسی ابتدائی حصہ میں طلوع ہوتا ہے اور ان قسموں کو ”لترکبن طبقاً عن طبق“ کے اس جملے کی تمہید قرار دیتا ہے جو مختلف ایسے حالات کو بیان کرتا ہے جو انسان اپنی راہ حیات میں یکے بعد دیگرے پیدا کرتا ہے۔ اس جملے کے لئے مفسرین نے مختلف تعبیریں بیان کی ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے۔

۱۔ مراد وہ گونا گوں حالات ہیں جو انسان، خدا اور کمالِ مطلق کی جانب سفر کرنے کے پر مشقت راستے پیدا کرتا ہے۔ پہلے عالمِ دنیا، پھر عالمِ برزخ ہے اور پھر قیامت اور اس کے مختلف حالات ہیں۔ (توجہ فرمائیں کہ ”طبق“ ”مطابقہ“ کے مادہ سے ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر قرار دینے کے معنی میں ہے اور ان منزلوں کے معنی میں ہے جنہیں انسان اپنی سیر صعودی میں طے کرتا ہے)۔

۲۔ مراد وہ حالات ہیں جنہیں انسان کو نطفہ سے لے کر موت تک کے سفر میں سامنا کرنا ہوتا ہے۔ بعض محققین نے ایسی ۳۷ حالتیں شمار کی ہیں۔

۳۔ مراد وہ مختلف حالات و شدائد ہیں جن میں سے انسان دنیاوی زندگی میں صحت و بیماری، غم و اندوہ سرور و مسرت، سختی و آرام اور صلح و جنگ کی صورت میں دوچار ہوتا ہے۔

۴۔ مراد وہ مختلف حالات و شدائد ہیں جن سے انسان قیامت میں دوچار ہوگا یہاں تک کہ حساب سے فارغ ہو کر ہر شخص اپنے اعمال کے نتیجے میں دوزخ اور جنت کی طرف جائے گا۔

۵۔ مراد وہ حالات ہیں جو گزشتہ قوموں کو پیش آئے یعنی وہی تلخ و شیریں حوادث اور انواع و اقسام کی تردیدیں اور مخالفین کے انکار اس امت میں بھی واقع ہوں گے یہ مضامین ایک اور رویت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوئے ہیں۔

ان تفسیروں کا جمع ہونا بھی معنی نہیں رکھتا۔ ہو سکتا ہے کہ آیت ان تمام تبدیلیوں، تغیرات اور مراحل کی طرف اشارہ کر رہی ہو جنہیں انسان اپنی زندگی میں دیکھتا ہے۔ بعض مفسرین یہاں مخاطب خود پیغمبر کو سمجھتے ہیں اور آیت کی ان آسمانوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جن سے پیغمبر اسلام معراج کی شب گزرے ہیں۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”لترکبن“ میں جو ”ب“ ہے اور پرپیش ہے اور جمع کے معنی دیتا ہے، اس لئے یہ تفسیر مناسب ہے۔ خصوصاً یہ کہ گزشتہ آیات میں بھی مخاطب کل انسان تھے۔

بہر حال ان حالات کا حدوث اور آدمی کا ایک حالت پر قیام نہ کرنا ایک تو اس کے مخلوق ہونے اور محتاج خالق ہونے کی دلیل ہے، اس لئے کہ ہر متغیر حادث ہے اور ہر حادث کو خالق کی ضرورت ہے، دوسرے اس جہان کی ناپائیدار ہونے کی دلیل ہے۔

تیسرے انسان کی پروردگار عالم کی طرف حرکتِ مستمر مسئلہ معاد و قیامت کی نشانی ہے جیسا کہ گزشتہ آیات میں آیا تھا ﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ انْكِارِ إِلَى رَبِّكَ كَدْحًا فَمَلَا قِيَهُ﴾

اس کے بعد گزشتہ مباحث ایک نتیجہ کلی اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”وہ ایمان کیوں نہیں لاتے“ ﴿فَمَالَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾، اس کے باوجود کے حق کے دلائل واضح و آشکار ہیں، توحید و خدا شناسی کے بھی اور معاد و قیامت کے بھی۔ آیات آفاقی بھی جو رات دن کی خلقت اور چاند سورج، نور و ظلمت، طلوع و غروب، آفتاب و شفق، رات کی روشنی اور رات کی روشنی کے تکامل میں چھپے ہوئے ہیں۔ اور آیات انفسی بھی۔ اس لمحے سے لے کر جب انسان کا نطفہ رحم میں قرار پاتا ہے اور یکے بعد دیگرے مختلف مراحل طے کرتا ہے یہاں تک کہ عالم جنین میں اپنے اوج کمال کو پہنچتا ہے، اس کے بعد ولادت کے لمحے سے لیکر موت تک دوسرے مراحل طے کرتا ہے، تو ان واضح نشانیوں کے باوجود نوع بشر ایمان کیوں نہیں لاتی۔

اس کے بعد کتاب تکوین سے کتاب حق کی طرف رخ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ خضوع اختیار کیوں نہیں کرتے“۔ ﴿وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ﴾۔

قرآن جو آفتاب کے مانند اپنی دلیل آپ ہے، نور اعجاز اس کے مختلف پہلوؤں سے عیاں ہے، پھر اس کے مضامین و مشمولات یہ سب اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اسے وحی کے سرچشمہ سے لیا گیا ہے۔

قرآن کے بارے میں ہر غیر جانب دار یہ جانتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ قرآن کسی انسان کے دماغ کی تخلیق ہو۔ پھر انسان بھی ایسا جس نے کبھی کوئی سبق نہیں پڑھا ہو اور ایک ایسے ماحول میں اس نے زندگی بسر کی ہو جو خرافات و ظلمات سے پر ہو۔ یہاں سجدہ سے مراد خضوع، تسلیم اور اطاعت ہے۔^(۲)

اور وہ مشہور سجدہ جس میں پیشانی کو زمین پر رکھتے ہیں، اس مفہوم کلی کا ایک مصداق ہے۔ اور شاید اسی بنا پر بعض روایات میں آیا ہے کہ پیغمبر نے ان آیات کی تلاوت فرمائی تو سجدہ کیا۔

البتہ فقہائے اہلبیت کے مشہور فتوے کے مطابق یہ سجدہ قرآن کے مستحب سجدوں میں سے ہے اور اہل تسنن کے چاروں مذاہب اس آیت کی تلاوت کے وقت سجدہ کرنا واجب سمجھتے ہیں، سوائے امام مالک کے جن کا نظریہ ہے کہ سورہ کے ختم ہونے کے بعد سجدہ کرنا چاہیے۔^(۳)

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”بلکہ کفار ہمیشہ آیات الہی اور معاد قیامت کی تکذیب کرتے ہیں“ ﴿بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يَكْذِبُونَ﴾۔ یہاں فعل مضارع کا استعمال، جو عام طور پر استمرار کے لئے ہوتا ہے، ان معانی کا گواہ ہے کہ وہ اپنی تکذیب پر مصر تھے اور یہ ایسا اصرار تھا جو محض ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے تھا۔ ان کی تکذیب ایسی نہیں تھی کہ انہیں اس کے لئے دلیلیں نہیں مل سکی تھیں، بلکہ تعصب، اندھی تقلید، مادی منفعتوں کی حفاظت اور شیطانی خواہشات کی تسکین کے لئے تھی۔

اس کے بعد تہدید آمیز لہجے میں فرماتا ہے: ”خدا اسے اچھی طرح جانتا ہے جسے وہ اپنے دل کے اندر پنہاں رکھتے ہیں“ ﴿وَاللَّهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُونَ﴾۔ خدا ان کی نیتوں، مقاصد اور ایسی ترغیبات سے، جو مسلسل تکذیبوں کا سبب بنتی ہیں، باخبر ہے، وہ چاہے کتنی ہی پردہ پوشی کیوں نہ کریں، انجام کار انہیں اس کی سزا ملے گی۔

”یوعون“ ”وعاء“ کے مادہ سے ظرف اور برتن کے معنی میں ہے، جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کی مشہور عبارت سے نہج البلاغہ میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

﴿اِنَّ هَذِهِ الْقُلُوبَ اَوْعِيَةٌ فَخِيَرَهَا اَوْعَاهَا﴾ یہ دل ظروف ہیں اور ان میں سے بہترین دل وہی ہے جس کی حفاظت اور ظرفیت زیادہ ہو۔

اور بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ”پس انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے“ ﴿فبشرهم بعذاب الیوم﴾ بشارت کی تعبیر جو عام طور پر خوشخبری کے لئے استعمال ہوتی ہے، یہاں ایک قسم کے طعن اور سرزنش کے طور پر ہے۔ درحقیقت وہ اس طرح مومنین کو جنت کی وسیع نعمتوں کی بشارت دیتا ہے تاکہ تکذیب کرنے والے دوزخی حسرت و اندوہ میں ڈوب جائیں۔ اس سورہ کی آخری آیت میں ایک استثناء کی شکل میں ایک مرتبہ پھر نیک عمل مومنین کی سرنوشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دیے ان کے لئے اجر و ثواب ہے، ایسا اجر جو ثابت شدہ اور منقطع نہ ہونے والا اور ہر قسم کے نقصان سے محفوظ ہے۔“

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾۔

”ممنون“ ”من“ کے مادہ سے نقصان و انقطاع کے معنی میں آیا ہے اور منت کے معنوں میں بھی ہے۔ (لفظ ممنون جو موت کے معنوں میں ہے وہ بھی اسی مادہ سے ہے) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب معانی یہاں جمع ہوں، اس لئے کہ آخرت کی نعمتیں دنیاوی نعمتوں کے برعکس، جو ناپائیدار اور نقصان پذیر بھی ہیں اور عام طور پر غیر مطلوب عوارض کی آمیزش رکھتی ہیں، کسی قسم کی منت نقصان، فنا اور غیر مطلوب عوارض نہیں رکھتیں۔ وہ جاودانی ہیں، نقصان ناپذیر ہیں اور ہر قسم کے نامناسب امور اور منت و احسان سے مبرا ہیں، یہ استثناء متصل ہے یا منقطع مفسرین کے درمیان اس میں اختلاف ہے۔

بعض نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ استثناء منقطع ہے، یعنی کفار کے حالات کی تشریح جو گزشتہ آیات میں تھی اس کو چھوڑ کر مومنین کی جاودانی اجر کی بات کرتا ہے لیکن زیادہ مناسب یہی ہے کہ استثناء متصل ہو اور مقصد یہ ہو کہ کفار کے سامنے بازگشت کی راہ کھولے اور انہیں یہ یہ بتائیں کہ جو لوگ توبہ کرے کے ایمان لے آئیں اور اعمال صالح انجام دیں، ان سے عذاب دائمی اٹھا لیا جائے گا اور انہیں ایسا اجر دیا جائے گا جو دائمی ہوگا اور جس میں نقصان کا کوئی پہلو نہ ہوگا۔

ایک نکتہ

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اس سورہ کی آخری آیات سے پہلے تو اختیار اور ارادہ کی آزادی کا اصل کی فائدہ اٹھاتے ہیں، اس لئے مجبور افراد کے بارے میں ترک سجدہ اور ترک ایمان پر ملامت کرنا خداوند حکیم کے لئے یہ ایک امر قبیح ہے

اور وہ جو یہ فرماتا ہے: ﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ﴾ مسئلہ اختیار پر واضح دلیل ہے، اور پھر ترک سجدہ پر ملامت کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ کفار جس طرح اصول دین کے مکلف ہیں اسی طرح فروع دین کے بھی مکلف ہیں۔ (یہ گفتگو اس صورت میں ہے جب لفظ سجدہ مذکورہ بالا آیت میں نماز والے سجدے کے معنی میں ہو یا کم از وسیع معانی رکھتا ہو جس میں سجدہ نماز بھی شامل ہے)۔

خداوند! جس دن سب لوگ تیری داد گاہ عدل میں حاضر ہوں گے ہم پر حساب آسان کر دیجو۔
 پروردگار! اس راہ میں جہاں تمام بندے تیری طرف سفر کرتے ہیں صراطِ مستقیم طے کرنے میں ہماری مدد فرما۔
 بار الہا! ہم تیرے قرآن کریم کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں، ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔

آمین یا رب العالمین

۱۔ تفسیر نمونہ۔ جلد ۹، ۱۴۳، سورہ قصص کی آیت ۷۱ تا ۷۳ سے رجوع فرمائیں۔

”ما وسق“ کی تعبیر ۲ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”وسق“ بکھری ہوئی چیزوں کے جمع کرنے کے معنی میں ہے ۳ اور مختلف قسم کے

۲۔ ”ما وسق“ میں ما موصولہ ہے اور اس کے مصدر یہ ہونے کا احتمال ضعیف ہے اور اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر بھی محذوف ہے اور تقدیر میں ”وما وسقه“ ہے۔

۳۔ ”وسق“ (بروزن غضب) اونٹ کے ایک باریا ساٹھ صاع جس کا ہر صاع تقریباً تین کلو ہے کے معنی میں آیا ہے اور وہ بھی ان سب کے مجتمع ہونے کے معنی میں ہے۔

۲۔ ان معانی کے شواہد میں سے گزشتہ اور آئندہ آیات کی شہادت کے علاوہ ایک یہ ہے کہ سجدہ جس کے معنی تلاوت قرآن کے وقت زمین پر پیشانی رکھنا ہے، سوائے چند آیات کے نہ واجب ہے نہ مستحب، اس لئے یہ جو کہہ رہا ہے کہ قرات قرآن کے وقت وہ سجدہ کیوں نہیں کرتے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سجدے سے مراد سارے قرآن کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔

۳۔ روح البیان، جلد ۱، ص ۱۳۸۲

سورہ بروج

یہ سورہ مکے میں نازل ہوا اس میں ۲۲ آیتیں ہیں

سورہ بروج کے مضامین اور اس کی فضیلت

ابتدائے بعثت کے زمانے میں مومنین (مکہ میں) بہت سخت رنج و تکلیف اور دباؤ کی حالت میں تھے اور ہمیشہ دشمنوں کی طرف سے جسمانی اور روحانی اذیتوں میں گرفتار رہتے تھے اور یہ اس وجہ سے تھا کہ راہ ایمان کو خیر باد کہہ دیں

اس سلسلہ میں ایک گمروہ نے صورت حال کا مقابلہ کیا، لیکن بعض کمزور افراد دشمنوں کے مقابلہ میں شکستہ دل ہو کر ایمان سے پلٹ گئے۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ ان مومنین کی پامردی اور استقامت کا شوق دلایا ہے اس صورت حال کے حوالے سے پروردگار عالم اس سورہ میں اصحابِ اخدود کے واقعہ کو نقل کرتا ہے: وہی لوگ جنہوں نے خندق کھودی، اس میں بہت زیادہ آگ جلائی اور مومنین کو اس آگ میں جلانے کی دھمکی دی اور ایک گمروہ کو اس آگ میں جلایا، لیکن انہوں نے راہ ایمان کو خیر باد نہیں کہا۔ پھر اس سورے کے دوسرے حصہ میں ان کافروں کو تنبیہ کرتا ہے جنہوں نے مومنین پر دباؤ ڈال رکھا تھا، اور انہیں جہنم میں جلانے والے عذاب کی خبر دیتا ہے جب کہ جنت کے پر نعمت باغات کی مومنین کو بشارت دیتا ہے۔

بعد والے حصہ میں انہیں گزشتہ تاریخ کی طرف لے جاتا ہے اور فرعون و ثمود اور دیگر ظالم اقوام کی داستانیں ان کی نگاہوں کے سامنے مجسم کر کے پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ عذاب الہی نے انہیں کس طرح نابود کر دیا، تاکہ کفار مکہ جو ان کی نسبت بہت کمزور تھے اپنا اندازہ لگالیں۔ نیز یہ کہ یہ صورت حال پیغمبر اور مومنین کے دلوں کی تسلی کا سبب بھی ہو۔ اس سورہ کے آخری حصہ میں قرآن مجید کی عظمت اور وحی الہی کی سب سے زیادہ ہیبت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اسی مفہوم پر سورہ کو ختم کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ سورہ مومنین کو ظالموں کے مقابلہ میں پامردی و استقامت اور صبر و شکیبائی کا درس دیتا ہے۔ اس کی آیتوں کے اندر نصرت الہی کا وعدہ بھی چھپا ہوا ہے، اس سورہ کا جو بروج کا نام رکھا گیا ہے وہ اس لفظ کی وجہ سے ہے جو اس کی پہلی آیت میں آیا ہے

ابتدائے بعثت کے زمانے میں مومنین (مکہ میں) بہت سخت رنج و تکلیف اور دباؤ کی حالت میں تھے اور ہمیشہ دشمنوں کی طرف سے جسمانی اور روحانی اذیتوں میں گرفتار رہتے تھے اور یہ اس وجہ سے تھا کہ راہ ایمان کو خیر باد کہہ دیں

اس سلسلہ میں ایک گروہ نے صورت حال کا مقابلہ کیا، لیکن بعض کمزور افراد دشمنوں کے مقابلہ میں شکستہ دل ہو کر ایمان سے پلٹ گئے۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ ان مومنین کی پامردی اور استقامت کا شوق دلایا ہے اس صورت حال کے حوالے سے پروردگار عالم اس سورہ میں اصحابِ اخدود کے واقعہ کو نقل کرتا ہے: وہی لوگ جنہوں نے خندق کھودی، اس میں بہت زیادہ آگ جلائی اور مومنین کو اس آگ میں جلانے کی دھمکی دی اور ایک گروہ کو اس آگ میں جلایا، لیکن انہوں نے راہ ایمان کو خیر باد نہیں کہا۔ پھر اس سورے کے دوسرے حصہ میں ان کافروں کو تنبیہ کرتا ہے جنہوں نے مومنین پر دباؤ ڈال رکھا تھا، اور انہیں جہنم میں جلانے والے عذاب کی خبر دیتا ہے جب کہ جنت کے پر نعمت باغات کی مومنین کو بشارت دیتا ہے۔

بعد والے حصہ میں انہیں گزشتہ تاریخ کی طرف لے جاتا ہے اور فرعون و ثمود اور دیگر ظالم اقوام کی داستانیں ان کی نگاہوں کے سامنے مجسم کر کے پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ عذاب الہی نے انہیں کس طرح نابود کر دیا، تاکہ کفارِ مکہ جو ان کی نسبت بہت کمزور تھے اپنا اندازہ لگالیں۔ نیز یہ کہ یہ صورت حال پیغمبر اور مومنین کے دلوں کی تسلی کا سبب بھی ہو۔ اس سورہ کے آخری حصہ میں قرآن مجید کی عظمت اور وحی الہی کی سب سے زیادہ اہمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اسی مفہوم پر سورہ کو ختم کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ سورہ مومنین کو ظالموں کے مقابلہ میں پامردی و استقامت اور صبر و شکیبائی کا درس دیتا ہے۔ اس کی آیتوں کے اندر نصرت الہی کا وعدہ بھی چھپا ہوا ہے، اس سورہ کا جو مروج کا نام رکھا گیا ہے وہ اس لفظ کی وجہ سے ہے جو اس کی پہلی آیت میں آیا ہے

اس سورہ کی فضیلت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ پیغمبر اسلام کی ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ:

(من قراء هذه السورة اعطاه الله من الاجر بعد د كل من اجتمع في جمعة و كل من اجتمع في يوم عرفة عشر

حسنات و قرائتها تنجي من المخاوف و الشدائد)

”جو شخص اس سورہ کو پڑھے تو خداوند عالم اس ان افراد کی تعداد سے جو نماز جمعہ میں جمع ہوتے ہیں اور ان کی تعداد سے جو یوم عرفہ عرفات میں جمع ہوتے ہیں، دس گناہ حسنات دیتا ہے اور اس کی تلاوت انسان کو خوف و ہراس اور مصائب سے رہائی بخشتی ہے۔“^(۱)

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”شاہد و مشہود“ کی ایک تفسیر روزِ جمعہ اور روزِ عرفہ ہے، نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ سورہ مصیبتوں کے مقابلہ میں مومنین کی مقاومت کو بیان کرتی ہے، لہذا اس اجر و ثواب کی مناسبت سورہ کے مضامین سے واضح ہو جاتی ہے اور حتمی طور پر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تمام اجر و ثواب ان لوگوں کے لئے ہے جو اسے پڑھیں، اس میں غور و فکر کریں اور پھر اس پر عمل کریں۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ﴾۔

۲۔ ﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ﴾۔

۳۔ ﴿وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ﴾۔

۴۔ ﴿قَتْلِ أَصْحَابِ الْأَخْذُودِ﴾۔

۵۔ ﴿النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ﴾۔

۶۔ ﴿أَذْهَمَ عَلَيْهَا قَعُودِ﴾۔

۷۔ ﴿وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ﴾۔

۸۔ ﴿وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ﴾۔

۹۔ ﴿الَّذِي لَهُ مَلِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾۔

ترجمہ

رحمن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ قسم ہے آسمان کی جس کے بہت سے بروج ہیں۔

۲۔ اور قسم ہے اس موعود دن کی۔

۳۔ اور شاہد و مشہود کی (شاہد سے مراد پیغمبر اور اعمال کے گواہ ہیں اور مشہود سے مراد اعمال ہیں)۔

۴۔ موت اور عذاب ہو ایذا دینے والے اصحاب اخذ و دہر (آگ کی خندق)۔

۵۔ شعلہ اور آگ سے پر خندقیں۔

۶۔ جس وقت وہ اس کے کنارے بیٹھے تھے۔

۷۔ اور جو کچھ وہ مومنین کی نسبت انجام دیتے تھے (سرد مہری سے) اسے دیکھ رہے تھے۔

۸۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ان (مومنین) پر نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ خداوند عزیز و حمید پر ایمان لائے تھے۔

۹۔ وہی خدا کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت جس کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے

مومنین انسانوں کو جلانے والی بھٹیوں کے سامنے

ہمیں معلوم ہے کہ مکہ کے مسلمان ابتداء میں سخت فشار اور دباؤ میں تھے اور دشمن ان کے لئے ہر قسم کی تکلیف کو جائز سمجھتے تھے اور جیسا کہ ہم نے سورہ کے مضامین کی تشریح میں کہا ہے اس سورہ کے نزول کا مقصد ان ایذا پہنچانے والے کفار کو خبردار کرنا ہے کہ وہ ماضی کی اپنے سے مشابہت رکھنے والی اقوام کے لوگوں کی سرنوشت کو پیش نظر رکھیں، اور ساتھ ہی یہ سورہ موجودہ مومنین کی تسلی، دلداری اور تقویتِ روحانی کا باعث اور تمام مسلمانوں کے لئے ایک درس بھی ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

”قسم ہے آسمان کی جس کے بہت سے مروج ہیں“ ﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ﴾ (مروج)۔ (مرج) کی جمع ہے جس کے معنی اصل میں قصر اور محل کے ہیں۔

بعض مفسرین نے اسے ظاہر و آشکار شے کے معنوں میں لیا ہے اور بلند و بالا عمارات کو اس نام سے منسوب کرنے کا سبب ان کے ظاہر ہونے کو قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر شہر کے اطراف کی دیوار کے ایک خاص حصہ کو اور لشکر کے جمع ہونے کی جگہ کو جو نمایاں ہوتی ہے، برج کا نام دیا جاتا ہے اور جب عورت اپنی زینت کا اظہار کرے تو اسے تبرجت المرأة کہا جاتا ہے۔^(۱)

۱۔ آسمانی برج یا تو آسمان کے درخشاں اور روشن ستاروں کے معنی میں ہے یا آسمانی شکلوں اور صورتوں کے معنی میں ہے، یعنی ستاروں کا ایسا مجموعہ جو ہماری نظروں کے اعتبار سے موجوداتِ زمین میں سے کسی ایک سے مشابہت رکھتا ہے اور بارہ برج بارہ فلکی شکلیں ہیں۔ سورج اپنے سالانہ سفر میں سے ہر ماہ ان میں سے ایک برج کی حدود میں گزارتا ہے، البتہ سورج حرکت نہیں کرتا۔ زمین اس کی گردش کرتی ہے لیکن نظر ایسا آتا ہے کہ سورج حرکت کر رہا ہے اور ان فلکی صورتوں میں سے کسی ایک کے سامنے آگیا ہے۔^(۲)

ان معانی میں سے جو بھی ہوں وہ عظیم ہیں اور پھر ان کی عظمت بھی ایسی ہے جو غالباً اس زمانے میں عربوں پر واضح نہیں تھی لیکن موجودہ زمانے میں ہمارے لئے جانی پہچانی ہے۔ اگرچہ زیادہ یہی نظر آتا ہے کہ مراد وہی آسمانی ستارے ہوں۔ ایک حدیث میں منقول بھی ہے کہ لوگوں نے پیغمبر اسلام سے اس آیات کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد ستارے ہیں۔^(۳)

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد ہوا: ”اور قسم ہے اس موعود دن کی“ (قیامت کا دن جس کا وعدہ کیا گیا ہے)۔ ﴿وَالْيَوْمَ الْمَوْعُودِ﴾۔ وہی دن جس کی تمام انبیاء اور پیغمبروں نے خبر دی ہے اور کئی سو قرآنی آیتیں جس کے ثبوت کے طور پر وہی دن جو اولین و آخرین کی وعدہ گاہ ہے اور وہی دن جس میں سب کے حساب کا فیصلہ ہونا ہے۔

تیسری اور چوتھی قسم میں فرماتا ہے: ”اور قسم ہے شاہد و مشہود کی“ ﴿وَشَاهِدٌ وَمُشْهُودٌ﴾۔ یہ کہ شاہد و مشہود سے کیا مراد ہے، اس کی علماء نے بہت سی تفسیریں کی ہیں جو تعداد میں تیس سے زیادہ ہیں جن میں سے اہم ترین درج ذیل ہیں:

۱۔ شاہد سے مراد پیغمبر اسلام کی ذات گرامی ہے جیسا کہ قرآن مجید کہتا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ انا أرسلناك شاهداً و مبشراً و نذيراً﴾ ”اے پیغمبر ہم نے تجھے شاہد، بشارت دینے والے اور ڈرانے والے کی حیثیت سے بھیجا ہے۔“ (احزاب - ۴۵)۔

اور مشہور سے مراد قیامت کا دن ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ﴿ذَالِك يَوْمَ مَجْمُوعٌ لَهُ النَّاسُ وَ ذَالِك يَوْمَ مَشْهُودٍ﴾ قیامت کا دن وہ دن ہے جس میں تمام لوگ جمع ہوں گے وہ مکمل طور پر ”مشہود“ اور آشکارا دن ہے۔ (ہود - ۱۰۳)۔

۲۔ شاہد سے مراد انسان کے اعمال کے گواہ ہیں، مثلاً اس کے جسم کے اعضاء جو ارج جیسا کہ سورہ نور کی آیت ۲۴ میں ہمیں ملتا ہے ﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمُ السُّنَنُومُ وَ اَيْدِيهِمُ وَ اَرْجُلُهُمُ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ وہ دن جس میں ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ لہذا مشہود سے مراد انسان اور اس کے اعمال ہیں۔

۳۔ شاہد کے معنی جمعہ کا دن ہے جو نماز جمعہ کے بہت ہی اہم مراسم کے سلسلہ میں مسلمانوں کے اجتماع کا شاہد ہے اور ”مشہود“ عرفہ کا دن ہے کہ بیت اللہ الحرام کے زائرین اس دن کے شاہد و ناظر ہیں۔

ایک روایت میں پیغمبر اسلام، اور امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ تفسیر منقول ہے۔ (۴)

۴۔ شاہد عید قربان کا دن ہے اور ”مشہود“ عرفہ کا دن ہے (جو عید قربان سے ایک دن پہلے ہے)۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص مسجد نبوی میں داخل ہوا، اس نے کسی کو دیکھا کہ بیٹھا ہوا ہے اور رسول اللہ سے حدیث نقل کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اس شخص سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو اس نے کہا شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے، وہ کہتا ہے کہ میں وہاں سے ہٹ کر ایک دوسرے شخص کے پاس گیا وہ بھی رسول اللہ سے حدیث نقل کر رہا تھا تو میں نے اس آیت کی تفسیر اس سے بھی پوچھی تو اس نے کہا شاہد جمعہ کا دن اور مشہود عید قربان کا دن ہے۔ اس سے ہٹ کر میں ایک

جوان کے پاس گیا جو خوبصورت تھا اور رسول خدا ہی حدیث نقل کر رہا تھا میں نے کہا اس آیت کی تفسیر کے بارے میں کچھ بتا، تو اس نے کہا: ”شاہد محمد ہیں اور مشہود قیامت کا دن ہے۔ کیا تو نے سنا نہیں کہ خدا کہتا ہے:“

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ انْ أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَ مَبْشَرًا وَ نَذِيرًا﴾ اور یہ بھی سنا کہ خدا کیا کہتا ہے: ﴿ذَالِكِ الْيَوْمِ الْمَجْمُوعِ لَهُ النَّاسُ وَ ذَالِكِ يَوْمِ مَشْهُودٍ﴾

میں نے سوال کیا کہ پہلا شخص کون تھا، لوگوں نے بتایا ابن عباس، دوسرے کے متعلق پوچھا تو بتایا عبد اللہ بن عمر اور تیسرے کے متعلق پوچھا تو بتایا کہ وہ حسین بن علی علیہ السلام تھے^(۵)

۵۔ شاہد سے مراد راتیں اور دن ہیں اور مشہود سے مراد اولادِ آدم جن کے اعمال کی وہ گواہی دیں گے، جیسا کہ امام زین العابدین علیہ السلام کی صبح و شام کی دعائیں ہم پڑھتے ہیں (ہذا یوم حادث جدید و ہو علینا شاہد عتیدان احسنًا ودعنا بحمد و اناسًا نأفارقتنا بذنب) یہ یاد دہن ہے جو ہمارے اعمال کا شاہد اگر ہم نیکی کریں تو حمد و سپاس کے ساتھ ہم کو الودع کہے گا اور اگر برائی کریں تو مذمت کرتا ہوا ہم سے جدا ہوگا۔^(۶)

۶۔ شاہد سے مراد ملائکہ اور شہود سے مراد قرآن ہے۔

۷۔ شاہد سے مراد حجر الاسود اور مشہود سے مراد حجاجِ حرم ہیں جو اس کے پاس آتے ہیں اور اس پر ہاتھ رکھتے ہیں۔

۸۔ شاہد مخلوق اور مشہود حق تعالیٰ ہے۔

۹۔ شاہد سے مراد امتِ اسلامی اور مشہود سے مراد دوسری تمام امتیں ہیں جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں آیا ہے ﴿لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ مقصد یہ ہے کہ تم دوسری امتوں پر گواہ بنو۔

۱۰۔ شاہد پیغمبر اسلام اور مشہود باقی تمام انبیاء ہیں۔ سورہ نساء کی آیت ۴۱ میں گواہی ہے ﴿وَ جئنا بک علیٰ ھو لاء شہیداً﴾ اس دن ہم تجھے دوسرے انبیاء کا گواہ بنا کر لائیں گے۔

۱۱۔ شاہد پیغمبر اور مشہود حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

البتہ اس آیت کی گزشتہ آیتوں سے مناسبت اس کو قبول کرتی ہے کہ روز قیامت کے شہود اور گواہوں کی طرف اشارہ ہو عام اس سے کہ وہ پیغمبر اسلام ہو یا باقی انبیاء اپنی امتوں کے مقابلہ میں، یا ملائکہ ہوں یا بدنِ انسانی کے اعضاء و جوارح، یا رات دن، یا کچھ امور، اور مشہور سے مراد انسان ہوں یا ان کے اعمال۔

اسی طرح بہت سے تفسیریں ایک دوسرے میں سے مدغم ہو جائیں گی اور ایک مجموعی مفہوم میں ان کا خلاصہ ہو جائے گا۔ لیکن روز جمعہ، روز عرفہ اور روز عید جیسی تفسیریں ان معانی سے الگ ہیں، اگر وہ بھی روز محشر کے مشہود اور انسانوں کے اعمال کے گواہ ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک ایسا پرہجوم دن ہے جو اس دنیا میں قیامت کا ایک منظر شمار ہوتا ہے۔

اس بیان کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ ان تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ شاہد و مشہود کے وسیع مفہوم میں یہ سب شامل ہوں۔ اور یہ قرآن کی عظمت کی ایک نشانی ہے کہ اس میں اس قسم کے وسیع مفہیم ہیں جو مختلف اور کافی تفسیروں کے اپنے اندر جگہ دیتے ہیں اس لئے کہ شاہد ہر قسم کے گواہ کو کہتے ہیں اور مشہود ہر اس چیز کو جس کی گواہی دی جائے۔ پھر یہ دونوں نکرہ کی شکل میں بیان ہوئے ہیں جو اس شاہد اور مشہود کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جو اوپر والی تفسیروں میں منعکس ہوا ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ایک لطیف و عمدہ تعلق ان چار حصوں کے درمیان اور اس مطلب کے درمیان، جس کی قسم کھائی گئی ہے، موجود ہے، آسمان، درخشاں ستارے اور اس کے موزوں برج سب کے سب نظم و حساب کی نشانی ہیں اور یوم موعود حساب و کتاب کا واضح منظر ہے، شاہد و مشہود بھی اسی حساب کی نکتہ رسی کا ذریعہ ہیں۔

پھر یہ تمام قسمیں اس لئے ہیں کہ ایذا پہنچانے والے ظالموں کو خبردار کرے کہ سچے مومنین کے ساتھ کئے جانے والے ان کے تمام مظالم ثبت و ضبط ہیں اور یوم موعود کے لئے انہیں محفوظ کیا گیا ہے اور وہ مشہود جنہوں نے تمہارے جسم کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے، عام اس سے کہ وہ فرشتے ہوں یا تمہارے جسم کے اعضاء و جوارح یا رات و دن یا اسی قسم کی اشیاء وہ سب ان کاموں کو نظر میں رکھے ہوئے ہیں اور قیامت میں گواہی دیں گے۔ ۷

اس لئے اس قسموں کے بعد فرماتا ہے: ”موت اور عذاب تشدد کرنے والوں پر یوں“ ﴿قتل اصحاب الاخدود﴾۔ ”وہی خندقین جو آگ اور لکڑیوں سے پر تھیں جن میں سے بڑے بڑے شعلے نکل رہے تھے“ ﴿النار ذات الوقود﴾۔ ”جس وقت وہ اس آگ کی خندق کے پاس بیٹھے ہوئے تھے (سرد مہری سے) ﴿اذہم علیہا قعود﴾۔ ”اور جو کچھ مومنین کے بارے میں انجام دے رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے“۔ ﴿وہم علی ما یفعلون بالمومنین شہود﴾۔

”اخدود“ مفردات میں راغب کے بقول زمین وسیع و عمیق اور کھلے ہوئے شگاف کے معنی میں ہے دوسرے لفظوں میں بڑی بڑی خندقوں اور گڑھوں کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع ”اخواید“ ہے اور اصل انسان کے خد سے لی گئی ہے جو انسان

کی ناک کے دونوں طرف دائیں اور بائیں دو دھنسی ہوئی جگہوں کے معنی میں ہے۔ (رخسار) اور گریہ کرتے وقت اس پر آنسو جاری ہوتے ہیں۔

اس کے بعد بطور کنایہ اس گڑھے پر اس کا اطلاق ہوا ہے جو زمین پر ظاہر ہو (پھر ایک حقیقی معنی کی شکل اختیار کر گیا ہے) یہ کہ یہ اذیت دینے والا گروہ کون تھا اور کس زمانہ میں تھا، مفسرین اور ارباب تاریخ اس سلسلہ میں مختلف نظریات کے حامل ہیں، جن کی تشریح انشاء اللہ آیات کے ذیل میں نکات کی بحث میں آئے گی۔

لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ انہوں نے آگ کی بہت بڑی بڑی خندقیں بنا رکھیں تھیں۔

وہ مومنین کو مجبور کرتے تھے کہ اپنے ایمان سے دستبردار ہو جائیں۔ مومنین جس وقت اس کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے تھے تو وہ انہیں جلانے والی ان بھٹیوں میں ڈال کر آگ لگا دیتے تھے۔

”وقود“ اصل میں ان مادوں کے معنی میں ہے جس سے وہ آگ لگاتے تھے، (لکڑیاں وغیرہ) اور ذات الوقود کی تعبیر اگرچہ ایندھن کی محتاج نہیں ہوتی ہے لیکن یہاں اس سے آگ بھڑکانے والے مواد کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، جسے وہ استعمال کرتے تھے اور جس کی آگ طبعی طور پر بہت زیادہ اور طبعی ہوتی تھی۔

یہی وہ وجہ ہے کہ جسے بعض مفسرین نے سمجھا ہے کہ وقود کے دو معنی ہیں، ایک ایندھن اور دوسرے شعلہ، اور انہوں نے افسوس کیا ہے کہ مفسرین و مترجمین نے اس نکتہ کی طرف توجہ کیوں نہیں کی۔

اس آیت ﴿اذھم علیہا قعود﴾ اور اس کے بعد کی دوسری آیت سے مراد یہ ہے کہ ایک گروہ انتہائی سرد مہری سے بیٹھا ہوا تھا اور اس تشدد کو دیکھ رہا تھا اور لذت حاصل کر رہا تھا، جو خود ان کی انتہائی قساوت اور سخت دل ہونے کی نشانی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ گروہ مذہب حق سے مومنین کو روگرداں کرنے پر مامور تھا۔ بعض نے انہیں دو گروہوں پر مشتمل سمجھا ہے، ایک اذیت دینے والا اور دوسرا تماشا دیکھنے والا۔ اور چونکہ دیکھنے والے تشدد کرنے والوں کے اعمال سے راضی تھے لہذا اس فعل کی ان سب کی طرف نسبت دی گئی ہے اور یہ فطری بات ہے کہ اس قسم کے کام میں ایک گروہ ہمیشہ کام کرنے والا ہوتا ہے اور ایک دیکھنے والا۔

علاوہ ازیں ان کے سرغنہ عام طور پر حکم دیتے ہیں اور کارندے نچلے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک گروہ بیٹھا ہوا تھا اور تشدد کے اعمال کی نگرانی کر رہا تھا کہ وہ متعلقہ کام سے کسی قسم کی روگردانی نہ کریں اور بادشاہ کے

سامنے گواہی دیں کہ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھایا ہے۔ اس گروہ کی تشکیل ان مختلف گروہوں سے بھی بعید نظر نہیں آتی۔ لہذا ان تمام تفسیروں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

بہر حال یفعلون کا جملہ فعل مضارع کی شکل میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عمل ایک مدت استمرار رکھتا تھا اور کوئی ایک لخت ہونے والا حادثہ نہیں تھا۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”وہ تشدد کرنے والے ان مومنین پر سوائے اس کے اور کوئی اعتراض نہیں رکھتے تھے کہ وہ خداوند عزیز و حکیم پر ایمان لائے ہوئے تھے“ ﴿وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ﴾۔

جی ہاں! ان کا جرم اور گناہ صرف خدائے واحد و یگانہ و یکتا پر ایمان تھا۔ خداوند قادر جو ہر قسم کی ستائش کے لائق اور ہر قسم کے کمال کا جامع ہے، تو کیا اس قسم کے خدا پر ایمان لانا جرم و گناہ ہے یا ہر قسم کے شعور و شائستگی سے محروم بتوں پر ایمان رکھنا کوئی گناہ یا جرم ہے؟

”نقموا“ ”نقم“ (بروزن قلم) کے مادہ سے کسی چیز کا انکار کرنے یا اسے عیب لگانے کے معنی میں ہے۔ زبانی طور پر عیب لگانا یا کسی عملی طور پر سزا دینا، یہ دونوں پہلو اس کے معنی میں داخل ہیں۔ اسی مادہ سے انتقام ہے یہ بات طے شدہ ہے کہ اس قسم کا کام ایک بڑے اور واضح گناہ کے مقابلہ میں سرانجام پاتا ہے، نہ کہ پروردگار عالم پر ایمان لانے کے سلسلہ میں۔

اس قسم کے اقدام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ قوم جو یہ کام کر رہی تھی اس کا تمدن نہایت پست اور بگڑا ہوا تھا، جیسا تو ان کے نزدیک افتخار و اعزاز والا کام عظیم ترین جرم و گناہ تھا۔

بہر حال یہ چیز سورہ مائدہ کی آیت ۵۹ میں آئی ہے کہ جادو گروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے اور فرعون کی طرف سے تشدد اور قتل کی دھمکی کے بعد اس سے کہا کہ ﴿هَلْ تَنْقُمُونَ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِاللَّهِ﴾ تو ہم سے صرف اس وجہ سے انتقام لے رہا ہے کہ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں۔

”عزیز“ طاقتور اور شکست نہ کھانے والے اور ”حمید“ ہر قسم کی تعریف اور توصیف کے قابل اور ہر قسم کے کمال کے حامل کی تعبیر حقیقت میں ان کے جرائم کا جواب ہے اور ان کے برخلاف ایک دلیل ہے یعنی کیا اس قسم کے خدا پر ایمان لانا جرم و گناہ ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہے کہ یہ بات تشدد کرنے والے کے لئے پورے دورِ تاریخ میں ایک قسم کی تہدید و تنبیہ بھی ہے کہ خداوند عزیز و حمید ان کی کمین گاہ میں ہے۔ اس کے بعد وہ عظیم معبود اپنے دو اور اوصاف کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

”وہی خدا کہ آسمان اور زمین کی حکومت جس کے لئے ہے اور جو ہر چیز کا گواہ ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے ﴿الذی له ملک السماوات و الارض و اللہ علی کل شیء شہید﴾۔“

حقیقت میں یہ چار اوصاف ایسے ہیں جو عبودیت کی قابلیت کو مسلم کر دیتے ہیں کہ خدا وہ ہے جو قادر و توانا ہے، ہر قسم کے کمال کا حامل ہے وہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور ہر چیز سے آگاہ ہے، یہ چیز مومنین کے لئے بشارت بھی ہے کہ خدا حاضر و ناظر ہے اور ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں وہ ان کے صبر و استقامت کو دیکھتا ہے اور ان کے اشار و قربانی اور فداکاری کا اسے علم ہے۔

ایسی صورت حال ان کو قوت توانائی اور احساس نشاط عطا کرتی ہے دوسرے یہ ان کے دشمنوں کے لئے تہدید اور دھمکی ہے کہ اگر خدا ان کے کام میں مانع نہیں ہوتا تو یہ اس کمزوری کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ آزمائش اور امتحان کی وجہ سے ہے اور انجام کار یہ ظالم اپنے گناہ کے نتیجہ میں دردناک عذاب کا تلخ مزہ چکھیں گے۔

۱۔ بعض محققین کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ فارسی لفظ ”بزر“ سے لیا گیا ہے جو بلندی، بزرگی اور شکوہ کے معنی رکھتا ہے، بہان قاطع اور اس کے حاشیہ کی طرف رجوع کیا جائے۔
۲۔ بارہ صورتیں عبارت ہیں حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، میزان، عقرب، قوس، دلو اور حوت سے جو اسی ترتیب سے گوسفند، بیل، دو بچے جو اخروٹ کھیل رہے ہیں، لیکڑا، شیر، خوشہ، ترازو، بچھو، کمان، بکری، ڈول اور مچھلی کی شکلیں ہیں۔

۳۔ در المنثور جلد ۶، ص ۳۳۱۔

۴۔ مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۶۶۔

۵۔ نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۴۳۔ یہی مضمون ابو الفتوح رازی اور طبرسی نے بھی اپنی تفسیروں میں نقل کیا ہے

۶۔ صحیفہ سجادیہ، دعائے ششم۔

۷۔ اس بنا پر جواب قسم یہاں مخدوف ہے اور قتل اصحاب الاخذود کا جملہ یا ان الذین فتنوا المومنین و المومنات اس پر دلالت کرتے ہیں اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ اقسام بخذا الامور ان الذین فتنوا المومنین و المومنات معذبین ملعونون کمالعن اصحاب الاخذود۔ میں ان امور کی قسم کھاتا ہوں جن لوگوں نے مومنین مرد و عورت کو مصیبت میں ڈالا وہ ملعون و معذب ہیں، جس طرح خندق والے معذب تھے۔

۱۔ اصحابِ اخدود کون لوگ تھے؟

۱۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اخدود عظیم گڑھے اور خندق کے معنی میں ہے اور یہاں بڑی بڑی خندقیں مراد ہیں جو آگ سے پر تھیں تاکہ تشدد کرنے والے اس میں مومنین کو پھینک کر جلائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ واقعہ کس قوم سے متعلق ہے اور کس وقت معرض وجود میں آیا اور کیا یہ ایک خاص معین و مقرر واقعہ تھا، یا دنیا کے مختلف علاقوں کے اسی قسم کے متعدد واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

مفسرین و مورخین کے درمیان اس موضوع پر اختلاف ہے، سب سے زیادہ مشہور یہ کہ یہ واقعہ سرزمین یمن کے قبیلہ حمیرا کے ذونواس نامی بادشاہ کے دور کا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ذونواس، جو حمیرا نامی قبیلہ سے متعلق تھا، یہودی ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا پورا قبیلہ بھی یہودی ہو گیا۔ اس نے اپنا نام یوسف رکھا۔ ایک عرصہ تک یہی صورت حال رہی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ کسی نے اسے خبر دی کہ سرزمین نجران (یمن کا شمالی حصہ) میں ابھی تک ایک گروہ نصرانی مذہب پر قائم ہے۔ ذونواس کے ہم مسلک لوگوں نے اسے اس بات پر ابھارا کہ اہل نجران کو دینِ یہود کے قبول کرنے پر مجبور کرے۔

وہ نجران کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے وہاں کے رہنے والوں کو اکٹھا کیا اور دینِ یہود ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے اصرار کیا کہ وہ اس دین کو قبول کریں۔ لیکن انہوں نے انکار کیا اور شہادت قبول کرنے پر تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے دین کو خیر باد نہ کہا۔ ذونواس کے حکم پر اس کے حامیوں نے بہت بڑی خندق کھودی اس میں لکڑیاں ڈالیں اور آگ لگادی۔ ذونواس اور اس کے ساتھیوں نے ایک گروہ کو پکڑ کر اس آگ میں زندہ جلایا اور ایک گروہ کو تلوار کے گھاٹ اتارا اس طرح آگ میں جلنے والوں اور مقتولین کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی۔^(۲)

بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سلسلہ دار و گیر سے بچ کر نصاریٰ بنی نجران کا ایک آدمی قیصر روم کے دربار میں جا پہنچا۔ اس نے وہاں ذونواس کی شکایت کی اور اس سے مدد طلب کی۔ قیصر نے کہا تمہاری سرزمین مجھ سے دور ہے۔ بادشاہ حبشہ کو خط لکھتا ہوں جو عیسائی اور تمہارا ہمسایہ ہے میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ تمہاری مدد کرے۔

پھر اس نے خط لکھا اور حبشہ کے بادشاہ سے نصاریٰ نجران کے عیسائیوں کے خون کا انتقام لینے کی خواہش کی۔

وہ نجرانی شخص بادشاہ حبشہ نجاشی کے پاس گیا، نجاشی اس سے یہ تمام ماجرا سن کر بہت متاثر ہوا اور سرزمین نجران میں شعلہ دین مسیح کے خاموش ہو جانے کا اسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے ذونواس سے شہیدوں کے خون کا بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

اس مقصد کے پیش نظر حبشہ کی فوج یمن کی طرف روانہ ہوئی اور گھمسان کی جنگ کے نتیجے میں اس نے ذونواس کو شکست فاش دی اور ان میں سے بہت سے افراد کو قتل کیا۔ جلدی ہی نجران کی حکومت نجاشی کے قبضہ میں آگئی اور نجران حبشہ کا ایک صوبہ بن گیا۔^(۳)

بعض مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ اس خندق کا طول چالیس ذراع (ہاتھ) تھا اور اس کا عرض بارہ ذراع تھا۔ (ایک ذراع تقریباً آدھا میٹر ہے اور بعض اوقات گز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو تقریباً ایک میٹر ہے)۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ سات گڑھے تھے جن میں سے ہر ایک کی وسعت اتنی ہی تھی جتنی اوپر بیان ہوئی۔^۲ مندرجہ بالا واقعہ تاریخ و تفسیر کی بہت سی کتابوں میں درج ہے منجملہ دیگر کتب کے عظیم مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں، ابو الفتوح رازی نے اپنی تفسیر میں فخر رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں، آلوسی نے روح المعانی میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں زیر بحث آیات کے ذیل میں، اسی طرح ہشام نے اپنے سیرہ (جلد اول ص ۳۵) میں اور ایک دوسری جماعت نے اپنی کتب میں اس واقعہ کو تحریر کیا ہے۔

جو کچھ ہم نے تحریر کیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ تشدد کرنے والے بے رحم افراد آخر کار عذاب الہی میں گرفتار ہوئے اور ان سے اس خون ناحق کا انتقام دنیا ہی میں لیا گیا اور عاقبت کا عذاب جہنم ابھی ان کے انتظار میں ہے۔

انسانوں کے جلائے والی یہ بھٹیاں جو یہودیوں کے ہاتھ سے معرض وجود میں آئیں، احتمال اس امر کا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں یہ پہلی آدم سوز بھٹیاں تھیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اسی قسم کی قساوت اور بے رحمی کا خود یہودی بھی شکار ہوئے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بہت سے لوگ ہٹلر کے حکم سے آدم سوز بھٹیوں میں جلائے گئے اور اس جہان میں بھی عذابِ حریق کا شکار ہوئے۔

علاوہ ازیں ذونواس یہودی، جو اس منحوس اقدام کا بانی تھا، وہ بھی اپنی بد اعمالی کے انجام سے نہ بچ سکا۔ جو کچھ اصحاب اخدود کے بارے میں درج کیا گیا ہے یہ مشہور و معروف نظریات کے مطابق ہے لیکن اس ضمن میں کچھ اور

روایات بھی موجود ہے جو یہ بتاتی ہیں کہ اصحاب اخدود صرف یمن میں ذونو اسی ہی کے زمانے میں نہیں تھے۔ بعض مفسرین نے تو ان کے بارے میں دس قول نقل کئے ہیں۔

ایک روایت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا ہے وہ اہل کتاب مجوسی تھے جو اپنی کتاب پر عمل کرتے تھے۔ ان کے بادشاہوں میں سے ایک نے اپنی بہن سے مباشرت کی اور خواہش ظاہر کی کہ بہن سے شادی کو جائز قرار دے۔ لیکن لوگوں نے قبول نہیں کیا۔ بادشاہ نے ایسے بہت سے مومنین کو جنہوں نے یہ بات قبول نہیں کی تھی، جلتی ہوئی آگ کی خندق میں ڈلوادیا۔^(۴)

یہ فارس کے اصحاب الاخدود کے بارے میں ہے، شام کے اصحاب الاخدود کے بارے میں بھی علماء نے لکھا ہے کہ وہاں مومنین رہتے تھے اور آنتیا حوس نے انہیں خندق میں جلوایا تھا۔^(۵)

بعض مفسرین نے اس واقعہ کو بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر حضرت دانیال h t i t r کے اصحاب و انصار کے ساتھ مربوط سمجھا ہے جس کی طرف تورات کی کتاب دانیال میں اشارہ ہوا ہے اور ثعلبی نے بھی اخدود فارسی کو انہی پر منطبق کیا ہے۔^۶

کچھ بعید نہیں کہ اصحاب اخدود میں یہ سب کچھ اور ان جیسے دوسرے لوگ شامل ہوں اگرچہ اس مشہور مصداق سر زمین یمن کا ذونو اس ہی ہے

۱۔ حمیر یمن کے مشہور قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا۔

۲۔ تفسیر علی ابن ابراہیم قمی، جلد ۲، ص ۴۱۴۔

۳۔ قصص قرآن بلاغی، ص ۲۸۸۔

۴۔ تفسیر روح المعانی اور ابوالفتوح رازی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۵۔ اعلام قرآن، ص ۱۳۷-۱۳۸

۶۔ اعلام قرآن، ص ۱۳۷-۱۳۸

۲۔ حفظ ایمان کے سلسلہ میں استقامت

ان کی حفاظت کے سلسلہ میں ماضی و حال دونوں میں فداکاری کی بہت درخشاں مثالیں ہیں۔ تاریخ انسانی بہت سے ایسے افراد کا پتہ دیتی ہے جنہوں نے اس راستے میں جامِ شہادت نوش کیا ہے اور سولی کی رسی اور جلا دوں کی تلواروں کو بوسہ دیا ہے اور پروانہ دار تشدد کرنے والوں کی روشن کی ہوئی آگ میں جلے ہیں جن میں سے صرف ایک گروہ کا نام و نشان تاریخ میں محفوظ ہے۔

آسیہ زن فرعون کی داستان ہم نے سنی ہے جو موسیٰ بن عمران پر ایمان لانے کی وجہ سے ان تمام شدائد سے دوچار ہوئی اور جس نے انجام کار اس راہ میں اپنی جان جان آفرین کی بارگاہ میں پیش کی۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ خدا نے حبشہ کے لوگوں میں سے ایک پیغمبر ان پر مبعوث کیا۔

وہ لوگ اس پیغمبر کی تکذیب پر آمادہ ہوئے۔ ان کے درمیان جنگ ہوئی۔ آخر کار ان لوگوں نے اس پیغمبر کے اصحاب میں سے ایک گروہ کو قتل کیا اور ایک گروہ کو اس پیغمبر سمیت گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد ایک جگہ آگ تیار کی اور لوگوں کو اس کے قریب بلایا اور کہا جو شخص ہمارے دین پر وہ اپنے آپ کو آگ میں ڈال دے۔ پیغمبر کے وہ مقید ہر ابھی آگ میں کودنے پر ایک دوسرے سے سبقت میں چھلانگ لگائے تو شفقتِ مادری جوش میں آئی اور سدِ راہ ہوئی تو اس بچے نے کہا اے مادر گرامی خوف نہ کھائیں آپ خود بھی اس آگ میں کود جائیں اور مجھ کو بھی ڈال دیں۔ خدا کی قسم یہ چیز راہِ خدا میں بہت معمولی ہے۔ (ان لهذا و الله فی الله قليل)

اور یہ بچہ بھی ان افراد میں سے تھا جنہوں نے گہوارہ میں کلام کیا۔^(۱)

اس داستان سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھا گروہ اصحاب الاخدود کا حبشہ میں تھا۔ حضرت عمار یا سر کے ماں باپ اور ان جیسے دوسرے افراد کی داستان اور اس سے بڑھ کر حضرت امام حسین علیہ السلام کا واقعہ جاں بازی اور میدانِ کربلا میں ایک دوسرے سے بڑھ کر جامِ شہادت نوش کرنا، اسلام میں مشہور و معروف ہے۔

ہم اپنے اس زمانے میں بھی بہت زیادہ نمونے اس موضوع کے اپنے کانوں سے سنتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ بوڑھوں اور جوانوں نے دین و ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نہایت والہانہ انداز میں

منزلِ شہادت کی طرف قدم بڑھائے۔ کہنا یہ چاہیئے کہ خدا کے دین کی بقا گزشتہ اور موجودہ زمانہ میں اس قسم کی قربانیوں کے بغیر نہ تھی۔

۱۔ تفسیر عیاشی مطابق تفسیر المیزان، جلد ۲۰ ص ۳۷۷۔ (تلخیص کے ساتھ)۔

آیات ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶

- ۱۰۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ﴾۔
- ۱۱۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ﴾۔
- ۱۲۔ ﴿إِنَّ بِطَشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾۔
- ۱۳۔ ﴿إِنَّهُ هُوَ يَبْدِئُ وَ يَعِيدُ﴾۔
- ۱۴۔ ﴿وَ هُوَ الْغَفُورُ الْودُودُ﴾۔
- ۱۵۔ ﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ﴾۔
- ۱۶۔ ﴿فَعَالٌ لَّما يُرِيدُ﴾۔

ترجمہ

- ۱۰۔ جنہوں نے صاحبان مرد اور عورتوں پر تشدد کیا، پھر انہوں نے توبہ نہ کی ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے اور آگ کا جلانے والا عذاب ہے۔
- ۱۱۔ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیئے ان کے لئے جنت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔
- ۱۲۔ تیرے پرورگار کی قہر آمیز گرفت اور سزا بہت ہی شدید ہے۔
- ۱۳۔ وہی ہے جو خلقت کا آغاز کرتا ہے اور وہی ہے جو دوبارہ پلٹاتا ہے۔
- ۱۴۔ اور بخشنے والا اور (مومنین کا) دوست رکھنے والا ہے۔
- ۱۵۔ صاحب عرش مجید ہے۔
- ۱۶۔ اور جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

تشدد کرنے والے عذاب الہی کے سامنے

گزشتہ اقوام میں سے تشدد کرنے والوں کی عظیم بے رحمی کے بیان کے بعد جو صاحب ایمان لوگوں کو آگ میں زندہ جلاتے تھے ان آیات میں ان تشدد کرنے والوں کے متعلق خدا کے سخت عذاب اور مومنین کے لئے عظیم ثواب کی طرف نوید ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

”وہ جہنوں نے ایماندار مردوں اور عورتوں کو موردِ آزار و عذاب قرار دیا اور پھر توبہ نہیں کی ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے اور اسی طرح جلائے والی آگ کا عذاب ہے“ ﴿ان الذين فتنوا المومنين و المومنات ثم لم يتوبوا فلهم عذاب جهنم و لهم عذاب الحريق﴾

”فتنوا“ ”فتن“ (بروزن متن) اور فتنہ کے مادہ سے اصل میں سونے کو آگ میں ڈالنے کے معنی میں ہے تاکہ اس کو پرکھا جاسکے اور کھرا کھوٹا قرار دیا جاسکے۔ اس کے بعد یہ مادہ (فتنہ) آزمائش، عذاب و عقاب، گمراہی اور شرک کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور زیر بحث آیت میں عذاب، آزار اور تشدد کے معنی میں ہے۔

اس کی نظیر سورہ ذاریات کی آیت ۱۳-۱۴ میں بھی آئی ہے ﴿يوم هم على النار يفتنون ذوقوا فنتمكم هذا الذي كنتم به تستعجلون﴾ ”وہی دن جس دن وہ آگ میں جلائے جائیں گے اور ان سے کہیں گے کہ عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں تمہیں جلدی تھی“۔ ”ثم لم يتوبوا“ کا جملہ بتاتا ہے کہ توبہ کا راستہ اس قسم کا تشدد کرنے والوں کے لئے بھی کھلا ہوا ہے اور یہ چیز بتاتی ہے کہ پروردگار عالم گناہ گاروں پر کتنا رحم کرنا چاہتا ہے۔

ضمناً یہ مکہ کے لوگوں کے لئے تنبیہ ہے کہ وہ جلد از جلد مومنین کو آزار پہنچانے اور تکلیف دینے سے باز آجائیں اور خدا کی طرف رجوع کریں۔ قرآن اصولی طور پر بازگشت کی راہ کسی پر بند نہیں کرتا اور یہ چیز بتاتی ہے کہ دردناک عذاب دنیا بھی مفسدین کی اصلاح کے لئے ہے اور ان کے حق کی طرف لوٹ آنے کے لئے ہے۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ اس آیت میں ان کے لئے دو قسم کے عذاب بیان ہوئے ہیں، ایک عذاب جہنم دوسرا عذاب حریق (جلائے والی آگ کا عذاب) ان دو عذابوں کا ذکر ہو سکتا ہے کہ اس بناء پر ہو کہ چونکہ جہنم میں کئی قسم کی سزائیں اور عذاب ہیں، جن میں سے ایک جلائے والی آگ ہے۔ اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس بناء پر کہ تشدد کرنے والے مذکورہ افراد مومنین کو آگ میں جلاتے تھے لہذا وہاں انہیں آگ کی سزا ملنی چاہیے، لیکن یہ آگ کہاں اور وہ آگ کہاں۔ وہ آگ خدا کے قہر غضب کے شعلوں سے بھڑکائی گئی ہے اور وہ ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، نیز ذلت و خواری اپنے ہمراہ لیتے ہوئے ہے، جب کہ دنیا کی آگ ناپائیدار ہے جو کمزور مخلوق کی جلائی ہوئی ہے اور جو مومنین اس میں جلے ہیں وہ سر بلند پر افتخار ہوں گے اور راہ حق کے شہیدوں کی پہلی صف میں ان کی جگہ ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ عذاب جہنم ان کی کفر کی سزا تھا اور عذاب حریق ان کے تشدد اعمال کے نتیجے میں ہے۔ اس کے بعد مومنین کے اجر کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیئے ان کے لئے جنت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ بہت بڑی کامیابی اور نجات ہے۔“ ﴿ان الذین امنوا و عملوا الصالحات لهم جنات تجری من تحتها الانهار ذالک الفوز الکبیر﴾۔

اس سے بہتر کونسی کامیابی ہوگی کہ پروردگارِ عالم کے جوارِ اقدس میں انواع و اقسام کی پائیدار نعمتوں کے درمیان سر بلندی و افتخار کے ساتھ ان کو جگہ ملے۔ لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اس فوزِ کبیر اور کامیابی کی اصل کلید ایمان اور عملِ صالح ہے۔ اس راہ کا اصلی سرمایہ یہی ہے، باقی جو کچھ ہے وہ اس کی شاخیں ہیں۔

”عملوا الصالحات“ کی تعبیر (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ صالحاتِ صالح کی جمع ہے) بتاتی ہے کہ صرف ایک یا چند عملِ صالح کافی نہیں ہیں بلکہ ضروری ہے کہ انسان ہر قدم پر عملِ صالح انجام دے۔

”ذالک“ کی تعبیر جو عربی میں دور کے اشارے کے لئے آیا ہے، اس قسم کے مقامات پر اہمیت اور بلندی کو ظاہر کرتی ہے یعنی ان کی کامیابی، نجات اور اختیارات اور اعزازات اس قابل ہیں کہ ہماری فکر کی دسترس سے خارج ہیں۔ اس کے بعد دوبارہ تشدد کرنے والوں اور کفار کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”یہ یقینی بات ہے کہ تیرے پروردگار کی قہر آمیز گرفت اور سزا بہت ہی شدید ہے۔“ ﴿ان بطش ربہ لشدید﴾۔ اس کے بعد فرماتا ہے: ”یہ گمان نہ کرو کہ تمہارے درمیان میں قیامت نہیں ہے، یا تمہاری بازگشت مشکل ہے، وہی ہے جو خلقت کا آغاز کرتا ہے اور وہی ہے جو واپس لوٹائے گا۔“ ﴿انہ یدئ و یعید﴾۔

”بطش“ کے معنی ایسی گرفت کے ہیں جس میں قہر و قدرت کا دخل ہو، چونکہ عام طور پر یہ کام سزا کی تمہید ہوتا ہے اس لئے یہ لفظ سزا کے معنی میں بھی آیا ہے۔

”ربک“ تیرے پروردگار کی تعبیر پیغمبر کے دل کی تسلی اور خدا کی طرف سے ان کی حمایت کی تاکید ہے۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کئی قسم کی تاکیدوں کو لیتے ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو لفظ بطش خود قہر آمیز گرفت کے معنی میں ہے اور اس میں شدت پوشیدہ ہے، دوسرے جملہ اسمیہ ہے جو عام طور پر تاکید کے لئے آتا ہے، تیسرے ”شدید“ کی تعبیر اور چوتھے لفظ ”ان“، اور پانچویں ”لام تاکید“ یہ سب اسی آیت میں جمع ہیں، اس بناء پر قرآن مجید چاہتا ہے کہ انہیں انتہائی انداز میں سزاؤں کے بیان سے تہدید کرے اور دھمکائے اور انہ یدئ و یعید کا جملہ جس میں معاد کی اجمالی دلیل پوشیدہ ہے، کہہ کر ایک اور تاکید کا اضافہ کرتا ہے۔^(۱)

﴿قُلْ يَحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ﴾ کہہ دے وہی ذات جس نے اسے ابتداء میں خلق کیا ہے، دوبارہ زندہ کمرے گی اور وہ اپنی پوری مخلوق سے آگاہ ہے۔ کہتے ہیں کہ فارابی کی آرزو تھی کہ کاش مشہور یونانی فیلسوف ارسطو زندہ ہوتا تاکہ وہ محکم اور خوبصورت دلیل معاد و قیامت کے بارے میں قرآن مجید کی طرف سے سنتا۔ اس کے بعد خدائے عظیم و برتر کے اوصاف میں سے پانچ اوصاف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ”وہ توبہ کرنے والے بندوں کو بخشنے والا اور مومنین کو دوست رکھنے والا ہے“۔ ﴿وَهُوَ الْغَفُورُ الْودُودُ﴾۔

”وہ تخت قدرت والا، عالم ہستی پر حکومتِ مطلقہ رکھنے والا صاحبِ مجدد و عظمت ہے“۔ ﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ﴾ ”وہ کام کا ارادہ کر کے اسے انجام دیتا ہے“۔ ﴿فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾

”غفور“ و ”ودود“ دونوں مبالغہ کئے صیغہ ہیں اور اس کی انتہائی بخشش اور محبت کی طرف اشارہ ہیں۔ گناہ گار توبہ کرنے والوں کا بخشنے والا اور بندگانِ صالح کے بارے میں شفیق و مہربان۔

حقیقت میں ان اوصاف کا ذکر اس تہدید کے مقابلہ میں، جو گزشتہ آیات میں آئی ہے، اس حقیقت کو بیان کرنے کے لئے ہے کہ بازگشت کا راستہ گناہ گاروں کے سامنے کھولا ہے اور خدا شدید العقاب ہونے کے باوجود غفور و ودود، و رو ف و مہربان ہے۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ودود یہاں فاعل کے معنی رکھتا ہے، نہ کہ مفعول کے۔ اور یہ جو بعض مفسرین نے ودود کے لفظ کو اسم مفعول کے معنوں میں سمجھا ہے، مثل رکوب کے جو مرکوب کے معنی میں آیا ہے یعنی خدا سے بہت زیادہ محبت و دوستی کی گئی، غفور کی صفت کے ساتھ جو اس سے پہلے آئی ہے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ خدا کا ہدف و مقصد بندوں سے محبت کرنا اور انہیں دوست رکھنا ہے، نہ کہ بندوں کا اس کی نسبت دوست رکھنا اور محبت کرنا ہے۔

تیسری صفت یعنی ذوالعرش، اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ عرش بلند تخت شاہی کے معنی میں ہے، اس قسم کے موارد میں قدرت و حاکمیت کا کنایہ ہے اور اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ جہاں ہستی کی حکومت اسی لئے ہے اور جو کچھ وہ ارادہ کرے وہ انجام پاجاتا ہے۔

اس بنا پر حقیقت میں ”فعال لما یزید“ کا جملہ اس حاکمیت مطلقہ کے لوازم میں سے ہے اور ان سب میں مسئلہ معاد اور مردوں کو موت کے بعد زندہ کرنے والے جباروں کو سزا دینے اور کیفرِ کردار تک پہنچانے کے سلسلہ میں اس کی طاقت و قدرت کی نشاندہی کرتا ہے۔

”مجید“ ”مجد“ کے مادہ سے کرم و شرافت و جلالت کی وسعت کے معنی میں ہے اور یہ ایسی صفات میں سے ہے جو خدا کی ذات سے مخصوص اور دوسروں کے بارے میں بہت کم استعمال ہوتی ہیں۔^(۲)

یہ پانچویں صفتیں ایک واضح انجام اور ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے کہ غفور و ودود ہونا اس وقت مفید ہے جب قدرت حاصل ہو اور کرم و وسیع اور نعمت بے پایاں ہو، تاکہ وہ جو کچھ ارادہ کرے انجام دے سکے۔ نہ کوئی چیز اس کے کام میں مانع ہو اور نہ کوئی مقابلہ کی قدرت رکھتا ہو اور اس کے ارادہ میں ضعف و تقاہت و شک اور تردید و فسخ کا امکان نہ ہو۔

۱۔ معاد کے بارے میں مندرجہ بالا خوب صورت دلیل وہی ہے جو سورہ یسین کے آخر میں آیہ ۷۹ میں بھی آئی ہے۔

۲۔ توجہ رکھنی چاہیے کہ اوپر والی آیت میں مجید مشہور قرائت کی بناء پر مرفوع ہے اور خدا کے اوصاف میں سے ہے نہ کہ مجرد اور عرش کے اوصاف میں سے۔

آیات ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲

۱۷۔ ﴿ہل اناک حدیث الجنود﴾۔

۱۸۔ ﴿فرعون و ثمود﴾۔

۱۹۔ ﴿بل الذین کفروا فی تکذیب﴾۔

۲۰۔ ﴿و اللہ من وائہم محیط﴾۔

۲۱۔ ﴿بل هو قرآن مجید﴾۔

۲۲۔ ﴿فی لوح محفوظ﴾۔

ترجمہ

۱۷۔ کیا لشکروں کی داستان تجھ تک پہنچی ہے۔

۱۸۔ فرعون و ثمود کے لشکر۔

۱۹۔ بلکہ کفار ہمیشہ حق کی تکذیب میں مصروف رہتے ہیں۔

۲۰۔ اور خدا ان سب پر احاطہ رکھتا ہے۔

۲۱۔ (یہ کوئی جادو اور جھوٹ نہیں ہے) بلکہ با عظمت قرآن ہے۔

۲۲۔ جو لوح محفوظ میں موجود ہے۔

تو نے دیکھا کہ خدا نے فرعون و ثمود کے لشکروں کے ساتھ کیا کیا؟

گزشتہ آیات میں خدا کی قدرتِ مطلقہ اس کی قطعی حاکمیت اور تشدد کرنے والے کفار کی تہدید کے طور پر تھیں۔

یہ بتانے کے لئے یہ تہدیدیں عملی ہیں، باتوں اور نعروں کی حد تک محدود نہیں ہیں، زیر بحث آیات میں روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”کیا لشکروں کی داستان تجھ تک پہنچی ہے“۔ ﴿ہل اناک حدیث الجنود﴾۔ وہ عظیم لشکر جنہوں نے خدائی پیغمبروں کے مقابلہ میں صف آرائی کی اور لڑنے کے لئے مستعد ہو گئے اس گمان میں کہ وہ خدائی قدرت کے مقابلہ میں اپنے کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے دو بہت ہی واضح اور آشکار نمونوں کی طرف جن میں سے ایک قدیم الایام میں اور دوسرا بہت ہی نزدیک کے زمانے میں وقوع میں آیا، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”وہی فرعون اور ثمود کے لشکر“ ﴿فرعون و ثمود﴾۔ ”وہی جن میں سے بعض نے دنیا کے مشرق و مغرب کو اپنے زیر تسلط کر لیا تھا اور بعض نے پہاڑوں کے چیر کمر بڑے بڑے پتھر کاٹ کر ان سے بڑے بڑے مکانات، قصر اور محل بنائے اور کسی میں بھی ان کا مقابلہ کرنے کی جرات نہیں تھی، لیکن خدا نے اپنے گروہ کو پانی کے ذریعہ اور دوسرے کی آندھی کے وسیلے سے، جو دونوں انسانی زندگی کا ذریعہ ہیں اور زیادہ لطیف موجودات شمار ہوتے ہیں، سپرد کوبی کی۔ دریائے نیل کی موجیں فرعون اور اس کے لشکر کو نگل گئیں اور ٹھنڈی اور سرکوبی کرنے والی ہوا قوم ثمود پر گاہ کی طرح اٹھاتی اور تھوڑے وقفہ کے بعد ان کے بے جاں جسموں کو سطح زمین پر پھینک دیتی تھی تاکہ مشرکین عرب جان لیں کہ وہ کچھ بھی کر سکتے۔

جب خدا نے ان عظیم اور طاقتور لشکروں سے اس طرح انتقام لیا تو ان لوگوں کی کیا ہستی ہے جو ان کے مقابلہ میں بہت ہی کمزور و ناتواں ہیں، اگر اس کی قدرت مقابلہ میں ضعیف قوی برابر ہیں۔

گزشتہ عام اقوام میں سے قوم ثمود و فرعون کا انتخاب سرکش قوموں کے نمونہ کے طور پر اس بناء پر ہے کہ وہ دونوں قویں انتہائی طاقتور تھیں۔ ایک گزشتہ ادوار سے متعلق تھی (قوم ثمود) اور دوسری زیادہ نزدیک ماضی سے تعلق رکھتی تھی (قوم فرعون) علاوہ ازیں قوم عرب ان ناموں سے باخبر تھی اور اجمالی طور پر ان کی تاریخ سے آشنا تھی۔

بعد الی آیت میں مزید کہتا ہے: ”بلکہ وہ لوگ کافر ہو گئے وہ ہمیشہ حق کی تکذیب میں گرفتار و مبتلا ہیں“۔ ﴿بل الذین کفروا فی تکذیب﴾۔ اس طرح نہیں ہے کہ حق کی نشانیاں کسی سے مخفی ہیں۔ عناد اور ہٹ دھرمی اجازت نہیں دیتے کہ بعض لوگ راہ نکال کر منزل حق کی طرف قدم بڑھائیں۔

”بل“ کی تعبیر جو اصطلاح کے، مطابق ”اضراب“ (ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف عدول کرنے) کے لیے ہے، گویا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مشرک گروہ قوم فرعون و ثمود سے بھی بدتر اور زیادہ ہٹ دھرم ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ قرآن کے انکار اور تکذیب میں لگے رہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اور وسیلہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لیکن انہیں جان لینا چاہیے کہ خدا ان سب پر احاطہ رکھتا ہے اور وہ سب ان کی قدرت کی گرفت میں ہیں ﴿واللہ من

ورائہم محیط﴾۔

اگر خدا انہیں مہلت دیتا ہے تو عجز و توانائی کی بنا پر نہیں ہے اور اگر انہیں جلدی سزا نہیں دیتا تو وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اس کی اقالیم قدرت سے باہر ہیں۔ ﴿ورائہم﴾ ان کے پیچھے اور پس پشت کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہر جہت سے قدرت الہی کے قبضہ میں ہیں اور قدرت تمام اطراف سے ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اس بنا پر ممکن نہیں ہے کہ اس کی عدالت اور سزا سے راہ فرار اختیار کر سکیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد ان کے اعمال پر تمام جہات سے خدا کا علمی احاطہ ہو اس طرح سے کہ ان کی کوئی گرفتار، ان کا کوئی کردار اور ان کا کوئی کام اس سے مخفی نہیں ہے۔ بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے:

”ان کا قرآن مجید کی تذبذب پر اصرار اور اسے سحر، جادو، شعر اور کہانت سے تشبیہ دینا، بیہودہ اور فضول بات ہے، بلکہ وہ قرآن مجید با عظمت اور بلند مرتبہ ہے“ ﴿بل هو قرآن مجید﴾۔ ”ایسا کلام ہے جو لوح محفوظ میں ثبت ہے اور نا اہل شیاطین اور کاہنوں کا ہاتھ ہر گز اس تک نہیں پہنچتا، اور ہر قسم کے تغیر، تبدیلی، اضافہ اور نقصان سے محفوظ ہے ﴿فی لوح محفوظ﴾۔“

اس بنا پر اگر وہ ناروا نسبتیں تیری طرف دیتے ہیں اور تجھے شاعر، ساحر، کاہن، اور مجنون کہتے ہیں تو تو اس سے ہر گز غمگین نہ ہو۔ تیری تکیہ گاہ محکم، تیری راہ روشن اور تیرا حمایتی صاحب قدرت ہے۔

”مجید“ جیسا کہ ہم نے کہا ہے ”مجد“ کے مادہ سے شرافت و جلالت کی وسعت کے معنی میں ہے اور یہ معنی قرآن کے بارے میں پورے طور پر صادق آتے ہیں، اس لئے کہ قرآن کے مشمولات و مضامین وسیع و عظیم ہیں اور اس کے معانی بلند و پر مایہ ہیں۔

معارف و عقائد کے سلسلہ میں بھی اور اخلاق و مواعظ و احکام و تسنن کے بارے میں بھی۔ (لوح، لام کے زمر کے ساتھ) عریض و وسیع صفحہ کے معنی میں ہے جس پر کوئی چیز لکھتے ہیں اور لوح (لام کے پیش کے ساتھ) پیاس کے معنی میں ہے۔ اس ہوا کو بھی کہتے ہیں، جو زمین و آسمان کے درمیان موجود ہے، وہ فعل جو پہلے تلفظ سے مشتق ہوتا ہے آشکار ہونے اور چمکنے کے معنوں میں ہے۔

بہر حال یہاں مراد وہ صفحہ ہے جس پر قرآن مجید تحریر ہے۔ لیکن وہ صفحہ نہیں جو ہمارے درمیان رائج ہے جو الواح کی مانند ہے بلکہ ایک تفسیر کے مطابق جو ابن عباس سے منقول ہے کہ:

لوح محفوظ کا طول زمین و آسمان کے درمیانی فاصلے کے برابر ہے اور عرض مغرب و مشرق کے فاصلے کے برابر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں محسوس ہوتا ہے کہ لوح محفوظ وہی علم خدا کا ایک صفحہ ہے جس نے عالم مشرق و غرب کو گھیر رکھا ہے اور وہ ہر قسم کی دگرگونی، تغیر اور تبدیلی و تحریف سے محفوظ ہے۔

جی ہاں! قرآن مجید کا سرچشمہ حق تعالیٰ کا علم بے پایاں ہے۔ یہ انسانی فکر کی پیداوار نہیں ہے، نہ یہ القائے شیاطین کا نتیجہ ہے۔ اس کے مشمولات و مضامین اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

یہ احتمال وہی چیز ہے جسے قرآن مجید میں کبھی کتاب مبین سے اور کبھی ام الكتاب سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ رد کی آیت ۳۹ میں ہم پڑھتے ہیں (يُخَوِّدُ الْإِنسَانَ إِذَا مَا أَرَادَ أَن يُسِيرَ) خدا جسے چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الكتاب ہے۔ اور سورہ انعام کی آیت ۵۹ میں آیا ہے (وَلَا رطب ولا يابس الا في كتاب مبين) خشک و تر کی کوئی چیز ایسی نہیں مگر یہ کہ واضح کتاب میں ثبت ہے۔

خداوند! ہمیں اپنی اس عظیم آسمانی کتاب کی حقیقت سے زیادہ آشنا فرما۔

پروردگار! اس دن جس میں مومنین صلح فوز کبیر حاصل کریں گے اور کافرین مجرم عذاب حریق میں گرفتار ہوں گے اپنے دامن عافیت میں پناہ دیجو۔

بار الہا! تو غفور و ودود و روف و مہربان ہے۔ تو ہم سے وہ سلوک کمر جو تیرے ان اسمائے صفات سے ہم آہنگ ہے۔ وہ سلوک نہ کیجو جس کا ہمارے اعمال تقاضا کرتے ہیں۔

آمین یا رب العالمین

سورہ بروج کا اختتام

سورہ طارق

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اور اس میں ۱۷ آیتیں ہیں

سورہ طارق کے مضامین اور ان کی فضیلت

اس سورہ کے مطالب نہایت عمدہ طریقہ سے دو محوروں کے گرد گھومتے ہیں۔

۱۔ معاد و قیامت کا محور۔

۲۔ قرآن مجید اور اس کی قدر و قیمت کا محور۔

لیکن سورہ کے آغاز میں فکر آفرین قسموں کے بعد ان نگہبانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو خدا کی طرف سے بندوں پر مقرر ہیں اور معاد و قیامت کے امکان کو ثابت کرنے کے بعد پہلی زندگی، یعنی انسان کے نطفہ کے پانی سے پیدا ہونے، کی طرف اشارہ کر کے نتیجہ اخذ کرتا ہے اور فرماتا ہے:

”وہ خدا جو قدرت رکھتا ہے کہا سے اس قسم کی بے قیمت اور ناچیز پانی سے پیدا کرے، وہ نئے سرے سے اس کی باز گشت کی توانائی اور طاقت بھی رکھتا ہے، بعد کے مرحلے میں روز قیامت کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس کے بعد متعدد پر معنی قسموں کے حوالہ سے قرآن کی اہمیت کو گوش گزار کرتا ہے اور آخر کار سورہ کو خدائی عذاب کی اس تہدید پر ختم کرتا ہے جو کافروں کے لئے ہے۔“

اس سورہ کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں ہمیں پیغمبر اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ (من قرأھا اعطاه اللہ بعدد کل نجم فی السماء عشر حسنات) جو شخص اس کی تلاوت کرے خدا اسے ہر اس ستارے کی تعداد کے مقابلہ میں، جو آسمان میں ہے، دس نیکیاں عطا کرتا ہے۔^(۱)

اور ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے (من کان قرأته فی الفریضة و السماء و الطارق کان له عند اللہ يوم القيامة جاه و منزله و کان من رفقاء النبیین و اصحابهم فی الجنة) جو شخص نماز فریضہ و واجب میں سورہ و السماء و الطارق کی تلاوت کرے وہ روز قیامت خدا کے ہاں عظیم مقام و منزلت کا حامل ہوگا اور جنت میں پیغمبروں کے رفقاء اور ان کے اصحاب میں سے شمار ہوگا۔^(۲)

واضح رہے کہ سورہ کے مضامین پر عمل کرنا ہی ایسی چیز ہے جس کا یہ اجر عظیم ہے، نہ کہ وہ تلاوت جو عمل اور غورو فکر سے خالی ہو۔

۱۔ مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۶۹۔

۲۔ ثواب الاعمال مطابق نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۴۹۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ﴾۔

۲۔ ﴿وَمَا اَدْرَاكَ مَا الطَّارِقِ﴾۔

۳۔ ﴿النَّجْمِ الثَّاقِبِ﴾۔

۴۔ ﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لِّمَا عَلَيْهَا حَافِظٌ﴾۔

۵۔ ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾۔

۶۔ ﴿خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ﴾۔

۷۔ ﴿يَخْرُجُ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ﴾۔

۸۔ ﴿اِنَّهُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ﴾۔

۹۔ ﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ﴾

۱۰۔ ﴿فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَ لَا نَاصِرٍ﴾۔

ترجمہ

رحمن و رحیم کے نام سے

۱۔ قسم ہے آسمان کی اور رات کے کھٹکھٹانے والی کی۔

۲۔ اور تو نہیں جانتا کہ رات کو کھٹکھٹانے والا کون ہے؟

۳۔ وہی درخشاں ستارہ اور تاریکیوں کو چیرنے والا۔

۴۔ (اس عظیم خدائی آیت کی قسم) ہر شخص کا ایک مراقب و محافظ ہے۔

۵۔ انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟

۶۔ وہ اچھلتے ہوئے پانی (منی) سے پیدا ہوا ہے۔

۷۔ وہ پانی جو پشت اور سینوں کے درمیان سے خارج ہوتا ہے۔

۸۔ (وہ جس نے اس قسم کی ناچیز شے سے پیدا کیا ہے) اسے واپس لوٹا سکتا ہے۔

۹۔ جس دن اسرار کھلیں گے۔

۱۰۔ اور اس کے لئے کوئی قوت اور مددگار نہیں ہے۔

اے انسان دیکھ کہ تو کس چیز سے پیدا ہوا ہے

یہ صورت بھی قرآن کے آخری پارے کی بہت سی دوسری سورتوں کی طرح خوبصورت اور فکر انگیز قسموں کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ ایسی قسمیں ایک عظیم حقیقت کے بیان کی تمہید ہیں۔

”قسم ہے آسمان کی اور رات کو کھٹکھٹانے والے کی“ ﴿و السماء و الطارق﴾ ”اور تو نہیں جانتا کہ رات کو کھٹکھٹانے والا کون ہے“ ﴿وما ادراک ما الطارق﴾ ”بلند و درخشاں اور رات کی تاریکیوں کو چیرنے والا ستارہ ہے“۔ ﴿النجم الثاقب﴾۔

”طارق“ طریق (مروزن برق) کے مادہ سے کوٹنے کے معنی میں ہے۔ راستے کو اسی لئے طریق کہتے ہیں کہ وہ چلنے والے لوگوں کے قدموں سے رونداجاتا ہے اور مطرقہ اس ہتھوڑے کے معنوں میں ہے جسے دھاتوں وغیرہ کو کوٹنے کے لئے استعمال کی کیا جاتا ہے۔ چونکہ رات کو گھروں کے دروازے بند کر دیتے ہیں اس لئے وہ شخص جو رات کو آتا ہے دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہوتا ہے، لہذا رات کو آنے والے شخص کو طارق کہتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اشعث بن قیس منافق کے بارے میں، جو رات کے وقت آپ کے دروازہ پر آیا تھا اور حلوہ اپنے ساتھ لایا تھا کہ اپنے خیال ناقص میں حضرت علی علیہ السلام اپنی طرف متوجہ کرے اور کسی معاملہ میں آپ سے اپنے موافق حکم حاصل کرے، فرماتے ہیں (وا عجب من ذالک طارق طرقتنا بملفوظہ و عائھا) اور اس سے زیادہ تعجب کی بات تو اس شخص کی ہے جس نے رات کے وقت دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور وہ لذیذ حلوہ سے پُر ڈھکا ہوا برتن اپنے ہمراہ لایا تھا۔^(۱)

لیکن قرآن یہاں طارق کی خود تفسیر کرتا ہے اور کہتا ہے یہ رات کا مسافر وہی درخشاں ستارہ ہے جو آسمان پر ظاہر ہوتا ہے اور اس قدر بلند ہے گویا چاہتا ہے کہ آسمان کی چھت میں سوراخ کر دے۔ اس کی روشنی آنکھوں کو اس قدر خیرہ کرنے والی ہے کہ تاریکیوں میں شگاف ڈال دیتی ہے اور انسان کی آنکھوں کے اندر نفوذ کرتی ہے۔ (توجہ فرمائیں کہ ثاقب ثقب کے مادہ سے سوراخ کرنے کے معنی ہے)۔

یہ بات کہ اس سے مراد کوئی معین ستارہ ہے، مثلاً ثریا نامی ستارہ (آسمان میں بلندی اور دوری کے لحاظ سے) یا زحل، پھر زہرہ یا شہب، (خیرہ کرنے والی روشنی کے لحاظ سے) یا آسمان کے تمام ستاروں کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں تفسیریں کی گئی ہیں۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بعد کی آیت میں اسے نجم ثاقب (نفوذ کرنے والے ستارے) کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہر ستارہ نہیں بلکہ وہ درخشاں ستارے ہیں جن کو نور تاریکی کے پردوں میں شگاف ڈال دیتا ہے اور انسان کی آنکھوں میں نفوذ کرتا ہے۔

بعض روایات میں النجم الثاقب کی زحل ستارے سے تفسیر کی گئی ہے جو نظام شمسی کے سیاروں میں سے بہت ہی پرمفروع اور منور ستارہ ہے، اور یہ معنی اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتے ہیں، جو امام صادق علیہ السلام نے النجم الثاقب کی تفسیر کے سلسلہ میں ایک منجم کو بتائے ہیں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: زحل ستارہ ہے جو ساتویں آسمان میں طلوع ہوتا ہے اور اس کی روشنی تمام آسمانوں کو چیرتی ہوئی نچلے آسمان تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی لئے خدا نے اسے نجم ثاقب کہا ہے۔^(۲)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ زحل آخری اور سب سے دور جو نظام شمسی ہے، اس کا ستارہ ہے، جو بغیر کسی آلے کی مدد کے خالی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے اور چونکہ نظام شمسی کے ستاروں کی ترتیب کے اعتبار سے سورج کی نسبت کے پیش نظر ساتویں مدار اور مقام گردش میں قرار پاتا ہے (چاند کے مدار کے حساب سے) تو امام اس حدیث میں اس کا مدار ساتواں آسمان بتاتے ہیں۔ اس ستارے کی کچھ خصوصیات ہیں جو اسے قابل قسم بناتی ہیں۔

ایک تو یہ نظام شمسی کے سب سے دور ستاروں میں سے ہے۔ اس وجہ سے ادب عربی میں ہر بلندی کی اس سے مثال دیتے ہیں اور کبھی اسے شیخ النجوم بھی کہتے ہیں۔^(۳)

زحل ستارہ جس کا فارسی نام کیوان ہے، اس کے کئی نورانی حلقے ہیں جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اس کے آٹھ چاند ہیں۔ زحل کے نورانی حلقے جو اس کا احاطہ کئے ہوئے عجیب ترین آسمانی مظاہر میں سے ہیں، جن کے بارے میں ماہرین فلکیات کے مختلف نظریات ہیں اور وہ حلقے اب بھی پر اسرار موجودات ہیں۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ زحل دس چاند ہیں جن میں سے آٹھ کا عام نجومی دور بینوں سے مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور دوسرے دو چاند صرف بہت بڑی دور بینوں سے نظر آسکتے ہیں۔^(۴)

مذکورہ اسرار میں اس وقت کسی پر قطعاً واجب نہیں تھے۔ جب قرآن نازل ہوا تھا۔ وہ اس کے صدیوں بعد آشکار ہوئے، بہر حال نجم ثاقب کی زحل ستارے سے تفسیر خصوصیت کے ساتھ ممکن ہے، ایک واضح مصداق کے بیان کی قبیل سے ہوا اور وہ اس راہ میں حائل نہ ہو کہ آسمان کے دوسرے درخشاں ستاروں سے تفسیر کی جائے، اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری روایات میں مصداقی تفسیر بہت زیادہ ہے۔

سورہ صافات کی آیت ۱۰ میں ہم پڑھتے ہیں (الّا من خطف الخطفۃ فاتبعۃ شہاب ثاقب) ”مگر وہ جو مختصر سے لہجہ میں استراق سمع کے لئے (چوری چھپے کان لگا کر سننے کے لئے) آسمان کے نزدیک ہو تو شہاب ثاقب اس کا تعاقب کرتا ہے“۔

تو اس آیت میں شہاب کی توصیف لفظ ثاقب سے ہوئی ہے اور چونکہ یہ آسمان میں وجود میں آنے والی چیز عجائباتِ عالم میں سے ایک ہے، لہذا ممکن ہے کہ زیر بحث آیت کی ایک تفسیر یہ بھی ہو۔ اس آیت کے لئے جو شانِ نزول بعض کتب تفسیر میں بیان ہوئی ہے وہ بھی ان معانی کی تاکید کرتی ہے۔^(۵)

ہم دیکھیں کہ یہ قسمیں کس لئے ہیں۔ بعد میں آنے والی آیت میں فرماتا ہے: ”مسلم ہے کہ ہر ایک مراقب و محافظ ہے، ﴿ان کل نفس لما علیہا حافظ﴾“

۲۔ اس آیت میں ان نافیہ ہے اور لما الّا کے معنی میں ہے۔

جو اس کے اعمال کو لکھتا ہے اور حساب کتاب اور جزاء و سزا کے لئے محفوظ رکھتا ہے۔ جیسا کہ سورہ انفطار کی آیت ۱۰-۱۱-۱۲ میں ہم پڑھتے ہیں ﴿و انّ علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعملون ماتفعلون﴾ اور تم پر کچھ محافظ مقرر کر دیئے گئے ہیں، لکھنے والے مکرم و محترم، جو ہمیشہ تمہارے اعمال لکھتے ہیں اور جو کچھ انجام دیتے ہو اس سے واقف ہیں۔“

اس طرح تم اکیلے اور تنہا نہیں ہو، اور تم میں سے کوئی بھی ہو اور جہاں کہیں بھی ہو، وہ پروردگار کے مامورین کی زیر نگرانی ہوگا۔ یہ ایسا مفہوم ہے جس کی طرف توجہ انسان کی اصلاح و تربیت کے لئے بے حد موثر ہے قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیت میں یہ نہیں بیان کیا گیا کہ یہ حافظ کون ہے اور کن امور کی حفاظت کرتا ہے۔

لیکن قرآن کی دوسری آیتیں گواہی دیتی ہیں کہ حفاظت کرنے والے فرشتے ہیں اور جن چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں وہ انسان کے اعمال ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ طاعتیں ہوں یا معاصی و گناہ۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کی حوادث و مہلکات سے حفاظت ہے۔

واقعی اگر خدا انسان کی حفاظت نہ کرے تو دنیا میں بہت کم افراد کو طبعی موت نصیب ہو، اس لئے کہ حوادث کا حجم اس قدر زیادہ ہے کہ کوئی بھی ان سے نہیں بچ سکتا۔ خصوصاً وہ بچہ جن کی عمر ابھی چند سال ہی کی ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ بھی حفاظت نہ ہو تو جن و انس پر بنی شیطاں کے وسوسے اس قدر زیادہ ہیں کہ کوئی فرد بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بعد والی آیت مسئلہ معاد و قیامت اور اعمال و کمردار کے حساب و کتاب میں گفتگو کرتی ہے لہذا پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ اس آیت میں ان تینوں تفسیروں کو جمع کرنے سے بھی کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی۔

قابل توجہ یہ ہے کہ پہلے بیان شدہ قسموں کے اور اعمال انسان کی فرشتوں کے ذریعہ حفاظت کے مسئلہ کے درمیان ایک زندہ رابطہ ہے، اس لئے کہ بلند آسمان اور ستارے، جو اپنے منظم راستوں میں مسلسل راہ پیمائی کر رہے ہیں، اس عالم عظیم میں نظم و ضبط اور حساب و کتاب کے موجود ہونے کی دلیل ہے تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسان کے اعمال حساب و کتاب کے بغیر ہوں اور مراقبین الہی اور محافظین خدائی ان کی نگرانی نہ کریں۔

اس کے بعد مسئلہ معاد کے ایک استدلال کے عنوان سے، ان لوگوں کے مقابلہ میں جو اسے غیر ممکن سمجھتے ہیں، فرماتا ہے: ”انسان کو دیکھنا چاہئیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے“ ﴿فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّا خَلَقَ﴾

اس طرح قرآن تمام لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر پہلی خلقت کی طرف واپس لے جاتا ہے اور ایک جملہ استفہامیہ کے ذریعہ ان سے پوچھتا ہے ”تمہاری خلقت کس چیز سے ہوئی ہے؟“ اور بغیر اس کے کہ ان کے جواب کا انتظار کرے، اس سوال کا جواب جو بالکل واضح ہے، خود دیتا ہے اور مزید کہتا ہے: ”وہ ایک ٹپکنے والے پانی سے خلق ہوا ہے“ ﴿خَلَقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ﴾۔ جو مرد کے نطفہ کی توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے: ”جو صلب اور ترائب کے درمیان سے نکلتا ہے“ ﴿يَخْرُجُ مِنْ

بَيْنَ الصَّلْبِ وَ التَّرَائِبِ﴾۔

”صلب“ کے معنی پشت کے ہیں اور ترائب تربیہ کی جمع ہے جو علماء لغت کے مطابق سینے کے اوپر کی ہڈیوں کے معنی میں ہے، جس کے اوپر گلوبند باندھا جاتا ہے، جیسا کہ ابن منظور لسان العرب میں کہتا ہے: (قال اهل اللغة اجمعون

موضع القلادة من الصدر) سب اہل لغت کہتے ہیں وہ سینے کے قلادة والی جگہ ہے۔ اس کے باوجود اس کے کئی اور معنی بھی بیان ہوئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ کہ ترائب کے معنی ہاتھ، پاؤں اور آنکھیں ہیں، یہ کہ سینہ کی ساری ہڈیاں ہیں۔ یادائیں طرف کی چار پسلیاں،۔ یا بائیں طرف کی چار پسلیاں،۔ بہر حال یہ کہ اس آیت شریفہ میں صلب و ترائب سے کیا مراد ہے، اس عنوان پر مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں۔

ان میں سے چند درج ذیل ہیں :

- ۱۔ ”صلب“ مردوں کی طرف اشارہ ہے اور ”ترائب“ عورتوں کی طرف، اس لئے کہ مرد مظہر صلابت اور عورتیں مظہر لطافت و زینت ہیں۔ اس لئے یہ آیت نطفہ انسانی کی ترکیب کی طرف مرد اور عورت کے نطفے کے حوالے سے اشارہ کرتی ہے جو موجودہ زمانے کی اصلاح میں ”اسپرم“ (sperm) اور ”اودل“ کے نام سے موسوم ہے۔
- ۲۔ ”صلب“ اشارہ ہے مرد کی پشت کی طرف اور ترائب اشارہ ہے اس کے سینے اور بدن کے اگلے حصہ کی طرف۔ اس بناء پر مراد صرف مرد کا نطفہ ہے، جو شکم کے اندرونی حصوں میں سے پشت اور اگلے حصے کے اندر سے خارج ہوتا ہے۔

- ۳۔ مراد عورت کے رحم سے جنین کا خروج ہے جو اس کی پشت اور بدن کے اگلے حصہ میں قرار پاتا ہے۔
- ۴۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت ایک دقیق علمی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے اس آخری زمانے کے انکشاف نے پردہ اٹھایا ہے، جو نزولِ قرآن زمانے میں یقیناً پنہان تھا اور وہ یہ کہ نطفہ مرد کے بیضے اور عورت کے تخمدان سے لیا جاتا ہے اور ماہرین جنین شناسی کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ یہ دونوں ابتداء میں جب جنین میں ظاہر ہوتے ہیں تو گمردوں کے قریب میں ہوتے ہیں اور تقریباً پشت کے مہروں کے ستون کے وسط کے مقابلہ میں صلب اور ترائب (پشت اور انسان کی نچلی پسلیاں) کے درمیان قرار پاتے ہیں۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد اور ان دونوں اعضاء کے نشوونما سے اس جگہ سے نیچے آجاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی موجودہ جگہ پر آجاتا ہے۔

چونکہ انسان کی پیدائش عورت اور مرد کے نطفہ کی ترکیب سے ہوتی ہے اور دونوں ابتداء میں اصل محل صلب و ترائب کے درمیان قرار پاتا ہے، لہذا قرآن نے اس قسم کی تعبیر کو منتخب کیا ہے، وہ تعبیر جو اس زمانے میں کسی کو معلوم نہیں تھی اور جدید علم جنین شناسی نے اس پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ (۶)

زیادہ واضح تعبیر میں مرد کا بیضہ اور عورت کا تخمدان ابتدائے خلقت میں، یعنی اس وقت جب عورت و مرد خود عالم جنین میں تھے، ان کی پشت میں قرار پایا تھا، جو تقریباً پشت کے مہروں کے ستون کے وسط کے مد مقابل تھا۔ اس طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ مرد کا نطفہ ساز دستگاه دونوں صلب و ترائب کے درمیان تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب مرد و عورت کی خلقت شکم مادر میں مکمل ہوتی ہے تو وہاں سے الگ ہو کر آہستہ آہستہ نیچے آتی ہے، اس طرح سے کہ مرد کے بیضے کے تولد کے وقت شکم سے باہر اور آلہ تناسل کے قریب قرار پاتی ہے اور عورت کا تخمدان رحم کے قرب میں قرار پاتا ہے۔

لیکن اس تفسیر پر اہم اعتراض یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ وہ ٹپکنے والا پانی صلب اور ترائب کے درمیان سے خارج ہوتا ہے، یعنی پانی خروج کے وقت ان دونوں کے درمیان سے گزرتا ہے، جبکہ اس تفسیر کے مطابق نطفہ کے پانی کے خروج کے وقت ایسا نہیں ہوتا۔ جبکہ نطفہ ساز دستگاه اس موقع پر کہ جب خود شکم مادر میں تھی تو اس وقت صلب و ترائب کے درمیان تھی۔ اس سے قطع نظر ترائب کی تعبیر اگر نجلی آخری پسلیوں سے لی جائے تب بھی بحث و تنقید سے خالی نہیں ہے

۵۔ اس جملہ سے یہ مراد ہے کہ منی حقیقت میں انسان کے تمام اجزائے بدن سے لی جاتی ہے۔ اسی لئے خروج کے وقت سارے بدن میں ہیجان ہوتا ہے اور اس کے بعد تمام بدن میں سستی آجاتی ہے۔ اس لئے صلب و ترائب انسان کی عام پشت اور تمام اگلے حصہ کی طرف اشارہ ہے۔

۶۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ عمدہ ترین منی کی پیدائش کا عامل ”نخاع شوکی“ حرام مغز ہے کو مرد کی پشت اور اس کے بعد دل و جگر ہیں، جن میں سے ایک سینہ کی ہڈیوں کے نیچے اور دوسرا دونوں کے درمیان ہے اور یہی چیز سبب بنی کے صلب و ترائب کے مابین تعمیر کا اس کے لئے انتخاب ہوا، لیکن ہر چیز سے پہلے مشکل کے حل کرنے کے لئے اس اہم نکتہ کی طرف توجہ کی جائے کہ مندر بالا آیات میں صرف مرد کے نطفہ کے بارے میں گفتگو ہے اس لئے کہ ماء دافق“ کی تعبیر (اچھل کر نکلنے والا پانی) مرد کے نطفہ پر صادق آتی ہے، نہ عورت کے نطفہ پر۔

یہی وجہ ہے کہ بعد والی آیت پر ”یخرج“ کی ضمیر جس کی طرف لوٹتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ اچھل کر نکلنے والا پانی صلب و ترائب سے خارج ہوتا ہے، تو اس حساب سے اس بحث قرآنی میں عورت کو شریک کرنا مناسب نظر نہیں آتا، بلکہ زیادہ مناسب وہی تعبیر ہے کہ کہا جائے کہ قرآن نطفہ کے دو اصلی اجزاء میں سے ایک کی طرف، جو مرد کا نطفہ ہے اور

سب کو معلوم ہے، اشارہ کرتا ہے اور صلب و ترائب سے مراد انسان کی پشت اور اگلا حصہ ہے، اس لئے کہ مرد کے نطفہ کا پانی ان ہی دونوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔^(۷)

یہ تعبیر واضح اور ہر قسم کی پیچیدگی سے خالی ہے اور لفظ کے معنی کے سلسلہ میں جو کچھ کتب لغت میں آیا ہے اس سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے باوجود ممکن ہے کہ اس آیت میں ایک سے زیادہ اہم حقیقت بھی چھپی ہوئی ہو جو ہمارے موجودہ علم کی حد تک ہمارے لئے منکشف نہیں ہوئی اور ماہرین کے آئندہ کے انکشافات اس پر سے پردہ ہٹا سکیں گے۔ اس کے بعد اس بیان سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ جس نے انسان کو نطفہ کے پانی سے پیدا کیا ہے، قادر ہے کہ اسے دوبارہ زندگی کی طرف لوٹائے۔“ ﴿انہ علیٰ رجعه لقادر﴾۔

ابتداء میں وہ مٹی تھا، پیچیدہ اور تعجب انگیز مراحل طے کرنے کے بعد کامل انسان میں تبدیل ہوا۔ اس لئے اس کی نئی زندگی کی طرف بازگشت کوئی مشکل پیدا نہیں کرتی۔ اس بیان کی نظیر قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی نظر آتی ہے۔

سورہ حج کی آیت ۵ میں فرماتا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّن تَرَابٍ ثُمَّ مِّن نُّطْفَةٍ﴾ ”اے لوگوں! اگر قرآن کے بارے میں شک میں مبتلا ہو تو ہم نے تمہیں خاک سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے۔“ نیز سورہ مریم کی آیت ۶۷ میں ہم پڑھتے ہیں ﴿أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكْ شَيْءٌ﴾ ”کیا انسان اس بات کو یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اسے پہلے پیدا کیا، جبکہ وہ کوئی شے نہیں تھا۔“

اس کے بعد اس عظیم دن کی تعظیم و توصیف پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”یہ بازگشت اس دن تحقق پائے گی جس دن اسرار آشکار ہوں گے۔“ ﴿يَوْمَ تَبْلَى السَّرَائِرُ﴾^(۸)۔

”تبلی“۔ ”بلوی“ کے مادہ سے آزمائش اور امتحان کے معنی میں ہے اور چونکہ آزمائش کے وقت اشیاء کی حقیقت آشکارو واضح ہو جاتی ہے، لہذا یہ مادہ یہاں ظہور و بروز کے معنی میں آیا ہے۔

جی ہاں! اس دن جو یوم الظہور و یوم البروز ہے، اسرار آشکار ہو جائیں گے، قطع نظر اس سے کہ ایمان و کفر نفاق ہوں، یا نیت خیر و شریار یا و اخلاص۔

روز بروز یہ ظہور مومنین کے لئے باعث افتخار و فراوانی نعمت ہوگا اور مجرموں کے لئے شرمساری اور اس کے جھلکے کا سبب اور ذلت و خواری کا باعث۔ اور کیا ہی دردناک ہے کہ وہ انسان جس نے اپنی اندرونی خرابیوں اور برائیوں کو عمر بھر لوگوں سے چھپائے رکھا ہو اور ان کے درمیان عزت سے زندگی گزاری ہو، لیکن اس دن، جس دن تمام اسرار

آشکار ہوں گے، تو تمام مخلوق کے سامنے شرمسار اور ندامت سے سرنگوں ہو، اس لئے کہ بعض اوقات عذابِ ندامت اور دوزخ کی آگ سے بھی زیادہ دردناک ہوتا ہے۔

سورہ رحمن کی آیت ۴۱ میں بھی آیا ہے: ﴿يَعْرِفُ الْمَجْرُمُونَ بِسِيْمَاهُمْ﴾ ”قیامت میں گناہگار اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے۔“ نیز دوسری آیات میں ہے کہ ”قیامت میں ایک گمروہ کے چہرے روشن اور تابناک ہوں گے اور دوسرے گمروہ کے چہرے تاریک و غبار آلود ہوں گے۔“ (عبس - ۳۸ - ۴۱)

جی ہاں! جس طرح طارق اور ستارے رات کے وقت آسمان میں ظاہر ہوتے ہیں اور پردے سے باہر آجاتے ہیں، وہ محافظ و مراقب جو انسان کے اعمال کے حفظ و ضبط پر مامور ہیں، وہ بھی وہاں سب کچھ ظاہر کر دیں گے۔۔

ایک روایت میں معاذ بن جبل سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ سے اس آیت میں جو لفظ سرائر ہے، اس کے معنی پوچھے کہ وہ کون سے اسرار ہیں جن کے ذریعہ خدا قیامت میں بندوں کو آزمائے گا؟ تو آپ نے فرمایا

(سرائرکم ہی اعمالکم من الصلوة و الصيام و الزکوة و الوضوء و الغسل من الجنابة و کل مفروض لان الاعمال کلها سرائر خفية فان شاء الرجل صليت ولم یصل وان شاء قال توضأت ولم یتوضأ فذالک قولہ یوم تبلی السرائر)۔

”تمہارے سرائر تمہارے اعمال ہی ہیں، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، وضو، غسل، جنابت اور ہر واجبِ عمل، اس لئے کہ تمام اعمال حقیقت میں پنہاں ہیں۔ اگر انسان چاہے تو کہہ دے کہ میں نے نماز پڑھی ہے جب کہ اس نے نہ پڑھی ہو اور کہہ سکتا ہے کہ میں نے وضو کیا ہے جبکہ وضو نہ کیا ہو۔ یہ ہے خدا کے اس کلام کی تفسیر ﴿یوم تبلی السرائر﴾۔“^(۹)

اس دن اہم مشکل یہ ہوگی کہ انسان کے لئے کوئی قوت و طاقت اندر سے اور کوئی یاور و ہمدرد باہر سے نہیں ہوگا (نمالہ من قوۃ ولا ناصر)۔ کوئی طاقت جو اس کے برے اعمال اور بری نیت پر پردہ ڈالے اور کوئی مددگار جو اسے عذابِ الہی سے رہائی بخشے۔

یہ مفہوم بہت سی قرآنی آیات میں آیا ہے کہ اس دن نہ کوئی مددگار ہوگا نہ کوئی فدیہ ہونے والا قبول ہوگا، نہ ہی کوئی فرار اور بازگشت کی راہ انسان کے سامنے ہوگی اور نہ کوئی راستہ عدالت پروردگار کے چنگل سے فرار کرنے کا راستہ ہوگا۔ نجات کا وسیلہ صرف اور صرف عملِ صالح ہوگا۔ جی ہاں! نجات کا وسیلہ صرف یہی ہے۔۔

۲۔ نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۵۰ حدیث ۴۔

۳۔ دائرة المعارف دھندامادہ زحل۔

۴۔ دائرة المعارف دھندامادہ زحل۔

۵۔ روح المعانی، جلد ۱۰، ص ۳۹۷۔

۶۔ تفسیر مراغی، جلد ۳۰، ص ۱۱۳۔

۷۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی جب نطفہ سے انسان کی خلقت کی گفتگو درمیان میں آتی ہے تو زیادہ تر مردہ ہی کے نطفہ پر، جو ایک محسوس امر ہے، انحصار کیا جاتا ہے۔ سورہ نجم کی آیت ۴۶ اور سورہ قیامت کی آیت ۳۷ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۸۔ یوم یہاں ظرف ہے اور رجح کا متعلق ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے اور اس قسم کے مواد میں مصدر اور اس کے معمول کے درمیان فاصلہ ضرر نہیں رکھتا، اس لئے کہ یہ کسی اجنبی سے فاصلہ نہیں ہے۔

۹۔ مجمع البیان، جلد ۱۰۔ اس مفہوم سے مشابہ تفسیر در المنثور، جلد ۶، ص ۳۳۶ میں بھی آئی ہے۔

آیات ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷

۱۱۔ ﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ﴾۔

۱۲۔ ﴿وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ﴾۔

۱۳۔ ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ﴾۔

۱۴۔ ﴿وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾۔

۱۵۔ ﴿أَتَمْ يَكِيدُونَ كِيدًا﴾۔

۱۶۔ ﴿وَإِكِيدَ كِيدًا﴾۔

۱۷۔ ﴿فَمَهْلُ الْكَافِرُونَ اِمْهَلُهُمْ زُوَيْدًا﴾۔

ترجمہ

۱۱۔ پر بارش آسمان کی قسم۔

۱۲۔ پر شگاف زمین کی قسم۔

۱۳۔ یہ ایک سچی ہے۔

۱۴۔ یہ مذاق نہیں ہے۔

۱۵۔ وہ ہمیشہ مکر کرتے ہیں۔

۱۶۔ اور میں اس کے مقابلہ میں چارہ جوئی کرتا ہوں۔

۱۷۔ اب جبکہ ایسا ہے تو کافروں کو تھوڑی سی مہلت دے دے۔ (تاکہ اپنے اعمال کی سزا دیکھ لیں)۔

میں دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہوں

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں انسان کے نطفہ اور اس کی پہلی زندگی کی طرف توجہ کے حوالے سے استدلال تھا، ان آیات میں پھر امر معاد پر تاکید کرتے ہوئے اور دوسرے دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”قسم ہے بارش سے پر آسمان کی“۔ ﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ﴾ اور قسم ہے زمین کی جو شگافہ کی جاتی ہے اور اس میں سے سبزہ پھوٹتا ہے

“﴿وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ﴾۔ ”کہ یہ ایک حق بات ہے کہ تم زندہ ہو جاؤ گے“۔ ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ﴾۔

”یہ پکی بات اور اس میں کسی قسم کی شوخی اور مزاح نہیں ہے“۔ ﴿وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾

”رج“ رجوع کے مادہ سے بازگشت کے معنی میں ہے اور عرب بارش کو رجع کہتے ہیں، اس وجہ سے کہ پانی زمین اور سمندروں سے اٹھتا ہے اور بارش کی صورت میں زمین کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یہ کہ مختلف فاصلوں پر بار بار بارش ہوتی ہے۔

وہ گڑھے جن میں بارش جمع ہو جاتی ہے انھیں بھی رجع کہتے ہیں، بارش کے پانی کے جمع ہو جانے کی بناء پر، یا ان لہروں اور موجوں کی بناء پر جو ان کی سطح پر ہوا کی جنبش سے پیدا ہوتی ہیں۔^(۱)

”صدع“ سخت اجسام میں شگاف پڑ جانے کے معنی میں ہے، اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو کچھ رجع کے معنی میں کہا گیا ہے اس کو کشک و سخت زمینوں کے بارش کے فزول کے بعد شگافتہ ہونے اور سبزہ کی نشوونما کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ حقیقت میں یہ دونوں قسمیں اشارہ ہیں مردہ زمینوں کی بارش کی وجہ سے زندہ ہونے کی طرف، جسے قرآن نے بار بار مسئلہ معاد کے سلسلہ میں بطور دلیل پیش کیا ہے۔ مثلاً سورہ ق کی آیت ۱۱ ﴿و احيينا به بلدة ميتاً كذلك﴾

الخروج﴾ ”ہم نے بارش کے ذریعہ مردہ زمینوں کو زندہ کیا اور قیامت میں تمہارا خروج بھی اسی طرح ہوگا۔“ اسی طرح ان قسموں کے درمیان اور ان چیزوں کے درمیان جن کے لئے قسم کھائی گئی ہے، واضح مناسبت ہے یہ قرآن کے محاسن میں سے ایک ہے کہ قسموں کے درمیان اور ان کے درمیان جنکے لئے یہ قسمیں کھائی جا رہی ہیں، ایک عمدہ اور پرکشش تناسب نظر آتا ہے، جس طرح سورہ ج کی آیت ۵ میں مسئلہ معاد پر نطفہ سے انسان کی خلقت اور جنین کے اسرار استدلال کرتا ہے اور بارش کے فزول کے زیر اثر مردہ زمینوں کے زندہ ہونے پر استدلال کرتا ہے، اسی طرح اس سورہ (سورہ طارق) میں بھی ان دونوں مسائل پر انحصار کیا ہے۔

بعض مفسرین نے ”﴿و السماء ذات الرجع﴾“ کے جملے کے لئے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے اور وہ ہے آسمان کے ستاروں کی گردش کی تکرار اور ان کا پہلی حالت کی طرف پلٹنا، زمین کی مختلف ادوار میں اپنے گرد اور سورج کی گردش اور نظام شمسی کے سیاروں کی حرکت، چاند سورج اور ستاروں کی طلوع و غروب کی حرکت۔ یہ سب حرکات باز گشت کی حامل ہیں۔ ان باز گشتوں کا وجود انسان کی حیات تازہ کی طرف بازگشت کی علامت ہے۔ البتہ پہلے معنی زمین کے شگافتہ ہونے اور مسئلہ معاد کے دلائل کے ساتھ بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔

قول فصل کے معنی ایسی بات کے ہیں جو حق و باطل کو الگ الگ کر دے۔ یہاں گزشتہ آیتوں کے قرینہ سے ایک گروہ نے اسے قیامت کی طرف اشارہ سمجھا ہے جبکہ مفسرین کی ایک دوسری جماعت اسے قرآن کی طرف اشارہ سمجھتی ہے۔

معصومین علیہم السلام کی بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ ہوا ہے۔ البتہ قیامت کو قول فصل سے تعبیر کرنا قرآن کی بہت سی آیتوں میں نظر آتا ہے، جو ضمنی طور پر معاد کی خبر دیتی ہیں۔ اس طرح دونوں تفسیروں کے درمیان جمع ممکن ہے۔ ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے واسطے سے پیغمبر اسلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(انھا ستكون فتنة قلت فما المخرج منها يا رسول الله قال كتاب الله فيه نبأ من قبلكم و خبر ما بعدكم وحكم ما بينكم هو الفصل ليس بالهزل من تركه من جبار قصمه الله و من ابتغى الهدى في غيره أضله الله)

”عنقریب تمہارے درمیان فتنہ ظاہر ہوگا۔ میں نے عرض کیا اے خدا کے رسول اس سے نجات کی کیا صورت ہے؟ فرمایا: قرآن جس میں گزشتہ اور آئندہ لوگوں کی خبریں اور تمہارے درمیان کے فیصلے ہیں اور وہ ایسا کلام ہے جو حق کو باطل سے جدا کر دیتا ہے، محکم و پختہ ہے، اس میں شوخی و مزاح نہیں ہے، جو جبار اس کو چھوڑے گا خدا اس کی کمر توڑے گا اور جو شخص اس کے غیر سے ہدایت چاہے گا خدا اس کو گمراہ کر دے گا۔“^(۲)

اس کے بعد پیغمبر و مومنین کو تسلی دینے کے لئے اور دشمنان اسلام کی تہدید کی غرض سے خداوند عالم مزید فرماتا ہے: ”وہ ہمیشہ مکر و جیلہ کرتے ہیں اور منصوبے بناتے ہیں ﴿انهم يَكِيدُونَ كَيْدًا﴾۔ میں بھی ان کے مقابلہ میں ایک منصوبہ بناتا ہوں اور ان کی سازش کو خاک میں ملا دیتا ہوں۔ ﴿وَأَكِيدُ كَيْدًا﴾ اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو کافروں کو تھوڑی سے مہلت دے دے تاکہ وہ اپنے اعمال کا انجام دیکھ لیں۔ ﴿فَمَهْلُ الْكَافِرِينَ اَمْلَهُمْ رَوِيْدًا﴾۔“

ہاں! وہ ہمیشہ منحوس منصوبہ تم سے لڑنے کے لئے بناتے رہتے ہیں۔ کبھی مذاق اڑاتے ہیں، کبھی، کبھی دیوانہ کہتے ہیں، کبھی صبح کو ایمان لاتے ہیں اور عصر کے وقت کافر ہو جاتے ہیں تاکہ ایک گروہ کو اپنے ساتھ واپس کفر کی طرف لے جائیں۔

کبھی کہتے ہیں کہ جو لوگ تیرے گرد جمع ہو گئے ہیں وہ فقراء و بے نوا ہیں۔ انہیں دور کرتا کہ تیرا ساتھ دیں۔ کبھی کہتے ہیں کم از کم ہمارے بعض خداؤں کو قانونی طور پر قبول کر لے تو ہم تیرا ساتھ دیں گے۔ کبھی تجھے جلا وطن کرنے کا اور

قتل کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر لمحہ اور نئے بھیس میں آتے ہیں تاکہ تیری جماعت کو متفرق و منتشر کر دیں اور تیرے اصحاب و انصار پر دباؤ ڈالیں یا تجھے ختم کر دیں اور خدا کے نور کو بجھا دیں۔

لیکن انہیں جانتا چاہیے کہ خدا نے ارادہ کیا ہے کہ یہ نور عالمگیر ہو جائے۔ یہ خدا کا نور ہے۔ یہ کسی کے پھونک مارنے سے نہیں بجھ سکتا۔ یہ فروزاں آفتاب ہے جو چمگاڈڑوں کی چشم پوشی سے ختم نہیں ہو سکتا۔ وہ منصوبہ بناتے اور ہم بھی اپنی تدابیر کرتے ہیں۔

”کید“ بقول مفردات راغب، ایک قسم کی چارہ جوئی ہے اور یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک مذموم دوسرا پسندیدہ، اگرچہ اس کا استعمال مذموم چارہ جوئی میں زیادہ ہوتا ہے لیکن مدوح چارہ جوئی میں بھی ہوتا ہے، مثلاً ﴿كَذٰلِكَ كَدٰنَا لِيُوسُفَ﴾ ہم نے اس طرح یوسف کے لئے چارہ جوئی کی۔ (سورہ یوسف - ۷۶)

دشمنوں کے کید و مکر کی مراد زیر بحث آیت میں واضح ہے۔ یہ وہی صورت حال ہے جس کے کچھ عنوانات کے متعلق ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور قرآن کی ایذا رساں سازشوں اور شرارت پر مبنی واقعات سے پر ہے۔ باقی رہا خدائی کمی، اس سے یہاں کیا مراد ہے؟

بعض نے یہاں کہا ہے کہ وہی مہلت دیتا ہے جو دردناک عذاب پر منتہی ہوتی ہے اور بعض نے خود عذاب کے معنی میں سمجھا ہے۔ لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ مراد وہی الطاف الہی ہیں جو پیغمبر اور مومنین کے شامل حال تھے اور دشمنان اسلام کو غافل کر دیتے اور ان کی کوشش کو ختم کر دیتے۔ ان کی سازشوں کو درہم برہم کر دیتے جس کے نمونے تاریخ اسلام میں بہت زیادہ ہیں۔

ان آیات میں خصوصیت کے ساتھ پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ کافروں سے لطف و مدارت سے پیش آ، انہیں مہلت دے اور ان کے فنا ہو جانے کے بارے میں عجلت سے کام نہ لے۔ انہیں چھوڑ دے کہ کافی حد تک اتمام حجت ہو جائے اور انہیں رہنے دے تاکہ لوگ مختصر سی آمادگی بھی رکھتے ہوں وہ آخر کار مشرف بہ اسلام ہو جائیں۔

اصولی طور پر جلد باز وہ ہوتا ہے جو فرصتوں کے خود اور مکانات کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ رکھتا ہے اور یہ چیز خداوند قادر و قاہر کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتی۔

قابل توجہ یہ کہ فرماتا ہے: ﴿فَمَهْلِ الْكَافِرِينَ﴾ ”کافروں کو مہلت دے۔“ اور دوبارہ تاکید کرتے ہوئے کہتا ہے ﴿اَمْهَلُهُمْ﴾ ”انہیں مہلت دے۔“

ان میں سے ایک باب تفعیل سے ہے اور دوسرا افعال سے اور اس کی تکرار تاکید کے لئے ہے، بغیر اس کے کہ لفظ کی تکرار ہو اور اس کے کانوں کو بوجھ محسوس ہو۔

”رویداً“۔ ”رود“ (بروزن عود) کے مادہ سے آمد و رفت رکھنے اور کسی کام کو نرمی سے انجام دینے کے معنی میں ہے۔ یہاں اس کے مصدری معنی مراد ہیں اور تصغیر کا پہلو لئے ہوئے ہیں، یعنی انہیں تھوڑی سی مہلت دے۔^(۳)

اس طرح خدا اس مختصر سے جملے میں اپنے پیغمبر کو تین مرتبہ ان سے مدارات کرنے اور انہیں مہلت دینے کی ہدایت کرتا ہے، یہ تمام مسلمانوں کے لئے نمونہ عمل ہے کہ وہ اپنے کاموں میں، خصوصاً جبکہ ان کا دشمن سے مقابلہ ہو، اس وقت حوصلہ اور صبر و شکیبائی سے کام لیں اور ہر قسم کی جلد بازی سے پرہیز کریں۔ کوئی بے محل اقدال نہ کریں اور ہر کام کا منصوبہ بنائیں۔ علاوہ ازیں دین حق کی تبلیغ کی راہ میں ہمیشہ جلد بازی سے پرہیز کریں تاکہ وہ تمام افراد، جنگلی ہدایت کا احتمال موجود ہے ایمان لے آئیں اور باقی تمام افراد کے بارے میں اتمام حجت ہو جائے۔

یہ بات کہ یہ مہلت کم اور مختصر کیوں شمار کی گئی ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اسلام مختصر سی مدت میں دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب ہو گیا تھا اور کافروں کے منصوبے خاک میں مل گئے تھے۔ انہوں نے پہلی ضرب کا مزہ جنگ بدر میں چکھا۔ اس کے بعد بہت جلد میدان احزاب و خیبر و حنین وغیرہ میں ان کے ارادے خاک میں ملے۔ پیغمبر کی زندگی کے آخری دنوں میں نور اسلام سارے جزیرۃ العرب پر چھا گیا اور ایک صدی گزرنے سے پہلے دنیا کے اس دور کے عمدہ اور اہم حصوں پر اس نے اپنا سایہ ڈال دیا۔ یا پھر اس وجہ سے ہے کہ قیامت کا عذاب بھی نزدیک ہے اور اصولی طور پر جو کچھ قطعی ہو وہ نزدیک شمار ہوتا ہے۔

بہر حال یہ سورہ آسمان اور ستاروں کی قسم سے شروع ہوتا ہے اور سازش کرنے والے حقیقت کے دشمن کفار کی تہدید پر ختم ہوتا ہے، درمیان میں معاد قیامت کے خوبصورت اور موثر دلائل اور انسانوں پر نگہبانوں کے تقرر کے بارے میں لطف بیانات ہیں۔ نیز مومنین کی تشفی و دلداری ہے۔ یہ تمام عنوانات مختصر عبارتوں کے ساتھ، جو نہایت ہی لطیف ہے اور مخصوص قسم کی قاطعیت لئے ہوئے ہیں، یقیناً ہوئے ہیں۔

خدا وندا! دشمنوں کے کید و مکر کا رخ، جو ہمارے زمانے میں بہت زیادہ ہو گیا ہے، خود انہی کی طرف کمر دے اور ان کے منحوس منصوبے نقش بر آب کر دے۔

پروردگار! جس روز اسرار کھل جائیں گے اس روز ہمیں شر مندہ نہ کیجو۔

بار الہا! ہم تیرے علاوہ کوئی قوت، ناصر اور مددگار نہیں رکھتے۔ ہمیں اپنے غیر کے سپرد نہ کیجیو۔
آمین یا رب العالمین

۱۔ مفردات راغب، مادہ رج۔

۲۔ صحیح ترمذی، سنن داود مطابق روح المعانی جلد ۳، ص ۱۰۰، اور تفسیر مراغی، جلد ۳۰، ص ۱۸۔

۳۔ اس بنا پر رویداً یہاں مفعول مطلق کا جانشین ہے اور حقیقت میں ایسا ہے کہ جیسا کہ کہا جائے امہلہم امہلا قلیل اور یہ بعض نے احتمال پیش کیا ہے کہ رویداً یہاں امر کے معنی رکھتا ہے، اس لئے تین امر پے در پے آئے ہیں، بعید نظر آتا ہے البتہ روید امر کے معنی میں اور اسم مفعول کی شکل میں بھی آیا ہے لیکن زیر بحث آیت سے مناسب اور اس لفظ کے منصوب ہونے کے ساتھ موزوں یہی ہے کہ مفعول مطلق ہو۔

سورہ اعلیٰ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اس میں ۱۹ آیتیں ہیں

سورہ اعلیٰ کے مضامین اور ان کی فضیلت

اس سورے کے در حقیقت دو حصے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس میں روئے سخن خود پیغمبر کی طرف ہے اور ان کے لئے تسبیح پروردگار اور ادائے قرض رسالت کے سلسلہ میں احکام جاری کئے گئے ہیں۔ اس حصہ میں خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ اوصاف شمار کرائے گئے ہیں۔

دوسرا حصہ وہ ہے جو خوف خدا رکھنے والے مومنین اور شقی القلب کفار کی بات کرتا ہے۔ اس حصہ میں ان دونوں گروہوں کی سعادت و شقاوت کے عوامل و اسباب اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

سورہ کے آخر میں اعلان کیا گیا ہے کہ یہ مطالب صرف قرآن ہی میں نہیں آئے بلکہ وہ حقائق ہیں جن پر گزشتہ کتب و صحف اور صحف ابراہیم و موسیٰ میں بھی تاکید آئی ہے۔ اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں ہم تک بہت سی روایات پہنچی ہیں۔

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث ہمیں پیغمبر اسلام کی ملتی ہے کہ آپ نے فرمایا:

(من قرأھا اعطاه اللہ عشر حسنات بعدد کل حرف انزل اللہ علیٰ ابراہیم و موسیٰ و محمد (صلوٰۃ اللہ علیہم) ” جو شخص سورہ اعلیٰ کی تلاوت کرے خدا ہر اس حرف کے بدلے جو اس نے ابراہیم و موسیٰ اور محمد پر نازل کیا ہے دن نیکیاں اسے عطا فرمائے گا۔“ (۱)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام منقول ہے کہ (من قرأ سبح اسم ربک الاعلیٰ فی فرائضہ او نوافلہ قیل له یوم القيامة ادخل الجنة من ای ابواب الجنة شیئت انشاء اللہ)

جو شخص اپنے فرائض یا نوافل میں سورہ اعلیٰ کی تلاوت کرے تو قیامت کے دن اس سے کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جا (انشاء اللہ) (۲)

متعدد روایات میں آیا ہے کہ جس وقت پیغمبر یا ائمہ ہدیٰ ﴿سبح اسم ربک الاعلیٰ﴾ پڑھتے تو اس کے بعد اس حکم پر عمل کرتے ہوئے فرماتے ”سبحان ربی الاعلیٰ“۔ (۳)

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے بیس سال راتوں کو آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی تو سوائے ﴿سبح اسم ربک الاعلیٰ﴾ کے اور کوئی سورۃ آپ نماز میں نہیں پڑھتے تھے۔ آپ فرماتے تھے اگر تم جانتے کہ اس میں کیا برکتیں ہیں تو تم میں سے ہر شخص اسے دس مرتبہ پڑھتا۔ اور جو شخص اسے پڑھے گویا اس نے موسیٰ و ابراہیم کے صحف کی تلاوت کی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ مجموعہ روایات جو اس سلسلہ میں دستیاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ سورہ پیغمبر اکرم کو محبوب سورہ تھا (کان رسول اللہ یحب هذه السورة سبح اسم ربک الاعلیٰ) (۴)

یہ بات کہ یہ سورہ مکی ہے یا مدنی اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا جبکہ بعض کا نظریہ ہے کہ مدینہ میں نازل ہوا، علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس سورہ کا پہلا حصہ مکہ ہو اور دوسرا حصہ (ذیلی) مدنی وہ اس لیے کہ ذیل میں گفتگو نماز اور زکوٰۃ کی ہے اور اس، تفسیر کے مطابق جو آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے ہم تک پہنچی ہے، نماز سے مراد نماز عید الفطر اور زکوٰۃ سے مراد فطرہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ماہ مبارک رمضان کے روزے، نماز عید اور زکوٰۃ فطرہ مدینہ میں نازل ہوئے ہیں۔ (۵)

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا حکم اس سورہ کے آخری حصہ میں ایک عام حکم کے طور پر ہے، اگرچہ نماز عید الفطر اور زکوٰۃ فطرہ اس کے ایک واضح مصداق شمار ہوتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ واضح مصداق کے ساتھ روایات اہل بیت بہت ہی فراوان ہے۔ اس وجہ سے ان مشہور علماء کا نظریہ جو کہتے ہیں کہ تمام سورہ مکی ہے، بعید نظر نہیں آتا ہے بالخصوص جب کہ آغاز سورہ کی آیات اور اختتام سورہ کی آیات مکمل طور پر، مقاطع حروف کے لحاظ سے ہم آہنگ ہیں۔ لہذا مشکل ہے کہ یہ کہا جاسکے کہ ایک حصہ مکہ میں نازل ہوا اور ایک مدینہ میں۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ مسلمانوں کا جو گروہ بھی مدینہ میں داخل ہوتا تو یہی سورہ مدینہ میں لوگوں کے سامنے پڑھتا۔ (۶)

پس یہ احتمال کہ اس کا صرف صدر حصہ مکہ میں اس کا ذیلی حصہ مدینہ میں نازل ہوا ہو، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۳۳۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۳۳۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۴۴۔

۴۔ تفسیر مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۷۲۔

۵۔ المیزان، جلد ۲۰ ص ۳۸۶۔

۶۔ تفسیر در المنثور، جلد ۶، ص ۳۳۷۔ یہ مفصل حدیث ہے جس کے اجمالی مفہوم کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿سُبْحِ اسْمِ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾۔

۲۔ ﴿الَّذِي خَلَقَ فَسْوَى﴾۔

۳۔ ﴿وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى﴾۔

۴۔ ﴿وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَى﴾۔

۵۔ ﴿فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوَى﴾۔

ترجمہ

رحمن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ اپنے بلند مرتبہ پروردگار کے نام کی تسبیح کر (اور اسے منزہ رکھ)۔

۲۔ وہ خدا جس نے پیدا کیا اور منظم کیا۔

۳۔ اور وہ جس نے منظم کیا اور ہدایت فرمائی۔

۴۔ اور وہ جس نے چراگاہ کو ظاہر کیا۔

۵۔ پھر اسے خشک اور سیاہ قرار دیا۔

خداوند عظیم کی تسبیح کر

یہ سورہ حقیقت میں مکتب انبیاء کی دعوت فکر کا نچوڑ اور خلاصہ، یعنی پروردگار عالم کی تسبیح اقدس سے شروع ہوتا ہے

پروردگار عالم ابتداء میں روئے سخن پیغمبر اسلام کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اپنے بلند مرتبہ پروردگار کے نام کو ہر

عیب و نقص سے منزہ شمار کر“۔ ﴿سُبْحِ اسْمِ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾۔

مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ یہاں اسم سے مراد مسمیٰ ہے جبکہ ایک جماعت نے کہا ہے کہ مراد خود اسم

پروردگار ہے، وہ نام جو مسمیٰ پر دلالت کرتا ہے ان دونوں تفسیروں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں۔

بہر حال مراد یہ ہے کہ خدا کا نام بتوں کا ہم ردیف قرار نہ دیا جائے اور اس کی ذات پاک کو ہم ہر قسم کے عیب و نقص سے جسم و جسمانیات کے عوارض سے اور ہر قسم کی محدودیت و نقصان سے منزہ شمار کریں۔ بت پرستوں کی طرح نہیں جو خدا کا نام بتوں کے ساتھ لیتے تھے، یا وہ لوگ جو خدا کو جسم جسمانیات سے منزہ خیال نہیں کرتے۔

”اعلیٰ“ کی تعبیر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ وہ ہر شخص اور ہر اس چیز سے، جس کا اہم تصور کر سکتے ہیں، ہر خیال و قیاس و گمان سے اور ہر قسم کے جلی و خفی شرک سے برتر و بالا ہے۔

”ربک“ (تیرا پروردگار) کی تعبیر اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ پروردگار جس کی طرف تو لوگوں کو بلاتا ہے بت پرستوں کے پروردگار سے الگ ہے

رب و اعلیٰ کی دو صفتوں کے بعد ان کی وضاحت کے لئے پانچ اور صفات بیان کرتا ہے جو سب کی سب پروردگار کی اعلیٰ ربوبیت کی تشریح ہیں، فرماتا ہے:

وہ خدا جس نے پیدا کیا اور منظم و مرتب کیا ﴿الذی خلق فسوٰی﴾۔

”سوٰی“ تسوٰیہ کے مادہ سے نظام بخشنے اور مرتب کرنے سے جو آسمانی ستاروں پر حاکم ہے، یا جو زمینی مخلوقات پر حکم فرماتا ہے انسان کی جسم و جان کے لحاظ سے۔

اور جو مفسرین نے صرف انسان کے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کے خاص نظام یا انسان کے راست قامت ہونے کے ساتھ تفسیر کی ہے، درحقیقت وہ اس مفہوم کے ایک محدود و مصداق کا بیان ہے۔ بہر حال عالم آفرینش کا نظام جو عظیم ترین آسمانی نظاموں پر حاوی ہے، پروردگار کی ربوبیت اور اس کے وجود کے اثبات کے لئے سادہ اور عام موضوعات کا موید ہے۔ مثلاً انسان کی انگلیوں کی پوروں کی لکیروں تک، جن کی جانب سورہ قیامت میں اشارہ ہوا ہے: ﴿بلیٰ قادرین

علیٰ ان نسوٰی بنانہ﴾ (قیامت، آیت ۴) اس مختصر سی تعبیر میں مطالب کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔

آفرینش اور خلقت کی تنظیم کے مسئلہ کے بعد حرکتِ کمالی اور اس کی راہ میں موجودات کی ہدایت کے لئے لائحہ عمل مقرر کرنے کے موضوع کو پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: ”وہ جس نے تقدیر مقرر کی اور ہدایت فرمائی“ ﴿و الذی

فہدیٰ﴾۔

تقدیر سے مراد اندازہ، اہداف و مقاصد اور روبہ عمل ہونے کے لائحہ عمل کی تعیین ہے جن کے لئے موجودات کو خلق کیا گیا ہے۔ ہدایت سے مراد ہی ہدایت تکوینی ہے جو محرکات اور قوانین کی شکل میں ہے اور جسے ہر موجود پر حاکم قرار دیا جاتا ہے (عام اس سے کہ وہ اندرونی محرک ہوں یا بیرونی)۔

مثلاً ایک طرف ماں کے پستان اور اس کے دودھ کو بچہ کی غذا کے لئے پیدا کیا ہے، ماں کو شدید محبت مادری سے نوازا ہے اور دوسری طرف بچہ میں محرک پیدا کیا ہے جو اسے ماں کے پستان کی طرف کھینچتا ہے یہ آمادگی دونوں طرف کی وقت جاذبہ تمام موجودات کی راہ مقاصد میں نظر آتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہر موجود کی ساخت کے بارے میں تدبیر و تفکر کرنا اور وہ راہ عمل جسے وہ اپنی زندگی میں طے کرتا ہے، یہ دونوں باتیں اس حقیقت کا پتہ دیتی ہیں کہ نہایت باریک بینی پر بنی ایک لائحہ عمل تجویز کیا گیا ہے طاقت جست ہدایت کے پیچھے ہے جو اس لائحہ عمل کے اجزاء میں مدد کرتا ہے، اور یہ پروردگار کی ربوبیت کی ایک نشانی ہے۔

البتہ انسان کے لئے ہدایت تکوینی کے پروگرام کے علاوہ ایک اور قسم کی ہدایت بھی موجود ہے جو وحی اور بعثت انبیاء کے ذریعہ صورت پذیر ہوئی ہے۔ اس کا نام ہدایت تشریعی ہے، قابل توجہ یہ امر ہے کہ انسان کی ہدایت تشریعی بھی اس کی ہدایت تکوینی کی تکمیل کرتی ہے۔

اس مفہوم کو سورہ طہ کی آیت ۵۰ میں بھی پیش کیا گیا ہے جہاں حضرت موسیٰ و فرعون کے اس سوال کے جواب میں کہ تم دونوں کا پروردگار کون ہے؟ ﴿فَمَنْ رَبُّكُمَا يَا مُوسَى﴾ (۱) فرماتے ہیں ﴿رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى﴾ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر موجود کو اس کی خلقت لازمہ عطا فرمایا اور پھر اس کی ہدایت کی۔“

اس بات کا مفہوم موسیٰ بن عمران کے زمانے میں یا نزول قرآن کے زمانے میں اگرچہ مختصراً معلوم تھا لیکن موجودہ زمانہ میں، جبکہ انسانی علوم و دانش نے انواع موجودات کی شناخت کے سلسلہ میں خصوصاً پودوں اور جانداروں کے بارے میں بڑی پیش رفت کی ہے، اب بہت سی معلومات عام ہو چکی ہیں اور ہزار ہا کتابیں اس تقدیر اور ہدایت کے سلسلہ میں معرض تحریر میں آچکی ہیں۔ اس کے باوجود محققین کہتے ہیں کہ جو کچھ ابھی معلوم نہیں کیا جاسکا وہ کئی گنا زیادہ ہے۔

بعد والے مرحلے میں گیاه و نباتات یعنی چوپاؤں کی غذا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

”وہ چرگاہ کو وجود میں لایا اور اسے زمین کے اندر سے باہر نکالا ہے۔“ ﴿وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَى﴾

”اخرج“۔ ”کی تعبیر“۔ ”اخراج“ کے مادہ سے اس طرف اشارہ ہے۔ گویا یہ سب زمین کے اندر موجود تھے اور خدا نے انہیں باہر نکالا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ حیوانات کی غذا انسانی غذا کی تمہید ہے اور اس کا فائدہ آخر کار انسان کو پہنچتا ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”اس کے بعد خدا نے اسے خشک اور سیاہ قرار دیا“۔ ﴿فَجَعَلَهُ غِثَاءً أَحْوًی﴾۔ اصل میں خشک گھاس کے معنی میں ہے جو سیلاب کے نتیجے میں نکلتی ہے۔ وہ جھاگ جو دیگ کے جوش کھانے سے پیدا ہوتا ہے، اسے بھی غثاء کہتے ہیں۔ یہ تعبیر ہر اس چیز کے لئے کنایہ ہے جو ضائع ہو جاتی ہے۔

زیر بحث غثاء کے معنی خشک گھاس اور فضول چیز کے ہیں۔

”احوی“ ”حہ“ (بروزن قوہ) کے مادہ سے کبھی سبز رنگ اور کبھی سیاہ رنگ کے معنی دیتا ہے اور دونوں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہی ہیں، اس لئے سبز رنگ جب زیادہ ہو تو سیاہی مائل ہو جاتا ہے، یہ تعبیر اس بناء پر ہے کہ خشک گھاس جب اوپر تلے پڑی ہو تو آہستہ آہستہ کالی ہونے لگتی ہے، اس تعبیر کا انتخاب، باوجودی خدائی نعمتوں کے بیان کے محل پر، لیکن ہو سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل تین علتوں میں سے اس کی ایک علت ہو۔

۱۔ پہلی یہ کہ گھاس وغیرہ کی کیفیت دنیا کے فانی ہونے کو ظاہر کرتی ہے اور انسانوں کے لئے ہمیشہ درس عبرت کا کام دیتی ہے۔ وہ سبزہ جو فصل بہار میں تروتازہ اور مسرت بخش تھا، چند گزرنے کے بعد خشک ہو کر سیاہ رنگ اختیار کر لیتا ہے اور اس پر مردنی چھا جاتی ہے گویا زبان حال سے دنیا کی ناپائیداری اور وقت کے تیزی سے گزرنی کی داستان سناتی ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ خشک گھاس جب اوپر نیچے رکھ دی جائے اور بوسیدہ ہو جائے تو ایک قسم کی کھاد بن جاتی ہے جو نئی گھاس کی پرورش کے لئے مفید ہوتی ہے اور زمین کی تقویت کا باعث بنتی ہے۔

۳۔ تیسری علت یہ ہے کہ بعض مفسرین کے مطابق اس آیت میں گھاس اور درختوں سے پتھر کے کونلوں کی تخلیق کی طرف اشارہ ہے، اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ پتھر کا کونکہ جو کمرہ زمین سے حاصل ہونے والی قوتوں میں سے ایک اہم ترین قوت ہے انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنی صنعتوں اور کارخانوں میں اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا چکا ہے اور اب بھی اٹھاتا ہے۔

یہ کونلہ گیاه اور درختوں کا باقی ماندہ حصہ تھا جو کئی ملین سال سے خشک ہو کر زمین میں دفن ہو گیا اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ پتھر بن کر سیاہ رنگ اختیار کر چکا ہے۔ بعض ماہرین کا نظریہ ہے کہ وہ چراگا ہیں موجودہ زمانے میں پتھر کے کونلے کی شکل اختیار کر کے نکل آئی ہے تقریباً ڈھائی ملین سال پہلے موجود تھیں اور پھر زمین میں دفن ہو گئیں۔ یہ چراگا ہیں اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر موجودہ زمانے میں پتھر کے کونلہ کا مصرف ہم اپنی نگاہ میں رکھیں تو وہ چار ہزار سال سے زیادہ دنیا کے لوگوں کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔^(۱)

آیت کی تفسیر خصوصیت کے ساتھ آخری معنی کے حوالہ سے بعید از قیاس نظر آتی ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ آیت کے جامع معانی ہوں، جس میں تینوں تفسیریں جمع ہوں۔

بہر حال، ﴿غَنَاءٌ اٰحْوٰی﴾ ”خشک سیاہ رنگ کی گھاس“ بہت سی منفعتیں رکھتی ہے۔ سردی کے زمانے میں جانوروں کی مناسب غذا بھی ہے، انسان کے لئے آگ کی فراہمی کا ذریعہ بھی اور زمینوں کے لئے مناسب کھاد بھی ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ سات صفتیں، جو مندرجہ بالا آیت میں آئی ہیں، بلند و بالا ربوبیت، خلقت، تسویہ، تقدیر، ہدایت اور گیاه و نباتات کی تخلیق، یہ حقیقت میں پروردگار کی اعلیٰ ربوبیت کے مسئلہ کی نہایت احسن انداز میں تشریح ہے جس کا مطالعہ انسان کو خدا کے اعلیٰ مقام ربوبیت سے اچھی طرح آشنا کرتا ہے، اس کے دل میں ایمان کی روشنی پیدا کرتا ہے، خدا کی اہم ترین نعمتوں کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے اور انسان میں شکر گزاری کا احساس پیدا کرتا ہے۔

ایک نکتہ

مسئلہ تقدیر اور موجودات عالم کی عمومی ہدایت جو اوپر والی آیات میں پروردگار کی ربوبیت کے مظاہر میں شمار ہوئی ہے، ایسے مسائل میں سے ہے کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے انسانی علم و دانش میں پیش رفت ہوگی، اسی قدر اس میں زیادہ سے زیادہ حقائق آشکار ہوتے جائیں گے، علمی انکشافات ہمیں یہ امکان فراہم کرتے ہیں کہ ہم تمام ذرات عالم میں نئے تعجب انگیز اور زیادہ شوق آور چہرے دیکھیں۔

بعض مفسرین نے یہاں مشہور ماہر حیوانات کمریسی مورین کی کتاب (رازِ آفرینش انسان) کی تحریروں سے استناد کرتے ہوئے مختلف جانداروں کے حوالے سے حیوانات کی ہدایت کے بارے میں اس عظیم راز کے نمونے پیش کئے ہیں جس سے ایک مختصر سا نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے:-

۱۔ مہاجر پرندے، جو کبھی ایک سال کے اندر سمندروں، جنگلوں اور بیابانوں کا ہزار ہا میل کا راستہ طے کرتے ہیں، اپنے آشیانوں کو کبھی نہیں بھولتے، اور واپسی پر ٹھیک اپنے وطن پہنچ جاتے ہیں، اسی طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتے سے خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو جائیں اور تیز ہوا انہیں کتنا منتشر کیوں نہ کر دے، پھر بھی وہ ٹھیک اپنے چھتے کی طرف واپس لوٹ آتی ہیں، جبکہ انسان اپنے وطن کی طرف لوٹنے کے لئے واضح نشانیوں، اور پتوں اور رہنماؤں کا محتاج ہوتا ہے۔

۲۔ حشرات الارض خوردبینی آنکھیں رکھتے ہیں جن کی ساخت اور دیکھنے کی طاقت انسان کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے، جبکہ باز جیسے پرندے دور بینی آنکھ رکھتے ہیں۔

۳۔ انسان رات کے وقت اپنا راستہ معلوم کرنے کے لئے مجبور ہے کہ منبع نور سے فائدہ اٹھائے لیکن بہت سے پرندے انتہائی تاریکی شب میں اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں۔ ان کا یہ دیکھنا ایسی آنکھوں کے ذریعہ ہے جو ایسی شعاؤں کے مقابلہ میں جو سرخ رنگ سے کم ہیں، حساسیت رکھتی ہیں، اور اس طرح راڈار کی دستگاہ کی مانند ہیں جن میں سے بعض کے اندر یہ دستگاہ یادگار کے طور پر رکھی ہوتی ہے۔

۴۔ کتے ایک اضافی قوت شامہ رکھنے کی وجہ سے ہر اس جانور کو جو ان کے سامنے آئے، سونگھ کر پہچان لیتے ہیں، جبکہ انسان، ان وسائل و ذرائع کے باوجود جو اسے میسر ہیں، اس قسم کی قوت سے محروم ہے۔

۵۔ تمام جانور ان آوازوں کو سن لیتے ہیں جن کی شدت ارتعاس ہماری قوتِ سامعہ کی گرفت سے باہر ہے۔ ان کی قوتِ سماعت ہماری قوتِ سماعت سے کئی گنا زیادہ ہے۔ انسان اپنی اس کوتاہی کی تلافی علمی وسائل و آلات کے ذریعہ کر سکتا ہے اور مکھی کے پروں کی آواز جو کئی کلومیٹر دور ہو، اس طرح سن سکتا ہے کہ گویا یہ آواز اس کی کان کی لو کے نزدیک ہے۔ شاید انسان اور حیوان کی قوت و طاقت و سماعت کا یہ فرق، جو خدا نے دونوں میں رکھا ہے، اس بنا پر کہ انسان علم و عقل کے ذریعہ اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر سکتا ہے جب کہ حیوان اس سے محروم ہیں۔

۶۔ چھوٹی مچھلی ایک قسم ہے جو ساہا سال سمندر میں زندگی گزارتی ہے۔ اس کے بعد تخم ریزی کے لئے اس نہر یا دریا کی طرف لوٹ جاتی ہے جس میں وہ پیدا ہوئی ہے۔ یہ مچھلی امواج کے برعکس بڑھتی ہے اور اپنے اصلی وطن کو، جو اس کی پرورش سے مناسبت رکھتا ہے کئی سال دور کے فاصلہ پر رہنے کے باوجود اسے تلاش کر لیتی ہے۔

۷۔ پانی کے بعض جانوروں کی داستان اس سے زیادہ عجیب ہے۔ وہ اپنے راستے کو اس طریقہ کے برعکس طے کرتے ہیں۔

۱۔ آخری تفسیر کتاب ”قرآن بر فراز اعصار“ تالیف نوفل ترجمہ بہرام پور میں بیان ہوئی ہے۔

آیات ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳

۶۔ ﴿سَنَقِرُ لَكَ فَلَا تَنسَى﴾۔

۷۔ ﴿إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ أَنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى﴾۔

۸۔ ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَى﴾۔

۹۔ ﴿فَذَكِّرْ إِنَّا نَفَعُ الذِّكْرَى﴾۔

۱۰۔ ﴿سَيَذَّكَّرُ مِنْ يَخْشَى﴾۔

۱۱۔ ﴿وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى﴾۔

۱۲۔ ﴿الَّذِي يَصِلَى النَّارَ الْكُبْرَى﴾۔

۱۳۔ ﴿ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى﴾۔

ترجمہ

۶۔ ہم عنقریب تیرے سامنے (قرآن کو) پڑھیں گے اور تو اسے کبھی فراموش نہیں کرے گا۔

۷۔ مگر جو کچھ خدا چاہے۔ وہ آشکار اور پنہاں کو جانتا ہے۔

۸۔ اور ہم تمہیں ہر اچھے کام کے انجام دینے کے لئے آمادہ کریں گے۔

۹۔ تو جہاں سمجھنا مفید ہو، سمجھاتے رہو۔

۱۰۔ اور عنقریب وہ لوگ جو خدا سے ڈرتے ہیں متذکر ہوں گے۔

۱۱۔ لیکن زیادہ بد بخت لوگ اس سے دوری اختیار کرتے ہیں

۱۲۔ وہی جو بہت بڑی آگ میں داخل ہوگا۔

۱۳۔ پھر اس آگ میں نہ مر جائے گا، نہ زندہ رہے گا۔

ہم تجھے ہر اچھے کام کے لئے آمادہ کریں گے

گزشتہ آیتوں میں پروردگار کی ربوبیت اور توحید کے بارے میں گفتگو تھی۔ اس کے بعد زیر بحث آیات میں قرآن اور پیغمبر کی نبوت کی بات ہو رہی ہے۔

گزشتہ آیات میں عام موجودات کی ہدایت متعلق گفتگو تھی اور زیر بحث آیات میں نوع انسانی کی ہدایت کی بات ہے۔ خلاصہ یہ کہ گزشتہ آیات میں پروردگار علی و اعلیٰ کی تسبیح کا ذکر آیا تھا اور ان آیات میں اس قرآن کی بات ہے جو اس تسبیح کو بیان کرتا ہے۔

فرماتا ہے: ”ہم عنقریب تیرے لئے قرأت کریں گے اور تو کبھی نہیں بھولے گا۔“ ﴿سَنَقْرَأُكَ فَلَا تَنْسَى﴾ اس بنا پر نزول وحی کے وقت عجلت سے کام نہ لے اور آیات الہی کے بھول جانے کے بارے میں کبھی پریشان نہ ہو۔ وہ ذات جس نے یہ عظیم آیات انسانوں کی ہدایت کے لئے تجھ پر نازل کی ہیں، وہ ان کا محافظ و نگہبان بھی ہے۔ وہ ان آیات کا نقش تیرے مبارک سینے میں اس طرح ثبت کرے گا کہ نسیان کا گرد و غبار اسے کبھی مگر نہیں کمرے گا۔

یہ اس مفہوم کی نظر ہے جو سورہ طہ کی آیت ۱۱۴ میں آیا ہے ﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَ قُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ قرآن پڑھنے کے سلسلہ میں اس سے پہلے کہ اس کی وحی تجھ پر تمام ہو، جلدی نہ کر اور کہہ پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما۔

پھر سورہ قیامت کی آیت ۱۶-۱۷ میں ہم پڑھتے ہیں: ﴿لَا تَحْرُكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ أَنْ عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقُرْآنُهُ﴾ ”اپنی زبان کو قرآن کے ساتھ حرکت نہ دے اس سے پہلے کہ وحی تجھ پر تمام ہو، یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کو جمع کریں اور تیرے سامنے پڑھیں۔“

اس کے بعد خدا کی قدرت کو ثابت کرنے اور یہ جو کچھ خیر و برکت ہے وہ اسی کی طرف ہے، مزید کہتا ہے: ”تو آیات الہی میں سے کسی چیز کو نہیں بھولے گا، مگر وہ جسے خدا چاہے۔ اس لئے کہ وہ آشکار و پنہاں کو جاننے والا ہے۔“ ﴿إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى﴾

اس تعبیر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ پیغمبر آیات الہی میں سے کسی چیز کو بھول جائیں گے، یا ان کی گفتگو سے اطمینان قلب ہو جائے گا۔

مقصود کلام یہ ہے کہ آیات الہی کو یاد رکھنے کی نعمت خدا کی طرف سے ہے، لہذا جس وقت وہ چاہے اسے پیغمبر سے چھین سکتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں ہدف و مقصد خدا کے علم ذاتی اور اس کے پیغمبر کے علم وہبی کے درمیان جو فرق ہے اس کو بیان کرنا ہے۔

یہ آیت حقیقت میں اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ ہود کی آیت ۱۰۸ میں اہل بہشت کے جنت میں ہمیشہ رہنے کے بارے میں آئی ہے ﴿و اما الذین سعدوا ففی الجنة خالدین فیہا مادامت السماوات و الارض الا ما شاء ربک عطاء غیر مجذوذ﴾

سعادتمند ہمیشہ جنت میں رہیں گے، جب تک کہ آسمان و زمین قائم ہیں وہ جو تیرا پروردگار چاہے، یہ عطا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔“

یہ طے شدہ بات ہے کہ اہل جنت ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور آیت کا آخری حصہ گواہ ہے: ﴿الا ما شاء ربک﴾ کا جملہ خدا کے ارادے اور حاکمیت کی طرف اشارہ ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ ہر چیز اس کی مشیت سے ربط رکھتی ہے، اپنی ابتدا و خلقت میں بھی اور بقاء و استمرار میں بھی۔

من جملہ ان امور کے جو اس موضوع کے گواہ ہیں، یہ ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کے لئے ایک نعمت کے طور پر بیان کرے۔ لہذا مراد تمام آیات قرآن اور احکام و معارف اسلام کا حفظ اور یاد رکھنا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس اثناء سے مراد وہ آیتیں ہیں جنکے معنی اور تلاوت دونوں منسوخ ہو گئے ہیں، لیکن یہ تفسیر بہت بعید نظر آتی ہے اصولی طور پر اس قسم کی آیات کا وجود ہی ثابت نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ استثناء قرأت سے متعلق ہے۔ اس لئے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم عنقریب تیرے لئے قرأت کریں گے اور اپنی آیات کو بیان کریں گے، مگر وہ آیات کے سیاق کی طرف توجہ کرتے ہوئے بعید نظر آتی ہے ﴿انه يعلم الجهر و ما یخفی﴾ کا جملہ حقیقت میں اس مفہوم کی علت کا بیان ہے جو مستقر تک کے جملہ میں آیا ہے، جو اس طرف اشارہ ہے کہ وہ خدا جو تمام آشکار و پنہاں حقائق سے باخبر ہے، وہ تجھ پر نوع بشر کی احتیاجات میں سے باقی رہ جانے والی چیزیں وحی کے ذریعہ القا کرتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی چیز کو نظر انداز نہیں کرے گا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مراد یہ ہو کہ پیغمبر وحی کے حصول میں عجلت نہ کریں اور بھول چوک کا خوف نہ رکھیں، اسلئے کہ وہ خدا، جو آشکار و پنہاں حقائق کا علم ہے، اس نے وعدہ کیا ہے کہ پیغمبر کو نسیان نہیں ہوگا۔

بہر حال یہ پیغمبر اسلام کا ایک معجزہ ہے کہ طولانی آیات کو جبرائیل کے ایک ہی مرتبہ تلاوت کرنے سے یاد کر لیتے، ہمیشہ یاد رکھتے اور کوئی بات بھی نہیں بھولتے تھے۔

اس کے بعد پیغمبر کی دلداری کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”ہم تجھے ہر اچھے کام کے انجام دینے کی توفیق دیں گے۔“
 ﴿وَنِيَسْرُكَ لِلْيَسْرَى﴾^(۱)

دوسرے لفظوں میں مقصود کلام یہ ہے کہ اس راستہ میں جو تجھے درپیش ہے، بہت سی سختیاں اور مشکلات ہیں، وحی کے اخذ کرنے اور اسے یاد رکھنے کی راہ میں بھی، تبلیغ رسالت میں بھی اور اچھے کام انجام دینے میں بھی، ہم ان تمام امور میں (وحی کے حصول، اس کی تبلیغ، نشر و اشاعت، تعلیم دینے اور اس پر عمل کرنے میں) تیری مدد کریں گے اور مشکلات کو تجھ پر آسان کر دیں گے

یہ جملہ، ہو سکتا ہے کہ دعوت فکر پیغمبر کے نفس مضمون، پیغمبر کی ذمہ داریوں اور خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے لائحہ عمل کی طرف بھی اشارہ ہو، یعنی اس کا مفہوم و مضمون آسان ہے، اس کی شریعت شریعت سہلہ ہے اور اس کی خدائی دین میں حوصلہ شکن تکلیفیں اور ذمہ داریاں نہیں ہیں۔

اس بنا پر مندرجہ بالا آیات کا ایک بہت ہی وسیع مفہوم ہے۔ اگرچہ بہت سے مفسرین نے اسے ایک ہی جہت میں محدود کر دیا ہے، اور واقعی کار خدا کی مدد، توفیق اور نصرت نہ ہوتی تو ان مشکلات پر پیغمبر کا قابو پانا ممکن نہیں تھا، خود پیغمبر اسلام کی زندگی بھی اس حقیقت کی تعلیم کا ایک نمونہ تھی، آپ کسی چیز میں بھی، قطع نظر اس سے کہ لباس، خوراک، سواری یا زندگی کے دوسرے وسائل میں سخت گیر نہیں تھے۔ ہر مناسب غذا کھا لیتے، ہر قسم کا لباس باعث عیب و نقص نہ ہوتا، زیب تن فرما لیتے، کبھی بستر پر آرام کرتے، کبھی عام فرش پر، حتیٰ کبھی بیابان کے ریت پر، نیز آپ ہر قسم کے تعلق اور تقید سے آزاد تھے۔

پیغمبر اسلام پر وحی آسمانی کی موہبت و نعمت اور آپ کے لئے توفیق اور تسہیل امور کے وعدے کے بیان کرنے کے بعد آپ کی اہم ترین ذمہ داری کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”پس تذکر مفید ہو“ ﴿فَذَكَرْ اَنْفَعْتَ الذِّكْرَى﴾ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تذکر بہر حال مفید ہے، وہ افراد جو اس سے کسی طرح بھی مستفید نہ ہوں، وہ بہت کم ہیں، علاوہ ازیں اور کچھ نہیں کم از کم منکرین پر اتمام حجت کا سبب تو ہے، جو بجائے خود ایک بہت بڑی منفعت ہے۔ ۲۔

جبکہ بعض کا نظریہ ہے کہ آیت میں کچھ محذوف ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تذکر کردار اور یاد دہانی کراچاہے مفید ہو یا نہ و ﴿فَذَكَرْ اَنْفَعْتَ الذِّكْرَ اَوْلَمُ تَنْفَعْ﴾ یہ حقیقت میں اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ نحل کی آیت ۸۱ میں آئی ہے ﴿و

جعل لکم سراپیل تفتیکم الحر) خدا نے تمہارے لئے پیراہن قرار دیئے ہیں، جو تمہیں گرمی (سردی) سے محفوظ رکھتے ہیں

اس آیت میں صرف گرمی کا ذکر ہوا ہے اور دوسری قرینہ تقابل سے معلوم ہوتی ہے لیکن بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ جملہ شرطیہ یہاں مفہوم رکھتا ہے اور مراد یہ ہے کہ وہاں تذکر کر جہاں مفید ہو اور جہاں کوئی فائدہ نہ ہو تو پھر اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ ”ان“ یہاں شرطیہ نہ ہو بلکہ ”قد“ کے معنی میں تاکید و تحقیق کے لئے ہو اور جملہ کا مفہوم یہ ہو کہ تذکر مفید و فائدہ بخش ہے۔ ان چاروں تفسیروں میں سب سے زیادہ مناسب پہلی تفسیر ہے۔ پیغمبر اسلام کا لائحہ عمل بھی اس پر گواہ ہے کہ وہ اپنی تبلیغات و تذکرات کے لئے کسی قسم کی قید و شرط کے قائل نہیں تھے، سب کو وعظ و نصیحت کرتے اور خوفِ خدا دلاتے تھے۔

بعد والی آیت میں تذکر، وعظ اور انذار کے مقابلہ میں لوگوں کے ردِ عمل کو پیش کرتا ہے اور انہیں دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرماتا ہے: عنقریب وہ لوگ جو خدا سے ڈرتے ہیں اور مسئولیت و ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں، متذکر ہوں گے“ ﴿سیدکر من یحشی﴾

جی ہاں جب روح میں خوفِ خدا اور خشیتِ الہی نہ ہو، یا دوسرے لفظوں میں حق طلبی اور حق جوئی کی روح انسان میں نہ ہو، جو تقویٰ کا ایک مرتبہ مواعظِ الہیہ اور تذکراتِ انبیاء فائدہ نہیں پہنچاتے۔ اسی لئے سورہ بقرہ کے آغاز میں پروردگار قرآن کو پرہیزگاروں کے لئے سببِ ہدایت شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿ہدیٰ للمتقین﴾ ایک بعد والی آیت میں ایک دوسرے گروہ کو پیش کرتے ہوئے مزید ارشاد ہوتا ہے: ”لیکن زیادہ بد بخت افراد اس سے دوری کرتے ہیں“

﴿ویتجنبھا الاشقی﴾۔ (۳)

بعض روایات میں آیا ہے کہ ابن عباس کہتے ہیں کہ آیت (سیدکر من یحشی) عبد اللہ ابن مکتوم، پاک دل و حق طلب نابینا کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿یتجنبھا الاشقی﴾ ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کے بارے میں ہے کہ کفار و مشرکین کے سرغنہ تھے۔ (۴)

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اشقی سے مراد یہاں معاندین اور دشمنانِ حق ہیں، اس لئے کہ لوگوں کے تین گروہ ہیں: ایک عارف و آگاہ گروہ، دوسرا، متوقف اور شک کرنے والا گروہ اور تیسرا گروہ دشمنی کرنے والا گروہ۔ فطری و طبعی امر

ہے کہ پہلا اور دوسرا گروہ تو فہمائش سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ صرف تیسرا گروہ ہے جو مشیت سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ان کے بارے میں فہمائش کی تاثیر صرف وہی اتمام حجت ہے جس ذکر کیا گیا۔

اس آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام تیسرے گروہ کو بھی اپنی فہمائش سے مستفید فرماتے تھے، لیکن وہ لوگ دوری اختیار کرتے اور روگرداں ہوتے تھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں شقاوت و خشیت کا نقطہ مقابل قرار دیا گیا ہے جبکہ قاعدۃً اسے سعادت کے مقابلہ میں قرار پانا چاہیے تھا یہ اس بنا پر ہے کہ انسان کی سعادت اور خوش بختی کا اصل سبب مسئولیت و ذمہ داری کا احساس اور خشیت ہی ہے۔

بعد والی آیت میں آخری گروہ کی سرنوشت اس طرح بیان فرماتا ہے: ”وہ شقی جو دوزخ کی عظیم آگ میں داخل ہو گا اور وہاں قرار پائے گا“ ﴿الذی یصلی النار الکبریٰ﴾ پھر اس آگ میں ہمیشہ رہے گا، نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ ﴿ثم لا یموت فیہا ولا یمحی﴾ یعنی نہ تو مرے گا تاکہ آسودہ ہو اور نہ اس حالت کو جس میں وہ زندگی کا نام دیا جا سکتا ہے۔۔۔ وہ ہمیشہ زندگی اور موت کے درمیان ہاتھ پاؤں مارتا رہے گا، جو کیفیت ایسے افراد کے لئے بدترین بلا و مصیبت ہے۔

﴿النار الکبریٰ﴾ سے کیا مراد ہے؟ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ جہنم کا سب سے نچلا طبقہ اسفل السافلین ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ شقی ترین اور معاند ترین لوگ ہیں۔ لہذا ان پر نازل ہونے والا عذاب بھی سخت ترین اور ہولناک ترین ہونا چاہیے، لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آگ کی لفظ کبریٰ کے ساتھ توصیف آتش صغریٰ کے مقابلہ میں ہے، یعنی اس دنیا کی آگ کے مقابلہ میں، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

(ان نارکم لہذہ جزء من سبعین جزء من نار جہنم و قد اطفئت سبعین مرة بالماء ثم التہبت ولولا ذالک ما استطاع آدمی ان یطیقہا)۔ ”یہ تمہاری آگ جہنم کی آگ کی ستر اجزاء میں سے ایک ہے۔ وہ پانی سے ستر مرتبہ دھوئی گئی پھر بھی وہ بھڑک اٹھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر کوئی آدمی اس کے تحمل کی طاقت نہ رکھتا اور اسکے قریب نہ ٹھہر سکتا۔“ (۵)

مشہور دعائے کیل جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہے اس میں دنیا کی آگ اور آخرت کی آگ کے موازنہ میں ہم پڑھتے ہیں (علیٰ ان ذالک بلاء و مکروہ مکثہ یسیر بقائہ قصیر مدتہ) یہ ایسی بل اور مکروہ و ناپسندیدہ چیز ہے جس میں توقف کم ہے، اس کی بقا مختصر ہے اور اس کی مدت تھوڑی ہے۔

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ واقعی آیت کا مفہوم ونیسرک الیسری لک تھا، اور تاکید کے عنوان سے تقدیم و تاخیر ہوئی ہے اور ونیسرک للیسری ہو گیا ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ ونیسرک نوفک کے معنی میں نہ ہو ورنہ تقدیم و تاخیر کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ اور یہ جو قرآن کہتا ہے ”سواء علیہم ء انذرکم ام لم تنذر ہم لا یؤمنون“ ان کے لئے برابر ہے چاہے تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (نقرہ۔ ۶) یہ لوگوں کی صرف ایک اقلیت کے لئے، ورنہ اکثریت بہر حال اچھی باتوں کا اثر لیتی ہے، البتہ بعض لوگ بہت زیادہ اور اس کے برعکس بعض لوگ بہت کم اثر لیتے ہیں۔ لیکن بہر حال سنجیدہ باتیں عام طور پر اثر کرتی ہیں۔ اس وجہ سے یہاں جملہ شرطیہ قید غالب کی قبیل سے ہے جو اثر نہیں رکھتی۔

۳۔ بتجنہا کی ضمیر ذکر کی طرف لوٹتی ہے جو گزشتہ آیات میں آیا ہے۔ (غور کیجئے)

۴۔ تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، ص ۷۱۱۰ دوسرا حصہ تفسیر کشاف و روح المعانی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۵۔ بحار الانوار، جلد ۸، ص ۲۸۸، حدیث ۲۱۔

آیات ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹

۱۴۔ ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى﴾۔

۱۵۔ ﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصْلَى﴾۔

۱۶۔ ﴿بَلْ تَوَثُّونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾۔

۱۷۔ ﴿وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ مِّمَّا أَبْقَى﴾۔

۱۸۔ ﴿إِنَّ هٰذَا لَفِي الصَّحَفِ الْاُولٰٓئِ﴾۔

۱۹۔ ﴿صَحَفِ اِبْرٰهٖمَ وِ مُوسٰٓى﴾۔

ترجمہ

۱۴۔ یقیناً وہ رستگار ہوگا جو تزکیہ کرے۔

۱۵۔ اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرے اور نماز پڑھے۔

۱۶۔ بلکہ تم دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھتے ہو۔

۱۷۔ جب کہ آخرت زیادہ پائیدار اور بہتر ہے۔

۱۸۔ یہ احکام پہلی آسمانی کتب میں آچکے ہیں۔

۱۹۔ کتاب ابراہیم و موسیٰ میں۔

وہ دستور العمل جو تمام آسمانی کتب میں آیا ہے

گزشتہ آیات میں کفار اور دشمنان حق کے بارے میں سخت سزا کا اشارہ ہوا ہے، زیر بحث آیات میں اہل ایمان کی نجات اور اس نجات کے اسباب و عوامل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

”یقیناً وہ شخص فلاح پائے گا جو اپنا تزکیہ کرے“ ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى﴾۔ اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرے اور اس کے بعد نماز پڑھے (و ذکر اسم ربہ فصلی) اس طرح فلاح و رستگاری اور کامیابی و نجات کے عوامل ان تین چیزوں کو بتایا ہے، تزکیہ، نام خدا کا ذکر اور اس کے بعد نماز پڑھنا۔

تزکیہ سے مراد کیا ہے؟ اس سلسلہ میں علماء نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔ پہلی روح کو نجاستِ شرک سے پاک کرنا ہے، گزشتہ آیات کے قرینہ سے، نیز اس قرین سے بھی کہ اہم ترین تطہیر شرک سے تطہیر ہے۔

دوسری یہ کہ تزکیہ سے مراد دل کو اخلاقی رزائل سے پاک کرنا اور اعمال صالح بجالانا ہے۔ قرآن مجید میں آیات فلاح کے نقطہ نظر سے دوسری آیات کے علاوہ سورہ مومنین کے آغاز کی آیتیں ہیں جو فلاح کو اعمال صالح کی روح قرار دیتی ہیں اور سورہ شمس آیت ۹ کے حوالے سے جس میں تقویٰ اور فجور کے بیان کے بعد فرماتا ہے: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهُ﴾ وہ فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو فسق و فجور اور دوسرے برے اعمال سے پاک کیا اور تقویٰ سے آراستہ کیا۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ زکیٰ سے مراد زکوٰۃ فطرہ دینا ہے۔ عید فطر سے پہلے زکوٰۃ فطرہ ادا کی جائے، پھر نماز عید پڑھی جائے۔ جیسا کہ متعدد روایات میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ ۱۔ اور یہی معانی منابع اہل سنت میں امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہیں۔ (۲)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورہ اعلیٰ کی ہے اور مکہ میں نہ زکوٰۃ فطرہ مقرر ہوئی تھی، نہ ماہ رمضان کے روزے، نہ نماز عید ہی اور فطرہ کے مراسم۔ اس سوال کے جواب میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کوئی مانع نہیں ہے کہ اس سورہ کا پہلا حصہ مکہ میں نازل ہوا ہو اور ذیلی حصہ مدینہ میں۔ یہ احتمال بھی قوی طور پر موجود ہے کہ مندرجہ بالا تفسیر ایک واضح مصداق کے بیان کی قبیل سے ہو اور آیت کی تطبیق کسی واضح فرد پر ہو، بعض نے یہاں تزکیہ کو مالی صدقہ دینے کے معنی میں سمجھا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تزکیہ کے وسیع معانی ہیں۔ یہ روح سے شرک کی آلودگی کو دور کرنے کے معنی میں بھی ہے، اخلاقِ رزیلہ سے خود کو پاک کرنے کے معنی میں بھی، ہر قسم کے مکر و ریا سے پاک کرنے کے معنی میں بھی اور راہِ خدا میں زکوٰۃ دے کر مال و جان کی تطہیر کے معنی میں بھی اس لئے کہ سورہ توبہ آیت ۱۰۳۔ ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُ

ہُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾ ”ان کے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) لے تاکہ انہیں اس کے ذریعہ پاک کرے اور ان کا تزکیہ کرے۔“ کے مطابق زکوٰۃ کا دینا روح و جان کی پاکیزگی کا سبب ہے۔

اس بنا پر تمام تفسیریں آیت کے وسیع معنی کے اعتبار سے ممکن ہے کہ ٹھیک ہوں۔ قابل توجہ یہ بات ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں پہلے تزکیہ، اس کے بعد پروردگار کا ذکر اور پھر نماز کی بات ہوئی ہے۔ بعض مفسرین کے بقول مکلف کے تین عملی مراحل ہیں، پہلا دل سے فاسد عقیدہ کا ازالہ، اس کے بعد اللہ کی معرفت اور اس کے صفات و اسماء کا دل میں حضور، اور تیسرا مشغلہ ہے ”اشتغال بخد مت“ مندرجہ ذیل بالا آیت نے تین مختصر جملوں میں ان تینوں مرحلوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ نماز کا ذکر پروردگار کی فرع شمار کیا گیا ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ جب تک اس کی یاد میں محو نہ ہو اور نور ایمان دل میں سایہ فلک نہ ہو اس وقت تک بندہ نماز کے لئے کھڑا نہیں ہوتا۔ علاوہ از این وہ نماز قدر و قیمت رکھتی ہے جس کے ساتھ اس کا ذکر بھی ہو اور وہ اس کی یاد کو ساتھ لئے ہوئے ہو اور یہ جو بعض لوگوں نے ذکر پروردگار سے مراد صرف اللہ اکبر یا بسم اللہ الرحمن الرحیم کو لیا ہے، یہ درحقیقت اس کی بعض مصادیق کا بیان ہے۔

اس کے بعد اس فلاح و رستگاری کے دستور العمل سے انحراف کے اصلی عامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: ”بلکہ تم دنیاوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو اور اسے ترجیح دیتے ہو“ ﴿بل تو ثرون الحیوة الدنیا﴾ جبکہ آخرت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے ﴿و الآخرة خیر و ابقى﴾۔

یہ حقیقت میں وہی مفہوم ہے جو احادیث میں بھی آیا ہے (حب الدنيا رأس كل خطیئة) ”دنیا کی محبت ہر گناہ کا سرچشمہ ہے“۔^(۴)

حالانکہ عقل کبھی اجازت نہیں دیتی کہ انسان سرائے باقی کو متاع فانی کے بدلے فروخت کرے اور اور ان مختصر سی لذتوں کو جو انواع و اقسام کے درد و رنج ساتھ لئے ہوئے ہیں ان تمام جاودانی اور ہر قسم کی تکالیف سے مبرا نعمتوں پر مقدم سمجھے اور ان پر ترجیح دے۔

انجام کار سورے کے آخر میں فرماتا ہے: ”یہ احکام جو بتائے گئے ہیں اس کتاب آسمانی ہی میں محدود نہیں ہیں بلکہ پہلی کتب اور صحف میں بھی آچکے ہیں“۔ ﴿انّ هذا الصحف الاولی﴾ یعنی صحف و کتب ابراہیم و موسیٰ میں۔ ﴿صحف ابراہیم و موسیٰ﴾۔^(۵)

یہ بات کہ ہذا کا مشارالیه کیا ہے اس سلسلہ میں کئی نظریات موجود ہیں۔ ایک جماعت نے کہا ہے کہ تزکیہ، نماز اور حیات دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دینے کے آخری حکم کے سلسلہ میں اشارہ ہے، اس لئے کہ یہی انبیاء کی سب سے اہم اور بنیادی تعلیمات تھیں اور ناکابیاں تمام کتب آسمانی میں موجود ہے۔

بعض دوسرے مفسرین اس کو ساری سورۃ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، اس لئے کہ سورۃ توحید سے شروع ہوتی ہے اور نبوت کا تذکرہ جاری رکھتے ہوئے عملی دستور العمل پر ختم ہو جاتی ہے۔ بہر حال یہ تعبیر بتاتی ہے کہ اس سورہ کا اہم مضمون، بالخصوص آخری آیات عالم ادیان کے اصول اساسی میں سے ہے، تمام انبیاء کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے اور یہ خود اس سورۃ کی عظمت اور ان کی تعلیمات کی اہمیت کی نشانی ہے۔

”صحف“ صحیفہ کی جمع ہے جو یہاں لوح تختی اور صفحہ کے معنی میں، جس پر کوئی چیز لکھتے ہیں مندرجہ بالا آیات بتاتی ہیں کہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ بھی آسمانی کتابوں کے حامل تھے۔ ایک روایت حضرت ابوذر غفاری (رض) سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے پیغمبر اکرم کی خدمت میں عرض کیا کہ انبیاء کی تعداد کیا ہے، تو آپ نے فرمایا ”ایک لاکھ چوبیس ہزار“ میں نے عرض کیا ”ان میں سے رسول کتنے تھے؟“ فرمایا: تین سو تیرہ اور باقی سب نبی تھے۔“ میں نے عرض کیا ”حضرت آدم بنی تھے؟“ فرمایا ہاں۔ خدا نے ان سے کلام کیا اور انہیں اپنے دست قدرت سے خلق فرمایا۔“

اس کے بعد پیغمبر اکرم نے مزید فرمایا: ”اے ابوذر انبیاء میں سے چار افراد عرب تھے: ہود، صالح، شعیب، اور تیرا پیغمبر۔“ میں نے کہا ”اے اللہ کے رسول! خدا نے کتنی کتابیں نازل فرمائیں ہیں؟“ فرمایا: ایک سو چار کتابیں ”دس کتابیں آدم پر پچاس کتابیں شیث پر اور تیس کتابیں اخنوخ پر، جو ادیس وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم سے لکھا۔ ابراہیم پر دس کتابیں اور توریت، انجیل، زبور اور فرقان، موسیٰ، عیسیٰ، داود، اور پیغمبر اسلام پر نازل ہوئیں۔“ (۴)

﴿الصحف الاولی﴾ کی تعبیر ابراہیم و موسیٰ کی کتب کے بارے میں آخری صحف کے مقابل ہے جو حضرت عیسیٰ اور پیغمبر اسلام پر نازل ہوئے۔

۱۔ نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۵۶ حدیث ۲۱۹ تا ۲۱۔

۲۔ روح المعانی، جلد ۳۰، ص ۱۱۰ اور تفسیر کشاف، جلد ۴، ص ۷۴۰۔

۳۔ تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱، ص ۱۴۷۔

۴۔ یہ حدیث مختلف عبارتوں کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام زین العابدین علیہ السلام سے، بلکہ تمام انبیاء سے نقل ہوئی ہے اور یہ اس کی حد سے زیادہ اہمیت کی بناء پر ہے۔ نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۵۶-۵۵۷۔

۵۔ ہو سکتا ہے کہ صحف ابراہیم و موسیٰ صحف الاولیٰ کی وضاحت ہو، یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا بیان اور واضح مصداق ہو، پہلی صورت میں گزشتہ تمام انبیاء کی کتب پر حاوی ہوگا اور دوسری صورت میں صرف ابراہیم و موسیٰ کے صحیفہ مراد ہوں گے۔

۶۔ مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۷۶۔

حب الدنيا رأس کل خطیئۃ کی تحلیل

یقیناً مومن افراد کے لئے یہ قرآنی محاسبہ، جو مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے اور جو دنیا و آخرت کے موازنے کے سلسلہ میں ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے، مکمل طور پر واضح ہے۔ لیکن اس کے باوجود مومن اکثر اوقات اپنے علم و آگاہی کو اپنے قدموں تلے روندتا ہے اور گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ایک ہی جملہ دیا جاسکتا ہے کہ یہ سب ان خواہشات کے نتیجے میں ہوتا ہے جن کا انسان کے وجود پر غلبہ ہوتا ہے اور خواہشات کے غلبہ کا سرچشمہ بھی حب دنیا ہی ہے۔ حب دنیا میں یہ سب چیزیں شامل ہیں:-
حب مال، حب مقام، شہوت جنسی، تفوق طلبی، تن پروری، جذبہ انتقام اور اسی قسم کے دیگر امور جو انسان کی روح میں کبھی کبھی اس قسم کا طوفان برپا کر دیتے ہیں کہ اس کی تمام معلومات کو برباد کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات اس کی حس تشخیص ہی کو ختم کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے۔

یہ جو بعض اسلامی روایات میں بارہا حب دنیا کو تمام گناہوں کا سرچشمہ بتایا گیا ہے یہ ایک حقیقت واقعی ہے، جسے ہم نے خود اپنی زندگی اور دوسروں کی زندگی میں بارہا آزمایا ہے۔ اسی بنا پر گناہ کی جڑوں کو کاٹنے کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم دنیا کی محبت اور اس کے عشق کو دل سے باہر نکال دیں

ہمیں چاہئے کہ ہم دنیا کو ایک وسیلہ، رہنمائی، پل اور کھیتی سمجھیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا کے عاشق، دورا ہے پر کھڑے ہیں، یعنی متاع دنیا کے حصول اور رضائے خدا کے حصول کا دورا ہے وہ کسی دوسری چیز کو ترجیح دیں۔

اگر ہم اپنے جرائم کے دفتر کو دیکھیں تو مندرجہ بالا آیت کی حقیقت ہمیں اس میں اچھی طرح نظر آئے گی، اگر ہم لڑائیوں میں، خونریزیوں اور قتل و غارت کے اسباب و علل کو موردِ توجہ قرار دیں تو ان سب میں حب دنیا بنائے فساد کے طور پر ملے گی۔

باقی رہا کہ حب دنیا کو کس طرح دل سے نکالا جاسکتا ہے کہ ہم سب ابنائے دنیا ہیں اور ماں سے بیٹے کی محبت ایک امر فطری ہے۔ یہ چیز فکری تعلیم و تربیت اور تہذیبِ نفس کی متقاضی ہے۔ من جملہ ان امو کے جو حب دنیا کو دل سے نکالنے کے خواہشمند لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں، اہل دنیا کے انجام کار کا مطالعہ ہے۔

فراعنہ باجود و قوت اور مالی وسائل کے آخر کار کیا کیا؟ قارون ان خزانوں میں سے، جن کی چابیاں کئی طاقتور انسان مشکل سے اٹھا سکتے تھے، اپنے ساتھ کیا لے کر گیا؟ وہ طاقتیں جنہیں ہم اپنے زمانے میں دیکھتے ہیں ایک موج ہوا کے ذریعہ ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جاتا ہے اور صرف ایک گردش لیل و نہار کے نتیجے میں ان کا تحت سلطنت الٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے قصر دولت و ثروت کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، یا زیر خاک پنہاں ہو جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ہمارے لئے بہترین معلم کا کام دے سکتی ہیں۔

اس وسیع و عریض گفتگو کو ہم امام زین العابدین علیہ السلام کی ایک بہت ہی معنی خیز حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آنجناب سے کچھ لوگوں نے پوچھا ”خدا کے نزدیک سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا:

(ما من عمل بعد معرفة الله عز وجل ومعرفة رسول افضل من بغض الدنيا) ”خدا اور اس کے رسول کی معرفت کے بعد بغض دنیا سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے“۔ اس کے بعد آپ نے مزید فرمایا: ”محبت دنیا بہت سے شعبے ہیں۔ سب سے پہلی چیز جس کی وجہ سے خدا کی نافرمانی ہوئی، وہ ابلیس کی نافرمانی تھی، جس وقت اس نے انکار کیا اور تکبر کر کے کافریں میں سے شمار ہو گیا۔

اس کے بعد حرص تھی جو آدم و حوا کے ترک اولیٰ کا سبب بنی، جس وقت کہ خداوند متعال نے ان سے فرمایا جنت کی جس جگہ سے چاہو کھاؤ، لیکن اس ممنوع درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے۔ لیکن وہ اس چیز کی طرف گئے جس کی انہیں ضرورت نہیں تھی، یہی چیز ان کی اولاد کے لئے قیامت تک باقی رہ گئی، اس لئے کہ زیادہ تر چیزیں جو انسان طلب کرتا ہے اس کی ضرورت سے تعلق نہیں رکھتیں۔ (عام طور ضرورتیں گناہ کا سبب نہیں ہیں۔ وہ چیزیں جو سبب گناہ ہے وہ ہوا و ہوس اور ضرورت سے زائد امور ہیں)۔

اس کے بعد حسد تھا جو آدم کے بیٹے کا سبب گناہ تھا اس نے اپنے بھائی سے حسد کیا اور اس کو قتل کر دیا۔ اس کے شعبوں میں سے عورتوں کی محبت، دنیا کی محبت^(۱)

حب ریاست، حب راحت و آرام، حب گفتگو و کلام، حب برتری اور حب دولت و ثروت ہے۔ یہ سات صفات ہیں جو سب کی سب حب دنیا میں جمع ہیں، اسی لئے انبیاء مرسلین اور علماء اعلام نے اس حقیقت سے آگاہی کے لئے کہا ہے کہ ”حب الدنيا رأس كل خطيئة)۔

خداوند! دنیا کی محبت، جو تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے، اسے ہمارے دلوں سے نکال دے۔

پروردگار! تو خود ہی تکامل و ارتقاء کے پرینچ راستے میں ہمارا ہاتھ تھام کر منزل مقصود تک ہماری ہدایت فرما۔
بار لہا! تو آشکار و پنہاں سب سے آگاہ ہے، ہمارے مخفی اور آشکار گناہ اپنے لطف و کرم سے بخش دے۔
آمین یا رب العالمین

- ۱۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یہاں حب دنیا میں باقی رہنے کی محبت ہے، جو سات شعبوں میں سے ایک شمار ہوتی ہے اور عام طور پر طویل امیدوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اصول کافی جلد ۲، باب ”حب الدنيا والحرص علیہا“ حدیث ۸۔ اصول کافی کے اس باب میں اس سلسلہ میں ۱۷ روایت نقل ہوئی ہیں، جو بہت ہی اخلاقی اور تربیتی ہیں۔

سورہ غاشیہ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہو ۱۱ اس میں ۲۶ آیتیں ہیں

سورہ غاشیہ کی مشتملات اور اس کی فضیلت

یہ سورہ جو مکی سورتوں میں سے ہے، زیادہ ترین محوروں کے گردش کرتا ہے۔
پہلا۔ معاد و قیامت کی بحث، یا بالخصوص مجرموں کا دردناک انجام اور مومنوں کو ملنے والا شوق انگیز ثواب۔
دوسرا۔ توحید کی بحث جو آسمان کی خلقت، پہاڑوں اور آسمان کی آفرینش کی طرف اشارہ اور انسان کی تین موضوعات کی طرف توجہ کے بیان سے عبارت ہے۔
تیسرا۔ نبوت کی بحث، پیغمبر اسلام کی فرائض اور ان کی ذمہ داریوں کے بیان پر مبنی ہے۔
یہ سورہ مجموعی طور پر مکی سورتوں کی مقاصد ہی کو موضوع گفتگو بناتا ہے جن سے ایمان و اعتقاد کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں ایک حدیث پیغمبر اسلام سے منقول ہے (من قرأھا حاسبہ اللہ حساباً یسیراً) ”جو شخص اس کی تلاوت کرے گا پروردگار عالم بروز قیامت اس کا حساب آسان کر دے گا۔
ایک اور حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے ”جو شخص واجب اور مستحب نمازوں میں اس سورہ کی قرأت کی پابندی کرے گا، خدا سے دنیا و آخرت میں اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا
یقیناً یہ سب ثواب اسی صورت میں انسان کو حاصل ہو گا جب اس کی تلاوت اس کے لئے فکر و عمل کا محرک ثابت ہو۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

۱۔ ﴿ھَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ﴾ ۲۔ ﴿وَجِوْہُ یَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ﴾ ۳۔ ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾

۴۔ ﴿تَصْلٰی نَارًا حَامِیَةً﴾ ۵۔ ﴿تَسْقٰی مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَّةٍ﴾ ۶۔ ﴿لَیْسَ لَھُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ﴾

۷۔ ﴿یَسْمُنُّ وَلَا یَغْنٰی مِنْ جَوْعٍ﴾

ترجمہ

رحمن و رحیم خدا کے نام سے۔

- ۱۔ کیا غاشیہ (قیامت کا دن جس کے وحشت ناک حوادث سب کا احاطہ کر لیں گے) کی داستان تجھ تک پہنچی ہے؟
- ۲۔ چہرے اس دن خاشع اور ذلت بار ہوں گے۔
- ۳۔ وہ جنہوں نے ہمیشہ عمل کیا ہے تھک چکے ہیں (اور کوئی نتیجہ انہیں حاصل نہیں ہوا)۔
- ۴۔ دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔
- ۵۔ انہیں حد سے زیادہ گرم چشمے سے پلایا جائے گا۔
- ۶۔ ضریع (بدبودار اور تلخ خشک کاٹنے) کے علاوہ انہیں اور کوئی کھانا نہیں ملے گا۔
- ۷۔ ایسی غذا جو نہ انہیں موٹا کرے گی اور نہ ان کی بھوک کو ختم کرے گی۔

بد نصیب تھکے ماندے

اس سورہ کے آغاز میں ہمارا سامنا قیامت کے ایک نئے نام سے ہوا ہے جو غاشیہ ہے۔ فرماتا ہے: ”کیا غاشیہ کی داستان تجھ تک پہنچی ہے“۔ ﴿ہل اُتک حدیث غاشیۃ﴾۔

”غاشیہ“ غشاوۃ کے مادہ سے ڈھانپنے کے معنوں میں ہے۔ قیامت کے لئے اس کا نام انتخاب اس وجہ سے ہے کہ اس دن اولین و آخرین حساب کے لئے جمع ہوں گے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ مراد اس طرح کی آگ ہے جو کافروں اور مجرموں کے چہرے کو ڈھانپ لے گی۔

پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس آیت میں مخاطب خود پیغمبر کی ذات اقدس ہے اور پیغمبر اسلام سے یہ جملہ استفہام کی شکل میں اس عظیم دن کی اہمیت کے پیش نظر کہا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی تجویز کیا ہے کہ اس آیت میں مخاطب ہر انسان ہے۔ لیکن یہ مفہوم بعید نظر آتا ہے۔ اس کے بعد مجرموں کی حالت کو پیش کیا کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”چہرے اس دن خاشع اور ذلت بار ہوں گے“۔ ﴿وجوہ یومئذٍ خاشعۃ﴾ ذلت عذاب اور عظیم سزا کے خوف نے اس دن ان کے تمام وجود کو گھیر رکھا ہوگا، اور چونکہ انسان کے باطنی حالات ہر جگہ سے زیادہ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں، لہذا خوف، ذلت اور وحشت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو اس کے تمام چہرے کو ڈھانپ لیں گے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ”وجوہ“ سے کفر کے بڑے بڑے لوگ اور سر غنے مراد ہیں، جو ایک گہری ذلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں۔ اس وقت مزید فرماتا ہے: ”یہ ایسے لوگ ہیں جو مسلسل کام کر کے تھک چکے ہیں“۔ ﴿عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ﴾ زندگانی دنیا میں بہت زیادہ کوشش کرتے ہیں، لیکن تھکن کے علاوہ انہیں کوئی فائدہ نصیب نہیں ہوتا، نہ ان کا بارگاہِ خدا میں کوئی عمل مقبول ہے اور نہ اس دولت و ثروت میں سے وہ کوئی چیز اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں، جسے انہوں نے جمع کر رکھا ہے، نہ اپنے بعد وہ کوئی نیک نامی چھوڑ جاتے ہیں، نہ کوئی اولاد صلح، وہ محض تھک جانے والے زحمت کش ہیں، کتنی بہترین اور عمدہ تعبیر ہے ﴿عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ﴾

بعض مفسرین نے اس جملہ کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس نیا میں وہ عمل کرتے ہیں لیکن اس کی خستگی و رنج و تکلیف اپنے ساتھ آخرت میں لے جاتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ مجرموں سے دوزخ میں محنتِ شاقہ لی جائے گی تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ عذاب جھیلیں۔ لیکن ان تینوں تفسیروں میں سے پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

آخر کار یہ خستہ، تھکے ہوئے اور فضول کام کرنے والے زحمت کش بھرکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور اس میں جلیں گے۔ ﴿تَصْلٰی نَارًا حَامِیَةً﴾ ”تصلی“ صلی (بروزن نفی) کے مادہ سے آگ میں داخل ہونے اور اس میں جلنے کے معنی میں ہے (صلی بالنار ای لزما و احترق بها) آگ میں ہمیشہ رہا اور جلتا رہا۔“

لیکن ان کا عذاب اسی پر ختم نہیں ہوگا، جب وہ آگ کی حرارت کی وجہ سے پیاس میں مبتلا ہوں گے تو حد سے زیادہ کھولتے ہوئے چشمے سے انہیں پلایا جائے گا۔ ﴿تَسْقٰی مِنْ عَيْنٍ اٰنِیَةٍ﴾ ”انیۃ“ مونث ہے انی کے (انی بروزن حلی) مادہ سے جو تاخیر میں ڈالنے کے معنی میں ہے اور کسی چیز کے بیان کرنے کے وقت کے پہنچ جانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہاں ایسے جلانے والے پانے کے معنی میں ہے جس کی حرارت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔

سورہ کہف کی آیت ۲۹ میں ہم پڑھتے ہیں ﴿وَ اِنْ یَسْتَغِیْثُوْا یَغَاثُوْا بِمَآءٍ کَلْمَہْل یشوٰی الجوہ بئس الشوَاب و ساء ت مرتفقاً﴾

اور اگر پانی مانگیں گے تو ان کے لئے ایسا پانی لائیں گے جو کسی پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہوگا جو ان کے چہروں کو بھون دے گا۔ وہ کتنا برا مشروب ہے اور وہ محل اجتماع کتنا برا ہے۔

بات بعد والی آیت میں ان کی خوراک کے بارے میں، جبکہ وہ بھوکے ہوں گے، مزید فرماتا ہے: ”وہ ضریع کے علاوہ کوئی غذا نہیں رکھتے۔“ ﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ﴾ یہ ضریع کیا ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین کے پاس مختلف تفسیر ہیں، بعض نے کہا ہے کہ ایک قسم کا کانٹا ہے جو زمین سے چمٹ جاتا ہے، اگر وہ قرہ ہو تو قریس اسے شبرق کہتے تھے اور جب خشک ہوتا تو ضریع کہتے۔ وہ ایک زہریلی گھاس ہے جسے کوئی جانور منہ نہیں لگاتا۔^(۱)

علمائے لغت میں سے خلیل کا کہنا ہے کہ ضریع بدبودار اور سبز گھاس ہے جو دریا سے باہر آن گرتی ہے، ابن عباس نے کہا ہے کہ یہ آتش جہنم کا ایک درخت ہے جو اگر دنیا میں ہو تو زمین اور جو کچھ اس میں ہے اس سب کو جلا کر فنا کر دے۔ ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے کہ ضریع دوزخ کی آگ میں ایک چیز ہے جو کانٹے کی طرح ہے، حنظل سے زیادہ تلخ اور مردار سے زیادہ بدبودار، آگ سے زیادہ جلانے والی ہے۔ خدا نے اسکا نام ضریع رکھا ہے (الضریع شئ یكون فی النار یشبه الشوک اشد مرارة من الصبر و انتن من الجيفة و احر من النار سماه الله ضریعاً) بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ضریع ایک ذیل غذا ہے کہ جہنمی جس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے بارگاہ خدا میں تضرع کریں گے۔^(۲) (ہم اس بات کو نہ بھول جائیں کہ ضرع کا مادہ ضعف، ذلت اور خضوع کے معنی ہے۔^(۳))

یہ تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ منافات نہیں رکھتی اور ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کے معنی میں یہ سب جمع ہوں۔ اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: نہ وہ انہیں موٹا کرتا ہے نہ ان کی بھوک کو ختم کرتا ہے۔ ﴿لَا يَسْمَنُ وَلَا يَغْنَى مِنْ جُوعٍ﴾۔ یقیناً اس قسم کی غذا نہ جسم کی تقویت کے لئے اور نہ بھوک کو ختم کرنے کے لئے ہے۔ وہ ایک ایسی غذا ہے جو بجائے خود ایک عذاب ہے جیسا کہ سورہ مزمل کی آیت ۱۳ میں ہم پڑھتے ہیں:

﴿و طَعَاماً ذَا عَصَةِ وَ عَذَاباً أَلِيماً﴾ ہمارے پاس گلے میں پھندہ لگانے والی غذائیں ہیں اور وہ دردناک عذاب ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس دنیا میں انواع و اقسام کی لذیذ، مرغن اور شیریں غذائیں دوسروں پر ظلم کر کے فراہم کی ہیں اور جنہوں نے محروم لوگوں کو ناگوار غذائیں کھانے کے علاوہ اور کسی غذا کے حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا، ضروری ہے کہ وہاں ان کی ایسی غذا ہو جو ان کے لئے عذاب الیم بنے۔ البتہ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے جنت کی نعمتیں اور دوزخ کی عذاب دونوں ہم جیسے اسیروں زندگی کے لئے ناقابل تشریح ہیں۔ یہ سب اشارے ہیں جنہیں ہم سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

۲۔ تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، ص ۷۱۲۰۔

۳۔ ایک اور بحث دوزخیوں کی غذا کے بارے میں جسے قرآن کبھی ضریع کبھی زقول اور کبھی غسلین کے نام سے یاد کرتا ہے اور ان تعیرات میں فرق ہے۔ یہ سب تفسیر نمونہ کی جلد ۱۴، پر سورہ حاقہ کی آیت ۳۶ کے ذیل میں ہم پیش کر چکے ہیں

آیات ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶

- ۸۔ ﴿وَجُوهٌ يُّومئذٍ نَّاعِمَةٌ﴾ - ۹۔ ﴿لَسَعِيهَا رَاضِيَةٌ﴾ - ۱۰۔ ﴿فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ﴾ -
 ۱۱۔ ﴿لَا يَسْمَعُ فِيهَا لِاَغْيَةٍ﴾ - ۱۲۔ ﴿فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ﴾ - ۱۳۔ ﴿فِيهَا سُرُورٌ مَّرْفُوعَةٌ﴾ -
 ۱۴۔ ﴿وَإِكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ﴾ - ۱۵۔ ﴿وَنَمَارِقٌ مَصْفُوفَةٌ﴾ - ۱۶۔ ﴿وَوِزَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ﴾ -

ترجمہ

- ۸۔ اس دن کچھ چہرے شاداب ہوں گے - ۹۔ اس لئے کہ اپنی کوشش سے مسرور ہوں گے -
 ۱۰۔ جو بہشت عالی میں ہوں گے - ۱۱۔ جس میں تو کوئی لغو اور بیہودہ بات نہیں سنے گا -
 ۱۲۔ اس میں چشمے جاری ہیں - ۱۳۔ اس میں خوبصورت بلند تخت ہوں گے -
 ۱۴۔ اور پیالے جو ان چشموں کے پاس رکھے ہوں گے - ۱۵۔ اور تکیے جو صف بستہ ہوں گے -
 ۱۶۔ اور کچھے ہوئے فاغرہ فرش ہوں گے -

بہشت کی روح پرور نعمتوں کے مناظر

اس تشریح کے بعد جو گزشتہ آیات میں دوسری دنیا میں مجرموں اور بدکاروں کی حالت اور جہنم کے عذاب کے بارے میں آئی تھی، ان آیتوں میں نیکو کار مومنین کی حالت کی تشریح اور جنت کی بے نظیر نعمتوں کی توصیف پیش کرتا ہے تاکہ قہر کو مہر سے ملا دے اور انذار کو بشارت سے مربوط کر دے، فرماتا ہے:

”چہرے اس دن پر طراوت اور مسرور ہوں گے“ ﴿وَجُوهٌ يُّومئذٍ نَّاعِمَةٌ﴾ بدکاروں کے چہروں کے برعکس، جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے کہ وہ ذلت و اندوہ میں غرق ہوں گے -

”ناعمۃ“ نعمت کے مادہ سے یہاں ایسے چہروں کی طرف اشارہ ہے جو نعمت سے سرشار، قروتازہ شاداب اور مسرور و نورانی ہوں گے، جیسا کہ سورہ مطففین کی آیت ۲۴ میں آیا ہے کہ جنتیوں کی توصیف میں فرماتا ہے: ﴿تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ﴾ ”ان کے چہروں میں تجھے طراوت اور نعمت کی شادابی نظر آئے گی“ - یہ چہرے ایسے نظر آئیں گے کہ وہ اپنی سعی و کوشش سے راضی اور خوش ہوں گے ﴿لَسَعِيهَا رَاضِيَةٌ﴾ دوزخیوں کے برعکس جنہوں نے اپنی سعی و کوشش سے سوائے تھکن اور رنج کے اور کچھ حاصل نہیں کیا ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ -

بہشتی اپنی سعی و کوشش کو احسن وجہ سے دیکھیں گے اور مکمل طور پر راضی اور خوش ہوں گے، ایسی سعی و کوشش جو لطف خدا کے پرتو کے سائے میں کبھی کئی گنا، کبھی دس گنا اور کبھی سات سو گنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہو۔ اور کبھی اس سے بے حد و حساب و جزا حاصل کر چکے ہوں گے ﴿انما فی الصابرون اجرهم بغير حساب﴾ (زمر-۱۰)۔

اس کے بعد اس مفہوم کی شرح پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے: ”وہ بہشت عالی میں قرار پائے ہیں“ ﴿فی جنة عالیة﴾ لفظ ”عالیہ“ ممکن ہے کہ علو مکانی کی طرف اشارہ ہو، یعنی وہ جنت کے عالی طبقات میں ہیں، یا یہ علو مکانی ہے۔ مفسرین نے دونوں احتمال تجویز کئے ہیں، لیکن دوسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اگرچہ دونوں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

اس کے بعد اس جنت کی ایک اور صفت، جو روحانی اور معنوی پہلو رکھتی ہے، بیان فرماتا ہے: ”وہاں تو کوئی اور لغو اور بیہودہ بات نہیں سنے گا“ ﴿لا یسمع فیہا لاغیة﴾^(۱)

نہ ایسی بات جو نفاق کا پہلو لئے ہوئے ہو، نہ عداوت و جنگ و جدال کی، نہ کینہ پروری اور حسد کی، نہ جھوٹ نہ تہمت و افترا، نہ غیبت، نہ لغو و بے فائدہ۔ وہ ماحول کیسا آرام دہ ہوگا جو ان فضولیات سے پاک و مبرا ہو۔

اگر ہم ٹھیک طرح سے غور و فکر کریں تو دنیا میں وہ زندگی کا زیادہ تر حصہ اسی قسم کی باتوں کا سننا ہے جو روح و جان کے سکون اور اجتماعی نظاموں کو درہم برہم کر دیتا ہے، فتنوں کی آگ بھڑکاتا ہے اور انہیں شعلہ ور کرتا ہے۔

اس روحانی اور آرام و سکون بخش نعمت کے ذکر کے بعد، جو جنتیوں کی روح و جان کو لغو و بیہودہ باتیں نہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہے، جنت کی مادی نعمتوں کے ایک حصہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اس جنت میں چشمے جاری ہیں“ ﴿فیہا عین جاریة﴾ اگرچہ عین یہاں نکرہ ہے اور عام طور پر نکرہ ایک فرد کے لئے بھی آتا ہے، لیکن قرآن کی باقی آیات کے قیہ سے جس کے معنی رکھتا ہے اور مختلف چشموں کے معنی میں ہے، جیسا کہ سورہ ذاریات کی آیت ۱۵ میں ہے ﴿ان المتقین فی جنات و عیون﴾ پرہیزگار اور متقی لوگ جنت کے باغات اور چشموں کے درمیان قرار پائے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے جنتیوں کے محلوں میں سے ہر محل میں ایک چشمہ جاری ہے اور عین کا مفرد ہونا یہاں اس طرف اشارہ کرتا ہے، ایسا چشمہ جو جنت والوں کی خواہش کے مطابق جس طرف چاہیں گے اسی طرف بہے گا اور جنت والے نہر وغیرہ بنانے کے محتاج نہیں ہوں گے۔ البتہ کئی چشموں کا ہونا خوبصورتی و زیبائی و طراوت کے اضافہ

کے علاوہ یہ فائدہ بھی رکھتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مخصوص مشروب ہو اور جنتیوں کے ذائقہ کو انواع و اقسام کی شرابِ طہور سے شیریں و معطر کرتا ہو۔

ان چشموں کے تذکرہ کے بعد جنت کے تخت اور پلنگوں کو موضوع بنا کر فرماتا ہے: ”جنت کے ان باغوں میں بلند اور اونچے تخت اور پلنگ ہوں گے“ ﴿فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ﴾ ”سرر“ جمع ہے سریر کی، ”سرور“ کے مادہ سے ایسے تخت اور پلنگوں کے معنی میں کہ جن پر مجالس انس و سرور میں بیٹھتے ہیں۔ (۲)

ان پلنگوں کا بلند ہونا اس بناء پر ہے کہ جنتی اپنے اطراف کے تمام مناظر اور صحن دیکھ سکیں اور ان کے مشاہدہ سے لذت حاصل کریں۔ ابن عباس کہتے ہیں یہ بلند تخت اور پلنگ اس قسم کے ہیں کہ جس وقت ان کے مالک ان پر بیٹھنے کا ارادہ کریں گے تو وہ تواضع و خضوع کریں گے اور نیچے ہو جائیں گے اور بیٹھنے کے بعد اپنی پہلی حالت پر پلٹ جائیں گے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ان پلنگوں کی مرفوعہ کے لفظ کے ساتھ توصیف ان کے قیمتی ہونے کی طرف اشارہ ہو اور، جیسا کہ بعض نے کہا ہے کہ وہ سونے کے ٹکڑوں سے بنے ہوئے ہوں گے اور دُر و یاقوت و زبرجد سے مزین ہوں گے۔ دونوں تفسیروں کے مابین جمع بھی ممکن ہے۔

چونکہ ان خوشگوار چشموں اور جنت کی شرابِ طہور سے فائدہ اٹھانا برتنوں کی احتیاج رکھتا ہے، لہذا بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ”خوبصورت اور جاذب نظر پیالے ان چشموں کے پاس رکھے ہوں گے“ ﴿وَ اَكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ﴾۔ جس وقت وہ ارادہ کریں گے تو پیالے چشموں سے پر ہو کر ان کے سامنے آجائیں گے اور وہ تازہ تازہ نوش کریں گے ایسی لذت جس کا شعور ساکنین دنیا کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اکواب جمع کوب (بروزن خوب) جو قدح، پیالے یا اسی ظرف کے معنی میں ہے جس میں دستہ لگا ہوا ہو۔

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ قرآن میں اہل جنت کی شرابِ طہور کے برتنوں کے بارے میں مختلف تعبیریں آئی ہیں یہاں اور بعض دوسری آیت میں اکواب کی تعبیر آئی ہے جبکہ بعض دوسری آیات میں اباریق (ابریق کی جمع) کی تعبیر آئی ہے، جو ایسے ظرف کے معنی میں ہے جس کا دستہ اور ٹوٹی ہو، سیال چیزوں کو انڈیلنے کی غرض سے۔ یا پھر کاس کا لفظ آیا ہے جس کے معنی شراب سے لبریز جام کے ہیں ﴿يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مَّخْلُودُونَ بَاكُوبًا وَ اَبَارِيقًا وَ كَأْسٌ مِّنْ مَّعِينٍ﴾ ان کے گرد ایسے جوان گردش کرتے ہوں گے جو ہمیشہ جوانی کی طراوت و تروتازگی کے حامل ہوں گے۔ جبکہ

شراب طہور سے لبریز پیالے اور جام ان کے ہاتھ میں ہوں گے اور وہ ان کے سامنے پیش کریں گے۔ (واقعہ ۱۷)۔

اس کے بعد جنت کی نعمتوں کے جزئیات کے متعلق مزید نکات پیش کرتے ہوئے اضافہ فرماتا ہے: ”وہاں پلنگوں پر تکیے اور گاوتکیے ہوں گے جو صف بستہ ہوں گے“ ﴿وَنَارِقُ مَصْفُوفَةً﴾ - نمارق نمرقہ (بروزن غلغلہ) کی جمع ہے جس کے معنی چھوٹے تکیے کے ہیں جس کا سہارا لیتے ہیں ۳

اور عام طور پر مکمل استراحت کے وقت ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور مصفوفہ کی تعبیر اشارہ ہے نظم خاص اور تعداد کی طرف جو ان پر حاکم ہے۔ یہ تعبیر بتاتی ہے کہ وہ مجالس انس تشکیل دیں گے اور یہ مجلسیں جو ہر قسم کی لغویت اور بیہودگی سے پاک ہوں گی۔

ان میں صرف الطاف الہی، اس کی بے پایاں نعمتوں اور دنیا کے درد و رنج اور عذاب سے نجات کے بارے میں گفتگو ہوگی، اس قدر لطف اور لذت رکھتی ہوں گی کہ کوئی چیز ان کی ہمسر نہیں ہو سکتی۔

آخری زیر بحث آیت میں جنت کے قیمتی فرشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہاں گمراہ بہا اور خوبصورت فرش بچھے ہوئے ہوں گے“ ﴿وَزَرَابٰی مَبْنُوۡثَةً﴾ -

”زرابی“ جمع ہے زربہ کی جو ایسے قیمتی فرش کے معنی میں ہے جو نرم، راحت بخش اور بیش قیمت ہوں گے۔ واضح ہے کہ ان آسائش و لذت کے وسائل و ذرائع کے برابر اور بہت سے دوسرے وسائل موجود ہوں گے جبکہ یہ مشتبہ نمونہ از خروارے کے مصداق ہیں۔ ان آیتوں میں جنت کی ساتھ اہم نعمتیں بیان ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک دوسری سے زیادہ جاذب تر اور زیبا تر ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جنت ایک بے نظیر جگہ ہے، جس میں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہیں ہے۔ وہاں انواع و اقسام کے رنگ برنگ کے پھل، دل خوش کن نغمے، آبِ جاری کے چشمے، شراب طہور، سائستہ خدمتگار، بے مثل بیویاں، مصع پلنگ، قیمتی فرش اور پر خلوص دوست ہوں گے۔ نیز عمدہ اور خوبصورت پیالے ہوں گے جو چشموں کے پاس رکھے ہوں گے۔ مختصر یہ ایسی نعمتیں وہاں دستیاب ہوں گی جن کی نہ اس دنیا کے الفاظ کے ذریعے تشریح ممکن ہے اور نہ عالم خیال ہی اس کی توضیح کر سکتا ہے۔

یہ سب چیزیں ان مومنین کی تشریف آوری کی منتظر ہیں جنہوں نے اپنے اعمال صالح کے ذریعہ نعمت الہی کے اس مرکز میں ورود کی اجازت لے لی ہے۔

مذکورہ بالا مادی لذتوں کے علاوہ معنوی لذتیں بھی ہیں۔ سب سے بڑھ کر لقا اللہ کی نعمت ہے۔ اس معبود حقیقی کے لطف و کرم ہیں کہ اگر ایک لمحے کے لئے مل جائیں تو وہ جنت کی تمام مادہ نعمتوں کے مقابلہ میں بہتر و برتر ہیں بقول شاعر گرم بہ دامن و صل تو دسترس باشد دگر ز طالع خویشم چہ ملتمس باشد؟

اگر بہر دو جہاں یک نفس زخم بردوست مرا زہر دو جہاں حاصل آن نفس باشد

اگر مجھے تیرے وصل کے دامن تک دسترس حاصل ہو جائے تو پھر میں اپنے مقدر سے اور کیا مانگوں۔

اگر دونوں جہاں کے بدلے دوست کے ساتھ ایک سانس لوں تو اس دونوں جہاں کا حاصل یہی ایک سانس ہوگا۔

۱۔ ”لاغیۃ“ اگرچہ اسم فاعل ہے لیکن اس قسم کے موارد میں اس چیز کے معنی ہے جو لغویت لئے ہو۔ اسی لئے مفسرین نے اس کی (ذات لغو) لغو لئے ہوئے تفسیر کی ہے

۲۔ مفردات راغب مادہ ”سر“

۳۔ صحاح اللغۃ مادہ غرق۔

آیات ۱۴، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶

۱۷۔ ﴿اَفَلَا يَنْظُرُونَ اِلَى الْاِبْلِ كَيْفَ خَلَقْت﴾ - ۱۸۔ ﴿وَ اِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رَفَعْت﴾ -

۱۹۔ ﴿وَ اِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نَصَبْت﴾ - ۲۰۔ ﴿وَ اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سَطَحْت﴾ -

۲۱۔ ﴿فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مَذْكُرٌ﴾ - ۲۲۔ ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصِيْطِرٍ﴾ -

۲۳۔ ﴿اِلَّا مَنْ تَوَلَّىٰ وَ كَفَرَ﴾ - ۲۴۔ ﴿فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرُ﴾ -

۲۵۔ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا اِيَّا هُمْ﴾ - ۲۶۔ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ -

ترجمہ

۱۷۔ کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح اسے پیدا کیا گیا؟

۱۸۔ اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلندی پر قائم کیا گیا؟

۱۹۔ اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح وہ اپنی جگہ نصب ہوئے ہیں؟

۲۰۔ اور زمین کی طرف کہ وہ کس طرح مسطح ہوئی ہے؟ ۲۱۔ پس نصیحت کر کہ تو صرف نصیحت کرنے والا ہے۔

۲۲۔ تو ان پر مسلط نہیں ہے کہ انہیں (ایمان لانے پر) مجبور کرے - ۲۳۔ مگر وہ شخص جو پشت پھیرے اور کافر

ہو جائے۔

۲۴۔ خدا جسے بہت بڑے عذاب کی سزا دے گا۔ ۲۵۔ یقیناً ان کی بازگشت ہماری طرف ہے۔

۲۶۔ اور یقیناً ان کا حساب کتاب ہمارے پاس ہے۔

اونٹ کی طرف دیکھو جو خود ایک آیت ہے

گزشتہ آیات میں بہت زیادہ بحثیں جنت اور اس کی آیتوں کے بارے میں آئی تھیں لیکن زیر بحث آیات میں ان نعمتوں تک پہنچنے کی اصل کلید کی گفتگو ہے جو اللہ کی معرفت ہے۔ خدا کی قدرت کے چار مظاہر بیان کر کے خدا کی نادر خلقت اور انسان کو اس کے مطالعہ کی دعوت کے ساتھ جنت میں داخل ہونے کی راہ بتاتا ہے اور ضمنی طور پر یہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ خدا کی قدرت بے پایاں ہے، جو مسئلہ معاد کے حل کرنے کی کلید ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ”کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے“۔ ﴿فَلَا يَنْظُرُونَ اِلَى الْاِبْلِ كَيْفَ

خَلَقْت﴾ یہاں پر ہر چیز سے پہلے اونٹ کی خلقت کو کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین نے بہت کچھ تحریر کیا

ہے لیکن یہ چیز واضح ہے کہ ابتداء میں روئے زمین سخن مکہ کے عربوں کی طرف تھا، جن کی زندگی کے بہت سے کام اونٹ سے وابستہ تھے۔ اس سے قطع نظر یہ جانور عجیب و غریب خصوصیتوں کا حامل ہے، جو اسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ:

۱۔ بعض جانور ایسے ہیں کہ جنکے صرف گوشت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، بعض ایسے ہیں جن کے صرف دودھ سے استفادہ ہوتا ہے، بعض ایسے ہیں جو صرف سواری کے کام آتے ہیں اور بعض صرف بارداری کے کام آتے ہیں، لیکن اونٹ ایسا جانور ہے جس میں یہ تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کا گوشت بھی قابل استعمال ہے اور دودھ بھی۔ یہ سواری کے کام بھی آتا ہے اور بارداری کے لئے بھی اسے کام میں لایا جاتا ہے۔

۲۔ اونٹ زیادہ طاقتور اور زیادہ قوت مقاوت رکھنے والا جانور ہے۔ یہ بہت زیادہ سامان اٹھالیتا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جس وقت وہ بیٹھا ہوا ہو تو

بھاری بوجھ اس پر رکھ دیتے ہیں اور ایک ہی حرکت کے ساتھ اپنے ہاتھوں کے سہارے کھڑا ہو جاتا ہے، جبکہ دوسرے جانور اس قسم کا کام نہیں کر سکتے۔

۳۔ اونٹ آٹھ دس روز تک پیاسا رہ سکتا ہے، اور اس میں بھوک کو برداشت کرنے کی بھی بہت صلاحیت ہوتی ہے

۴۔ اونٹ ہر روز راستے کی طولانی مسافت طے کر سکتا ہے اور ایسی زمینوں سے، جن میں سے گزرنا مشکل ہو جیسے ریگستان علاقہ، جس کو عبور کرنا مشکل ہوتا ہے، آسانی سے اس بناء پر عرب اسے صحرائی جہاز کہتے ہیں۔

۵۔ وہ غذا کے اعتبار سے بہت ہی سستا ہے، ہر قسم کے خاورد و خاشاک کھا لیتا ہے۔

۶۔ وہ غذا کے نامناسب حالات میں بیابان کے ایسے طوفانوں کے درمیان، جو آنکھ و کان کو بہرا کر دیتے ہیں، اپنے مخصوص وسائل کے ساتھ، جو خدا نے ان کی پلکوں، کانوں اور ناک میں مہیا کئے ہیں، مقابلہ کرتا ہو اپنے سفر کو جاری رکھتا ہے۔

۷۔ وہ اپنی پوری طاقت و قوت کے باوجود نہایت مطیع جانور ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ بھی اونٹ کی مہارہاتھ میں لے کر جدھر اس کا دل چاہے انہیں لے کر جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس جانور کی خصوصیات کچھ اس قسم کی ہیں کہ اگر اس کی خلقت کے بارے میں غور و فکر کیا جائے تو وہ انسان کو خالقِ عظیم کی طرف متوجہ کرتی ہے، جو ایسی مخلوق کا پیدا کرنے والا ہے۔ جی ہاں! قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ”کیا یہ وادی غفلت کے گمشدہ اس مخلوق کے حیران کن اسرار پر غور نہیں کرتے تاکہ انہیں حق کی راہ حاصل ہو اور یہ بے راہ روی سے بچ جائیں؟“ یہ بات بغیر کہے واضح ہے کہ ”فلا یظنرون“ کے جملہ میں نگاہ سے مراد عام نگاہ نہیں، بلکہ ایسی نگاہ ہے کہ جس میں غور و فکر و تفکر و تدبر شامل ہو۔

اس کے بعد آسمان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرماتا ہے: ”کیا وہ آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح قرار دیا گیا ہے۔“ ﴿وَاللّٰی السَّمَاۤءُ کَیۡفَ رَفَعَتْ﴾ آسمان اپنی عظمت کے ساتھ اور اپنے ان سب عجائبات کے ساتھ ستاروں اور کہکشاؤں کے ساتھ اور اس سارے جمال و زیبائی و شکوہ کے ساتھ، جس نے انسان کو درطہ حیرت میں ڈال رکھا ہے، جس کی وجہ سے اپنے آپ کو وہ اس عظیم اور نظم و حساب سے پر جہان کے پیدا کرنے والے کے مقابلہ میں چھوٹا اور ناچیز بلکہ اس لامحدود کے مقابلہ میں صفر کے برابر سمجھتا ہے، کس طرح یہ عظیم کمرے اپنی اپنی جگہ پر میخ کی طرح گڑے ہوئے ہیں اور بغیر ستون کے اپنی جگہ برقرار ہیں۔

اس نظام شمسی کے کروں کو عالم وجود میں آئے ہوئے لاکھوں سال گزر چکے ہیں، لیکن ان کی حرکت اصلی کے محور تبدیل نہیں ہوئے آسمان کی خلقت اگرچہ ہمیشہ عجیب تھی لیکن موجودہ زمانہ کے علمی انکشافات کے سائے میں اس کے عجائبات کئی گنا زیادہ ہو گئے ہیں اور بھی نمایاں ہو گئی ہے کیا اس عالم عظیم کے خالق و مدبر کے بارے میں غور و فکر نہیں کرنا چاہیئے اور اس کے بلند و عظیم مقاصد کے قریب نہیں جانا چاہیئے؟ اس کے بعد آسمان سے ہٹ کر زمین کو موضوع گفتگو بناتے ہوئے فرماتا ہے:۔۔۔ کیا وہ پہاڑوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح اپنی جگہ پر نصب ہوئے ہیں:۔ ﴿وَاللّٰی الْجِبَالِ

کَیۡفَ نَصَبَتْ﴾ وہ پہاڑ جن کی جڑیں ایک دوسرے سے متصل ہیں، زمین کے اطراف کو زہ کے حلقوں کی مانند گھیرے ہوئے ہیں اور اندرونی پگھلے ہوئے مادہ سے پیدا ہونے والے زلزلوں اور چاند و سورج کی قوت جاذبہ سے پیدا ہونے والے مدوجزر کم کرتے ہیں وہ پہاڑ جو ان طوفانوں کے مقابلہ میں قابلِ اطمینان پناہ گاہ اور ڈھال ثابت ہوتے تو کرہ زمین ایسے بیابانوں میں تبدیل ہو جاتا جن میں زندگی گزارنا ناممکن ہوتی وہ پہاڑ جو پانی کے ذخیروں کو اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے ہیں اور انہیں آہستہ آہستہ پیاسی زمینوں کی طرف روانہ کرتے ہیں اور اپنے چاروں طرف زندگی کی مسرت، ہریالی، خوشی،

طراوت اور تروتازگی پیدا کرتے ہیں غالباً یہی پہلو ہیں جن کی وجہ سے دوسری آیات میں پہاڑوں کو زمین کی میخیں کہا گیا ہے اصولی طور پر پہاڑ عظمت و صلابت کے مظہر ہیں اور ہر

جگہ خیر و برکت کا سبب ہیں یہی وجہ ہے کہ انسان پہاڑوں پر تفکر کی زیادہ صلاحیت محسوس کرتا ہے اور یہ بات بلا سبب نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم اپنی بعثت سے مدتوں پہلے جبلِ نور اور غارِ حرا میں مشغول رہتے تھے۔

”نصبت“ نصب کے مادہ سے ثابت قرار دینے کے معنی میں ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر ضمنی طور پر آغازِ خلقت میں پہاڑوں کی خلقت کی کیفیت کی طرف اشارہ ہو وہی چیز جس پر سے موجودہ علم نے پردہ اٹھایا ہے، اسے پہاڑوں کی خلقت کے متعدد اسباب و عوامل کی طرف نسبت دی ہے اور ان کے لئے انواع و اقسام کی قائل ہے۔

وہ پہاڑ جو زمین کے گھومنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں وہ پہاڑ جو آتش فشانیوں کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں، وہ پہاڑ جو بارش سے پیدا ہونے والے جھاگ کا نتیجہ ہیں، وہ پہاڑ جو سمندروں کے اندر بنتے ہیں اور جو سمندر کی کچھڑ اور اس میں پھنس جانے والے جانوروں کا مجموعہ ہیں۔ (مثلاً مرجانی پہاڑ اور جزیرے)۔

جی ہاں! ان پہاڑوں میں سے ہر ایک کی بناوٹ اور اس کے آثار و برکات مشکل سے سمجھ میں آنے والے ہیں، اہمیت کے حامل بھی اور بیدار مغز انسانوں کے لئے قدرتِ حق کی نشانیاں بھی۔

اس کے بعد زمین کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”کیا وہ زمین کی طرف نہیں دکھتے کہ وہ کس طرح مسطح ہوئی ہے“۔ ﴿وَالْاَرْضُ كَيْفَ سُطِحَتْ﴾

کس طرح مسلسل بارشوں نے پہاڑوں کو غسل دے کر مٹی کے ذرات کو وجود دیا ہے، پھر گڑھوں کو وسعت دے کر ایسی صاف زمین تیار کی ہے جو زراعت کے لئے بھی موزوں ہے اور ہر قسم کی تعمیر کے لئے بھی اور اسے انسانوں کے اختیار میں دے دیا گیا ہے۔

اگر تمام کرہ زمین پہاڑوں اور درّوں پر مشتمل ہوتا تو اس پر زندگی گزارنا کس قدر مشکل اور طاقتور ہوتا۔ وہ کون ہے جس نے ہمارے پیدا ہونے سے پہلے اسے مسطح کر کے قابلِ استفادہ بنایا۔ یہ سب ایسے امور ہیں جن پر غور و فکر کی قرآن ہمیں دعوت دیتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان چاروں امور کے درمیان کونسا ربط ہے: اونٹ، آسمان، پہاڑ اور زمین۔ فخر رازی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ:

یہ اس بنا پر ہے کہ قرآن عربی میں نازل ہوا ہے اور عرب عام طور پر سفر میں رہتے تھے چونکہ ان کے علاقہ میں زراعت اور کھیتی باڑی نہیں تھی اور ان کے سفر زیادہ تر اونٹوں پر ہی ہوتے تھے۔ جب وہ ہولناک بیابانوں اور غیر آباد ریگستانوں میں سفر کرتے تھے تو ان میں تفکر کا مادہ پیدا ہوتا تھا۔ کوئی موجود نہ ہوتا جس سے وہ بات کرتے۔ کوئی چیز ایسی نہ ہوتی جو ان کی آنکھ اور کان کو اپنی طرف متوجہ رکھتی۔ ایسی حالت میں جب وہ غور و فکر کرتے تو سب سے پہلے ان کی نظر اونٹ پر پڑتی جس پر وہ سوار ہوتے تھے۔ وہ اس کا عجیب منظر دیکھتے اور سوچ میں ڈوب جاتے جب وہ سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھتے تو آسمان کے علاوہ کوئی چیز انہیں نظر نہیں آتی۔ جب دائیں بائیں نگاہ کرتے تو پہاڑوں کے سوا انہیں کچھ نظر نہیں آتا، اور جب اپنے قدموں کی طرف دیکھتے تو زمین کے علاوہ کوئی چیز موجود نہ ہوتی، گویا خدا انہیں دعوت فکر دے رہا ہے اور دعوت فکر بھی ایسی جو تنہائی موقع پر دی جائے اور اس کا دائرہ صرف چار چیزوں تک محدود ہو۔^(۱)

لیکن اگر ہم چاہیں کہ ہم عربوں کے ماحول سے نگاہ ہٹا کر زیادہ وسیع فضا میں غور و فکر کریں تو کہا جاسکتا ہے کہ چاروں امور، اوپر والی آیت میں آئے ہیں انسانی زندگی کی بنیاد کو تشکیل دیتے ہیں۔ آسمان نور و روشنی کا مرکز ہے اور بارش ہوا کا بھی۔ زمین انواع و اقسام کے موادِ غذائی کی پرورش کا مرکز ہے۔

پہاڑ آرام و سکون کی رمز اور پانی اور معانیات کا ذخیرہ ہیں۔

اونٹ خانگی جانوروں کا نمونہ ہے جسے انسان کے اختیار میں دیا گیا ہے اس طرح زراعت کے مسائل اور صنعت و کاریگری کے مسائل انہیں چاروں میں پوشیدہ ہیں۔ ان گوناگوں نعمتوں کے بارے میں غور و فکر بہر حال انسان کو شکر منعم حقیقی پر ابھارتا ہے اور شکر منعم انہیں اللہ کی معرفت اور خالقِ نعمت کی شناخت کی دعوت دیتا ہے۔

توحید سے متعلق اس بحث کے بعد پیغمبر کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ”اب جب ایسا ہی ہے تو انہیں یاد دلا اور نصیحت کر اور تو، تو صرف یاد دہانی کرانے والا ہی ہے۔“ ﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ﴾۔ تو ان پر بالکل مسلط نہیں کہ انہیں ایمان لانے پر مجبور کرے۔ ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾۔

جی ہاں! آسمان و زمین، پہاڑوں اور جانوروں کی خلقت بتاتی ہے کہ یہ عالم ظاہر حساب و کتاب کے بغیر نہیں ہے اور اسکی خلقت کا کوئی ہدف و مقصد ہے۔ اب جبکہ ایسا ہی ہے تو تو انہیں یاد دہانیوں اور نصیحتوں سے خلقت و آفرینش پر غور کرنے کی تلقین کر، انہیں قرب خدا کی راہ دکھا اور راہِ تکامل اور ارتقا میں ان کا رہبر و رہنما بن جا۔

البتہ راہ کمال اسی صورت میں طے کی جاتی ہے جب ارادہ و اختیار کے ساتھ میل و رغبت بھی شامل ہو۔ وہ تکامل و ارتقاء جو حالت جبر کے نتیجے میں ہو، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تو انہیں مجبور نہیں کر سکتا اور اگر مجبور کر بھی سکتا تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ حکم فرمانِ جہاد کے نزول سے پہلے تھا اور حکم جہاد کے نزول سے یہ حکم منسوخ ہو گیا یہ کہنا برا اشتباہ اور غلطی ہے۔ پیغمبر کے تذکر اور تبلیغ کا سلسلہ پہلے دن سے شروع ہوا اور آپ کی زندگی کے آخری دن تک جاری رہا۔

آپ کے بعد بھی آپ کے جانشینوں اور علمائے دین کے ذریعہ جاری و ساری رہا اور ہے۔ یہ فسخ ہونے والی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور نہ کرنا بھی ایک بنیادی بات ہے، جہاد کا مقصد بھی زیادہ تر سرکش افراد سے جنگ کرنا ہے اور حق طلب لوگوں کے راستے سے رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔

یہ مفہوم اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ نساء کی آیت ۸۰ میں آئی ہے، جس میں فرماتا ہے: ﴿وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا﴾ ”اور جو شخص روگردانی کرے تو ہم نے تجھ کو اس کا ذمہ دار نہیں بنایا، اور سورہ انعام کی آیت ۱۰۷ اور شوریٰ کی آیت ۴۸ میں انہیں معافی کو بیان کرتی ہیں۔

”مصیطر“ سطر کے مادہ سے کتاب کی سطور کے معنی میں ہے اور مصیطر وہ شخص ہے سطروں کو مرتب کرتا ہے اس کے بعد ہر وہ شخص جو کسی چیز پر مسلط ہو اور اسکو منظم کرے یا اسے کسی کام کے انجام دینے پر مجبور کرے۔

بعد والی آیت میں ایک استثناء کی شکل میں فرماتا ہے: ”مگر وہ شخص جو پشت پھیرے اور کافر ہو جائے“ ﴿الَا مِنْ تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ﴾۔ ”اسے خدا ایک بہت بڑے عذاب کی سزا دے گا“۔ ﴿فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرُ﴾۔ یہ بات کہ یہ استثناء کس جملے سے متعلق ہے، اس کی مختلف تفسیریں ہیں۔

پہلی یہ کہ فذکر کے جملے کے مفعول سے استثناء ہے۔ یعنی ضروری و لازمی نہیں ہے کہ ان معاند افراد سے روگردانی کرتے ہیں اور پند و نصیحت کو قبول نہیں کرتے تو نصیحت کمر اور یاد دہانی کمر۔ حقیقت میں یہ اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ زخرف کی آیات ۸۳ میں آئی ہیں ﴿فَذَرِهِمْ يَخْضُوا وَ يَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوْعَدُونَ﴾ ”انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے تاکہ وہ اپنے باطل میں الجھے رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں، یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس کا وعدہ کیا گیا ہیں“ دوسرے یہ کہ ایک محذوف جملے سے استثناء ہے اور معنوی طور پر اس طرح ہے ”نصیحت کمر اس لئے کہ

نصیحت سب لوگوں کے لیے نفع بخش ہے، مگر وہ جو حق کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں “اس چیز کے مشابہ جو سورہ اعلیٰ کی آیت ۹ میں آئی ہے ﴿فَذَكَرَ اَنْ نَّفَعْتَ الذِّكْرٰی﴾ اس بنا پر کہ آیت معنی شرط رکھتی ہو۔ تیسرے یہ کہ ”علیہم“ کی ضمیر سے استثناء ہے جو گزشتہ آیت میں ہے تو ان پر کوئی تسلط نہیں رکھتا، مگر وہ لوگ جو رد گرداں ہو جائیں اور راہِ عناد اختیار کریں تیری ذمہ داری ہے کہ ان سے مقابلہ کریں^(۲)

یہ سب تفاسیر اس صورت میں ہیں کہ اگر استثناء اصطلاح کے مطابق متصل ہو، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ استثناء منقطع ہو، جو تقریباً بلکہ کا مفہوم رکھتا ہے اور جملہ کے معنی اس طرح ہیں ”بلکہ وہ لوگ جو روگرداں ہو جائیں اور کافر ہو جائیں تو خدا ان پر مسلط ہے یا خدا انہیں بہت بڑے عذاب کی خبر دے گا“ ان تفسیروں میں سے دو تفسیریں سب سے زیادہ مناسب ہیں پہلی یہ کہ استثناء متصل ہو اور لست علیہم بمصیطر کے جملے کی طرف لوٹے، جو طاقتوروں کے مقابلہ میں طاقت سے کام لینے کی طرف اشارہ ہو یا استثناء متصل ہو اور ہٹ دھرم کافروں کے لئے عذابِ الہی کی خبر کے معنوں میں ہو۔ عذابِ اکبر لے مراد آخرت کا عذاب ہے، دنیا کے عذاب کے مقابلہ میں جو چھوٹا ہے اور کم اہم ہے جیسا کہ سورہ زمر کی آیت ۲۶ میں ہم پڑھتے ہیں ﴿فَاِذَا قَهَمَ اللّٰهُ الْخٰذِیْ فِی الْحٰیوۃِ الدُّنْیَا وَلِلعَذَابِ الْاٰخِرَةِ اَکْبَرُ﴾ خدا نے ذلت و خواری کا مزہ انہیں اس دنیا میں چکھایا اور آخرت کا عذاب اکبر ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ عذابِ اکبر سے مراد عذابِ قیامت و دوزخ کا شدید ترین حصہ ہے اس لئے کہ دوزخ میں تمام مجرموں کا عذاب ایک جیسا نہیں ہے۔ اس سورہ کے آخر میں تہدید آمیز لہجے میں فرماتا ہیں: ”یقیناً ان کی بازگشت ہماری طرف ہے“ ﴿اِنَّ الْاِیۡنَا اِیۡاَہُمُ﴾۔۔۔ اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: ”اس کے بعد یقیناً ان کا حساب ہمارے ہاتھ میں ہے“ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا حِسَابَہُمْ﴾ یہ حقیقت میں پیغمبر کے دل کے لئے ایک قسم کی تشفی و تسلی ہے کہ کافروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے پریشان و غمزدہ نہ ہوں اور اپنے کام کو جاری رکھیں ضمنی طور پر یہ سب ہٹ دھرم کافروں کی دھمکی ہے تاکہ وہ جان لیں کہ ان کا حساب و کتاب کسی کے اختیار میں ہے۔ اس طرح سورہ غاشیہ جو قیامت کے موضوع سے شروع ہو رہا تھا، قیامت ہی کے موضوع پر ختم ہو رہا ہے درمیان میں توحید و نبوت کی طرف جو قیامت کی بنیادوں کو تشکیل دیتے ہیں، اشارہ ہوا ہے۔ اس سورہ کی ابتدائی آیات کے ضمن میں مجرموں کو ملنے والی سنگین سزاؤں کا ایک حصہ اور اس کے بعد مومنین کے روح پرور حساب کا اہم حصہ آیا ہے ضمنی طور پر راستے کے انتخاب کا اختیار دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور اس کو ان سے حساب لینا ہے ساتھ ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر تبلیغ رسالت پر مامور ہیں اور

لوگوں کے کفر و گناہ کے ذمہ دار ہیں راہِ حق کے تمام مبلغین کی ذمہ داری اسی قسم کی ہوتی ہے خداوند! جس دن تمام مخلوقات کی بازگشت تیری طرف ہے اور سب کا حساب تجھے لینا ہے، ہم پر اپنا لطف و کرم کیجیو۔

پروردگار! ہمیں اپنی رحمتِ کبریائی سے کام لے کر عذابِ اکبر سے رہائی بخش بارِ الہا! تیری جنت کی نعمتیں جن کا ایک گوشہ ثونے اس سورہ میں بیان کیا ہے، بہت ہی بیش بہا اور شوق انگیز ہیں۔

اگر ہم اپنے اعمال کی وجہ سے اس کے مستحق نہیں ہیں تو تو ہمیں ان کو اپنے فضل و کرم سے مرحمت فرما۔

آمین یا رب العالمین

۱۔ تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱، ص ۱۰۸۔

۲۔ ایک حدیث سے جو در المنثور میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کی ذمہ داری تھی کہ بت برستوں سے جنگ کریں اور اس صورت کے علاوہ باقی حالات میں ان کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ نصیحت کریں۔

سورہ فجر

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں تیس آیات ہیں۔

سورہ فجر کے مشمولات

یہ سورہ بہت سے دوسرے سوروں کی طرح، جو مکے میں نازل ہوئے، مختصر، متزلزل کردینے والی، پُر جلال اور بہت زیادہ ڈرانے والی آیات کا حامل ہے اس سورہ کے پہلے حصہ میں ہمیں بہت سی قسمیں ملتی ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نئی ہیں اور یہ قسمیں ظالموں کے لئے عذاب الہی کی تہدید کے طور پر ہیں۔ اس سورہ کے دوسرے حصہ میں گزشتہ سر کشی کرنے والی بعض اقوام، مثلاً- قوم عاد و ثمود و فرعون اور ان سے خدا شدید انتقام لینے کی طرف اشارہ ہے، تاکہ دوسری طاقتیں اپنے انجام پر غور کریں۔ اس سورہ کے تیسرے حصہ میں مسئلہ معاد اور مجرمین و کافرین کی سر نوشت اور اسی طرح مومنین کے اجر کو، جو صاحب نفس مطمئنہ ہیں، موضوع بنایا گیا ہے

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں ہمیں ایک حدیث پیغمبر اسلام کی ملتی ہے (من قراءھا فی لیال عشر غفر اللہ لہ ومن قراءھا سائر الا یام کانت لہ نوراً یوم القیامت) جو شخص اسے دس راتوں (اول ذی الحج کی دس راتوں) میں پڑھے، خدا اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور جو شخص باقی ایام میں پڑھے تو قیامت کے دن اس کے لئے نور و روشنی ہوگی^(۱)

ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام کی ہے کہ سورہ فجر کو ہر واجب اور مستحب نماز میں پڑھو کہ یہ حسین بن علی کا سورہ ہے۔ جو شخص اسے پڑھے گا وہ قیامت میں امام حسین علیہ السلام کے ساتھ بہشت میں ان کے درجہ میں ہوگا۔^(۲) اس سورہ کا تعارف سورہ امام حسین علیہ السلام کے عنوان سے ممکن ہے کہ اس وجہ سے ہو کہ نفس مطمئنہ کا وضع مصداق، جو اس سورہ کی آخری آیات میں واقع ہوا ہے، حسین بن علی علیہ السلام ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے انہی آیات کے ذیل میں آیا ہے۔ یا پھر اس بناء پر کہ لیال عشر (دس راتوں سے مراد) تفسیر محرم الحرام کی پہلی دس راتیں ہیں جو حسین بن علی علیہ السلام سے خاص رابطہ رکھتی ہیں۔ بہر حال یہ سب اجر و ثواب و فضیلت ان اشخاص کے لئے ہے جو اس کی تلاوت کو اپنی اصلاح اور تربیت کی تمہید قرار دیں۔

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿وَالْفَجْرِ﴾ - ۲۔ ﴿وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ - ۳۔ ﴿وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ -

۴۔ ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَسِرَ﴾ - ۵۔ ﴿هَلْ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرِ﴾ -

ترجمہ

رحمن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ صبح کی قسم - ۲۔ اور دس راتوں کی - ۳۔ اور زوج و فرد کی -

۴۔ اور رات کی جب وہ (دن کی روشنی کی طرف) حرکت کرتی ہے قسم ہے (کہ تیرا پروردگار ظالموں کی گھات میں ہے

۔)

۵۔ کیا جو کچھ کہا گیا ہے اس میں صاحبان عقل کے لئے اہم قسم نہیں ہے؟

تمہاری صبح کی سفیدی کی قسم

اس سورہ کے آغاز میں پانچ بیدار کرنے والی قسموں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: ”قسم ہے فجر اور رات کے سیاہ پردے کے چاک ہونے کی“۔

﴿وَالْفَجْرِ﴾ - ”اور قسم ہے دس راتوں کی“ - ﴿وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ -

”فجر“ اصل میں وسیع شگاف کے معنی ہے، چونکہ صبح کا نور شب کی تاریکی میں شگاف ڈال دیتا ہے، لہذا اسے فجر کہا گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ فجر دو قسم کی ہے، کاذب اور صادق۔ فجر کاذب طولانی سفیدی ہے جو آسمان میں ظاہر ہوتی ہے اور اسے لومڑی کی دم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جس کا باریک نقطہ افق کی طرف ہے اور اس کا قاعدہ مخروط وسط آسمان میں ہے۔

فجر صادق ابتداء ہی سے افق میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ اس میں نورانیت اور صاف قسم کی شفافیت ہوتی ہے۔ وہ آب زلال کی نہر کی مانند افق مشرق کو گھیر لیتی ہے۔ اس کے بعد پورے آسمان میں پھیل جاتی ہے۔ فجر صادق رات کے ختم ہونے اور دن کے آغاز کا اعلان ہے۔ اس موقع پر روزہ داروں کو اکل و شرب سے ہاتھ کھینچ لینا چاہئے۔ اس وقت صبح کی نماز کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں فجر کے اس کے مطلق معنی یعنی صبح کی سفیدی مراد لی ہے، جو یقیناً عظمت پروردگار کی ایک نشانی ہے، یہ انسانوں اور تمام زمینی موجودات کے لئے نور کی حاکمیت کے آغاز اور ظلمت کے ختم ہونے کا نقطہ عطفی ہے۔ یہ زندہ موجودات کی جنبش و حرکت کا آغاز نیند و سکوت کا اختتام ہے۔ اس زندگی کی بناء پر خدا اس کی قسم کھاتا ہے۔

لیکن بعض مفسرین نے اس سے نئے سال کا پہلا دن یعنی پہلی محرم مراد لی ہے بعض نے اس کی تفسیر عید قربان کی فجر کی ہے جس میں حج کے اہم مراسم انجام پاتے ہیں اور یہ دس راتوں سے متصل ہے، بعض نے اس کو ماہ رمضان مبارک کی صبح قرار دیا ہے اور بعض نے روزِ جمعہ کی فجر سمجھا ہے۔ لیکن آیت کا وسیع مفہوم ہے جو ان سب مفاہیم پر حاوی ہے، اگرچہ اس کے بعض مصداق دوسرے بعض مصداقوں سے زیادہ واضح اور اہم بھی ہیں۔

بعض نے آیت کے معنی اس سے زیادہ وسیع سمجھے ہیں اور کہا ہے کہ فجر سے مراد ہر وہ روشنی ہے جو تاریکی میں چمکتی ہے۔ اس بناء پر اسلام اور نور پاک محمدی کا عصر جاہلیت پر طلوع ہونا اس فجر کا ایک مصداق ہے اسی طرح قیام محمدی کی صبح کی سفیدی کا عالم کے ظلم و ستم کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہونے کے وقت چمکنا، اس کا ایک دوسرا مصداق شمار ہوتا ہے جیسا کہ بعض روایات میں اسکی طرف اشارہ ہوا ہے۔^(۳)

علیٰ ہذا دشتِ کربلا میں عاشورہ حسینی کا قیام اور اس کا بنی امیہ کے مظالم کے تاریک پردوں کو چاک کرنا اور ان دیو صفت لوگوں کے حقیقی چہروں کو بے نقاب کرنا، اس کا ایک اور مصداق ہے۔

اسی طرح تمام سچے انقلاب، جو کفر و جہالت اور ظلم و ستم کے خلاف گزشتہ اور موجودہ تاریخ میں برپا ہوتے ہیں، نہ صرف وہ فجر کے مصداق ہیں بلکہ بیداری کا وہ شعلہ جو گنہگاروں کے تاریک دل میں ظاہر ہوتا ہے اور انہیں توبہ کی دعوت دیتا ہے، وہ فجر ہے، البتہ یہ آیت کے مفہوم کی ایک وسعت ہے جبکہ ظاہر آیت وہی فجر ہے، یعنی سپیدہ صبح کا طلوع ہونا۔

باقی رہا ”لیال عشر“ (دس راتیں) تو مشہور وہی ذوالحجہ کی دس راتیں ہیں جو مسلمانانِ عالم کے سیاسی اور عبادتی عظیم ترین اور نہایت متاثر کرنے والے اجتماعات کی گواہ ہیں۔ یہ معانی ایک حدیث میں جابر بن عبد اللہ انصاری کے واسطے سے پیغمبر اسلام سے منقول ہوئے ہیں۔^(۲)

بعض مفسرین نے ان دس راتوں کو ماہ مبارک رمضان کی آخری دس راتیں قرار دیا ہے جن میں شب قدر ہے۔ بعض نے محرم کی ابتدائی دس راتوں کو ”لیال عشر“ کا مصداق قرار دیا ہے۔ ان تینوں تفسیروں کو جمع کرنا بھی مکمل طور پر ممکن ہے۔

بعض ایسی روایات جو بطون قرآن کی طرف اشارہ کرتی ہیں ان کے مطابق فجر سے مراد حضرت مہدی کا وجود ہی ہے اور یہاں عشر ان کے پہلے کے دس ائمہ ہیں اور شفیع جو بعد والی آیت میں آیا ہے، اس سے مراد حضرت علی و حضرت فاطمہ الزہرا ہیں بہر حال دس راتوں کا خواہ اس کی تفسیر کچھ بھی کیوں نہ ہو، ان کی حد سے زیادہ اہمیت کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ قسم ہمیشہ اہم امور کی کھائی جاتی ہے۔^(۵)

ان تمام معانی کی جمع بھی ممکن ہے۔

اس کے بعد قسموں کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے: ”جفت و طاق کی قسم“ ﴿وَالشَّفْعَ وَالْوَتْرَ﴾ یہ کہ شفیع و وتر (زوج و فرد) سے اس آیت میں کیا مراد ہے، مفسرین نے بہت سے اقوال اور احتمال بیان کئے ہیں۔ بعض نے بیس اقوال تک پیش کئے ہیں۔^(۶)

اور بعض نے اس سے بھی زیادہ یعنی ۳۶ / اقوال تک نقل کئے ہیں۔^(۷)

ان میں سے زیادہ اہم امور مندرجہ ذیل اقوال ہیں:

۱۔ مراد، زوج و فرد اعداد ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق خدا نے ان تمام اعداد کی قسم کھائی ہے جو زوج و فرد سے تشکیل پاتے ہیں۔ وہ اعداد ایسے ہیں کہ تمام حسابات اور تمام نظام ان کے محور کے گرد گھومتے ہیں اور انہوں نے سارے عالم معنی کو گھیر رکھا ہے گویا فرماتا ہے:

قسم ہے نظم و ضبط اور حساب و کتاب کی، اور حقیقت میں عالم ہستی میں اہم ترین مفہوم یہی نظم و حساب اور عدد کا مسئلہ ہے جو انسانی زندگی میں اصل بنیاد کو تشکیل دیتا ہے۔

۲۔ شفیع سے مراد مخلوقات ہیں کیونکہ ساری مخلوق جوڑا جوڑا ہیں اور ایک دوسرے کے قرین ہے جب کہ وتر سے مراد خدا ہے، جس کی شبیہ و نظیر و مانند و مثل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمام ممکنات ماہیت و وجود سے مرکب ہیں، جسے فلسفہ میں زوج ترکیبی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ صرف غیر متناہی شے جو ماہیت کے بغیر ہے، وہ خدا کی اپنی ذات ہے، اس تفسیر کی طرف معصومین علیہم السلام کی بعض روایات میں اشارہ ہوا ہے۔^(۸)

۳۔ زوج و فرد سے مراد اس جہان کی تمام مخلوق ہے جو ایک لحاظ سے زوج اور ایک لحاظ سے فرد ہے۔

۴۔ مراد نمازیں ہیں جن میں رکعات کی تعداد کے لحاظ سے بعض زوج اور بعض فرد ہیں۔ یہ معنی بھی ایک روایت میں معصوم سے نقل ہوئے ہیں۔^(۹)

۵۔ شفع سے مراد روز ترویہ ہے (آٹھویں ذی الحج جس دن حاجی عرفات کی طرف کوچ کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں) اور وتر سے مراد عرفہ کا دن ہے (دس ذی الحج) اور وتر سے مراد عرفہ کا دن ہے۔ یہ تفسیر بھی معصومین علیہم السلام کی روایات میں آئی ہے۔^(۱۰)

وہ بات یہ ہے کہ اگر الف لام ان دونوں الفاظ میں عموم کے لئے ہوں تو یہ تمام معانی اس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان تفسیروں میں سے ایک تفسیر کی کوئی نہ کوئی مصداق ہے۔ شفع و وتر کا خصوصیت سے ذکر ہونا اس مفہوم میں مخصوص ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ایک واضح مصداق سے مطابقت رکھنے کی قسم سے ہے۔ لیکن الف لام ان دونوں میں عہد کا ہو تو پھر خاص قسم کے زوج و فرد کی طرف اشارہ ہوگا اور یہاں گزشتہ قسموں کی مناسبت سے سب سے زیادہ دو معنی مناسب ہیں:

ایک یہ کہ عید کا دن اور عرفہ کا دن ہو جو ذی الحج کی ابتدائی دس راتوں سے مکمل طور پر مناسبت رکھتا ہے اور مناسک حج کا اہم ترین حصہ انہیں دونوں میں انجام پاتا ہے۔ یا یہ کہ مراد نمازیں ہوں جو فجر کی قسم کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں، جو سحر کا اور بارگاہِ خدا میں راز و نیاز کا وقت ہے، خصوصاً جبکہ یہ دونوں تفاسیر ان روایات میں بھی وارد ہوئیں ہیں جو معصومین سے مروی ہیں۔

آخر میں آخری قسم میں فرماتا ہے: ”اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ صبح اور دن کی روشنی کی طرف جاتی ہے“ ﴿وَاللَّیْلِ

اِذَا یَسِرُ﴾^(۱۱)

کیسی پرکشش اور عمدہ تعبیر ہے کہ چلنے کی نسبت رات کی طرف وہی ہے، وہ بھی رات کو چلنا اس لئے کہ ”یسر“۔ ”سری“ کے مادہ سے (بروزن شما) بقول راغب مفردات میں رات کے چلنے کے معنی میں ہے۔ گویا رات ایک زندہ وجود ہے اور حس و حرکت رکھتی ہے جو تاریکی میں قدم بڑھاتی ہے اور روشنی کی طرف جاتی ہے۔ جی ہاں! اس تاریکی کی قسم کھائی ہے جس کا رخ روشنی کی طرف ہے، متحرک تاریکی نہ کہ ٹھہری ہوئی۔

تاریکی اس وقت وحشت ناک ہوتی ہے جب وہ رکی ہوئی ہو لیکن اس میں اگر نور و روشنی کی طرف حرکت ہو تو اس کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ظلمتِ شب کمرہ زمین پر حرکت کی حالت میں ہے اور اصولی طور پر جو رات اہم مفید اور حیات بخش ہے وہ وہی رات ہے جو حرکت کی حالت میں ہو، یعنی جو مستقل طور پر بتدریج خود کو دن سے تبدیل کرے، اس لئے کہ اگر رات کمرہ زمین کے نصف حصہ پر جا کر رک جائے اور میخ کی طرح گمڑ جائے تو وہ آدھا حصہ بھی ختم ہو جائے اور دوسرا آدھا حصہ بھی جو ہمیشہ سورج کی روشنی کے مقابل ہو:

رات سے مراد یہاں کیا ہے؟ کیا سب راتیں مراد ہیں، یا کوئی خاص رات؟

اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اگر اس کا الف لام عموم کے لئے ہو تو اس میں تمام راتیں شامل ہوں گی، جو خدا کی آیات میں سے خود ایک آیت ہے اور آفرینش کے مظاہر میں سے خود ایک مظہر ہیں۔ اگر اس کا الف لام عہد ہو تو پھر معین رات کی طرف اشارہ ہے اور گزشتہ قسموں کی مناسبت سے مراد عید قربان کی رات ہے جس میں حجاج کرام مزدلفہ (مشعر الحرام) کی طرف اور اس وادی مقدس میں رات گزارنے کے بعد طلوع آفتاب کے وقت سر زمین منیٰ کی طرف راونہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تفسیر معصومین علیہم السلام سے منقول روایات میں بھی آئی ہے۔ (۱۲)

جن لوگوں نے اس رات کا منظر قریب سے عرفات و مشعر میں دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ کس طرح ہر گز گوشہ و کنار سے لاکھوں افراد کی حالت میں ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات اپنے وجود کے ساتھ حرکت کر رہی ہے یہ ٹھیک ہے کہ حاجی چل رہے ہوتے ہیں، لیکن یہ حرکت عمومی اس قدر وسعت رکھتی ہے گویا زمین و زمان سب حرکت میں ہوں اور یہ سب اس وقت محسوس ہوتا ہے جب انسان عید کی رات اس سر زمین میں ہو اور واللیل اذایسر کے معنی اپنی آنکھوں دیکھے۔ بہر حال رات کسی بھی معنی میں ہو، عام یا خاص، عظمت الہی کی نشانی ہے اور عالم ہستی کے اہم موضوعات میں سے ہے۔

رات ہوا کی حرارت میں اعتدال پیدا کرتی ہے، تمام موجودات کو آرام پہنچاتی ہے اور بارگاہ خدا میں راز و نیاز کے لئے فضا میں سکون پیدا کرتی ہے۔ باقی رہی عید قربان کی رات جس کا نام (لیلۃ جمع) ہے، وہ بھی اس مقدس وادی مشعر الحرام میں سال کی عجیب ترین رات ہے۔

بہر حال ان پانچ قسموں کا رشتہ (فجر کی قسم، دس راتوں کی قسم، زوج و فرد کی قسم اور رات کی قسم) اس صورت میں بالکل واضح ہے جب ہم ان سب کو ایام ذی الحج اور حج کے عظیم مراسم سے متعلق سمجھیں۔

اس صورت حال کے علاقہ پھر عالم تکوین اور عالم تشریع کے اہم حوادث کے مجموعہ کی طرف اشارہ ہے جو خدا کی عظمت کی نشانیاں ہیں اور عالم ہستی کے عجیب و غریب اور حیران کن مظاہر ہیں، ان پر معنی اور بیدار کرنے والی قسموں کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

”کیا کچھ کہا گیا ہے اس میں صاحبانِ خرد کے لئے اہم قسم ہے“ ﴿ہَلْ فِي ذَالِكِ قِسْمٌ لِّذِي حِجْرٍ﴾۔ حجر یہاں عقل کے معنی میں ہے اور اصل میں

منع کے معنی میں ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ قاضی نے فلاں شخص کو حجر (بر وزن زجر) کیا یعنی اسے اس کے اموال میں تصرف کرنے سے منع کر دیا۔ یا یہ کہ کمرہ کو حجر کہا جاتا ہے، اس لئے کہ وہ ایک محفوظ و ممنوع جگہ ہوتی ہے کہ اس میں دوسرے وارد نہیں ہو سکتے۔

دامن اور آغوش کو حجر (بر وزن فکر) کہا جاتا ہے دوسروں سے محفوظ ہونے اور ممنوع ہونے کی وجہ سے اور عقل بھی انسان کو غلط کاموں سے روکتی ہے لہذا اسے حجر سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ خود لفظ عقل کے معنی بھی خود منع کرنے کے ہیں۔ اسی لئے وہ رسی جسے اونٹ کے گھٹنے میں باندھتے ہیں کہ اسے چلنے پھرنے سے روکیں، عقلاً کہلاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ منقسم بہ (وہ چیز جن کے لئے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں) کیا ہے؟ اس سلسلہ میں دو احتمال ہیں، پہلا یہ کہ جملہ ﴿ان ربک بالمرصاد﴾ تیرا پروردگار کی نگاہ میں ہے، اس قسموں کا جواب قسم ہے۔ دوسرا یہ کہ جواب قسم محذوف ہے اور آنے والی آیات میں جو سرکشوں کی سزا اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کی بات کرتی ہے اور وہ اس پر گواہ ہیں۔ یہ معنی کے لحاظ سے اس طرح ہے۔ قسم ہے ان چیزوں کی جو کہی ہیں کہ ہم کافروں اور سرکشوں پر عذاب نازل کریں گے^(۱۳)

۱۔ مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۱۔

۲۔ مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۸۱۔

۳۔ یہ معنی امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں نقل ہوئے ہیں۔ تفسیر بہان، جلد ۴، ص ۴۵۷، حدیث ۱۔

۴۔ تفسیر ابو الفتوح رازی، جلد ۱۲، ص ۷۴۔

۵۔ اگرچہ ”لیال عشر“ یہاں نکرہ کی شکل میں بیان ہوئی ہیں لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ نکرہ یہاں بیان عظمت کے لئے ہے، لہذا یہ عہد کا مفہوم پیدا کرتی ہیں اور یہ ان

مخصوص راتوں کی طرف اشارہ ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔

۶۔ تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱، ص ۱۶۴۔

۷۔ علامہ طباطبائی نے المیزان میں بعض مفسرین سے جلد ۲۰، ص ۴۰۶ پر نقل کیا ہے اور روح المعانی نے تحریر و التجر سے جلد ۳۰ ص ۱۲۰ پر نقل کیا ہے۔

۸۔ ابوسعدی خدری نے اسے پیغمبر سے نقل کیا ہے۔ مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۸۵۔

۹۔ مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۸۵۔

۱۰۔ مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۸۵۔

۱۱۔ سیر اصل میں سیری ہے جو مادہ سری کا فعل مضارع ہے اس کے بعد اس کی یاء تخفیف اور گزشتہ آیات سے ہم آہنگی کی بناء پر حذف ہو گئی ہے۔

۱۲۔ نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۷۱۔

۱۳۔ تقدیر میں اس طرح ہے کہ لنغذبن الکفار و الطاغین۔ اس طرح قسم اور منقسم بہ واضح ہو جاتے ہیں۔

آیات ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴

- ۶۔ ﴿الْم تَرَكِيفَ فَعَلَ رَبِّكَ بُعَادٍ﴾ - ۷۔ ﴿ارْمِ ذَاتَ الْعِمَادِ﴾ - ۸۔ ﴿الَّتِي لَمْ يَخْلُقْ مِثْلَهَا فِي الْبِلَادِ﴾ -
 ۹۔ ﴿وَتُمُودَ الَّذِي جَابُوا الصَّخَرَ بِالْوَادِ﴾ - ۱۰۔ ﴿وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ﴾ - ۱۱۔ ﴿الَّذِي طَغَا فِي الْبِلَادِ﴾ -
 ۱۲۔ ﴿فَاكْثَرُوا فِيهَا الْفُسَادَ﴾ - ۱۳۔ ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمُ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ -
 ۱۴۔ ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبَاسِرٌ﴾ -

ترجمہ

- ۶۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا؟ ۷۔ اور اس با عظمت شہر ارم کے ساتھ
 ۸۔ وہی شہر جس کی نظیر شہروں میں پیدا نہیں کی گئی۔ ۹۔ اور قوم ثمود جو دروں میں سے بڑے بڑے پتھر کاٹی تھی۔
 ۱۰۔ اور فرعون جو صاحب قوت اور سخت سزا دینے والا تھا۔ ۱۱۔ وہی قومیں جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی۔
 ۱۲۔ اور ان میں بہت زیادہ فساد انہوں نے کیا۔ ۱۳۔ لہذا خدا نے ان کو عذاب کا تازیانہ لگایا۔
 ۱۴۔ یقیناً تیرا پروردگار کمین گاہ میں ہے۔

تیرا پروردگار ظالموں کی گھات میں ہے

گزشتہ آیات کے بعد جو سرکشوں کی سزا اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کے بارے میں بامعنی قسموں کی ضمانت
 لئے ہوئے تھیں، ان آیات میں گزشتہ اقوام میں سے چند طاقتور قوموں کے متعلق، جن میں سے ہر ایک عظیم قوت کی
 مالک تھی، لیکن ساتھ ہی مغرور بھی متکبر و سرکش بھی تھی، ان کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ان کی دردناک سرنوشت کو
 واضح کرتا ہے تاکہ مشرکین مکہ اور دوسری اقوام جو ان کے مقابلہ میں بہت کمزور ہیں، اپنا اندازہ لگالیں اور خواب غفلت
 سے بیدار ہو جائیں۔ پہلے فرماتا ہے: ”کیا تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا ہے؟“ - ﴿الْم تَرِ
 كِيفَ فَعَلَ رَبُّكَ بُعَادٍ﴾ -

رویت (دیکھنا) سے یہاں مراد علم و آگاہی ہے چونکہ ان اقوام کی داستانیں اس قدر مشہور و معروف تھیں کہ گویا بعد کے
 زمانے کے لوگ بھی انہیں اپنی آنکھوں سے
 دیکھتے تھے، لہذا رویت کی تعبیر صرف ہوئی ہے۔ البتہ اس آیت میں مخاطب پیغمبر تھے لیکن مقصود سب کو تنبیہ کرنا اور
 خبردار کرنا ہے۔

”عاد“ خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ہود کی قوم ہے۔ بعض موخین کا نظریہ ہے کہ عاد کا اطلاق دو قبیلوں پر ہوتا ہے ایک وہ جو بہت پہلے تھا اور قرآن نے اسے عاد الاولیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ (نجم - ۵۰)۔ وہ غالباً تاریخ سے پہلے موجود تھا۔ دوسرا قبیلہ جو تاریخ بشر کے دور میں اور تقریباً ولادت مسیح سے سات سو سال پہلے تھا اور عاد کے نام سے مشہور تھا۔ یہ احقاف یا یمن میں رہائش پذیر تھا۔ اس قبیلہ کے افراد بلند قامت اور قوی الجثہ تھے اور عاد کے نام سے نمایاں جنگجو شما رہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ متمدن بھی تھے۔ ان کے شہر آباد اور زمینیں سرسبز و شاداب تھیں۔ ان کے باغات پر بہار تھے اور انہوں نے بڑے بڑے محل بھی تعمیر کئے تھے بعض موخین کا خیال ہے کہ عاد اس قبیلہ جد اعلیٰ کا نام تھا اور وہ قبیلہ کو اپنے جد کے نام سے موسوم کر کے پکارتے تھے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

”وہی پر شکوہ اور عظیم شہر ارم“ ﴿ارم ذات العماد﴾، اس بات میں کہ ارم کسی شخص کا نام ہے یا قبیلے کا یا جگہ یا کسی شہر کا، موخین کے درمیان اختلاف ہے۔ زرخش و کثافت میں نقل کرتا ہے کہ عاد بیٹا ہے عوص کا، وہ بیٹا ہے ارم کا، وہ بیٹا ہے سا، ابن نوح کا اور چونکہ قبیلے کے اجداد سے قبیلے منسوب ہوتے تھے، لہذا عاد کو ارم بھی کہتے ہیں،۔ موخین کا نظر یہ ہے کہ ارم وہی عاد اولیٰ ہے اور عاد دوسرا قبیلہ ہے، جبکہ کچھ اور حضرات کا نظریہ ہے کہ ارم ان کے شہر اور سرزمین کا نام ہے۔ (۱)

لیکن بعد والی آیت سے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارم ان کے بے نظیر شہر کا نام ہے۔
عماد کے معنی ستون اور اس کی جمع عمد ہے (بروزن شتر) پہلی تفسیر کی بنا پر قوم عاد کے طاقتور جسموں اور ستون جسے پیکروں کی طرف اشارہ ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق با عظمت عمارتوں، بلند و بالا محلات، اور ان عظیم ستونوں کی طرف اشارہ ہے جو عظیم محلوں میں تعمیر کئے گئے تھے اور ان دونوں صورتوں میں قوم عاد کی طاقت و قوت کا اشارہ ہے۔ (۲)

اس کے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ”وہی شہر و دیار جن کی مانند و مثل دنیا کے شہروں میں پیدا نہیں ہوئی تھی“ ﴿التی لم یخلق مثلها فی البلاد﴾ یہ تعبیر بتائی ہے کہ ارم سے مراد وہی شہر ہے، نہ کہ قبیلہ طائفہ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے اسی تفسیر کو قبول کیا ہے اور ہم نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ (۳)

بعض مفسرین نے جزیرۃ العرب کے بیابانوں اور عدن کے صحراؤں میں شہر ارم کے برآمد ہونے کی ایک دلچسپ داستان بیان کی ہے جس میں وہ اس شہر کی بلند و بالا عمارات اور سامان زینت وغیرہ کی بات کرتے ہیں۔ لیکن مذکورہ

داستان واقیعت کی نسبت خواب یا افسانے سے زیادہ تعلق رکھتی ہے، لیکن اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ قوم عاد طاقتور قبائل پر مشتمل تھی، ان کے شہر ترقی یافتہ تھے اور جیسا کہ قرآن اشارہ کرتا ہے، ان جیسے شہر پھر آباد نہیں ہو سکے۔ بہت سی داستانیں شدا کی، جو عاد کا بیٹا، زبان زدِ عام ہیں اور تاریخ میں مرقوم ہیں، یہاں تک کہ شدا کی بہشت اور اس کے باغات ضرب المثل کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن ان داستانوں کی حقیقت کچھ نہیں ہے، یہ محض افسانے ہیں۔ یہ ایسے افسانے ہیں کہ ان کی حقیقت پر بعد میں حاشیہ آرائی کر لی گئی۔

اس کے بعد گزشتہ اقوام کے دوسرے سرکش گروہ کا حوالہ دے کر فرماتا ہے: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے قوم ثمود کے ساتھ کیا کیا، جو وادی میں بڑے بڑے پتھروں کو کاٹتی اور ان سے گھر اور قصر بناتی تھیں۔ ﴿ثَمُودَ الذِّينِ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾ ثمود کی قوم قدیم ترین اقوام میں سے ہے۔ ان کے پیغمبر حضرت صالح تھے اور وہ وادی القریٰ نامی سرزمین میں رہتے تھے، جو مدینہ اور شام کے درمیان تھی، ان کا تمدن ترقی یافتہ تھا، زندگی مرفہ الحال تھی اور ان کی عمارتیں عظیم تھیں۔

بعض مورخین کہتے ہیں ثمود اس قبیلے کے باپ کا نام تھا، اسی نام سے وہ قبیلہ موسوم ہوا۔^(۴) جابوا اصل میں جو بہ (بروزن توبہ) سے لیا گیا ہے جو پست زمین کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد ہر قطعہ زمین کی قطع و برید کے معنی میں آیا ہے۔

کسی بات کے جواب کو اس لئے جواب کہتے ہیں گویا وہ ہوا کو قطع کرتا ہے اور کہنے والے کے منہ سے نکل کر سننے والے کے کان تک پہنچتا ہے (یا اس لحاظ سے کہ سوال کو کاٹ کر دیتا ہے)۔

بہر حال یہاں مراد پہاڑوں کے ٹکڑوں کا کاٹنا اور اطمینان کے ساتھ ان سے گھر بنانا ہے، جیسا کہ سورہ فجر کی آیت ۸۲ میں اسی قوم ثمود کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں ﴿وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ﴾۔ وہ دو پہاڑوں کے اندر پرسکون گھر بناتے تھے۔ ان معنی کی نظیر سورہ شعرا کی آیت ۱۴۹ میں آئی ہے وہاں بیوتاً فارہین کی تعبیر صرف ہوئی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان گھروں میں عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے اور ہوس رانی سے کام لیتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ قوم ثمود وہ پہلی قوم تھی جنہوں نے پہاڑوں سے پتھر کاٹ کر پہاڑوں کے اندر مضبوط و محکم گھر بنانے کا اقدام کیا۔

”واد“ جو اصل میں وادی تھا، دریا سیلابوں کی گزرگاہ کے معنی میں ہے اور کبھی درہ کے معنی میں بھی آیا ہے، اس لئے کہ سیلاب ان سے جو پہاڑوں کے قریب ہوتے ہیں، گزرتے ہیں، یہاں سے دوسرے معنی مناسب ہیں یعنی درے اور پہاڑ کے دامن، اس لئے کہ قرآن کی وہ آیات بھی یہی بتاتی ہیں جو اس قوم کے متعلق بیانات دیتی ہیں اور اس کا اوپر بھی اشارہ ہوا ہے کہ قوم ثمود اپنے گھر پہاڑوں کے دامن میں بناتی تھی۔ اس طرح وہ پتھر کاٹتے اور ان کے اندر پر امن گھر بناتے۔ (۵)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر تبوک کے موقع پر راستہ چلتے ہوئے دبستان کے شمال میں داوی ثمود میں پہنچے۔ آپ گھوڑے پر سوار تھے۔ فرمایا جلدی کرو اس وقت تم ملعون و معذب سرزمین پر ہو۔ (۶)

اس میں شک نہیں کہ قوم ثمود ترقی یافتہ تھا کہ ان کے شہر آباد تھے۔ لیکن پھر ہمیں ایسے اعداد و شمار سے واسطہ پڑتا ہے جو مبالغہ آمیز نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مفسرین کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک ہزار سات سو شہر بنائے تھے، جو سب کے سب پتھروں سے تعمیر ہوئے تھے۔

اس کے بعد تیسری قوم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”اور اسی طرح فرعون صاحب ثروت“ ﴿و فرعون ذی الاوتاد﴾ جو اس طرف اشارہ ہے کہ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے طاقتور ظالم اور بیدادگر قوم فرعون کے ساتھ کیا کیا۔

”اوتاد“ جمع ہے وتد کی (بروزن صمد) جس کے معنی میخ کے ہیں۔ فرعون کو ذی الاوتاد کیوں کہتے ہیں؟ اس کی مختلف تفسیریں ہیں۔

پہلی یہ کہ اس کے بہت سے لشکر تھے جن میں سے بہت سے خیموں میں زندگی گزارتے تھے اور جو خیمے ان کے لئے گاڑے جاتے تھے ان میں میخیں استعمال ہوتی تھیں۔

دوسری یہ کہ فرعون جس شخص پر غضبناک ہوتا، زیادہ تر اس کو یہ سزا دیتا کہ اس کے چاروں ہاتھ پاؤں میخوں سے باندھ دیتا، یا اس کے ہاتھ اور پاؤں میں میخیں گاڑ دیتا یہاں تک کہ وہ مرجاتا۔ یہ تفسیر ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ (۷)

تاریخ میں آیا ہے کہ جس وقت فرعون کی بیوی حضرت آسیہ حضرت موسیٰ پر ایمان لے آئیں تو انہیں بھی یہی سزا دی گئی اور شہید کیا گیا۔ ذی الاوتاد اصولی طور پر قوت اور استقرار حکومت کا کنایہ ہے۔

تینوں تفسیریں آپس میں منافات بھی نہیں رکھتی۔ ہو سکتا ہے کہ آیت کے معنی جمع ہوں۔ اس کے بعد مجموعی طور پر ان تینوں اقوام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

”وہی جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی“ ﴿الذین طغوا فی البلاد﴾ اور ان میں بہت سا فساد برپا کیا اور خرابی کی ﴿فاکثروا فیہا الفساد﴾ فساد جو ہر قسم کی ظلم و ستم، تجاوز عن الحدود، عیاشی اور ہوس رانی پر مشتمل تھا۔ واقعی ان کی سرکشی ایک اثر رکھتی ہے اور ہر سرکشی کرنے والی قوم آخر کار ہر قسم کے فساد میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد ایک مختصر اور پر معنی جملے کے ساتھ ان تمام سرکش قوموں کی دردناک سزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ فرماتا ہے: ”لہذا خدا نے ان کو عذاب کا تازیانہ لگایا“ ﴿فصب علیہم ربک سوط عذاب﴾۔

”سوط“ کے معنی تازیانے کے ہیں۔ اس کے معنی اصل میں ایک شی کو دوسری چیز سے مخلوط کرنے کے ہیں۔ اس کے بعد اس کا تازیانہ پر بھی اطلاق ہوا ہے جو چمڑے وغیرہ سے بنا ہو۔ بعض مفسرین کے نزدیک عذاب کا کنایہ ہے، ایسا عذاب جو انسان کے گوشت و خون سے مخلوط ہو جائے اور اس کو سخت پریشان و بے حال کر دے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں امتحان کے بارے میں ملتا ہے (و الذی بعثہ بالحق لتبلبلن بلبلة و لتغربلن غریلة و لتساطن سوط القدر)۔ قسم ہے اس کی جس نے پیغمبر کو حق کے ساتھ مبعوث کیا تم شدت و سختی کے ساتھ مورد امتحان و آزمائش قرار پاؤ گے، چھلنی کی مانند ہو جاؤ گے، دیگ میں جو چیز ہو اس کی طرح اس کے جوش کھانے اور ابال آنے کے وقت مل جل جاؤ گے اور اوپر نیچے ہو جاؤ گے۔^(۸)

یہ مختصر سی تعبیر شدید اور مختلف قسم کے عذابوں کی طرف اشارہ ہے جو اس قوم پر نازل ہوئے۔ قوم عاد تو قرآن مجید کے بقول تیز ٹھنڈی اور جلانے والی ہوا اور آندھی سے ہلاک ہوئی ﴿واماعاد فاهلکوا بریح صرصر عاتية﴾ (حاقہ - ۶) باقی رہی قوم ثمود تو وہ عظیم آسمانی چیخ کے ذریعہ نابود ہوئی۔

﴿فاما ثمود فاهلکوا بالطاغية﴾ (حاقہ - ۵) اور قوم فرعون دریائے نیل کی موجوں میں غرق اور دفن ہو گئی ﴿فاغرقنا ہم اجمعین﴾ (زخرف: ۵۵)

آخری زیر بحث آیت میں ان تمام لوگوں کو ہشیار اور خبردار کرنے کے لئے، جو اس راستہ پر چلتے ہیں جس پر وہ سرکش لوگ چلتے تھے، فرماتا ہے:

”یقیناً تیرا پروردگار کمین گاہ میں ہے“ ﴿ان ربک لبالمرصاد﴾۔ ”مرصاد“ رصد کے مادہ سے کسی چیز کی نگہبانی کرنے کے لئے آمادگی کے معنی میں ہے۔ فارسی میں اسے کمین گاہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ عا طور پر ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں کچھ افراد مجبور ہوں کہ کسی گزرگاہ سے گزریں اور کوئی شخص اس گزرگاہ میں ضرب لگانے کے لئے آمادہ و تیار ہو۔

اس ساری گفتگو میں اس طرف اشارہ ہے کہ گمان نہ کرو کہ کوئی شخص عذابِ الہی سے بچ کر جاسکتا ہے۔ سب کچھ اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور جس وقت وہ ارادہ کرے ان کو سزا دے سکتا ہے اور ان پر عذاب نازل کر سکتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ خدا کا کوئی مکان نہیں ہے اور وہ کسی گزرگاہ میں بھی نہیں بیٹھتا۔ یہ تعبیر اس بات کا کنایہ ہے کہ پروردگار اپنی قدرت کے ذریعہ تمام سرکشوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے: (ان ربک قادر علی ان یجزی اهل المعاصی جزائهم) ”تیرا پروردگار قدرت و توانائی رکھتا ہے کہ گنہگاروں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے“۔ (۹)

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: (المرصاد قنطرة علی الصراط لایجوزها عبد بمظلمة عبد) ”مرصاد ایک پل ہے اس راستہ پر جو جہنم کے اوپر سے گزرتا ہے۔ جس شخص کی گردن پر کسی مظلوم کا حق ہوگا وہ اس پر سے نہیں گزر سکے گا“۔ (۱۰)

یہ حقیقت میں ایک واضح مصداق کے بیان کی قسم میں سے ہے اس لئے کہ خدا کی کمین گاہ قیامت اور مشہور پل صراط تک محدود نہیں ہے۔ خدا تو اس دنیا میں بھی ہر ظالم کی گھات میں ہے اور گزشتہ تینوں اقوام پر نازل ہونے والا عذاب اس کا واضح مصداق ہے۔

”ربک“ (تیرا پروردگار) کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ سنتِ الہی تیری امت کی سرکش، ظالم اور ستمگر قوموں کے بارے میں بھی جاری ہوگی۔ پیغمبر اور مومنین کے دلوں کی تسکین بھی ہے کہ وہ سمجھ لیں کہ یہ ہٹ دھرم اور کینہ پرور دشمن خدا کی قدرت کے چنگل سے کبھی فرار نہیں کر سکیں گے اور یہ ان لوگوں کے لئے خطرہ کی تینہ بھی ہے جو پیغمبر اکرم اور مومنین پر ہر قسم کا ظلم و ستم روا رکھتے تھے۔ انہیں جان لینا چاہیئے کہ وہ لوگ جو ان سے زیادہ صاحب طاقت تھے، ایک تیز آندھی، ایک طوفان، ایک شعلہ اور صیحہ آسمانی کے مقابلہ میں تاب مقاومت نہ لاسکے تو یہ کس طرح سوچتے ہیں کہ اپنے ان غلط اعمال کے باوجود عذابِ الہی سے نجات پاسکیں گے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے آپ فرماتے ہیں: ”جبرائیل امین نے مجھ کو خبر دی ہے کہ جس وقت خداوند و یکتا اولین و آخرین کی مخلوق کو میدانِ حشر میں جمع کرے گا تو جہنم کو لے آئے گا اور پل صراط کو، جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، اس پر رکھ دے۔ اس صراط پر تین پل ہوں گے۔ پہلے پل پر امانت و رست گاری اور رحمت و محبت ہے۔ دوسرے پل پر نماز اور تیسرے پل پر پروردگار عالم کا عدل ہوگا۔ لوگوں کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اس پل پر سے گزریں۔ جنہوں نے امانت اور رحم میں کوتاہی کی ہوگی وہ پہلے پل پر ہی رہ جائیں گے۔ اس سے گزر گئے تو نماز میں کوتاہی کی ہوگی تو دوسرے پل پر ہی رہ جائیں گے اور اگر اس سے بھی گزر گئے تو اپنے راستے کے آخر میں عدل الہی پائیں گے اور ﴿ان ربک لبالمصاد﴾ کے یہی معنی ہیں۔^(۱۱)

حضرت علی علیہ السلام کے ارشادات و کلمات میں ہم پڑھتے ہیں (ولئن امهل الله الظالم فلن يفوٓث اخذه وهو له بالمصاد مجاز طریقہ و بموضع الشجی من مساع ربقہ)

اگر خدا ظالم کو مہلت دے دے تو اس کی سزا ہرگز ختم نہیں ہوگی۔ وہ ستمگاریوں کی گھات میں ہے اور اس طرح ان کے حلق کو اپنے دستِ قدرت میں لئے ہوئے ہے کہ جس وقت چاہے گا اس طرح دبا لے گا کہ اس کا لعاب دہن تک گلے سے نیچے نہیں جاسکے گا۔^(۱۲)

۱۔ تفسیر کشاف، جلد ۴، ص ۷۴۷۔ اس مضمون کو قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح دوسری تفسیروں میں بھی ہے۔

۲۔ پہلی تفسیر کی بناء پر ذات کا مونث ہونا طائفہ و قبیلہ کی بناء پر ہے جو مونث لفظی ہے۔

۳۔ ارم غیر منصرف ہے اسی لئے حالتِ جر میں منصوب ہوتا ہے۔

۴۔ ثمود اہل لغت کے لحاظ سے ثمد (بروزن نمد) اس تھوڑے سے پانی کے معنی میں جس کا کوئی مادہ نہ ہو اور ثمود اس شخص کو کہتے ہیں جس سے زیادہ مال کا مطالبہ کریں، اتنی مقدار جس سے اس کے مال میں نقص پیدا ہو جائے، بعض اس لفظ کو عجمی کہتے ہیں۔ مفردات راغب۔

۵۔ جابو الصخر بالواد میں باء بظاہر ظرفیت کے معنی رکھتا ہے۔

۶۔ روح البیان، جلد ۲ ص ۴۲۵۔

۷۔ علل الشرائع نور الثقلین کی نقل کے مطابق جلد ۵، ص ۵۷۱ حدیث ۶

۸۔ »نہج البلاغہ«، خطبہ ۱۶۔

۹۔ مجمع البیان، جلد ۴۸۷۔

١٠- مجمع البيان، جلد ٤٨٧-

١١- روضه كافي مطابق نقل نور الثقلين، جلد ٥، ص ٥٧٣-

١٢- نهج البلاغه خطبه ٩٧-

آیات ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰

۱۵۔ ﴿فَإِذَا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَ نَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّيَ أَكْرَمَنِ﴾۔

۱۶۔ ﴿وَ اِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّيَ أَهَانَنِ﴾۔

۱۷۔ ﴿كَأَلَّا بِلْ تَكْرَمُونَ الْيَتِيمَ﴾ ۱۸۔ ﴿وَ لَا تَحْضُونْ عَلَىٰ طَعَامِ الْمَسْكِينِ﴾۔

۱۹۔ ﴿وَ تَاْكُلُونَ الثَّرَاثَ أَكْلًا لِّمًا﴾ ۲۰۔ ﴿وَ تَحْبِرُونَ الْمَالَ حَبًّا جَمًّا﴾۔

ترجمہ

۱۵۔ لیکن انسان کو خدا جس وقت آزمائش کے لئے عزت دیتا ہے (اس کا اکرام کرتا ہے) اور نعمت بخشتا ہے تو (مغرور ہو جاتا ہے) اور کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے میرا اکرام کیا ہے۔
۱۶۔ لیکن جب امتحان کے لئے اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے اور کہتا ہے میرے پروردگار نے مجھے ذلیل و خوار کیا ہے۔

۱۷۔ ایسا نہیں ہے جیسا تم نے خیال کیا ہے بلکہ تم یتیموں کا احترام نہیں کرتے۔

۱۸۔ اور ایک دوسرے کو مساکین و فقراء کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتے۔

۱۹۔ اور میراث کو جائز و ناجائز طریقہ سے جمع کر کے کھاتے ہو۔ ۲۰۔ اور مال و دولت کو بہت دوست رکھتے ہو۔

نہ اس کی نعمت کے ملنے پر غرور کرو اور نہ سلب نعمت پر مایوس ہو

گزشتہ آیات کے بعد جو سرکشی کرنے والوں کو خبردار کر رہی تھیں اور انہیں خدا کے عذاب سے ڈرا رہی تھیں، زیر بحث آیات میں مسئلہ امتحان کو پیش کرتا ہے جو ثواب اور عقاب الہی کا معیار ہے اور انسانی زندگی کا اہم مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

لیکن انسان، جس وقت اس کا پروردگار اور اس کی آزمائش کے لئے اس کا اکرام کمرے اور نعمت بخشے، تو مغرور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے عزت دی ہے ﴿فَإِذَا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَ نَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ﴾ وہ نہیں جانتا کہ خدائی آزمائش کبھی نعمت کے ذریعہ اور کبھی انواع و اقسام کی مصیبتوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ نہ نعمت کا حصول سبب غرور بننا چاہیئے اور نہ مصائب مایوسی اور ناامیدی کا سبب بنیں۔ لیکن یہ کم ظرف انسان دونوں

حالتوں میں مقصد آزمائش کو بھول جاتا ہے، نعمت کے ملنے کے وقت اس طرح خیال کرتا ہے کہ وہ مقرب بارگاہ خدا ہو گیا اور یہ نعمت اس قرب کی دلیل ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ابتداء میں کہتا ہے کہ خدا اسے مورد اکرام قرار دیتا ہے۔ لیکن آیت کے ذیل میں ہے کہ انسان خود کو مورد اکرام خدا دیکھتا ہے۔ اس کی مذمت ہو رہی ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ پہلا اکرام انعام ہی کے معنی میں ہے اور دوسرا اکرام بارگاہ خدا کے قرب کے معنی میں ہے، لیکن جس وقت امتحان لینے کے لئے اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

”میرے پروردگار نے مجھے ذلیل و خوار کر دیا ہے“ ﴿و اما اذا ما ابتلاه فقدر عليه رزقه فيقول اهان﴾ ناامیدی اسے ہر طرف سے گھیر لیتی ہے اور وہ اپنے پروردگار سے رنجیدہ و ناخوش ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے غافل ہے کہ یہ سب چیزیں تو اس کی آزمائش اور امتحان کے ذرائع ہیں۔ وہ امتحان جو انسان کی پرورش اور ارتقاء کی رمز ہے اور اس کے استحقاقِ ثواب کا سبب اور مخالفت کی صورت میں استحقاقِ عذاب کا باعث ہے۔

یہ دونوں آیتیں خبردار کرتی ہیں کہ نہ تو نعمت کا ورود تقرب خدا کی دلیل ہے اور نہ اس کا سلب ہو جانا حق سے دوری کی دلیل۔ یہ تو امتحان کی مختلف صورتیں ہیں کہ خدا اپنی حکمت کے مطابق ہر گروہ کی کسی چیز سے آزمائش کرتا ہے۔ یہ کم ظرف انسان ہیں کہ جو کبھی مغرور ہو جاتے ہیں اور کبھی مایوس ہو جاتے ہیں۔

سورہ حم سجدہ کی آیت ۵۱ میں بھی آیا ہے:

﴿و اذا انعمنا على الانسان اعرض و نا بجانبه و اذا مسه الشر فذود دعاء عريضا﴾۔

جس وقت ہم کسی انسان کو نعمت دیتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے اور تکبر کمرے کے حق سے دور ہو جاتا ہے، لیکن جب اسے تھوڑی سی تکلیف پہنچے تو ہمیشہ دعا کرتا ہے اور بے تابی دکھاتا ہے۔ اسی سورہ ہود کی آیت ۹ میں آیا ہے ﴿ولئن اذقنا الانسان منا رحمة ثم نزعنا ها منه انه لى و س كفور﴾۔

جس وقت ہم انسان کو رحمت کا ذائقہ چکھائیں اور اسے چھین لیں تو ناامید و ناشکرا ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں آیتیں علاوہ اس کے کہ خدا کی آزمائش کے مسئلہ کو مختلف طریقوں سے بیان کرتی ہیں، یہ نتیجہ بھی بخشی ہیں کہ نعمت سے بہرہ ور ہونا یا اس سے محروم ہونا قربِ خدا یا دوری پروردگار کی دلیل نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ اور ہر جگہ ایمان و تقویٰ کا معیار ہے۔

کتنے یتیم بچے تھے جو اس دنیا میں انواع و اقسام کے مصائب میں مبتلا رہے۔ ان کے مقابلہ میں کتنے کافر تھے جو گونا گونا گون نعمتوں سے بہرہ مند تھے۔ دنیا کی زندگی کا مزاج و طبیعت یہی ہے۔ اس آیت کے ضمن میں پروردگار عالم ابتلائات اور درد ناک حوادث کے فلسفہ کی طرف ایک سر بستہ اور جمالی اشارہ بھی کرتا ہے۔ اس کے بعد ان اعمال کی تشریح کرتا ہے جو خدا سے دوری اور عذاب الہی کے چنگل میں پھنسنے کا موجب ہیں۔ فرماتا ہے:

”ایسا نہیں ہے جیسا تم خیال کرتے ہو (کہ تمہارے اموال پروردگار کے نزدیک تمہارے قرب منزلت کی دلیل ہیں، بلکہ تمہارے اعمال تو تمہاری خدا سے دوری کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں) ”تم تو یتیموں کا احترام نہیں کرتے“ ﴿کَلَّا بَلْ لَا تَكْرَمُونَ الْيَتِيمَ﴾۔ ”اور ایک دوسرے کو فقراء و مساکین کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتے“۔ ﴿وَلَا تَخَاضُّونَ عَلٰی طَعَامِ الْمَسْكِينِ﴾۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یتیموں کو کھانا کھلانے کی بات نہیں کرتا، بلکہ اکرام و احترام کی بات کرتا ہے۔ اس کے لئے یتیموں کے سلسلہ میں صرف بھوک کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا بلکہ اسے احترام سے محرومی کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور وہ یہ احساس کمرنے لگتا ہے کہ چونکہ اس کا باپ مر گیا ہے، لہذا وہ ذلیل و خوار ہو گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی عزت کی جائے تاکہ وہ باپ کے نہ ہونے کا احساس نہ کرے۔

اسی لئے اسلامی روایات میں یتیموں سے محبت اور ان پر نوازش کرنے کے مسئلہ کو ایک خاص اہمیت دی گئی ہے، ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ﴿مَامَنْ عَبْدٌ يَمْسَحُ يَدَهُ عَلَى رَأْسِ يَتِيمٍ رَحْمَةً لَهُ إِلَّا أَعْطَاهُ اللَّهُ بِكُلِّ شَعْرَةٍ نُورًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ کوئی شخص کسی یتیم کے سر پر دست شفقت نہیں پھیرتا مگر یہ کہ خدا ان بالوں کی تعداد کے برابر جو اس کے ہاتھ کے نیچے آتے ہیں، قیامت میں اسے نور بخشے گا۔^(۱)

سورہ ضحٰی کی آیت ۹ میں بھی آیا ہے ﴿فَإِمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ ”باقی رہا یتیم تو اسے مورد قہر و تحقیر قرار نہ دے“ یہ بالکل اس چیز کے مقابلہ میں ہے جو ایمان و اخلاق سے دور کل کے دور جاہلیت کے معاشرہ کی طرح آج کے معاشرہ میں بھی رواج رکھتی ہے کہ یتیموں کے مال کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے اپنی ملکیت بنایا جاتا ہے اور اس یتیم کو اس طرح تنہا چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ باپ کی غیر موجودگی کا دکھ تلخ ترین شکل میں محسوس کرتا ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یتیموں کا اکرام ان کے مال کی حفاظت تک محدود نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے، بلکہ اس کے ایک واضح، صاف اور وسیع معنی ہیں جو مال کی حفاظت اور دوسرے امور دونوں کے متقاضی ہیں۔ ”تخاضون“ (۲)

کا جملہ حض کے مادہ سے تحریر و ترغیب کے معنی میں ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ صرف مسکین کو کھانا کھلانا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ لوگ ایک دوسرے کو اس کا رخیر کے سلسلہ میں شوق دلائیں تاکہ یہ طریق کار معاشرہ کی فضا میں وسعت پیدا کرے تعجب کی بات یہ ہے کہ سورہ حاقہ کی آیت ۳۳-۳۴ میں اس موضوع کو خداوند عظیم پر ایمان نہ لانے کے برابر بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿انه كان لا يو من بالله العظيم و الا يحض على طعام المسكين﴾ وہ خدا نے عظیم پر ایمان نہیں رکھتا اور دوسروں کو مسکین کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتا۔ (۳)

اس کے بعد اس کے تیسرے غلط کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں موردِ مذمت و ملامت قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے: ”تم میراث کو (حلال و حرام طریقہ سے جمع کر کے کھا جاتے ہو۔ ﴿و تأکلون التراث اکلاً﴾۔ (۴)

اس میں شک نہیں کہ اس مال کا کھانا، جو شرعی میراث کے طور پر کسی شخص کو پہنچے، برا نہیں ہے۔ اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں اس کام کی مذمت ہو سکتا ہے کہ ذیل کے امور میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ ہو۔

پہلی یہ کہ اپنے اور دوسروں کے حق کو جمع کر لیتا ہو، اس لئے کہ ”لم“ کا لفظ اصل میں جمع کے معنی میں ہے اور بعض مفسرین مثلاً زمخشری نے کشاف میں خصوصیت سے اس کی حرام و حلال کے درمیان جمع کرنے سے تفسیر کی ہے۔ خصوصاً زمانہ جاہلیت کے عربوں کی حالت یہ تھی کہ وہ عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم کر دیتے تھے اور ان کا حق خود لے لیتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ میراث انہیں ملنی چاہیے جو جنگوں ہوں (اس لئے ان کے ہاتھ جو اموال لگتے تھے ان میں سے بہت سے مال وہ ہوتے تھے جو غارتگری کے نتیجے میں حاصل ہوتے تھے) لہذا وہ صرف ان لوگوں کو حقدار سمجھتے تھے جو غارتگری کے قابل ہوں۔

دوسرے یہ کہ جب میراث تم تک پہنچتی ہے تو تم فقیر و مسکین، عزیزوں اور رشتہ داروں اور معاشرہ کے محروم افراد پر بالکل خرچ نہیں کرتے اور جب تم میراث کے مال کے ساتھ، جو بغیر کسی زحمت و تکلیف کے تمہارے ہاتھ آتا ہے۔ اس طرح کرتے ہو تو یقیناً اپنے کمائے ہوئے مال کے بارے میں تو تم زیادہ بخیل اور سخت ہو گے، جو بہت بڑا عیب

ہے۔

تیسرے یہ کہ میراث اور چھوٹے بچوں کے حقوق کھانا ہے، اس لئے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بے ایمان افراد، اور وہ جو کسی قانون کے پابند نہیں ہوتے، جب میراث کا مال ان کے ہاتھ لگ جائے تو وہ یتیم اور چھوٹے بچوں کا کوئی لحاظ نہیں کرتے اور چونکہ وہ یتیم اور چھوٹے بچے اپنے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتے، لہذا بے ایمان لوگ اس مال سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ قبیح ترین شرمناک ترین گناہ ہے۔ ان تینوں تفسیروں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔ (۵)

”اور تم دولت و ثروت کو زیادہ عزیز رکھتے ہو“ ﴿وَتَحْبُونَ الْمَالَ حَبًّا جَمًّا﴾ (۶)

تم دنیا پرست اور مال و متاع دنیا کے عاشق افراد ہو اور یقیناً وہ شخص جو مال دنیا سے ایسا لگا ورکھے وہ اس کے جمع کرنے کے وقت جائز و ناجائز، حلال و حرام کا خیال نہیں رکھتا۔ اس قسم کا شخص حقوق الہی کو بالکل تسلیم نہیں کرتا، یا ان میں کمی کا مرتکب ہوتا ہے، جس شخص کو حب دنیا نے گھیر رکھا ہو، اس کے دل میں یاد خدا کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

اس طرح نعمت و بلا کے ذریعہ انسانوں کی آزمائش کے ذکر کے بعد چار ایسی اہم آزمائشوں کی طرف متوجہ کرتا ہے جن کے بارے میں یہ مجرم گروہ ناکام ہو کر مردود ہوا تھا: یتیموں کے بارے میں یہ آزمائش، مسکینوں کو کھانا کھلانے آزمائش، میراث کے حصوں کی جائز و ناجائز طریقہ سے جمع کرنے کی آزمائش اور آخر میں بغیر کسی قید و شرط کے اموال جمع کرنے کی آزمائش۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ تمام آزمائشیں مالی پہلو رکھتی ہیں، واقعی اگر کوئی شخص مالی آزمائشوں سے عہدہ برآمد ہو جائے تو پھر اس کے لئے دوسری آزمائشیں آسان ہو جائیں گی۔ یہ دنیا کا مال ہی ہے جو مشہو قول ”ایمان فلک دادہ بباد“ کے مطابق دنیا میں

ایمان کو خراب کر دیتا ہے۔ آدم کے بیٹے کی عظیم ترین لغزشیں اسی شعبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو مال کے ایک حد تک تو امین ہیں، لیکن جب ان کا پیمانہ پر ہو جائے اور وہ اس حد سے گزر جائیں تو شیطانی وسوسے انہیں خیانت کی طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ سچے مومنین وہ ہیں جو امانت اور صحتِ عمل کا خیال دوسروں کے واجب و مستحب حقوق کے سلسلہ میں مال کی ہر حد میں بغیر کسی قید و شرط کے رکھتے ہیں۔ اس قسم کے افراد کو ایمان اور تقویٰ زیب نہیں دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ جو افراد ہر حالت میں اور مال کی ہر مقدار کے سلسلہ میں امتحان و آزمائش سے عہدہ برا ہو سکیں، وہ قابلِ اعتماد، متقی، پرہیزگار اور عمدہ شخصیت کے حامل ہوتے ہیں اور بہترین دوست و احباب شمار ہو سکتے ہیں۔ وہ دوسرے

معاملات میں بھی (عام طور پر) پاک اور عمدہ افراد ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات جو مالی آزمائشوں تک محدود ہیں وہ اسی وجہ سے ہیں۔

۱۔ بخار الانوار، جلد ۱۵، ص ۱۲۰ (چاپ قدیم)۔

۲۔ تحاضون اصل میں تحاضون تھا جس کی ایک تاء تخفیف کے لئے حذف ہو گئی۔

۳۔ طعام اس آیت میں اور زیر بحث آیت میں مصدری معنی رکھتا ہے اور اطعام (کھانا کھلانے) کے معنی میں ہے۔

۴۔ ”لم“ کے معنی جمع کرنا ہیں اور کبھی ایسا جمع کرنا جس میں اصلاح کا مقصد بھی کارفرما ہو، اس کے معنی میں آتا ہے۔

۵۔ تراث اصل میں وارث (تراث ہی وزن پر) تھا اس کی واو تائیں تبدیل ہو گئی ہے۔

۶۔ جم جیسا کہ مصباح اللغۃ اور مقامیس میں آیا ہے کہ کثیر اور فراوان کے معنی میں اور جتہ برون جنہ سے کے آگے کے جمع شدہ بالوں کے معنی میں ہے۔

آیات ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶

۲۱۔ ﴿كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾ - ۲۲۔ ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾۔

۲۳۔ ﴿وَجِئْنَا يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى﴾۔

۲۴۔ ﴿يَقُولُ لِيَلَيْتَنِي قَدِمْتُ لِحَيَاتِي﴾ - ۲۵۔ ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَ أَحَدٍ﴾ - ۲۶۔ ﴿وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ﴾۔

ترجمہ

۲۱۔ ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں جس دن زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔

۲۲۔ اور تیرے پروردگار ک افراں پہنچے گا اور ملائکہ صف بہ صف ہوں گے۔

۲۳۔ اور اس دن جہنم کو حاضر کریں۔ جی ہاں! اس دن انسان متذکرہ ہوگا، لیکن کیسا فائدہ اس لئے کہ یہ تذکر اس کے لئے سود مند نہیں ہوگا۔

۲۴۔ وہ کہے گا کاش اس زندگی کے لئے میں نے کوئی چیز بھیجی ہوتی۔

۲۵۔ اس دن کوئی بھی اس جیسا عذاب نازل نہیں کمرے گا۔ ۲۶۔ اور کوئی شخص اس کی طرح کسی کو قید و بند میں نہیں جکڑے گا۔

اس دن بیدار ہوں گے کہ جب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوگا۔

ان مذمتوں کے بعد جو گزشتہ آیات میں سرکشی کرنے والوں، دنیا پرستوں اور دوسروں کے حقوق پر ہاتھ صاف کرنے والوں کی ہوئی تھیں، ان آیات میں انہیں خطرے سے آگاہ کرتا ہے کہ آخر کار قیامت آنے والی ہے اور حساب و کتاب اور جزا و سزا کا مرحلہ درپیش ہے۔ ضروری ہے کہ آپ خود کو اس کے لئے تیار کریں۔ پہلے فرماتا ہے:

ایسا نہیں ہے جیسا وہ گمان کرتے ہیں (حساب و کتاب نہیں ہے اور اگر خدا نے انہیں مال دیا ہے تو ان کے احترام و اکرام کی وجہ سے دیا ہے، نہ کہ آزمائش و امتحان کے لئے (کلا)۔

جس وقت زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی (اذا دکت الارض دکا دکا) دک اصل میں نرم و صاف زمین کے معنی میں ہے۔ پھر اونچی جگہ اور عمارتوں کے لئے کوٹنے اور ریزہ ریزہ کرنے اور صاف کرنے پر اطلاق ہوا ہے۔ ”دکان“ اس جگہ کو کہتے ہیں جو صاف اور نشیب و فراز کے بغیر ہو۔ ”دک“ (چبوترا) اس اونچی جگہ کو کہتے ہیں جسے بیٹھنے کے لئے صاف اور تیار کرتے ہیں۔ ”دک“ کی تکرار مندرجہ بالا آیت میں تاکید کے لئے ہے۔

مجموعی طور پر یہ تاکید دنیا کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے زلزلوں اور جھنجھوڑ دینے والے حوادث کی طرف اشارہ ہے۔ موجودات میں اس قسم کا زلزل رونما ہوگا کہ پہاڑ ریزہ ریزہ اور زمینیں ہموار ہو جائیں گی، جیسا کہ سورہ طہ کی آیت ۱۰۵ سے ۱۰۷ تک آیا ہے:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا﴾

تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دے میرا پروردگار انہیں برباد کر دے گا اور اس کے بعد زمین کو صاف و ہموار اور بے آب و گیاه کر دے گا، اس طرح کہ تو اس میں کسی طرح کا نشیب و فراز نہیں دیکھے گا۔ قیامت کے پہلے مرحلہ کے اختتام، یعنی اس جہاں کی ویرانی کے بعد، دوسرا مرحلہ شروع ہوگا۔ سارے انسان زندہ ہو جائیں گے اور عدالت الہی میں ظاہر ہوں گے۔ اس وقت تیرے پروردگار کا فرمان آن پہنچے گا۔ فرشتے صف در صف حاضر ہوں گے ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾۔ محشر میں موجود لوگوں کا محاصرہ کر لیں اور فرمان حق کے اجراء کے لئے آمادہ ہوں گے۔

یہ تصویر کشی اس عظیم دن کی عظمت اور عدالت کے چنگل سے انسان کے فرار کرنے کی توانائی نہ ہونے کی ہے۔ جاء ربك (تیرا پروردگار آئے گا) کی تعبیر اس حقیقت کا کنایہ ہے کہ مخلوقات کے حساب و کتاب کا فرمان پہنچے گا۔ یا پھر خدا کی عظمت کی علامتوں کا ظہور مراد ہے، یا پروردگار کے ظہور سے مراد اس دن اس کی معرفت کا ظہور ہے، اس طرح سے کہ کسی شخص کے لئے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ گویا سب لوگ اپنی آنکھوں سے اس کی ذات بے مثال کے جمال کا مشاہدہ کریں گے۔ بہر حال مسلم ہے کہ خدا کا آنا، اس لفظ کے حقیقی معنی جن کا لازمہ جسم ہے اور کسی مکان میں منتقل ہونا ہے، کوئی امکان نہیں رکھتے اور وہ مراد نہیں رہی اس لئے کہ خدا جسم اور خواص جسم سے مبرا ہے۔^(۱)

یہی مفہوم بڑی صراحت کے ساتھ ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا سے منقول ہے۔^(۲)

اس تفسیر کی شاہد سورہ نحل کی آیت ۳۳ ہے جس میں فرماتا ہے:

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْتِيهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيهِمْ أَمْرٌ رَّحِيمٌ﴾ کیا وہ اس کے علاوہ توقع رکھتے ہیں کہ فرشتے ان کے پاس آئیں یا

تیرے پروردگار کا امر آن پہنچے؟ صفا کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ملائکہ محشر میں مختلف صفوں میں وارد ہوں گے۔

احتمال ہے کہ ہر آسمان کے فرشتے ایک الگ صف میں حاضر ہوں گے اور اہل محشر کے گرد گھیرا ڈال دیں گے اس کے بعد فرماتا ہے:

”اور اس دن جہنم کو لے آئیں گے، اس دن انسان متذکر ہوگا لیکن اس کو اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا“
 ﴿وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَ أُنِّي لَهُ الذِّكْرُ﴾۔ اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم جلانے کے قابل ہے اور اسے لاکر مجرموں کے قریب کر دیا جائے گا، جیسا کہ جنت کے بارے میں بھی سورہ شعراء کی آیت ۹۰ میں ہم پڑھتے ہیں (و ازلفت الجنة للمتقين) جنت پر ہیزگاروں کے نزدیک کر دی جائے گی۔
 اگر مفسرین مائل ہیں کہ ان الفاظ کو مجازی معنوں پر محمول کریں اور جنت و جہنم کے نیکو کاروں اور بدکاروں کے سامنے ظہور کا کنایہ سمجھیں، لیکن اس خلاف ظاہر کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ بہتر ہے کہ انہیں اس کے ظاہر پر چھوڑ دیا جائے، اس لئے کہ عرصہ محشر کی حقیقتیں ہم پر مکمل طور پر واضح نہیں ہیں اور وہاں کے حالات ہماری دنیا کے حالات سے بہت مختلف ہیں۔ پھر اس کا کوئی مانع نہیں ہے کہ اس روز دوزخ و جنت کو اسن کی جگہ سے ہٹائیں گے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے ہمیں ملتا ہے کہ جس وقت مندرجہ بالا آیت ﴿وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ﴾ نازل ہوئی تو آپ کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا۔ یہ حالت اصحاب پر گمراہ گزری۔ وہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس آئے اور ماجرا بیان کیا۔ حضرت علی علیہ السلام آئے اور پیغمبر اسلام کے دونوں شانوں کے درمیان بوسہ دیا اور کہا:
 ”اے خدا کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں۔ کیا حادثہ رونما ہوا ہے؟“
 آپ نے فرمایا: ”جبرائیل آئے تھے اور یہ آیت تلاوت کی ہے۔“

حضرت علی علیہ السلام کہتے ہیں: ”میں نے عرض کیا کس طرح جہنم کو لے آئیں گے؟“
 فرمایا: ”ستر ہزار فرشتے ستر ہزار مہاروں کے ذریعہ اسے کھینچ کر لائیں گے اور وہ سرکشی کی حالت میں ہوگی۔ اگر اس کو چھوڑ دیں تو وہ سب کو آگ لگا دے گی، پھر میں جہنم کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا اور وہ کہے گی: اے محمد مجھے آپ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ خدا نے آپ کا جسم مجھ پر حرام کیا ہے۔“

اس دن ہر شخص اپنی فکر میں ہوگا لیکن جناب سید المرسلین کہیں گے: ”رب امتی رب امتی“ (پروردگار میری امت،

جی ہاں! جب مجرم انسان ان مناظر کو کو دیکھے گا تو ہل جائے گا اور غم و اندوہ میں ڈوب جائے گا، اپنے ماضی پر نگاہ ڈالے گا اور اپنے اعمال سے سخت پشیمان ہوگا، لیکن یہ پشیمانی اس کو کوئی فائدہ نہ دے گی، انسان آرزو کرے گا کہ واپس پلٹ جائے اور اپنے تاریک ماضی کی تلافی کرے، لیکن واپسی کے دروازے بالکل بند ہوں گے وہ چاہے گا کہ توبہ کرے لیکن توبہ کا زمانہ ختم ہو گیا ہوگا وہ چاہے گا کہ اعمال صالح بجالائے تاکہ اپنے برے اعمال کی تلافی کر سکے، لیکن اعمال کا دفتر بند ہو چکا ہوگا، یہ وہ مقام ہے جہاں اس کی فریاد بلند ہوگی اور وہ کہے گا: ”اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لئے اعمال صالح بھیجے ہوتے“ ﴿یقول یا لیتنی قدمت لحياتي﴾۔

قابل توجہ یہ ہے کہ یہ نہیں کہے گا کہ اپنی آخرت کی زندگی کے لئے، بلکہ کہے گا اپنی زندگی کے لئے، گویا زندگی کا لفظ آخرت کی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کے لئے موزوں نہیں ہے، اور جلدی گزرنے والی، انواع و اقسام کے مصائب کی آمیزش رکھنے والی دنیاوی زندگی شمار ہی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیت ۶۴ میں ہم پڑھتے ہیں ﴿وما لهذا الحيوة الدنيا لهو لعب و انّ الدار الآخرة لهي الحيوان لو كانوا يعلمون﴾ ”یہ دنیا کی زندگی کھیل کود اور لہو لعب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور حقیقی زندگی آخرت کی زندگی ہے اگر تم جانتے ہو“۔

جی ہاں! وہ لوگ جنہوں نے یتیموں کا مال کھایا، بھوکوں کے منہ لقمہ نہیں دیا، ان کا مال و میراث غارت کیا اور مال دنیا کی محبت نے ان کے دل کو مسخر کر رکھا تھا، وہ اس دن آرزو کریں گے کہ کاش کوئی چیز آخرت کی زندگی کے لئے، جو حقیقی اور جاودان زندگی ہے، ہم نے آگے بھیجی ہوئی، لیکن یہ آرزو بے نتیجہ ہوگی۔

اس کے بعد دو مختصر جملوں میں اس دن کے عذاب کے شدت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اس دن خدا اس قسم کی سزا دے گا کہ اس جیسی سزا کوئی بھی نہیں دے سکے گا“ ﴿فیو معذ لا يعذب عذابه احد﴾۔

جی ہاں! یہ سرکش جو اپنی قوت کے وقت بدترین جرائم اور گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں، اس دن ان کو اس قسم کی سزا ملے گی جو اس سے پہلے کسی کو نہیں ملی ہوگی، جیسا کہ نیکو کار اس قسم کی جزا پائیں گے جو کسی کے خیال و گمان میں بھی نہیں گزری ہوگی، اس لئے کہ خدا ارحم الراحمین بھی ہے اور اشد العاقبین بھی۔ نیز اس دن کوئی بھی خدا کی طرح کسی کو قید و بند کی سزا نہیں دے گا۔

﴿ولا یوثق وثاقه احد﴾۔ نہ اس کی قید بند و زنجیر کی کوئی مثال ہے، نہ اس کے عذاب کی کوئی مثل و نظیر ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ انہوں نے اس دنیا میں خدا کے مظلوم بندوں کو جتنا ان سے ممکن تھا قید و بند میں رکھا اور ان کو سخت تکالیف پہنچائیں۔

۱۔ فخر رازی اپنی تفسیر میں کہتا ہے کہ آیت میں کچھ محذوف ہو سکتا ہے کہ لفظ امر یا قہر جلائل آیات یا ظہور معرفت ہو۔ دوسرے مفسرین نے بھی ان چار الفاظ میں سے خصوصاً پہلے لفظ کو تقدیر آیت کے عنوان سے بیان کیا ہے۔

۲۔ تفسیر المیزان، جلد ۲۰ ص ۴۱۶۔

۳۔ مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۸۳۔ ان معنی کے قریب نیز تفسیر در المنثور میں آیا ہے، المیزان کی نقل کے مطابق جلد ۲۰، ص ۴۱۵۔

آیات ۲۴، ۲۸، ۲۹، ۳۰

۲۷۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ﴾ - ۲۸۔ ﴿ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مَُّرْضِيَةً﴾ -

۲۹۔ ﴿فَادْخُلِي فِي عِبَادِي﴾ - ۳۰۔ ﴿وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ -

ترجمہ

۲۷۔ تو اے سکون و اطمینان یافتہ نفس -

۲۸۔ اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جا، اس حالت میں کہ تو بھی اس سے راضی ہے اور وہ بھی تجھ سے راضی ہے -

۲۹۔ اور میرے بندوں کی صف میں داخل ہو جا - ۳۰۔ اور میری جنت میں وارد ہو جا -

اے صاحب نفس مطمئنہ!

اس وحشتناک عذاب کے تذکرے کے بعد جو سرکشوں اور دنیا پرستوں پر قیامت میں نازل ہوگا، زیر بحث آیات میں اس کے برعکس، جو صورت حال ہے اس کو پیش کرتا ہے، اب نفس مطمئنہ اور ان مومنین کی طرف جو ان عظیم طوفانوں میں مکمل سکون و اطمینان سے بہرہ ور رہے، متوجہ انہیں نہایت لطف و محبت سے مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”اے نفس مطمئنہ!“ ﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ﴾ - اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ، اس حالت میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے - ﴿ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مَُّرْضِيَةً﴾ - ”اور میرے بندوں کی صف میں داخل ہو جا“ - ﴿فَادْخُلِي فِي عِبَادِي﴾ - ”اور میری جنت میں داخل ہو جا“ - ﴿وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ - کیا ہی پرکشش، دل خوش کن اور روح پرور تعبیریں ہیں، جن سے لطف و صفا اور اطمینان کی خوشبو آتی ہے -

پروردگار کی دعوت مستقیم ایسے نفوس کے لئے، جو ایمان کے سائے میں اطمینان و سکون کی حالت میں پہنچے ہوئے ہیں، انہیں اپنے پروردگار، اپنے مالک و مربی اور مصلح کی طرف بازگشت کی دعوت دیتا ہے، ایسی دعوت جو طرفین کی رضامندی لئے ہوئے، دلدادہ عاشق کی رضامندی معشوق کے لئے اور محبوب و معبود حقیقی کی رضامندی - اس کے بعد افتخارِ عبودیت کا تاج اس کے سر پر رکھنا اور لباسِ زندگی سے اسے مفتخر کرنا اور اپنے خاصانِ بارگاہ کی مسلک میں انہیں پرونا اور جگہ دینا -

اس کے بعد انہیں جنت میں ورود کی دعوت دینا اور وہ بھی ”میری جنت میں داخل ہو جا“ کی تعبیر کے ساتھ جو بتاتی ہے کہ اس مہمان کا میزبان صرف اور صرف خدا کی ذات پاک ہے۔ عجیب دعوت، عجیب مہمان اور عجیب میزبان ہے۔

نف سے مراد وہی انسان ہے اور مطمئنہ کی تعبیر اس سکون و اطمینان کی طرف اشارہ ہے جو ایمان کے چرتو کے سائے میں پیدا ہوا ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ﴿الابذكر الله تطمئن القلوب﴾ ”جان لو کہ صرف اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے“۔ (رعد- ۲۸) اس قسم کا نفس اللہ کے وعدوں پر بھی اطمینان رکھتا ہے اور جو راہ اس نے اختیار کی ہے اس پر بھی مطمئن ہوتا ہے۔ دنیا اس کی طرف بڑھے، تب بھی اور اس سے منہ موڑے تب بھی، طوفان میں بھی اور حوادث و بلا میں بھی، اور سب سے بالاتر خوف و وحشت اور قیامت کے عظیم اضطراب میں بھی۔

پروردگار کی طرف بازگشت سے مراد، مفسرین کی ایک جماعت کے نظریہ کے مطابق، اسکے ثواب و رحمت کی طرف بازگشت ہے، یعنی اس کے جوار قرب میں جگہ پانا، معنوی و روحانی بازگشت پانا کہ مادی و جسمانی۔ کیا پروردگار کی طرف یہ بازگشت صرف قیامت میں ہوگی یا جان دینے والے عمر کے لمحات کے ختم ہونے سے متعلق ہے؟ آیات کا سیاق تو البتہ قیامت

سے مربوط ہے، اگرچہ اس آیت کی تعبیر مطلق و وسیع ہے، راضیہ کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ ثواب خداوندی کے تمام وعدوں کو، اس سے زیادہ کہ جتنا وہ تصور کر سکتا تھا، وہ حقیقی طور پر دیکھے گا اور اس طرح خدا کا فضل و کرم اس کے شامل حال ہوگا کہ وہ جسم رضا بن جائے گا۔ باقی رہا مرضیہ کی تعبیر تو وہ اس بنا پر ہے کہ وہ مورد قبول و رضائے دوست واقع ہوا ہے۔

اس قسم کا بندہ اس طرح کے اوصاف کے ساتھ اور مکمل رضا و تسلیم کے مقام پر پہنچنے کے ساتھ، جس نے عبودیت کی اس حقیقت کو جو معبود کی راہ میں ہر چیز کو چھوڑ دینا ہے، پایا ہے اور اس نے خدا کے بندگان خاص کے دائرہ میں قدم رکھا ہے۔ یقیناً اس کے لئے جنت کے علاوہ کوئی دوسری جگہ نہیں ہے۔

بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ یہ آیتیں سید الشہداء حضرت حمزہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکی ہے، یہ حقیقت میں ایک قسم کی تطبیق ہے، نہ کہ شان نزول، جیسا کہ امام حسین کے بارے میں بھی

ہم نے سورہ کے آغاز میں پڑھا ہے۔ قابل توجہ یہ کہ کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں ہمیں ملتا ہے کہ آپ کے ایک صحابی نے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک مومن اپنی روح کے قبض ہو جانے سے خوش نہ ہو؟ تو آپ نے فرمایا: ”نہیں خدا کی قسم! جب موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے لئے آتا ہے تو ناخوشی و ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔ اس وقت موت کا فرشتہ اس سے کہتا ہے ”اے ولی خدا! پریشان نہ ہو قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد کو مبعوث کیا ہے، میں تجھ پر مہربان باپ سے زیادہ شفیق ہوں ٹھیک طرح سے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھ لے“ وہ دیکھے گا رسول خدا، امیر المومنین حضرت فاطمہ زہرا حسن و حسین اور باقی ائمہ تیرے دوست و محبوب ہیں“ وہ اپنی آنکھوں کو کھولے گا اور دیکھے گا۔ اچانک ایک کہنے والا پروردگار کی طرف سے کہے گا ”﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ﴾“ اے وہ شخص جو حضرت اور ان کے اہلبیت پر ایمان رکھتا ہے، پلٹ آ، اپنے پروردگار کی جانب، اس حالت میں کہ تو ان کی ولایت پر راضی ہے اور وہ اپنے ثواب پر تجھ سے راضی ہیں۔ داخل ہو جا میرے بندوں یعنی محمد اور ان کے اہلبیت کے درمیان اور داخل ہو جا میری جنت میں تو اس موقع پر اس مومن کے لئے کوئی اور چیز زیادہ محبوب نہیں ہوگی۔

وہ چاہے گا کہ جس قدر جلد ہو روح بدن سے رہا ہو اور اس منادی کے ساتھ مل جائے۔“ (۱)
 خداوند! ہمیں اس قسم کے اطمینان و سکون سے مفتخر فرماتا کہ ہم اس عظیم خطاب کے لائق و شائستہ بنیں۔
 پروردگار! اس مقام تک پہنچنا تیرے لطف و کرم کے بغیر ممکن نہیں ہے ہمیں اپنے لطف و کرم سے نواز۔
 خداوند! یقیناً کوئی چیز تیرے کرم سے کم نہیں ہوگی، اگر ہمیں صاحبانِ نفوسِ مطمئنہ میں سے قرار دے ہم پر احسان و کرم فرما۔

بار الہا! ہم جانتے ہیں کہ یہ سکون و اطمینان تیرے ذکر کے سائے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تو ہمیں اپنے ذکر کی خود توفیق عطا فرما۔

آمین یا رب العالمین

سورہ بلد

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس کی بیس آیات ہیں۔

سورہ بلد کی فضیلت اور اس کا مضمون

یہ سورہ مختصر ہونے کے باوجود عظیم حقائق اپنے اندر لئے ہوئے ہے:

۱۔ اس سورہ کے پہلے حصہ میں پر معنی قسموں کے ذکر کے بعد اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ انسان کی زندگی اس عالم میں مشکلات اور تکلیفوں کے ساتھ توأم ہوتی ہے، تاکہ وہ ایک طرف تو اپنے آپ کو مشکلات سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ کرے اور دوسری طرف اس دنیا میں راحت و آرام اور مطلق آسودگی توقع اپنے ذہن سے نکال دے، کیونکہ مطلق آسودگی و راحت تو صرف آخرت کی زندگی میں ہی ممکن ہے۔

۲۔ یہ سورہ دوسرے حصہ میں انسان پر اللہ کی کچھ نعمتوں کو شمار کرتا ہے، اور اس کے بعد ان نعمتوں کے مقابلہ میں اس کی ناشکری اور کفران نعمت کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ اس سورہ کے آخری حصہ میں لوگوں کو دو گروہوں ”اصحاب میمنہ“ اور ”اصحاب مشئمہ“ میں تقسیم کرتا ہے، اور پہلے گروہ (صلح مومنین) کے صفات اعمال کے ایک گوشہ کو اور پھر ان کی سرزنش کو بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد ان کے نقطہ مقابل یعنی کفار و مجرین اور ان کی سرنوشت کو پیش کرتا ہے۔

اس سورہ کی آیات کی تعبیریں بہت ہی قاطع اور دو ٹوک اور چھبھنے والی ہیں، اس کی جملہ بنیاد مختصر اور زوردار ہیں الفاظ بہت ہی موثر اور انتہائی فصیح ہیں، آیات کی صورت اور اس کا مضمون اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ سورہ مکی سورتوں میں سے ہے۔

سورہ بلد کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبر اکرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”من قرأها اعطاه الله الامن من غضبه يوم القيامة“۔

”جو شخص سورہ بلد کو پڑھے گا خدا اسے قیامت میں اپنے غضب سے امان میں رکھے گا۔“ (”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص

نیز ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ :
 ”جو شخص نمازِ واجب میں سورہ ﴿لَا اَقْسَمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ کو پڑھے گا وہ دنیا میں صالحین میں شمار ہوگا اور آخرت میں ایسے لوگوں میں سے پہچانا جائے گا جو بارگاہِ خدا میں مقام و منزلت رکھتے ہیں، اور وہ انبیاء، شہداء اور صلحاء کے دوستوں میں سے ہوگا۔“ (ثواب الاعمال “مطابق نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۷۸)

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

- ۱۔ ﴿لَا اَقْسَمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ - ۲۔ ﴿وَ اَنْتَ حَلَّ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ - ۳۔ ﴿وَ الْوَالِدِ وَ مَا وَلَدَ﴾ -
- ۴۔ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ﴾ - ۵۔ ﴿اَ یَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ﴾ - ۶۔ ﴿یَقُولُ اَهْلَكْتُ مَا لَآ لِبَدَاً﴾ -
- ۷۔ ﴿اَ یَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَوْهُ اَحَدٌ﴾ -

ترجمہ

- شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے
- ۱۔ قسم ہے اس شہر مقدس (مکہ) کی - ۲۔ اور قسم ہے جس میں تو ساکن ہے!
 - ۳۔ اور قسم ہے باپ اور اس کے بیٹے کی (ابراہیم خلیل و اسمعیل ذبیح)۔
 - ۴۔ کہ ہم نے انسان کو تکلیف میں پیدا کیا ہے - (اور اس کی زندگی رنج و الم سے پر ہے)۔
 - ۵۔ کیا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کوئی بھی قدرت نہیں رکھتا؟!
 - ۶۔ وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے بہت سامان (اچھے کاموں میں) تلف کر دیا ہے!
 - ۷۔ کیا وہ گمان کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا - (اور نہ ہی دیکھتا ہے)؟

اس شہر مقدس کی قسم

بہت سے مورد میں قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ اہم حقائق کو قسم کے ساتھ شروع کرتا ہے، ایسی قسمیں جو خود بھی انسانی عقل اور فکر و نظر کے تحرک کا سبب ہوتی ہیں، ایسی قسمیں اس مورد نظر مطلب کے ساتھ ایک خاص رابطہ رکھتی ہیں۔

یہاں بھی اس حقیقت کو بیان کرنے کے لئے کہ دنیا میں انسان کی زندگی دکھ، درد اور رنج و الم کے ساتھ توأم ہے ایک نئی قسم سے قسم کرتا ہے اور فرماتا ہے:

”قسم ہے اس شہر مقدس مکہ کی“ ﴿لَا اَقْسَمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾^(۱)

۱۔ (یہاں ”لا“ زائدہ ہے، جو تاکید کے لئے آیا ہے۔ البتہ ایک دوسری تفسیر کے مطابق احتمال ہے کہ ”لا“ نافیہ ہو) اس سلسلہ میں مزید وضاحت سورہ قیامت کی ابتداء میں دی گئی ہے۔

”وہ شہر کہ جس میں تو ساکن ہے“ ﴿وَ اَنْتَ حَلْ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾۔

اگرچہ ان آیات میں مکہ کا نام صراحت کے ساتھ نہیں آیا، لیکن ایک طرف تو اس سورہ کے مکہ ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور دوسری طرف اس مقدس شہر کی حد سے زیادہ اہمیت کی بنا پر یہ بات واضح ہے کہ اس سے مراد مکہ ہی ہے۔ اور مفسرین کا اجماع بھی اسی پر ہے۔

یقیناً سرزمین مکہ کی شرافت اور عظمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ خدا کی قسم کھائے، کیونکہ توحید اور پروردگار کی عبادت کا پہلا مرکز یہیں بنایا گیا تھا، اور عظیم پیغمبروں نے اس گھر کے گرد طواف کیا ہے۔ لیکن ”و انت حل بھذا البلد“ کا جملہ ایک نئے مطلب کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، جو یہ کہتا ہے کہ یہ شہر تیرے وجود کے فیض و برکت سے اس قسم کی عظمت کا حامل ہو گیا ہے کہ وہ اس قسم کے لائق ہو گیا ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ سرزمینوں کی قدر و قیمت ان میں مقیم انسانوں کی قدر و قیمت کی وجہ سے ہوا کرتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کفار یہ تصور کرنے لگیں کہ قرآن نے جو اس سرزمین کی قسم کھائی ہے تو وہ ان کا وطن ہونے، یا ان کے بتوں کا مرکز ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت کا قائل ہو گیا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اس شہر کی قدر و قیمت (اس کے مخصوص تاریخی حالات سے قطع نظر) خدا کے خاص بندے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود و جود کی بناء پر ہے:

اے کعبہ رازِ یمنِ قدوم تو شرف دی مردہ رازِ مقدمِ پاکِ تو صد صفا

بطحا ز نورِ طلعت تو یافتہ فروغِ یثرب ز خاکِ پائے تو بارونق و نوا

اے وہ کہ تیرے قدومِ میمنت لزوم سے کعبہ کا شرف دوگنا ہو گیا ہے۔

اور تیرے پاک قدم کے آنے سے مروہ کو صفائی حاصل ہو گئی ہے۔

بطحانے تیرے نور کی چمک سے روشنی حاصل کی ہے۔

اور شرب تیرے پاؤں کی خاک کی وجہ سے بارونق اور خوشحال ہو گیا ہے۔

یہاں ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ: ”میں اس شہر مقدس کی قسم کھاتا، جب کہ انہوں نے تیرے احترام کی ہتک کی ہے، اور تیری جان و مال اور عزت و آبرو کو حلال اور مباح شمار کر لیا ہے۔“

اور یہ کفار قریش کے لئے ایک شدید سرزنش اور توبیخ ہے کیونکہ وہ خود کو حرم مکہ کے خادم اور محافظ سمجھتے تھے اور وہ اس سرزمین کے احترام کے اس قدر قائل تھے کہ اگر ان کے باپ کا قاتل بھی اس میں آجاتا تو وہ بھی امان میں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ کہتا کہ جو لوگ مکہ کے درختوں کا چھلکا بھی لے کر اپنے بدن پر باندھ لیتے تھے تو وہ بھی اس کی وجہ سے امان میں ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے بارے میں ان تمام آداب و سنن کو پاؤں تلے کیوں روند ڈالا؟!

اور آپ اور آپ کے اصحاب کے بارے میں ہر قسم کے آزار و اذیت کو جائز کیوں سمجھ لیا یہاں تک کہ ان کے خون کو بھی مباح سمجھنے لگے؟!

یہ تفسیر ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے۔ (”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۴۹۳)

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”قسم ہے باپ اور اس کے بیٹے کی۔ ﴿ووالد وما ولد﴾۔“

اس کے بارے میں کہ اس باپ اور بیٹے سے کون مراد ہے کئی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

پہلی تفسیر یہ کہ ”والد“ سے مراد ”ابراہیم“ اور ولد“ سے مراد اسماعیل ذبیح“ ہیں اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ آیت میں شہر مکہ کی قسم کھائی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کعبہ اور شہر مکہ کی بنیاد رکھنے والے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند اسماعیل علیہ السلام تھے، یہ تفسیر بہت ہی مناسب نظر آتی ہے، خصوصاً زمانہ جاہلیت کے عرب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند کی حد سے زیادہ اہمیت کے قائل تھے، اور ان پر فخر کرتے تھے اور ان میں سے بہت سے اپنا نسب اور ان دونوں تک پہنچاتے تھے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بیٹے ہیں۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت میں سے جو پیغمبر اور انبیاء مبعوث ہوئے وہ مراد ہیں۔ چوتھی تفسیر یہ ہے کہ اس سے ہر باپ اور بیٹا مراد ہیں کیونکہ مختلف زمانوں میں تولد اور نسل انسانی کی بقا کا مسئلہ خلقت کی آفرینش کے حیرت انگیز مسائل میں ہے، اور خدا نے خصوصیت کے ساتھ اس کی قسم کھائی ہے۔

ان چاروں تفسیروں کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے اگرچہ پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔^(۱)

۱۔ بعض تفاسیر میں والد سے مراد امیر المومنین علیہ السلام اور اولاد سے مراد ان کے فرزندان گرامی ہیں، اور شاید وہ جناب اس کے بہترین مصداق ہوں۔ لہذا اس تفسیر کو ذکر کرنا زیادہ مناسب تھا۔ (مترجم)

اس کے بعد اس چیز کو بیان کرتا ہے جو ان قسموں کا اصل مقصد ہے فرماتا ہے: ”یقیناً ہم نے انسان کو رنج و تکلیف میں پیدا کیا ہے، ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ﴾۔

”کبد“ مجمع لایان“ میں طبری کے قول کے مطابق شدت کے معنی میں ہے، اسی لئے جب دودھ گاڑھا ہو جاتا ہے تو اسے ”تکبد اللبن“ کہتے ہیں۔

لیکن ”مفردات“ میں ”راغب“ کے قول کے مطابق ”کبد“ (بروزن حسد) اس درد کے معنی میں ہے، جو انسان کے ”کبد“ (سیاہ جگر) کو عارض ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہر قسم کی مشقت اور دکھ تکلیف کے لئے اطلاق ہونے لگا۔ اس لفظ کی اصل چاہے جو کچھ بھی ہو اس کا اس مقام پر مفہوم وہی رنج اور دکھ درد ہی ہے۔

ہاں! انسان آغاز زندگی سے ہی، یہاں تک کہ اسی لمحہ سے جب اس کا نطفہ قرار گاہ رحم میں واقع ہوتا ہے۔ مشکلات اور درد و رنج کے بہت سے مرحلے طے کرتا ہوا متولد ہوتا ہے اور پیدا ہونے کے بعد بچپن میں، اور اس کے بعد جوانی میں، اور زیادہ بڑھاپے میں، طرح طرح کی زحمتوں، مشقتوں اور تکالیفات سے روبرو ہوتا ہے۔ دنیا کی زندگی کا مزاج یہی ہے اور اس کے علاوہ کوئی توقع رکھنا غلطی ہی غلطی ہے۔ ایک شاعر عرب کے قول کے مطابق:

طبع علی کدر و انت تریدھا صفواً عن الاکدار و الاقدار؟

و مکلف الایام ضد طباعھا متطلب فی الماء جدوة نار؟

جہاں کی طبیعت کدورت اور گندے پن پر ہے اور تو چاہتا ہے کہ ہر قسم کی کدورت اور ناپاکی سے صاف ہو، وہ جو شخص کی مانند ہے جو پانی کی موجوں کے درمیان آگ کا شعلہ طلب کرے۔

انبیاء اور اولیاء اللہ کی زندگیوں کی طرف نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے آفرینش کے ان سرسبد پھولوں کی زندگی بھی انواع و اقسام کے غیر مناسب امور اور درد و تکلیف میں گھری ہوئی تھی۔ جب دنیا کے لئے اس طرح ہے تو دوسروں کے لئے اس کی وضع و کیفیت واضح ہے۔

اور اگر ہمیں کچھ افراد یا معاشرے ایسے نظر آتے ہیں جنہیں بظاہر کوئی دکھ اور تکلیف نہیں ہوتی تو وہ یا تو ہمارے سطحی مطالعہ کی وجہ ایسا دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے جب ہم اور زیادہ نزدیک ہوتے ہیں تو انہیں مرفہ الحال زندگی والوں کی درد و

رنج کے عمق اور گہرائی سے آشنا ہو جاتے ہیں، اور یا پھر وہ ایک محدود مدت اور استثنائی زمانہ کے لئے ہوتا ہے، جو عالم کے قانون کلی کو نہیں توڑتا۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”کیا یہ انسان گمان کرتا ہے کہ کوئی بھی اس پر دست رسی کی قدرت نہیں رکھتا“۔ ﴿ایحسب﴾
ان لن یقدر علیہ احد﴾^(۱)

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کی زندگی کی ان تمام درد، دکھ اور تکالیف کے ساتھ آمیزش اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بالکل کوئی قدرت نہیں رکھتا۔

لیکن غرور و تکبر کے گھوڑے پر سوار ہے اور ہر قسم کے غلط کام گناہ جرم اور حد سے بڑھ جانے کا مرتکب ہوتا رہتا ہے، گویا وہ خود کو امن و امان میں سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو سزاؤں کی قلم رُو سے دور خیال کرتا ہے۔ جب اسے قدرت حاصل ہو جاتی ہے عذاب کے چنگل سے رہائی حاصل کر لے گا؟ کتنا بڑا اشتباہ اور غلط فہمی ہے!

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ دولت مند ہیں جو یہ خیال کرتے تھے کہ کوئی ان کی دولت و ثروت کو ان سے چھین لینے کی قدرت نہیں رکھتا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ تھا کہ ان کے اعمال کی کوئی بھی باز پرس نہیں کرے گا۔ لیکن آیت ایک جامع مفہوم رکھتی ہے جو ان تمام تفاسیر کو شامل ہو سکتی ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اوپر والی آیت قبیلہ ”جمع“ کے ایک شخص کی طرف جس کا نام ”ابو الاسد“ تھا اشارہ ہے وہ اس قدر طاقتور تھا کہ چمڑے کے ایک ٹکڑے پر بیٹھ جاتا تھا اور دس آدمی اسے اس کے نیچے سے کھینچنا چاہتے تھے تو نہیں کھینچ سکتے تھے وہ چمڑا ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا تھا، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا تھا۔ ۲

لیکن آیت کا اس قسم کے مغرور شخص یا اشخاص کے بارے میں بیان اس مفہوم کی عمومیت و وسعت سے مانع نہیں ہے۔ ﴿بقول اهلکت مالا لبداء﴾۔

یہ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ جب انہیں کارِ خیر میں مال صرف کرنے کو کہتے تھے تو وہ غرور و نخوت کی بناء پر یہ کہتے تھے: ہم نے یہ بہت زیادہ مال ان کاموں میں صرف کیا ہے، حالانکہ انہوں نے خدا کی راہ میں کوئی چیز خرچ نہیں کی تھی۔ اور اگر انہوں نے کسی کو مال دیا بھی تھا تو وہ دکھاوے، یا ریاکاری اور شخصی اغراض کی بناء پر تھا۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دشمنی اور اسلام کے برخلاف سازشوں میں صرف کیا تھا اور وہ اس پر فخر کرتے تھے، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جنگِ خندق کے دن جب علی علیہ السلام نے عمر بن عبدود کے سامنے اسلام کو پیش کیا تو اس نے جواب میں کہا: ”فاین ما انفقت فیکم مالاً لبداً“

”پس وہ سارا مال جو میں نے تمہاری مخالفت میں صرف کیا ہے اس کا کیا بنے گا۔“ (۳)

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت ”حارث بن عامر جیسے بعض سردارانِ قریش کے بارے میں ہے، جو ایک گناہ کا مرتکب ہوا تھا۔ اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نجات کے بارے میں پوچھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے کفارہ دینے کا حکم دیا۔ اس نے کہا: جب سے میں دین اسلام میں داخل ہوا ہوں میرا تمام مال و دولت کفاروں اور نفقات میں نابود ہو گیا ہے“

ان تینوں تفاسیر کے درمیان جمع میں کوئی امر مانع نہیں ہے اگرچہ پہلی تفسیر آیت کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ ”اہلکت“ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے اموال در حقیقت نابود ہی ہوئے ہیں، اور اسے ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

”لبد“ (بروزن لغت) تہ بہ تہ اور انبوه کثیر کے معنی میں ہے اور یہاں بہت زیادہ مال کے معنی میں ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”کیا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا، اور نہ ہی دیکھے گا؟!“ ﴿يَحْسِبُ اَنْ اَلَمْ

يَرَهُ اَحَدٌ﴾۔

وہ اس حقیقت سے غافل ہے کہ نہ صرف اس کے ظاہری اعمال کو خلوت و جلوت میں دیکھتا ہے، بلکہ اس کے دل اور روح کی گہرائیوں سے بھی آگاہ ہے، اور اس کی نیتوں سے باخبر ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خدا جس کا غیر متناہی وجود ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے کسی چیز کو نہ دیکھے اور نہ جانے؟ یہ غافل اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے خود کو پروردگار کی دائمی نگرانی ست باہر خیال کر رہے ہیں۔

ہاں خدا کو علم ہے کہ انہوں نے یہ اموال کہاں سے حاصل کئے ہیں اور انہیں کس راہ میں صرف کیا ہے؟! ایک حدیث میں ابن عباس (رض) سے نقل ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

”لا تزول قد ما العبد حتى يسأل عن اربعة: عن عمره فيما افناه و عن ماله من اين جمعه ، و فيما ذا انفقہ؟ و عن عمله ماذا عمل به ؟ و عن حبنا اهل البيت“

”قیامت میں کوئی شخص اپنے قدم سے قدم نہیں اٹھائے گا، مگر یہ کہ چار چیزوں کے بارے میں اس سے سوال ہوگا: اس کی عمر کے بارے میں کہ اسے کس راہ میں فنا کیا، اس کے مال کے بارے میں کہ اسے کہاں سے جمع کیا، کس راہ میں اسے صرف کیا، اور اس کے عمل کے بارے میں کہ اس نے کون کون سا عمل انجام دیا، اور ہم اہل بیت کی محبت و مودت کے بارے میں“^(۵)

اوپر وہ یہ دعویٰ کیسے کرتا ہے کہ میں نے بہت زیادہ مال خدا کی راہ میں خرچ کیا ہے جب کہ وہ اس کی نیت سے آگاہ ہے ، اور ان اموال کے غیر شرعی حصول کی کیفیت سے بھی آگاہ ہے، اور ریاکاری اور مغرضانہ طور پر صرف کرنے کی کیفیت سے بھی باخبر ہے۔

۱۔ ”ان“ اس جملہ میں ”مثقلہ سے مخفف ہے“ اور تقدیر میں ”انه لن يقدر عليه احد“ ہے۔

۲۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۴۹۳۔

۱۰۳۔ حدیث ۵۸۰ ص ۵ جلد الثقلین نور» مسکن الفؤاد»، صفحہ ۱۴۔

۴۔ مجمع البیان جلد ۱۰، ص ۴۹۳۔

۵۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان کس طرح سے مغرور ہو جاتا ہے اور قدرت و طاقت کا دعویٰ کیسے کرتا ہے، حالانکہ اس کی زندگی درد و رنج اور تکلیفات کے ساتھ خمیر ہوئی ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ مال ہے تو ایک رات کے لئے ہے، اور اگر جان رکھتا ہے تو ایک بخاریتک ہے

آنکھ، زبان اور ہدایت کی نعمت

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں سرکشی کرنے والے انسانوں کے غرور و غفلت کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں انسان پر خدا کی اہم ترین مادی و معنوی نعمتوں کا کچھ حصہ بیان کرتا ہے، تاکہ ایک طرف تو اس کے غرور و غفلت کو توڑ دے اور دوسری طرف اسے ان نعمتوں کو خلق کرنے والے میں تفکر اور غور و خوض کرنے پر آمادہ کرے اور اس کے دل و جان کے اندر شکر گزاری کے احساس کو بیدار کر کے اسے خالق کی معرفت کی طرف چلائے۔

پہلے فرماتا ہے: ”کیا ہم نے اس انسان کے لئے دو آنکھیں قرار نہیں دیں“۔ ﴿الْمَجْعَلُ لَهُ عَيْنَيْنِ﴾۔

”اور ایک زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیئے)“؟! ﴿وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ﴾۔ اور ہم نے اسے اس کی بھلائی اور برائی کو دونوں راہیں دکھادیں ﴿وَهَدَيْنَا النُّجْدَيْنِ﴾ اس طرح ان چند مختصر جملوں میں تین اہم مادی نعمتوں اور ایک عظیم معنوی نعمت کی طرف، جو سب کی سب خدا کی عظیم ترین نعمتیں ہیں، اشارہ کیا ہے۔ ایک طرف تو آنکھوں، زبان اور لبوں کی نعمت ہے اور دوسری طرف خیر و شر کی معرفت و ہدایت کی نعمت ہے۔

(اس بات کی طرف توجہ رہے کہ ”نجد“ اصل میں مرتفع اور بلند مقام کے معنی میں ہے، ”تھامہ“ کے مقابلہ میں پست زمینوں پر بولا جاتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں ”بلند جگہ“ اور پست جگہ“ اور یہاں خیر و شر و شقاوت کی راہ سے کنایہ ہے۔ ا

اوپر والی نعمتوں کی اہمیت کے بارے میں بس اتنا کافی ہے کہ:

”آنکھ“ بیرونی دنیا سے انسان کے رابطہ کے لئے ایک اہم ترین ذریعہ ہے آنکھ کے عجائبات اس قدر ہیں کہ وہ واقعی طور پر انسان کو خالق کے مقابلہ میں خضوع کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں، آنکھ کے سات طبقے ہیں جو صلیبہ (قرنیہ) مشیمیہ، عیبیہ، زلالیہ، زجاجیہ اور شبکیہ کے نام سے موسوم ہیں، ان میں سے ہر ایک عجیب و غریب اور عمدہ ساخت رکھتا ہے جن میں نور اور روشنی اور آئینوں سے مربوط طبعیاتی اور جسمانی قوانین کا بہت ہی باریک بینی کے ساتھ خیال رکھا گیا ہے۔ اس طرح سے کہ تصویر کشی کی ترقی یافتہ دور بینیں بھی اس کے مقابلہ میں بے قدر و قیمت ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ساری دنیا میں انسان کے سوا اور سارے وجود انسانی میں آنکھ کے علاوہ اور کوئی چیز نہ ہوتی تو اس کی عجائبات کا مطالعہ پروردگار کے عظیم علم قدرت کی شناخت کے لئے کافی تھا۔

باقی رہی ”زبان“ تو وہ انسان کے لئے دوسرے انسانوں سے ارتباط، اور ایک قوم سے دوسری قوم، اور ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف اطلاعات و معلومات کے نقل ہونے، اور مبادلہ کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے، اور اگر یہ ارتباط کا ذریعہ نہ ہوتا تو انسان ہرگز کبھی بھی علم و دانش اور مادی تمدن اور معنوی مسائل میں اس حد تک ترقی نہ کر سکتا۔

باقی رہے ”لب“ تو ”اولاً“ بول چال میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے کیونکہ بہت سے حروف لبوں ہی کے ذریعہ ادا ہوتے ہیں اس کے علاوہ ہونٹ کے چبانے، اور منہ کی رطوبت کو محفوظ رکھنے اور پانی کے پینے میں بہت زیادہ مدد کرتے ہیں، اور اگر یہ نہ ہوتے تو انسان کے کھانے پینے کا مسئلہ، یہاں تک کہ اس کے چہرے کا منظر، اس کے لعاب دہن کے باہر کی طرف بہنے کی وجہ سے، اور بہت سے حروف کی ادائیگی پر قدرت نہ رکھنے کی بناء پر افسوس ناک ہوتا۔

اور چونکہ حقائق کا ادراک پہلے درجہ میں آنکھ اور زبان سے ہوتا ہے۔ ان کے بعد ”عقل“ اور فطری ہدایت آتی ہے، یہاں تک کہ آیت کی تعبیر ”ہدایت تشریعی“ کو بھی جو انبیاء و اولیاء کے ذریعے ہوتی ہے شامل ہے۔

ہاں! اس نے دیکھنے والی آنکھ اور زبان کو بھی انسان کے اختیار میں رکھا ہے، اور ”راہ اور چاہ“ کی بھی اسے نشاندہی کرادی ہے ”تا آدمی نگاہ کند پیش پائے خویش“ تاکہ انسان اپنے سامنے کی ہر چیز کو دیکھ لے۔

لیکن ان روشن چراغوں کے باوجود، جو اس کے راستے میں موجود ہیں، اگر پھر بھی کوئی راستہ سے ہٹ جاتا ہے تو پھر کہنا چاہیے: ”بلذارتا یفتد ویند سزای خویش“! اسے گرنے دو تاکہ وہ اپنی سزا پالے۔

”﴿وہدیناھ النجدین﴾“۔ (ہم نے اسے بھلائی اور برائی کے دونوں راستے دکھا دیئے) کا جملہ علاوہ اس کے کہ وہ انسان کے ارادہ کی آزادی اور اختیار کے مسئلہ کو بیان کرتا ہے، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ”نجد“ اونچی جگہ کو کہتے ہیں لہذا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خیر اور بھلائی کی راہ کو طے کرنا مشکلات، زحمت اور رنج سے خالی نہیں ہے، جیسا کہ اونچی زمینوں کی طرف جانا مشکل ہے یہاں تک کہ شر اور برائی کی راہوں کا طے کرنا بھی مشکلات رکھتا ہے۔ لہذا کیسی اچھی بات ہے کہ انسان سعی و کوشش سے خیر کی راہ کو اختیار کرے۔

لیکن اس کے باوجود راستہ کا انتخاب کرنا خود انسان کے اختیار میں ہے۔ یہ وہی ہے جو اپنی آنکھ اور زبان کو حلال یا حرام کے راستے میں گردش دے سکتا ہے اور خیر و شر کی دونوں راہوں میں جسے چاہے انتخاب کر سکتا ہے۔

لہذا ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے خداوند تعالیٰ آدم علیہ السلام کی اولاد سے کہتا

ہے:

”﴿يَا بَنِي آدَمَ! انْزَعِكْ لِسَانَكَ فِيمَا حَرَمْتَ عَلَيْكَ فَقَدْ اعْتَنَكَ عَلَيْهِ بِطَبَقَتَيْنِ فَاطْبِقْ، اِنْ نَازَعَكَ بَصْرَكَ الْيُسْرَى﴾“

بعض ماحرمت عليك فقد اعتنك عليه بطقتين فاطبق﴿“

”اے اولاد آدم! اگر تیری زبان تجھے کسی فعلِ حرام پر ابھارنا چاہئے، تو میں نے اسے روکنے کے لئے دو ہونٹ تیرے اختیار میں دئے ہیں۔ پس تو ہونٹ کو بند کرے اور اگر تیری آنکھ تجھے حرام کی طرف لے جانا چاہے تو میں نے پلکیں تیرے اختیار میں دے دی ہیں تو انہیں بند کر لے“ (۲)

اس طرح سے خدا نے ان عظیم نعمتوں پر کنٹرول کے وسائل و ذرائع بھی انسان کے اختیار میں دیئے ہیں اور یہ ایک اور اس کا عظیم لطف ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات میں زبان کے بارے تو لبوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، لیکن آنکھوں کے بارے میں پلکوں کی طرف اشارہ نہیں ہوا۔ اس کے بظاہر دو اسباب ہیں، ایک تو یہ ہے کہ لبوں کا کام بات کرنے، کھانے اور تمام پہلوؤں میں پلکوں کی نسبت آنکھوں کے لئے کام کرنے سے کئی گنا زیادہ ہے، اور دوسرا سبب یہ ہے کہ زبان کا کنٹرول کرنا آنکھ کے کنٹرول سے کئی درجے زیادہ اہم ہے، اور زیادہ سخت ساز ہے

۱۔ یہ تفسیر ایک حدیث میں امیر المؤمنین علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے (مجمع البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں) اور یہ جو بعض نے ماں کے دو پستانوں سے جو سینہ پر ابھرے ہوئے ہوتے ہیں تفسیر کی ہے بہت ہی بعید ہے۔ ضمنی طور پر ”نجد“ کی تعبیر خیر کے بارے میں اس کی عظمت کی وجہ سے ہے اور شر کے بارے میں بابِ تغلب سے ہے۔

۱۔ آنکھ کی حیرت انگیزیاں

آنکھ کو عام طور پر کیمرے کی دوربین سے تشبیہ دیتے ہیں، جو اپنی بہت ہی چھوٹی سی پتلی کے ساتھ مختلف مناظر کے فوٹو اتارتی ہے، ایسی تصویریں جو فلم کے بجائے ”شبکیہ چشم“ (آنکھ کی سکرین) پر منعکس ہوتی ہیں اور وہاں سے بینائی کے اعصاب کے ذریعہ دماغ میں منتقل ہوتی ہیں۔

تصویر کشی کا یہ حد سے زیادہ لطیف و دقیق کا خانہ، شب و روز میں کئی ہزار تصویریں، مختلف مناظر کی اتار سکتا ہے، لیکن تصویر کشی اور فلمیں بنانے کی ترقی یافتہ مشینوں پر بھی اس کا بہت سے پہلوؤں سے قیاس نہیں ہو سکتا، کیونکہ:

۱۔ اس مشین میں روشنی کو منظم کرنے والا دریچہ وہی آنکھ کی پتلی ہے جو خود کار طریقہ سے زیادہ قوی روشنی کے مقابلہ میں زیادہ تنگ اور کمزور روشنی کے مقابلہ میں زیادہ کشادہ ہو جاتی ہے حالانکہ کیمرے کی مشین کو اشخاص کے ذریعے منظم کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ آنکھ کا عدسہ، ان تمام شیشوں کے برخلاف، جو دنیا کے تصویر کشی کے کیمروں میں استعمال ہوتے ہیں، ہمیشہ اپنی شکل بدلتا رہتا ہے، اس طور پر کہ کبھی تو اس کا قطر ۵/۱ ملی میٹر ہو جاتا ہے اور کبھی ۸/۱ ملی میٹر تک پہنچ جاتا ہے تاکہ وہ دور اور نزدیک کے مناظر کی تصویر بن سکے۔ اور یہ کام ان عضلات کے ذریعے، جنہوں نے عدسہ کو گھیرا ہوا ہے، اور وہ کبھی اسے کھینچ لیتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں، انجام پاتا ہے، اس طرح سے آنکھ کا ایک عدسہ تنہا سینکڑوں عدسوں کا کام انجام دیتا ہے۔

۳۔ تصویر کشی کی یہ مشین چار مختلف سمتوں کی طرف حرکت کرتی ہے، یعنی آنکھ کے عضلات کی مدد سے جس طرف چاہے حرکت کر سکتی ہے اور تصویر بنا سکتی ہے۔

۴۔ یہاں ایک اور اہم نکتہ بھی ہے کہ تصویر کشی کے کیمروں کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی فلموں کو تبدیل کرتے رہیں، اور جب فلم کی ایک ریل ختم ہو جائے تو اس کی جگہ دوسری ریل رکھنی پڑتی ہے۔ لیکن انسان کی آنکھیں زندگی بھر تصویریں اتارتی رہتی ہیں، اور اس میں کوئی چیز تبدیل نہیں کرنی پڑتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ کی سکرین کا وہ حصہ، جس پر تصویریں منعکس ہوتی ہیں، اس میں دو قسم کے سلول ہوتے ہیں:

۱۔ مخروطی سلول ۲۔ عمودی سلول، جو روشنی کے مقابلہ میں بہت ہی زیادہ حساس مادہ رکھتے ہیں اور روشنی کی تھوڑی سی چمک سے ہی ان کا تجزیہ ہو جاتا ہے اور وہ ایسی لہریں پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ دماغ کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور سکرین دوبارہ نئی تصویر کھینچنے کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے۔

۵۔ تصویر کھینچنے والی دوربینیں بہت ہی محکم اور مضبوط مادوں سے بنائی گئی ہیں، لیکن آنکھ کی تصویر کھینچنے کی مشین اتنی لطیف کہ جس میں معلولی سی چیز سے بھی خراش آجاتی ہے، اسی وجہ سے اس کو ایک مضبوط ہڈیوں سے بنی ہوئی حفاظت گاہ میں رکھا گیا ہے۔

لیکن اتنی ظرافت و نزاکت کے باوجود یہ لوہے اور فولاد سے بھی زیادہ چلنے والی چیز ہے۔

۶۔ فلمیں بنانے والوں اور تصویر کھینچنے والوں کے لئے ”روشنی کے منظم ہونے“ کا مسئلہ ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے، اور اس مقصد کے لئے کہ تصویریں صاف ہوں، بعض اوقات کئی کئی گھنٹے روشنی اور اس کے مقدمات کو منظم کرنے میں مشغول رہنا پڑتا ہے، جب کہ آنکھ تمام حالات میں، چاہے روشنی قوی ہو یا درمیانی یا کمزور، یہاں تک کہ تاریکی میں بھی، بشرطیکہ معمولی اور خفیف سی روشنی بھی وہاں پر موجود تصویر لے لیتی ہے۔ اور یہ چیز آنکھ کے عجائبات میں سے ہے۔

۷۔ بعض اوقات ہم روشنی سے تاریکی کی طرف جاتے ہیں، یا بجلی کے بلب اچانک بجھ جاتے ہیں، تو ہم اس وقت کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے، لیکن چند ہی لمحے گزر جانے کے بعد ہماری آنکھ خود کار طور پر اپنی کیفیت کو اس کمزور روشنی کے ساتھ منطبق کر لیتی ہے، اس طرح سے کہ جب ہم اپنے ارد گرد نظر کرتے ہیں کہ ہماری آنکھ تاریکی کی عادی ہو گئی ہے اور یہ عادت والی تعبیر کو سادہ اور عام زبان میں ادا ہو جاتی ہے۔ ایک بہت ہی پیچیدہ مکانیسم (طرز ساخت) کا نتیجہ ہے جو آنکھ میں رکھی گئی ہے، اور وہ خود کو بہت ہی مختصر سے وقت میں نئے حالات پر منطبق کر سکتی ہے۔

اس کے برخلاف جب ہم تاریکی سے روشنی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کے برعکس ہوتا ہے، یعنی ابتدا میں ہماری آنکھ قوی روشنی کو برداشت نہیں کرتی، لیکن چند لمحات کے بعد وہ اس سے منطبق ہو جاتی ہے اور اصطلاح کے مطابق عادی ہو جاتی ہے لیکن یہ امور تصویر بنانے والے کیمروں میں ہرگز موجود نہیں ہیں۔

۸۔ تصویر بنانے والے کمرے محدود فضا سے تصویر بنا سکتے ہیں جب کہ انسان کی آنکھ تمام افق کا نیم دائرہ جو اس کے سامنے ہوتا ہے دیکھ لیتی ہے، اور دوسرے لفظوں میں ہم اپنے اطراف کے تقریباً ۱۸۰ درجے کے دائرے کو دیکھ لیتے ہیں، جب کہ تصویر کشی کا کوئی کمرہ ایسا نہیں ہے۔

۹۔ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ انسان کی دونوں آنکھیں، جن میں سے ہر ایک ایک مستقل مشین ہے، اس طرح منظم ہوئی ہیں کہ ان دونوں سے لئے گئے فوٹو ایک ہی نقطہ پر جا کر پڑتے ہیں۔ اس طرح سے اگر یہ تنظیم تھوڑی سی خراب ہو جائے تو اسے اپنی دو آنکھوں سے ایک ہی جسم کو دو جسم دیکھتا ہے، جیسا کہ احوال (جمع دو دو نظر آتے ہوں) اشخاص میں یہ معنی مشاہدہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ وہ تمام مناظر جن کی آنکھ تصویر کشی کرتی ہے آنکھ کی اسکرین پر الٹے پڑتے ہیں، حالانکہ ہم کسی چیز کو الٹا نہیں دیکھتے، آنکھ کے عاد اور چیزوں کی ایک دوسرے سے نسبت کو محفوظ رکھنے کی بناء پر ہے۔

۱۱۔ آنکھ کی سطح ہمیشہ مرطوب ہونی چاہیے کیونکہ اگر وہ چند ساعت بھی خشک رہ جائے تو اس پر شدید ضرب پڑے یہ رطوبت ہمیشہ آنسوؤں کے غددوں سے حاصل ہوتی ہے جو آنکھ میں ایک طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور اسے بھی مرطوب رکھتے ہیں۔

اگر آنکھ کے غدد خشک ہو جائیں تو آنکھ خطرے میں پڑ جاتی ہے اور پلکوں کی حرکت غیر ممکن ہو جاتی ہے، اور اگر اس کا فعل حد سے بڑھ جائے تو ہمیشہ چہرے پر آنسوں بہتے رہتے ہیں، یا آنکھ کے فاضل پانی کو خشک کرتے ہیں اور یہ کتنا بڑا درد سر ہے

۱۲۔ آنسوؤں کی ترکیب ایک پیچیدہ ترکیب ہے، اور اس میں دس سے زیادہ عناصر ہوتے ہیں، اور وہ مجموعاً آنکھ کی نگہداشت کے لئے ایک بہترین اور مناسب ترین مائع یا مرکب ہوتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ آنکھ کے عجائبات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے بارے میں کئی دن تک بیٹھ کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، اور ان کی کئی کتابیں لکھنی پڑیں، اور ان تمام چیزوں کے باوجود اگر ہم اس کے اصلی مادہ کو دیکھیں تو وہ تقریباً چر بی کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام اپنی ایک قابل قدر گفتگو میں فرماتے ہیں:

”اعجبوا لهذا الانسان ينظر بشحم ، و يتكلم بلحم ، و يسمع بعظم، و يتنفس من خرم!“

”تعجب ہے اس انسان پر جو چربی کے ایک ٹکڑے سے دیکھتا ہے، اور گوشت کے ایک ٹکڑے سے بولتا ہے ہڈی سے سنتا ہے سوراخ سے سانس لیتا ہے اور وہ ان بزرگ حیاتی کاموں کو ان چھوٹے سے وسائل کے ذریعے انجام دیتا ہے^(۱)“

۱۔ نہج البلاغہ ”کلمات قصار“ حکمت ۸۔

۲۔ زبان کی حیرت انگیزیاں

زبان بھی اپنے جگہ پر انسانی بدن کے بہت ہی حیرت انگیز اعضاء میں سے ہے اور اس کے ذمے بہت ہی سخت ذمہ داریاں ہیں، وہ غذا کو نگلنے میں مدد دینے کے علاوہ اس کو چبانے میں بھی اہم کام انجام دیتی ہے، اور بار بار غذا کے لقمہ کو دانتوں کی ہتھوڑی کے نیچے دھکیلتی رہتی ہے، لیکن اس کام کو اتنے ماہرانہ انداز میں انجام دیتی ہے کہ اپنے آپ کو دانتوں کی ضربوں سے محفوظ رکھتی ہے، حالانکہ ہمیشہ ان کے پاس اور ان سے چمٹی ہوئی رہتی ہے۔

بعض اوقات اتفاقیہ طور پر کھانے کو چباتے وقت ہم اپنی زبان کو بھی چبالتے ہیں تو ہماری چیخ نکل جاتی ہے اور ہم یہ سمجھ جاتے ہیں کہ اگر زبان میں وہ مہارت نہ ہوتی تو ہم پر کتنی مصیبت آن پڑتی۔

ضمنی طور پر غذا کھانے کے بعد منہ کی فضا اور دانتوں کو پاک و صاف کرتی اور جھاڑ دیتی ہے۔

اور ان سب کاموں سے زیادہ اہم بات کرنے کا مسئلہ، جو زبان کی تیزی کے ساتھ منظم طور پر پے در پے حرکات اور چھ سمتوں میں حرکت کرنے سے انجام پاتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ خدا نے بات کرنے اور تکلم کے لئے ایک ایسا وسیلہ انسانوں کے اختیار میں دیا ہے جو بہت ہی سہل اور آسان، اور سب کی دسترس میں ہے، نہ کچھ تھکان ہوتی ہے اور نہ ہی رنج و ملال حاصل ہوتا ہے، اور نہ ہی کچھ خرچ ہوتا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات انسان میں گفتگو کرنے کی استعداد کا مسئلہ ہے، جو انسان کی روح میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور انسان اپنے طرح طرح کے حد سے زیادہ مقاصد کو بیان کرنے کے لئے بے حد مختلف صورتوں میں زیادہ سے زیادہ جملہ بندیاں کر سکتا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ اہم، مختلف زبانوں کی وضع کی استعداد ہے، اور ان ہزاروں زبانوں کے مطالعہ سے جو دنیا میں موجود ہیں، اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، واقعاً ”العظمیٰ للواحد القہار!“ (عظمت و بزرگی واحد و قہار خدا کے لئے ہی ہے)۔

۳۔ نجدین کی طرف ہدایت

”نجد“ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، بلندی یا بلند سرزمین کے معنی میں ہے اور یہاں ”خیر“ و ”شر“ کی راہ مراد ہے۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”یا ایہا الناس! ہما نجدان: نجد الخیر و نجد الشر فما جعل نجد الشر احب الیکم من نجد الخیر“۔

”اے لوگو! دو بلند سرزمینیں موجود ہیں، خیر کی سرزمین اور شر کی سرزمین، اور شر کی سرزمین تمہارے لئے خیر کی سرزمین سے ہرگز زیادہ محبوب قرار دی گئی۔“^(۱)

اس میں شک نہیں کہ ”تکلیف“ اور مسئولیت، معرفت و آگاہی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اوپر والی آیت کے مطابق خدا نے یہ آگاہی انسانوں کے اختیار میں دے دی ہے۔

یہ آگاہی تین طریقوں کے انجام پاتی ہے:

۱۔ عقلی اسراکات اور استدلال کے طریق سے۔

۲۔ فطرت و وجدان کے طریق سے، جس میں استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۳۔ روح اور انبیاء و اوصیاء کی تعلیمات کے طریق سے اور تکامل کی راہ کو طے کرنے کے لئے انسان کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی خدا نے ان تین طریقوں میں سے کسی ایک سے یا بہت سے موارد میں ان تینوں ہی طریقوں سے اسے تعلیم دی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہوئی ہے کہ ان دونوں راستوں میں کسی ایک کا طے کرنا انسان کی طبیعت اور مزاج کے لئے دوسرے سے زیادہ آسان نہیں ہے اور یہ بات حقیقت میں اس عمومی تصور کی کہ انسان برائیوں کی طرف زیادہ میلان رکھتا ہے اور شر کے راستے کو طے کرنا اس کے لئے زیادہ آسان ہے، نفی کرتی ہے۔ اور یہ سچی بات ہے کہ اگر غلط تربیتیں اور فاسد ماحول نہ ہو تو انسان کو نیکیوں کے ساتھ لگاؤ اور محبت زیادہ ہوتی ہے۔ اور شاید ”نجد“ (بلند سرزمین) کی تعبیر نیکیوں کے بارے میں اسی بناء پر ہے، کیونکہ بلند سرزمین بہتر اور زیادہ عمدہ فضا رکھتی ہیں، اور شرور کے بارے میں تغلیب کی بناء پر ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ تعبیر خیر و شر کے راستہ کے ظاہر، نمایاں اور آشکار ہونے کی طرف اشارہ ہے، جس طرح سے مرتفع اور بلند سرزمین مکمل اور پورے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔^(۲)

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۴۹۴ و تفسیر قرطبی جلد ۱ ص ۷۱۵۵-۲۔ جیسا کہ چاند اور سورج کو ”قرآن“ (دو چاند) کہا جاتا ہے۔

آیات ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰

۱۱۔ ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ - ۱۲۔ ﴿وَمَا ادْرَاكَ مَا لِعَقَبَةِ﴾ - ۱۳۔ ﴿فَكُ رَقِيبٌ﴾ - ۱۴۔ ﴿وَاطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ﴾ -

۱۵۔ ﴿يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ﴾ - ۱۶۔ ﴿أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ﴾

۱۷۔ ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَصَّوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ -

۱۸۔ ﴿أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ﴾ - ۱۹۔ ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ﴾ - ۲۰۔ ﴿عَلَيْهِمْ نَارٌ مُو

صَدَّةٌ﴾ -

ترجمہ

۱۱۔ لیکن وہ (ناشکرا انسان) اس اہم گھاٹی سے اوپر نہیں گیا۔

۱۲۔ اور تجھے کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ ۱۳۔ غلام کو آزاد کرنا ہے۔ ۱۴۔ یا بھوک کے دن کھانا کھلانا ہے۔

۱۵۔ رشتہ داروں میں کسی یتیم کو۔ ۱۶۔ یا خاک پر پڑے ہوئے مسکین کو۔

۱۷۔ پھر اسے ایسے لوگوں میں سے ہونا چاہیے جو ایمان لائے ہیں اور جو ایک دوسرے کو صبر و شکیبائی اور رحم کرنے

کی وصیت کرتے ہیں۔

۱۸۔ وہ اصحاب الیمین ہیں (اور ان کے نامہ اعمال کو ان کے دائیں ہاتھ میں دیں گے)۔

۱۹۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کر دیا، وہ شوم اور بد بخت لوگ ہیں اور ان کا نامہ اعمال ان کے بائیں

ہاتھ میں دیا جائے گا۔

۲۰۔ ان کو آگ نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے، (جس سے بھاگنے کی کوئی راہ نہیں ہے)۔

دشوار گزار گھاٹی

ان عظیم نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد، جو گزشتہ آیات میں آئی تھیں، زیر نظر آیات میں ناشکر گزار بندوں کو مورد ملامت و سرزنش قرار دیتا ہے، کہ ان تمام وسائل سعادت کے ہوتے ہوئے انہوں نے نجات کی راہ کیوں طے نہیں کی، پہلے

فرماتا ہے:- ”یہ ناشکرا انسان اس عظیم گھاٹی سے اوپر نہیں گیا“۔ ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ - (۱)

اس بارے میں یہ کہ یہاں عقبہ سے کیا مراد ہے، بعد والی آیات اس کی تفسیر کرتی ہیں۔
 فرماتا ہے: ”تو نہیں جانتا وہ گھاٹی کیا ہے“؟ ﴿و اما ادراك ما لعقبة﴾
 ”غلام کو آزاد کرنا ہے“۔ ﴿فك رقبة﴾۔

”بھوک کے دن کھانا کھلانا ہے“۔ ﴿او اطعام في يوم ذي مسغبة﴾۔
 ”قریبوں میں سے کسی یتیم کو“ ﴿یتیمًا ذا مقربة﴾۔
 ”یا خاک پر پڑے ہوئے مسکین کو“ ﴿او مسکینًا ذا متربة﴾۔

اس طرح یہ دشوار گزار گھاٹی جس سے گزرنے کے لئے ناشکرے انسانوں نے ہرگز خود توتیار نہیں کیا ہے، اعمالِ خیر کو ایک ایسا مجموعہ ہے جو ارادی طور پر خدمتِ خلق اور کمزوروں اور ضعیفوں کی مدد کرنے کے گرد گھومتا ہے، اور ان صحیح اور خالص عقائد کا مجموعہ بھی ہے جن کی طرف بعد والی آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

اور سچ تو یہ ہے، کہ اس شدید لگاؤ کو دیکھتے ہوئے جو عام طور سے لوگ مال و ثروت کے ساتھ رکھتے ہیں، اس دشوار گزار گھاٹی سے گزرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اسلام اور ایمان صرف دعویٰ اور باتوں سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ ہر مومن مسلمان کے سامنے ایسی دشوار گزار گھاٹیاں ہیں جن سے یکے بعد دیگرے، حول و قوۃ خدا اور روح ایمان و اخلاص سے مدد طلب کرتے ہوئے گزرنا پڑتا ہے۔

بعض نے یہاں ”عقبہ“ کی تفسیر ہوائے نفس کے معنی میں کی ہے یہاں آیات نے ”عقبہ“ کی تفسیر کی ہے تو اس تفسیر سے مراد اس طرح ہونا چاہیے کہ اصلی گھاٹی ہوائے نفس کی گھاٹی ہے، لیکن غلاموں کو آزاد کرنا، اور مسکینوں کو کھانا کھلانا، اس سے مبارزہ کرنے کے واضح مصداق میں سے ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس ”عقبہ“ سے مراد قیامت میں ایک دشوار گزار گھاٹی ہے، جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں آیا ہے:

”ان امامکم عقبۃ کو دأ لا یجوز ہا المثلقلون ، و انا ارید ان اخفف عنکم لتلک العقبة“۔

”تمہارے سامنے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے، جس سے بھاری بوجھ والے نہیں گزر سکیں گے، اور میں چاہتا ہوں کہ اس گھاٹی سے عبور کرنے کے لئے تمہارے بوجھ کو ہلکا کر دوں“ (۲)

البتہ حدیث جو پیغمبر اکرم سے نقل ہوئی ہے زیر بحث آیت کی تفسیر کے عنوان سے نہیں ہے، لیکن مفسرین نے اس سے یہی سمجھا ہے، لیکن ایسا سمجھنا، اس تفسیر کی طرف توجہ کمرے ہوئے جو صراحت کے ساتھ آیات میں آئی ہے، مناسب دکھائی نہیں دیتا، مگر یہ کہ مراد یہ ہو کہ قیامت کی دشوار گزار گھاٹیاں اس جہاں کی سخت اور سنگین اطاعتوں کا تجسم ہیں، اور ان سے عبور کرنا ان اطاعتوں سے عبور کرنے کی فرع ہے (غور کیجئے)۔

یہاں پر ”اقتحم“ کی تعبیر جو ”اقتحام“ کے مادہ سے ہے، قابل توجہ ہے، جو اصل میں سخت اور خوفناک کام میں داخل ہونے کے معنی میں ہے۔ (مفردات راغب) یا کسی چیز میں داخل ہونا یا اس کے پاس سے شدت و مشقت سے گزرنا ہے (تفسیر کشاف) اور یہ چیز بتاتی ہے کہ اس گھاٹی سے گزرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور یہ اس بات پر ایک تاکید ہے جو سورہ کے آغاز میں آئی ہے، جس میں فرماتا ہے: ”ہم نے انسان کو دکھ اور تکلیف میں پیدا کیا ہے، اور اس کی زندگی بھی دکھ اور رنج و تکلیف سے توأم ہے اور پروردگار کی اطاعت کرنا بھی بہر حال کوئی آسان کام نہیں ہے۔“

امیر المومنین علیہ السلام کے ایک ارشاد میں آیا ہے: ”ان الجنة حفت بالملكاه و ان النار حفت بالشهوات“
 ”بے شک جنت سختیوں کے درمیان گھری ہوئی ہے، اور دوزخ شہوات کے درمیان گھری ہوئی ہے“

چند قابل توجہ نکات

۱۔ ”فک رقبة“ سے مراد ظاہر اُوہی غلاموں کو آزاد کرنا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک اعرابی پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کوئی ایسا عمل تعلیم کیجئے کہ جو مجھے جنت میں داخل کرے، آپ نے فرمایا:

”ان كنت اقصرت الخطبة لقد عرضت المسألة“۔

”اگرچہ تو نے بات تو مختصر کی ہے، لیکن ایک بہت بڑے مطلب کا سوال کیا ہے۔“ (یا یہ کہ اگرچہ تو نے مختصر سی بات کی ہے، لیکن تو نے اپنے مقصود کو اچھی طرح سے بیان کیا ہے)۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”اعتق النسمة و فک رقبة“ ”غلاموں کو آزاد کر اور گردنوں کو طوق غلامی سے) رہائی دے۔“

راوی سوال کرتا ہے، کیا یہ دونوں چیزیں ایک ہی نہیں ہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں! پہلے سے میری مراد یہ ہے کہ مستقل طور پر آزاد کر دے، اور دوسرے سے میری مراد یہ ہے کہ تو اس کی قیمت کی ادائیگی میں امداد کرے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔“
اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”و الفیء علی ذی الرحم الظالم ، فان لم یکن ذالک فاطعم الجائع ، واسق الظمآن، و امر بالمعروف و انه عن المنکر ، فان لم تطق ذالک فکف لسانک الامن الخیر“۔

”ان رشتہ داروں کی طرف جنہوں نے تجھ سے قطع رحمی کی ہے اور تجھ پر ظلم کیا ہے، لوٹ جا (اور ان سے نیکی کر) اور اگر اس قسم کا کام ممکن نہ ہو تو پھر بھوکوں کو کھانا کھلا اور پیاسوں کو پانی پلا، اور امر بالمعروف اور نہی از منکر اور اگر تجھ میں اس کام کے کرنے کی بھی طاقت نہیں ہے تو کم از کم اپنی زبان نیکی کے علاوہ کسی چیز کے لئے نہ کھول، (۴)
۲۔ بعض مفسرین نے ”﴿فک رقبة﴾“ کو اپنی گردن کو گناہوں کے بارے سے توبہ کے ذریعہ آزاد کرنے، یا خود کو اطاعتوں کے ذریعے عذاب الہی سے آزاد کرنے کے معنی میں سمجھا ہے، لیکن ان آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو اس کے بعد آئی ہیں، اور یتیم و مسکین کے بارے میں وصیت کر رہی ہیں، ظاہراً اس سے مراد وہی غلامی کو آزاد کرنا ہی ہے۔

۳۔ ”﴿مسغبة﴾“ ”سغب“ (بروزن غضب) کے مادہ سے بھوک کے معنی میں ہے، اس بنا پر ”﴿یوم ذی مسغبة﴾“ بھوک کے دن کے معنی میں ہے، اگر بھوکے افراد انسانی معاشروں میں رہتے ہیں، لیکن یہ تعبیر قحط رسانی اور خشک سالی اور اسی قسم کے دنوں میں کھانا کھلانے کی ایک تاکید ہے، جو اس موضوع کے اہمیت کی بناء پر ہے، ورنہ تو بھوکوں کو کھانا کھلانا ہمیشہ افضل اعمال سے رہا ہے اور ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آیا ہے:

”من اشبع جائعاً فی یوم سغب ادخله اللہ یوم القيامة من باب من ابواب الجنة لا یدخلها الامن فعل مثل ما فعل“۔

”جو شخص کسی بھوکے کو قحط کے دنوں میں پیٹ بھر کھانا کھلائے گا تو خدا اس کو قیامت میں جنت کے دروازوں میں سے اس دروازے سے داخل کرے گا جس سے کوئی دوسرا داخل نہیں ہوگا سوائے اس شخص کے جس نے اس جیسا عمل انجام دیا ہوگا۔ (۵)

۴۔ ”﴿مقربة﴾“ قرابت اور رشتہ داری کے معنی میں ہے اور یتیم رشتہ داروں کے بارے میں تاکید بھی ان کی اولویت کی بنا پر ہے، ورنہ تمام یتیموں کو کھانا کھلانا اور ان پر نوازش کرنا چاہئیے۔ یہ جو خاص طور پر اس زمانے میں رشتہ دار یتیموں کے بارے میں زیادہ سخت ذمہ داری رکھتے ہیں۔

اس سے قطع نظر وہ غلط فائدے، جو خاص طور پر اس زمانے میں رشتہ دار یتیموں کے اموال سے اٹھائے جاتے تھے، تقاضا کرتے ہیں کہ اس دشوار گزار گھاٹی کے بارے میں ایک خاص قسم کی تنبیہ کی جائے۔ ابو الفتوح رازی کا نظریہ یہ ہے کہ ”مقربہ“ ”قرابت کے مادہ سے یہیں ہے، بلکہ ”قرب“ کے مادہ سے ہے اور ایسے یتیموں کی طرف اشارہ ہے جن کے پہلو بھوک کی شدت سے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ہیں۔^(۶) لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے۔

۵۔ ”﴿متربة﴾“ مصدر میمی ہے ”ترب“ (بروزن طرب) کے مادہ سے جو اصل میں ”قرب“ بمعنی ”خاک“ سے لیا گیا ہے۔ اور اس شخص پر بولا جاتا ہے جو فقر و فاقہ کی شدت کی بناء پر خاک نشین ہو گیا ہو، پھر یہ تاکید اس قسم کے مساکین کے لئے ان کی اولیت کی بناء پر ہے، ورنہ تمام مساکین کو کھانا کھلانا اعمال حسنہ میں سے ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے:

”امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام جب کھانا کھانا چاہتے تھے تو یہ حکم دیتے تھے کہ ایک بہت بڑی سینی دسترخوان کے پاس رکھ دی جائے، اور دسترخوان پر جتنے کھانے ہوتے تھے ان میں سے بہترین کھانا اٹھا کر اس سینی میں ڈال دیتے تھے اور پھر حکم دیتے تھے کہ وہ حاجت مندوں کو دے دیں، پھر آپ اس آیت کی تلاوت فرماتے: ”﴿فلا اقتحم العقبة﴾“ اس کے بعد مزید فرماتے: خداوند تعالیٰ جانتا تھا کہ سب لوگ غلاموں کو آزاد کرنے پر قادر نہیں ہیں لہذا اپنی بہشت کی طرف ایک اور راستہ بھی قرار دیا ہے۔“^(۷)

بعد والی آیت میں، اس تفسیر کو جاری رکھتے ہوئے، جو اس دشوار گزار گھاٹی کے لئے یہاں فرمائی ہے، مزید کہتا ہے: ”پھر وہ ایسے لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے ہیں، اور ایک دوسرے کو صبر و استقامت اور رحم کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔“ ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالرَّحْمَةِ﴾۔

اس طرح سے وہ لوگ اس دشوار گزار گھاٹی سے عبور کر لیں گے، جو صاحب ایمان بھی ہوں اور صبر کی دعوت کرنے اور عواطف انسانی جیسے اعلیٰ اخلاق بھی رکھتے ہوں اور انہوں نے غلاموں کو آزاد کرنے میں اور یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے جیسے اعمال صالح بھی انجام دیئے ہوں۔

یا دوسرے لفظوں میں وہ تین میدانوں، ایمان، اخلاق اور عمل میں قدم رکھیں اور اس سے سر بلند و سرفراز ہو کر نکلیں یہی ہیں وہ لوگ جو اس قسم کی دشوار گزار گھاٹی کو عبور کر لیں گے۔

”ثم“ (بعد) کی تعبیر ہمیشہ ہی تاخیر زمانی کے معنی میں نہیں ہوتی کہ اس کلام کا لازمہ یہ ہو کہ پہلے کھانا کھلائیں اور اتفاق کریں اس کے بعد ایمان لائیں، بلکہ اس قسم کے موارد میں۔ جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے۔ مقام کی برقراری کے بیان کے لئے ہے کیونکہ مسئلہ طور پر ایمان کا رتبہ، اور صبر و مرحمت کی وصیت کرنے کا رتبہ، حاجت مندوں کی مدد کرنے کے رتبہ سے بالاتر ہے، بلکہ اعمال صالح کا سرچشمہ ایمان اور اخلاق ہی ہیں اور ان سب کی جڑ بنیاد اعتقادات اور اعلیٰ اخلاق میں ہی تلاش کرنا چاہیئے۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ”ثم“ یہاں تاخیر زمانی کے معنی میں ہے، کیونکہ بعض اوقات اعمال صالح ایمان کی طرف جھکاؤ کا سرچشمہ بن جاتے ہیں اور خاص طور پر اخلاق کی بنیادوں کو محکم کرنے میں موثر واقع ہوتے ہیں، کیونکہ انسان کا خلق و خو پہلے ”فعل“ کی صورت میں ہوتا ہے، اس کے بعد ”حالت“ کی صورت میں اور پھر ”عادت“ بن جاتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک ”ملکہ“ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

”﴿تواصوا﴾“ کی خبر تعبیر جس کا مفہوم ایک دوسرے کو وصیت اور سفارش کرنا ہے، ایک اہم نکتہ اپنے اندر لیئے ہوئے ہے اور وہ یہ ہے کہ پروردگار کی اطاعت کی راہ میں صبر و استقامت اور ہوائے نفس سے مبارزہ و مقابلہ جیسے اہم مسائل، اور اسی طرح اصل محبت و مرحمت کو تقویت دینا معاشرے میں انفرادی صورت میں نہیں ہونے چاہیئے، بلکہ اسے ایک عمومی صورت میں سارے معاشرے میں جاری ہونا چاہیئے اور سب افراد ہی ایک دوسرے کو اس ”اصول“ کی رعایت و حفاظت کرنے کی وصیت کریں تاکہ اس طریقہ سے اجتماعی تعلقات اور زیادہ محکم سے محکم ہوں۔

بعض نے کہا ہے کہ ”صبر“ یہاں فرمان خدا کی اطاعت میں استقامت اور اس کے اوامر میں اہتمام کرنے کے معنی میں ہے اور ”مرحمت“ مخلوق خدا کے لئے محبت کی طرف اشارہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خالق و مخلوق سے ارتباط ہی دین کی اساس و بنیاد ہے، بہر حال صبر و استقامت ہی ہر قسم کی اطاعت و بندگی اور گناہ و عصیان کے ترک کرنے کی اصل و بنیاد ہے۔ اور ان اوصاف کے آخر میں اس اوصاف کے حاملین کو اس طرح بیان فرماتا ہے: ”وہ اصحاب یمین ہیں“ ﴿اولئک اصحاب الیمین﴾۔

اور ان کا نامہ اعمال بارگاہِ خداوندی میں قبول ہونے کی نشانی اور علامت کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ ”میمنہ“ ”یمن“ کے مادہ سے ہے۔ یعنی وہ صاحبانِ برکت ہیں اور ان کا وجود خود ان کے لئے بھی برکت ہے اور معاشرے کے لئے بھی۔
اس کے بعد اس گروہ کے نقطہ مقابل یعنی ان لوگوں کا بیان کرتے ہوئے، جو اس دشوار گزار گھاٹی سے نہیں گزرے فرماتا ہے:

وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کر دیا، ایسے بد بخت اور شوم ہیں کہ ان کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْئِمَةِ﴾۔

اور یہ اس بات کی نشانی ہے کہ ان کے ہاتھ حسنات اور نیکیوں سے خالی ہے اور ان کا نامہ اعمال سینات اور برائیوں سے سیاہ ہے۔

”مَشْئِمَةٌ“ ”شوم“ کے مادہ سے ”میمنہ“ کا جو ”یمن“ کے مادہ سے ہے، نقطہ مقابل ہے، یعنی یہ کافر گروہ شوم، بد بخت اور نامبارک افراد ہیں جو اپنی بد بختی کا سبب بھی ہیں اور معاشرے کی بد بختی کا بھی، لیکن چونکہ قیامت میں بد بخت و شوم ہونا اور مبارک ہونا اس چیز سے پہچانا جائے گا کہ ان کا نامہ اعمال ان کے بائیں یا دائیں ہاتھ میں ہوگا، لہذا بعض نے اس تفسیر کو اسی وجہ سے پسند کیا ہے، خصوصاً جب کہ شوم کا مادہ لغت میں بائیں طرف کے جھکاؤ کے معنی میں بھی آیا ہے۔ ^(۸)

اس سورہ کی آخری آیت میں آخری گروہ کی سزا کی طرف ایک مختصر اور پر معنی اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ان کے اوپر آگ ہے، جو انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، جس سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے۔ ﴿عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّوَصَّدَةٌ﴾۔

”مُوصَّدَةٌ“ ”ایصَاد“ کے مادہ سے دروازہ کو بند کرنے اور اسے محکم کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ انسان اس کمرے میں جس کی فضا گرم ہو یہ چاہتا ہے کہ اس کے دروازہ کو بند کرنے اور اسے محکم کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ انسان اس کمرے میں جس کی فضا گرم ہو یہ چاہتا ہے کہ اس کے دروازوں کو کھول دے، تاکہ تازہ ہوا آئے اور فضا کی گرمی کو معتدل کر دے۔

اب سوچنا چاہیے کہ دوزخ کی جلانے والی بھٹی میں، جب کہ تمام دروازے بند ہو جائیں، کیا حالت پیدا ہوگی؟
خداوند! ہمیں اس قسم کی جان گزار عذاب سے اپنے لطف و کرم کی پناہ میں محفوظ رکھنا۔
پروردگارا! ان گھاٹیوں سے گزرنا جو ہمارے سامنے ہیں، تیری توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تو اپنی توفیق کو ہم سے نہ
روکنا۔

بار الہا! ہمیں اصحاب میمنہ کی صف میں جگہ دینا اور نیک اور ابرار لوگوں کے ساتھ محصور فرمانا۔

آمین یا رب العالمین

۱۔ ظاہر یہ ہے کہ اس جملہ میں ”لا“ ”نافیہ“ اور ”خبریہ“ ہے اور یہ جو بعض نے اسے نفیرین یا استفہام کے معنی میں سمجھا ہے، بہت بعید نظر آتا ہے۔ وہ واحد اعتراض جو یہاں موجود ہے یہ ہے کہ جب انسان فعل ماضی پر ”لا“ آتا ہے تو عام طور پر اس کا تکرار ہوتا ہے، جیسا کہ سورہ قیامت کی آیت ۳۱ میں آیا ہے کہ **فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى**: (نہ تو اس نے صدقہ دیا اور نہ ہی نماز پڑھی) جب کہ زیر بحث آیت میں ”لا“ کا تکرار نہیں ہوا، لیکن جیسا کہ مرحوم ”طبرسی“ نے ”مجمع البیان“ میں نقل کیا ہے کہ بعض اوقات یہ تکرار کے بغیر بھی استعمال ہوتا ہے ”فخر رازی“ اور ”قرطبی“ نے اپنی تفاسیر میں بعض عربی ادب کے بزرگوں سے نقل کیا ہے کہ اگر ”لا“ ”لم“ کے معنی میں ہو تو پھر تکرار کی ضرورت نہیں ہے، یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں تقدیر میں تکرار ہوا ہے: **فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَلَا فُكِّ رِقَبَةً وَلَا اطْعَمَ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ**“

۲۔ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۹۵

۳۔ نبح البلاغہ، خطبہ ۱۷۶۔

۴۔ ”نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۵۸۳۔

۵۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۴۹۵۔

۶۔ ”تفسیر ابو الفتوح رازی، جلد ۱۲ ص ۹۶۔

۷۔ کافی مطابق نقل تفسیر المیزان، جلد ۲۰، ص ۴۲۴۔

۸۔ تفسیر ابو الفتوح رازی جلد ۱۲ ص ۹۷ اور المنجد مادہ ”شأم“۔

سورہ الشمس

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس کی ۱۵ آیات ہیں۔

سورہ الشمس اور اس کی فضیلت

یہ سورہ جو حقیقت میں ”تہذیبِ نفس“ اور دلوں کو آلائشوں اور ناپاکیوں سے پاک کرنے والا سورہ ہے، اسی معنی کے محور پر گردش کرتا ہے البتہ اس سورہ کے آغاز میں۔ اس مطلب کو ثابت کرنے کے لئے کہ فلاح و رست گاری تہذیبِ نفس کی مرہون منت ہے، عالمِ خلقت کے گیارہ اہم موضوعات اور خدا کی ذاتِ پاک کی قسم کھائی گئی ہے۔ اور قرآن مجید کی بیشتر قسموں کو مجموعی طور پر اپنے اندر سمو لیا ہے۔

اور سورہ کے آخر میں باغی اور سرکش قوموں میں سے ایک کا ذکر ”جو تہذیبِ نفس کو ترک کرنے کی بناء پر ابدی اور دائمی شقاوت و بد بختی میں ڈوب گئی تھی، اور خدا نے اسے شدید عذاب میں گرفتار کیا تھا، یعنی قوم ”ثمود“۔ بطور نمونہ پیش کرتا ہے، اور ایک مختصر سے اشارہ کے ساتھ ان لوگوں کی سرنوشت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حقیقت میں یہ مختصر سا سورہ بشر کی زندگی کے سرنوشت ساز مسائل میں سے ایک اہم ترین مسئلہ کو موضوع بناتا ہے اور انسانوں کے لئے اسلام کے قابلِ قدر نظام کو مشخص کرتا ہے۔

فضیلت تلاوت

یہ سورہ جو حقیقت میں ”تہذیبِ نفس“ اور دلوں کو آلائشوں اور ناپاکیوں سے پاک کرنے والا سورہ ہے، اسی معنی کے محور پر گردش کرتا ہے البتہ اس سورہ کے آغاز میں۔ اس مطلب کو ثابت کرنے کے لئے کہ فلاح و رست گاری تہذیبِ نفس کی مرہون منت ہے، عالمِ خلقت کے گیارہ اہم موضوعات اور خدا کی ذاتِ پاک کی قسم کھائی گئی ہے۔ اور قرآن مجید کی بیشتر قسموں کو مجموعی طور پر اپنے اندر سمو لیا ہے۔

اور سورہ کے آخر میں باغی اور سرکش قوموں میں سے ایک کا ذکر ”جو تہذیبِ نفس کو ترک کرنے کی بناء پر ابدی اور دائمی شقاوت و بد بختی میں ڈوب گئی تھی، اور خدا نے اسے شدید عذاب میں گرفتار کیا تھا، یعنی قوم ”ثمود“۔ بطور نمونہ پیش کرتا ہے، اور ایک مختصر سے اشارہ کے ساتھ ان لوگوں کی سرنوشت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حقیقت میں یہ مختصر سا سورہ بشر کی زندگی کے سر نوشت ساز مسائل میں سے ایک اہم ترین مسئلہ کو موضوع بناتا ہے اور انسانوں کے لئے اسلام کے قابل قدر نظام کو مشخص کرتا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں بس اتنا ہی کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے: ”من قرأھا فکانما تصدق بكل شیء طلعت علیہ الشمس و القمر“

”جو شخص اس سورہ کو پڑھے گا تو گویا اس نے ان تمام چیزوں کو تعداد میں جن پر سورج اور چاند طلوع کرتے ہیں،

صدقہ دیا ہے۔^(۱)

اور مسئلہ طور پر یہ عظیم فضیلت اس شخص کے لئے ہے، جو اس چھوٹے سے سورہ کے عظیم مطالب پر دل و جان سے عمل کرے اور تہذیب نفس کو اپنا قطعی وظیفہ سمجھے۔

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۴۹۶۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

- ۱- ﴿وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا﴾ - ۲- ﴿وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَّهَا﴾ - ۳- ﴿وَالنَّهَارُ إِذَا جَلَّهَا﴾ - ۴- ﴿وَالسَّمَاءُ إِذَا يَغْشَاهَا﴾ -
- ۵- ﴿وَالسَّمَاءُ وَ مَا بَنَاهَا﴾ - ۶- ﴿وَالْأَرْضُ وَ مَا طَحَّهَا﴾ - ۷- ﴿وَالنَّفْسُ وَ مَا سَوَّاهَا﴾ - ۸- ﴿فَالْهَمَّهَا فَجُورَهَا وَ تَقْوَاهَا﴾
- ۹- ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾ ۱۰- ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾ -

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے ۱- سورج اور اس کی روشنی کے پھیلنے کی قسم - ۲- اور چاند کی جب کہ وہ اس کے پیچھے آئے -

۳- اور دن کی جب کہ وہ صفحہ زمین کو روشن کرے - ۴- اور قسم ہے رات کی جب کہ صفحہ زمین کو ڈھانپ لے -

۵- اور قسم ہے آسمان کی اور جس نے اسے بنایا - ۶- اور قسم ہے زمین اور جس نے اسے بچھایا -

۷- اور قسم ہے انسان کے نفس کی اور جس نے اسے درست کیا - ۸- پھر اسے فجور و تقویٰ (خیر و شر) کا الہام کیا -

۹- کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وہ فلاح پاگیا (اور درست گار ہوا - ۱۰- اور جس نے اپنے نفس کو معصیت اور گناہ سے آلودہ کیا وہ ناامید اور محروم ہوا -

تہذیب نفس کے بغیر نجات ممکن نہیں

وہ پے در پے اور اہم قسمیں جو اس سورہ کے آغاز میں آئی ہیں ایک حساب سے ”گیارہ“ قسمیں ہیں اور دوسرے حساب سے ”سات“ قسمیں ہیں، اور قرآن کی بیشتر قسموں کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے - یہ چیز اس بات کی اچھی طرح سے نشان دہی کرتی ہے کہ یہاں کوئی بہت اہم مطلب درپیش ہے، ایسا مطلب جو آسمانوں، زمین اور چاند کی عظمت کے برابر ہے اور ایک ایسا مطلب ہے جو سر نوشت ساز اور حیات بخش ہے -

پہلے ضروری ہے کہ ہم ان قسموں کی تشریح و تفسیر بیان کریں اور اس کے بعد اس نہایت اہم مطلب پر غور کریں جس کے لئے یہ سب قسمیں کھائی گئی ہیں -

پہلے فرماتا ہے: ”سورج کی روشنی کی قسم“: ﴿وَالشَّمْسُ وَ ضُحَاهَا﴾ -

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں قرآن کی قسموں کے عام ہر دو مقصد ہوتے ہیں، پہلا مقصد اس مطلب کی اہمیت جس کے لئے قسم کھائی گئی ہے اور دوسرا ان امور کی اہمیت جن کی قسم کھائی گئی ہے کیونکہ قسم ہمیشہ اہم موضوعات کی کھائی جاتی ہے، اسی بناء پر یہ قسمیں انسان کو غور و فکر کی طرف مائل کر دیتی ہیں تاکہ وہ عالم خلقت کے ان اہم موضوعات کے بارے میں غور و فکر کریں، اور ان سے خدا کی طرف راستہ نکالیں۔

”سورج“ کا انسان اور تمام زندہ زمینی موجودات کی زندگی میں اہم ترین اور پائندہ ترین نقش و اثر ہے، کیونکہ اس بات کے علاوہ کہ وہ نور و روشنی اور حرارت کا منبع ہے، اور یہ دونوں انسانی زندگی کے اصلی عوامل میں سے شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے حیاتی منابع بھی اسی کے سبب سے وجود میں آتے ہیں، ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا، نباتات کی پرورش، دریاؤں اور آبشار کا چلنا، یہاں تک کہ قوت پیدا کرنے والے منابع کا ظاہر ہونا، جیسا کہ تیل و پیٹرول اور پتھر کا کونڈہ وغیرہ، اگر ہم صحیح طور پر غور کریں تو ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صورت میں سورج کی روانی سے ارتباط رکھتا ہے اس طرح سے کہ اگر کسی دن یہ حیات بخش چراغ خاموش ہو جائے تو تاریکی و سکوت اور خاموشی و موت ہر جگہ کو گھیر لے۔

”ضحیٰ“ اصل میں سورج کی روشنی کے پھیلنے کے معنی میں ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب سورج افق سے اوپر آجائے اور اس کی روشنی ہر جگہ کو گھیر لے۔ اس کے بعد دن کے اس موقع پر بھی ”ضحیٰ“ کا طلاق ہونے لگا۔

خصوصیت کے ساتھ ”ضحیٰ“ پر تکیہ اس کی اہمیت کی بناء پر کیونکہ وہ زمین پر سورج کی روشنی کے تسلط کا وقت ہوتا ہے، اس کے بعد تیسری قسم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”قسم ہے چاند کی جب وہ سورج کے پیچھے پیچھے آئے“ ﴿و﴾

القمر اذا تلاھا ﴿﴾

یہ تعبیر۔ جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ حقیقت میں چاند کے بدر کامل ہونے یعنی چودھویں رات کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ چودھویں رات کا چاند غروب آفتاب کے ساتھ ہی افق پر مشرق سے نمودار ہوتا ہے اور اپنے روشن چہرے کو ظاہر کرتے ہوئے اپنا تسلط آسمان پر جما لیتا ہے۔ اور چونکہ یہ اس وقت ہر زمانہ سے زیادہ عمدہ اور زیادہ پر شکوہ ہوتا ہے لہذا اس کی قسم کھائی ہے۔

مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے اوپر والی تعبیر چاند کے دائمی طور پر سورج کے تابع ہونے اور اس منبع نور سے روشنی حاصل کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن اس صورت میں ”﴿اذا تلاھا﴾“ کا جملہ قید تو ضیحی ہوگا۔

بعض نے اس آیت کی تفسیر میں کچھ اور احتمال بھی دئے ہیں جو توجہ کے لائق نہیں ہیں، لہذا ان کو ذکر نہیں کیا گیا۔

چوتھی قسم میں مزید کہتا ہے: اور دن کی قسم جب وہ صفحہ زمین کو روشن کر دے۔ ﴿وَالنَّهَارَ إِذَا جَلَا هَا﴾۔
 ”﴿جلاھا﴾“ تجلیۃ کے مادہ سے، اظہار و ابراز کے معنی میں ہے۔

اس کے بارے میں کہ جلاھا کی ضمیر کس طرف لوٹتی ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بہت سے اسے زمین یا دنیا کی طرف لوٹاتے ہیں۔ (جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے)۔ یہ ٹھیک ہے کہ گزشتہ آیات میں ”زمین“ کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں تھی، لیکن یہ بات قرینہ مقام سے واضح ہو جاتی ہے۔

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ یہ ضمیر ”سورج“ کی طرف لوٹتی ہے، یعنی قسم ہے دن کی کہ وہ سورج کو ظاہر کرتا ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

بہر حال اس اہم آسمانی مخلوق کی قسم اس کی نوع بشر اور تمام زندہ موجودات کی زندگی میں اس کی حد سے زیادہ تاثیر کی بناء پر ہے، کیونکہ دن حرکت، جنبش اور حیات کا مظہر ہے، اور زندگی کی تمام جدوجہد، کشش اور کوشش عام طور پر دن کی روشنی میں ہی صورت پذیر ہوتی ہے۔

پانچویں قسم میں فرماتا ہے: ”رات کی قسم جب وہ صفحہ زمین (یا سورج) کو ڈھانپ دیتی ہے“ ﴿وَاللَّيْلَ إِذَا يَغْشَاهَا﴾۔^(۱)

رات اپنی تمام برکات و آثار کے ساتھ ایک طرف تو سورج کی دن کی حرارت میں اعتدال پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف تمام زندہ موجودات کے آرام و سکون اور راحت پانے کا سبب بنتی ہے۔ کیونکہ اگر رات کی تاریکی نہ ہوتی، اور مسلسل سورج چمکتا رہتا تو آرام و سکون کا وجود ہی نہ ہوتا کیونکہ سورج جلانے والی حرارت ہر چیز کو نابود کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اگر شب و روز کا نظام موجودہ کیفیت کے برخلاف ہوتا تو بھی یہی مشکل پیش آتی، جیسا کہ چاند میں جس کی راتیں کرہ زمین کے دو ہفتوں کے برابر ہوتی ہیں اور دن بھی ہفتے کے برابر ہوتے وہ حرارت تقریباً تین سو درجہ سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتی ہے، جس میں کوئی بھی زندہ موجود جسے ہم پہچانتے ہیں باقی نہیں رہ سکتا اور آدھی رات کے وقت اس کا درجہ حرارت صفر سے نیچے چلا جاتا کہ اگر وہاں پر کوئی زندہ موجود ہو تو یقینی طور پر برف ہو کر نابود ہو جائے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں افعال ماضی کی صورت میں آئے تھے اور اس آیت میں مضارع کی صورت میں آئے ہیں، تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے، اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ شب و روز کے ظہور مثلاً حوادث کسی زمانے کے

ساتھ مخصوص نہیں ہوتے وہ گزشتہ اور آئندہ سب کو شامل ہوتے ہیں اس لئے بعض فعل ماضی کی صورت میں اور بعض مضارع کی صورت میں آئے ہیں، تاکہ ان حوادث کی عمومیت کو زمانہ کے ضمن میں واضح کریں۔

چھٹی اور ساتویں قسم میں آسمان اور خالق آسمان کی طرف توجہ کرتا ہے اور مزید فرماتا ہے: ”قسم ہے آسمان کی اور اس ذات کی جس نے آسمان کو بنایا“ ﴿وَالسَّمَاءِ وَ مَا بَنَاهَا﴾۔

ایسی خیرہ کرنے والی عظمت کے ساتھ آسمان کی اصل خلقت، عالم خلقت کے عظیم عجائبات میں سے ہے، اور ان تمام ستاروں، اجرام سماوی اور ان پر حاکم نظام ایک تعجب خیز چیز ہے۔ اور ان سب سے زیادہ اہم اس آسمان کا خالق ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ لفظ ”ما“ کو مصدریہ ”مراد لینے پر مجبور ہوئے ہیں نہ کہ، موصولہ“ اور اس صورت میں آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا،: ”قسم ہے آسمان کی اور اس کی بنائی“۔

لیکن آیات ”و نفس وما سواها فالھما فجورھا وتقواھا“ کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جن کی تفسیر عنقریب بیان کی جائے گی، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ ”ما“ ”موصولہ“ ہو اور خدا کی ذات پاک کی طرف اشارہ ہو جو تمام آسمانوں کا خالق ہے، اور عربی زبان میں افراد ذی العقول کے بارے میں بھی ”ما“ کا استعمال ہوتا رہتا ہے، جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۳ میں آیا ہے: فانکھواما طاب لکم من النساء: جو عورتیں پسند آئیں ان سے نکاح کرو۔

مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ، یہ ہے کہ ”ما“ (جس چیز) کی تعبیر یہاں اس بناء پر ہے کہ مبداء جہان کو پہلے مبہم صورت میں ذکر کیا گیا ہو، تاکہ بعد میں غور و تحقیق اور مطالعہ کے ساتھ اس کے علم و حکمت سے آشنا ہوں، اور ”جو چیز“ اس ذات کے ساتھ تبدیل ہو جائے، لیکن تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

پھر آٹھویں اور نویں قسم میں ”زمین“ اور ”زمین کے خالق“ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”قسم ہے زمین کی اور اس کی جس نے زمین کو بچھایا“ ﴿وَالْاَرْضِ وَ مَا طحھا﴾۔

زمین جو انسان اور تمام زندہ موجودات کی زندگی کا گہوارہ ہے۔

زمین جو اپنی تمام حیرت انگیز چیزوں: پہاڑوں، سمندروں، دروں، جنگلوں، چشموں، دریاؤں، معادن اور اس کے گرانہا منابع کے ساتھ، کہ ان میں سے ہر ایک اکیلا بھی حق تعالیٰ کی آیات میں سے ایک آیت اور اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

اور اس سے برتر و بالا اس زمین کا خالق اور وہ ذات ہے کہ جس نے اسے بچھایا ہے۔

”طحاھا“ ”طحو“ (بروزن سھو) کے مادہ سے بچھانے اور پھیلانے کے معنی میں بھی آیا ہے اور دھکیلنے، اور دور کرنے اور ختم کرنے کے معنی میں بھی، اور یہاں بچھانے کے معنی میں ہے، کیونکہ اولاً زمین ابتدا میں پانی کے نیچے غرق تھی۔ بتدریج آہستہ آہستہ پانی زمین کے گڑھوں میں قرار پایا اور خشکیوں نے سر نکال لیا اور زمین پھیلتی چلی گئی اور اس کو ”دحو الارض“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ثانیاً زمین ابتدا میں پستیوں اور بلندیوں اور ناقابل سکونت گڑھوں کی صورت میں تھی جس پر مسلسل موسلا دھار بارشیں برسیں جنہوں نے زمین کی بلندیوں کو دھو دیا اور گھاٹیوں میں پھیلادیا۔ اور آہستہ آہستہ انسانی زندگی اور زراعت کے لئے قابل استفادہ ہموار زمینیں وجود میں آگئیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس تعبیر میں زمین کی حرکت کی طرف ایک اجمالی اشارہ موجود ہے، کیونکہ ”طحو“ کے معانی میں سے ایک معنی دھکیلنا بھی، جو سورج کے گرد زمین کی انتقالی حرکت کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے، یا اس کی محوری حرکت، یا دونوں قسم کی حرکت بھی ہو سکتی ہے۔

اور آخر میں ”دسویں“ اور ”گیارہویں“ قسم کو پیش کرتے ہوئے کو اس سلسلہ کی آخری قسم ہے، فرماتا ہے: قسم ہے انسان کے نفس کی، اور اس ذات کی، جس نے اسے مرتب و منظم کیا ہے ﴿نفس و ما سواھا﴾۔

وہی انسان جو عالم خلقت کا خلاصہ جہان ملک و ملکوت کا نچوڑ اور عالم آفرینش کا گل سرسبد ہے:

یہ عجیب مخلوق جو عجائبات اور اسرار سے پر ہے اس قدر اہم ہے کہ خدا نے خود اس کی اور اس کے خالق کی ایک ہی جگہ قسم کھائی ہے۔ اس بارے میں کہ یہاں ”نفس“ سے مراد انسان کی روح یا جسم و روح دونوں؟ مفسرین نے کئی احتمال دیئے ہیں۔

اگر مراد روح ہو تو پھر ”سواھا“ سے مراد (جو تسویہ کے مادہ سے ہے) انسان کے روحی قوی اور استعدادوں کی، جو اس ظاہری سے لے کر ادراک، حافظہ، انتقال، تخیل، ابتکار، عشق، اور ارادہ، تصمیم اور اسی قسم کے قوای، جو ”علم النفس“ کے مباحث میں بیان ہوئے ہیں، تنظیم و تعدیل ہے۔

اور اگر روح و جسم دونوں مراد ہوں تو پھر بدن کے تمام حیرت انگیز نظاموں اور اسکے مختلف کارخانوں کو۔ جن کے بارے میں علم ”تشریح الاعضاء“ فزیالوجی“ (فعال الاعضاء) میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ شامل ہوگا۔ البتہ قرآن مجید میں نفس کا دونوں معانی پر اطلاق ہوا ہے:

روح کے بارے میں سورہ زمر کی آیت ۲۴ میں آیا ہے: ﴿اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنفُسَ حَيْنَ مَوْتِهَا﴾: ”خدا موت کے وقت ارواح کو لے لیتا ہے۔“

اور جسم کے بارے میں سورہ قصص کی آیت ۳۳ میں آیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں: قال رب انی قتلت ممنہم نفساً فاخاف ان یقتلونی: موسیٰ علیہ السلام نے کہا، میں نے ان (ظالم فرعونیوں) میں سے ایک کو قتل کر دیا ہے، مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

لیکن یہاں مناسب یہ ہے کہ دونوں کو شامل ہو، کیونکہ خدا کی قدرت کی حیرت انگیزیاں جسم میں بھی موجود ہیں اور روح میں بھی، اور ان میں سے کسی ایک کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں ”نفس“ نکرہ کی صورت میں بیان ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات نفسِ انسانی کی اہمیت و عظمت کی طرف اشارہ ہو، ایسی عظمت جو تصور سے مافوق اور ابہام سے ملی ہوئی ہو، جو اس کے انجانے موجود کی صورت میں تعارف کراتی ہے جیسا کہ موجودہ زمانہ کے ایک عظیم ترین عالم نے انسان کو اسی عنوان سے تعبیر کیا ہے، اور انسان کا ”موجودنا شناختہ“ نام رکھا ہے۔

ہاں! جب اس کی خلقت کی تکمیل ہو گئی اور اس کی ”ہستی“ وجود میں آگئی تو خدا نے اسے ”بایدھا ونبایدھا“ (جو کام کرنے چاہئیں اور جو کام نہیں کرنے چاہئیں) کی تعلیم دی۔

اور اس طرح سے وہ ایک وجود بن گیا، جو خلقت کے لحاظ سے ”سڑی ہوئی گیلی مٹی اور روحِ الہی کا مجموعہ ہے، تعلیمات کے لحاظ سے ”فجور و تقویٰ سے آگاہ ہے“ اور نتیجہ کے لحاظ سے وہ ایک ایسا وجود ہے کہ جو قوسِ صعودی میں فرشتوں سے برتر ہو سکتا ہے، فرشتوں سے بھی آگے پرواز کر سکتا ہے، اور جو بات وہم میں بھی نہ آئے وہ بھی بن سکتا ہے، جب کہ قوسِ نزولی میں درندہ جانوروں سے بھی پست تر ہو جائے اور ”بل ہم اضل“ کے مرحلہ تک جا پہنچے، اور یہ چیز اس بات پر موقوف ہے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ کونسی راہ اختیار کرتا ہے۔

”الھما“ ”الھام“ کے مادہ سے اصل میں تو کسی چیز کے نکلنے یا پینے کے معنی ہے، اور اس کے بعد پروردگار کی طرف سے انسان کی روح میں کسی مطلب کے القاء کمرے نے کے معنی میں آیا ہے۔ گویا انسان کی روح اس مطلب کو اس کے سارے وجود کے ساتھ پی لیتی ہے اور نگل جاتی ہے۔ اور کبھی وحی کے معنی میں بھی آیا ہے۔ لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ ”الھام“ اور ”وحی“ میں فرق یہ ہے کہ وہ شخص جسے الھام ہوتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مطلب اسے کہاں سے حاصل ہوا ہے، جبکہ وحی کے وقت وہ جانتا ہوتا ہے کہ یہ اسے کہاں سے کس ذریعہ سے پہنچتی ہے۔

”فجور“ ”فجر“ کے مادہ سے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ وسیع شگاف کرنے کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ صبح کی سفیدی رات کے پردہ کو چاک کر دیتی ہے، لہذا اسے ”فجر“ کہا گیا ہے۔ اور چونکہ گناہوں کا ارتکاب بھی دیانت کے پردہ کو چاک کر دیتا لہذا اس پر ”فجور“ کا اطلاق ہوا ہے۔

البتہ زیر بحث آیت میں ”فجور“ سے مراد وہی اس کے اسباب، عوامل اور طریقے ہیں۔

اور ”تقویٰ“ سے مراد، جو ”وقایہ“ کے مادہ سے نگہداری کے معنی میں ہے، یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو قباحتوں، برائیوں، آلودگیوں اور گناہوں سے محفوظ اور دور رکھے۔

یہ بات بھی یاد دلانا ضروری ہے کہ اس آیت ﴿فَالْهٰمَٰ فَجْوَرَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ کے معنی یہ ہیں، کہ خدا نے فجور و تقویٰ کے عوامل انسان کی روح کے اندر ایجاد کر دیئے ہیں، ایسے عوامل جو اسے فجور و آلودگی اور حیا کے پردوں کو چاک کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اور ایسے عوامل جو اسے خیرات اور نیکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں، جیسا کہ بعض نے خیال کیا ہے اور آیت کو انسان کے وجود میں تضاد کے موجود ہونے کی دلیل سمجھا ہے۔

بلکہ وہ کہتا ہے کہ اس نے ان دو حقیقتوں کا اسے الھام کیا اور تعلیم دی، یا زیادہ سادہ اور آسان زبان میں اس کو اور چاہ کی نشان دہی کر دی، جیسا کہ سورہ بلد کی آیت ۱۰ میں آیا ہے: ”وھدیناہ النجدین:“ ہم نے انسان کو خیر و شر کی ہدایت کر دی ہے۔

اور دوسرے لفظوں میں خدا نے اسے تشخیص کی ایسی قدرت اور بیدار عقل و وجدان عطا کیا ہے کہ وہ ”فجور“ و تقویٰ ”عقل“ و ”فطرت“ کے طریقہ سے معلوم کر لیتا ہے۔

اسی لئے بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت حقیقت میں ”حسن و قبح عقلی“ کے مسئلہ کی طرف ایک اشارہ ہے کہ خدا نے ادراک کی توانائی انسانوں کو عطا کی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ خدا نے انسان کو بے شمار نعمتیں عطا کیں ہیں، لیکن ان تمام نعمتوں میں سے یہاں مسئلہ فجور و تقویٰ اور حسن و قبح کے ادراک پر تکیہ کیا ہے کیونکہ یہ مسئلہ انسان کی زندگی کے مسائل میں سے زیادہ قسمت کو بنا نے یا بگاڑنے والا مسئلہ ہے۔

انجام کار ان تمام اہم اور پے در پے قسموں کے بعد کے نتیجہ کو پیش نظر کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”ان چیزوں کی قسم ہے کہ ”جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وہ نجات پائے گا۔“ ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾۔

”زکھا“ ”تزکیہ“ کے مادہ سے اصل میں، جیسا کہ راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے، رشد و نمو کے معنی میں ہے اور زکوٰۃ بھی اصل میں نشو و نما اور رشد کے معنی میں ہے۔ اسی لئے ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام سے آیا ہے: ”المال تنقصه النفقة و العلم يكو ا على الانفاق“۔ ”ماتو خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے لیکن علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے اور نشو و نما پاتا ہے، (۲)

اس کے بعد یہ لفظ طہارت اور پاک کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے، شاید اس مناسبت سے کہ آلودگیوں سے پاک کرنا رشد و نمو کا سبب ہوتا ہے، اور زیر بحث آیت میں دونوں معانی کا امکان ہے۔ ہاں! رست گاری اور نجات اس شخص کے لئے ہے جو اپنے نفس کی تربیت اور نشو و نما کرے اور اسے شیطانی اخلاق و عادات، گناہ و عصیان اور کفر سے پاک رکھے۔

حقیقت میں انسان کی زندگی کا اصلی مسئلہ بھی یہی ”تزکیہ“ ہی ہے کہ اگر ہو تو وہ سعادت مند ہے ورنہ بد بخت و بے نوا ہے اس کے بعد گمروہ مخالف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”نا امید و بد بخت ہو اوہ شخص جس نے اپنے نفس کو معصیت و گناہ سے آلودہ کیا۔“ ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾۔ ”خاب“ ”خبیثہ“ کے مادہ سے، اصل میں کسی چیز کو کراہیت و ناپسندیدگی کے ساتھ داخل کرنے کے معنی میں ہے۔ (۳)

جیسا کہ قرآن مجید عرب جاہلوں کے اپنی لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کے بارے میں فرماتا ہے: ام ید سہ فی التراب: ”اسے کراہت و نفرت سے مٹی میں پنہاں کر دیتا ہے۔“ (نخل - ۹۵)

”دسیسہ“ نقصان دہ مخفی کاموں کے لئے بولا جاتا ہے۔

زیر بحث آیت کے اس معنی کی مناسبت کے بارے میں مفسرین نے مختلف بیان دیئے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا گیا کہ یہ تعبیر گناہ اور فسق سے کنایہ ہے، کیونکہ اہل تقویٰ و صلاح خود کو آشکار کرتے ہیں، جب کہ آلودہ اور رگنہار لوگ خود کو چھپاتے ہیں، جیسا کہ نقل ہوا ہے کہ عربوں میں جوگ زیادہ سخی ہوتے تھے وہ اپنے خیمے اونچی جگہ پر نصب کرتے تھے اور رات کو آگ جلا دیا کرتے تھے تاکہ حاجت مند رات میں جب چاہیں ان کے پاس آسکیں اور ان سے مانوس ہو سکیں، لیکن بخیل اور کنجوس لوگ نشیبی زمینوں میں خیمے لگاتے تھے تاکہ کوئی شخص ان کے پاس نہ آسکے۔ اور کبھی یہ کہا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ گنہار خود کو صالح لوگوں میں پنہاں کر لیتے ہیں۔

یا اپنے نفس یا اپنی ہیئتِ انسانی کو معاصی و گناہ میں چھپالیتے ہیں۔

یا معاصی و گناہ کو اپنے نفس کے اندر چھپالیتے ہیں۔

بہر حال یہ گناہ و معصیت اور شیطانی عادات سے آلودگی سے ایک کنایہ ہے۔ اور یہ ٹھک تزکیہ کا نقطہ مقابل ہے۔

اس آیت کے وسیع مفہوم میں ان تمام معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

اس طرح سے دنیاوی زندگی کے میدان میں کامیاب ہونے والے اور شکست کھانے والے مشخص ہو جاتے ہیں اور ان دونوں گروہوں کی قدر و قیمت کا معیار ”تزکیہ نفس اور روح تقویٰ و اطاعت خداوندی نمود و رشد“ یا ”انواع و اقسام کے معصی اور گناہوں سے آلودگی“ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اور اس سے وہ بات واضح ہو جاتی ہے، جو امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہے، کہ آپ نے فرمایا: ”قد افلح من اطاع و خاب من عصی“:

”جس نے اطاعت کی وہ نجات پاگیا اور جس نے نافرمانی کی وہ ناامید اور محروم ہو گیا۔“ (۴)

یہ حقیقت میں نتیجہ کا بیان اور مقصود کا ماحصل ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس وقت آیہ ”قد افلح من زکاھا“ کی تلاوت کی تو

”اللھم انت نفسی تقواھا، انت ولیھا و مولاھا، و زکھانت خیر من زکاھا“

”خدا وندا! میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا فرما، تو اس کا ولی و مولا ہے، اور اس کا تزکیہ فرما، کیونکہ تو بہترین تزکیہ

کرنے والا ہے۔“ (۵)

یہ گفتگو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس پریچ و خم راہ کو عبور کرنا اور اس دشوار گزار گھاٹی سے گزرنا پیغمبر اکرام

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کے لئے بھی توفیق الہی کے بغیر ممکن نہیں ہے، یعنی بندوں کی طرف سے قدم اٹھانے اور

خدا کی طرف سے تائیدات کے ذریعے لہذا ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دو آیات کی تفسیر میں فرمایا:

”افلحت نفس زکاکھا اللہ ، و خابت نفس خیبھا اللہ من کل خیر!“: ”جس نفس کا خدا نے تزکیہ کیا وہ نجات پاگیا، اور جس نفس کو خدا نے خیر سے محروم کر دیا وہ ناامید و محروم ہو گیا۔“ (۴)

۱۔ اس بارے میں کہ یفشاھا“ کی ضمیر کس چیز کی طرف لوٹتی ہے؟ یہاں بھی دو نظریے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ یہ ”زمین“ کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ رات ایک پردہ کی مانند ہے جو صفحہ زمین پر گرتا ہے، اور دوسرا یہ ہے کہ یہ ”سورج“ کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ رات ایک پردہ کی مانند ہے جو سورج کے چہرے پر پڑتا ہے، البتہ اس صورت میں اس کا مفہوم مجازی ہوگا، کیونکہ رات حقیقت میں سورج پر پردہ نہیں ڈالتی۔ بلکہ سورج کے غروب ہونے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت میں اگر گزشتہ آیت میں ضمیر ”ارض“ کی طرف لوٹے تو یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے اور اگر ”شمس“ کی طرف لوٹے تو پھر یہاں بھی اسی طرح ہوگا۔

۲۔ نبج البلاغہ کلمات قصار کلمہ ۱۴۷۔

۳۔ مفردات ”راغب“ و ”قاموس اللغہ“

۴۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۴۹۸۔

۵۔ ’مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۴۹۸۔

۶۔ در المنثور جلد ۶ ص ۳۵۷۔

۱۔ قرآنی قسموں کا ان کے نتائج کے ساتھ ربط

ان گیارہ انتہائی قسموں کا، اس حقیقت کے ساتھ جس کے لئے قسم کھائی ہے، کیا رابطہ ہے؟
ایسا دکھائی دیتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس حقیقت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ میں نے تم انسانوں کی سعادت و خوش بختی کے لئے تمام مادی و معنوی وسائل فراہم کئے ہیں۔

ایک طرف تو سورج اور چاند کے نور اور روشنی سے تمہاری زندگی کے میدان کو روشن کر دیا ہے اور تمہاری رات دن کے حرکت و سکون کے نظام کو منظم کر کے زمین کو تمہاری زندگی کے لئے ہر جہت سے آمادہ کیا ہے۔
دوسری طرف تمہاری روح کو تمام صلاحیتوں کے ساتھ خلق کیا ہے۔ بیدار و وجدان تمہیں عطا کیا ہے، اور اشیاء کے حسن و قبح کا تمہیں الہام کیا ہے۔ اس بناء پر سعادت کی راہ کو طے کرنے کے لئے تمہارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اس حال میں تم اپنے نفس کا تزکیہ کیوں نہیں کرتے؟ اور شیطان کے بہکانے میں کیوں آتے ہو؟

۲۔ سورج کا عالم حیات میں نقش و اثر

سورج کے بارے میں، جو نظام شمسی کا مرکز ہے اور اس کے کواکب کا رہبر و سالار ہے، دو مباحث ہیں، ایک تو اس کے عظیم ہونے کی بحث کے بارے میں ہم پہلے بحث کر چکے ہیں، اور دوسری بحث اس کی برکتوں اور آثار کے بارے میں ہے، جس کے لئے خلاصہ کے طور پر اس طرح کہا جاسکتا ہے۔

۱۔ انسان اور دوسرے موجودات کی زندگی کے لئے پہلے مرحلے میں حرارت اور روشنی کی ضرورت ہے، زندگی کے یہ دونوں امر اس آتشیں کرہ کے ذریعے کامل طور پر اعتدال کے ساتھ مہیا ہوئے ہیں۔

۲۔ تمام غذائی اشیاء سورج کی روشنی کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں، یہاں تک کہ وہ موجودات جو سمندروں کی گہرائیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ایسی نباتات سے استفادہ کرتے ہیں، جو سمندروں کی سطح پر نور آفتاب کے سائے میں اور پانی کی موجوں کے درمیان پرورش پاتے ہیں نیچے بیٹھ جاتے ہیں، یا اگر زندہ موجودات ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں تو پھر ان میں سے ایک گروہ کی غذائیات ہی ہے، جو سورج کی روشنی کے بغیر پرورش نہیں پاتی۔

۳۔ وہ تمام رنگ، زیبائیاں اور جلوے، جنہیں ہم عالم طبیعات میں دیکھتے ہیں، ایک طرح سے سورج کی چمک کے ساتھ ارتباط رکھتے ہیں اور یہ معنی مختلف علوم کے ذریعے خصوصاً فزکس میں ثابت ہو چکے ہیں۔

۴۔ حیات بخش بارشیں بادلوں سے برستی ہیں، اور بادل وہی بخارات ہیں جو سمندروں کی سطح پر سورج کے چمکنے سے وجود میں آتے ہیں، اس بناء پر پانی کے تمام منابع جو بارش سے غذا حاصل کرتے ہیں، چاہے وہ دریا ہوں یا چشمے، نہریں ہوں یا کھال، یا گہرے کنویں، سب سورج کی روشنی کی برکات سے ہیں۔

۵۔ وہ ہوائیں جن کا کام فضا کو معتدل کرنا، بادلوں کو مختلف جگہوں تک پہنچانا، نباتات کی تلقیح اور پیوند لگانا، اور گرمی اور سردی کو گرم علاقوں سے سرد علاقوں کی طرف، اور سرد علاقوں سے گرم علاقوں کی طرف منتقل کرنا ہے۔ آفتاب کے نور اور روشنی کے زیر اثر روئے زمین کے مختلف منطقوں کے درجہ حرارت کے بدلنے سے وجود میں آتی ہیں۔ اور اس طرح سے وہ بھی سورج سے سرمایہ حاصل کرتی ہیں۔

۶۔ انرجی پیدا کرنے والے مادے اور منابع، چاہے وہ آبشار ہوں، یا وہ بڑے بڑے بند ہوں، جنہیں کوہستانی علاقوں میں بنایا جاتا ہے، پیٹرول اور تیل کے منابع، اور پتھر کو نلے کی کانیں، یہ سب کے سب ایک طرح سے سورج کے ساتھ پیوند رکھتے ہیں، کہ اگر وہ نہ ہوتا تو ان منابع میں سے کوئی بھی موجود نہ ہوتا اور صفحہ زمین میں تمام حرکتیں سکوت میں بدل جاتیں۔

۷۔ نظام شمسی کی بقاء جاذبہ و واقعہ کے اعتدال کی بناء پر ہے، جو ایک طرف تو کمرہ آفتاب کے درمیان اور دوسرے ان سیاروں کے درمیان، جو اس کے گردش کرتے ہیں، وجود رکھتا ہے۔ اس طرح سے سورج ان سیاروں کے اپنے مداروں میں محفوظ رہنے میں بہت موثر نقش و اثر رکھتا ہے۔

اس ساری گفتگو سے معلوم ہوتا ہے، کہ اگر خدا نے پہلی قسم کی ابتداء سورج سے کی ہے، تو اس کی کیا وجہ تھی؟ اسی طرح سے چاند اور دن کی روشنی، اور رات کی تاریکی کمرہ زمین میں سے ہر ایک انسان اور غیر انسان کی زندگی میں ایک اہم نقش و اثر رکھتے ہیں، اسی بناء پر ان کی قسم کھائی گئی ہے اور ان سب سے بڑھ انسان کی روح اور اس کا جسم ہے، جو ان سب سے زیادہ اسرار آمیز اور حیرت انگیز ہے۔

تہذیب نفس کے بارے میں ہم اس سورہ کے آخر میں ایک بحث کریں گے۔

آیات ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵

۱۱۔ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا﴾ ۱۲۔ ﴿إِذْ أَنْبَأْتُ اشْقَاهَا﴾ ۱۳۔ ﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا﴾۔

۱۴۔ ﴿فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمُ رَبُّهُم بِذَنْبِهِمْ فَسَوَّاهَا﴾ ۱۵۔ ﴿وَلَا يَخَافُ عَقْبَاهَا﴾۔

ترجمہ

۱۱۔ قوم ثمود نے سرکشی کی وجہ سے (اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی۔

۱۲۔ جب کہ ان کا ایک شقی ترین آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔

۱۳۔ اور خدا کے بھیجے ہوئے رسول (صلح) نے ان سے کہا: اس کے ناقے کو اس کے پانی پینے کے لئے چھوڑ دو (اور اس کی مزاحمت نہ کرو)۔

۱۴۔ لیکن انہوں نے اس کی تکذیب کی، اور ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں، اور اسے ہلاک کر دیا، لہذا ان کے خدا نے انہیں اس گناہ کی بناء پر جسکے وہ مرتکب ہوئے تھے تباہ کر دیا، اور ان کی زمین کو ہموار کر دیا۔

۱۵۔ اور وہ ہرگز اس کام کے انجام دینے سے نہیں ڈرتا۔

سرکشوں کا ہلاکت خیز انجام

اس تنبیہ کے بعد، جو گزشتہ آیات میں ان لوگوں کے بارے میں آئی تھی، جو اپنے نفس کو آلودہ کرتے ہیں، ان آیات میں نمونہ کے طور پر اس مطلب کی ایک واضح تاریخی مثال کو پیش کیا ہے اور سرکش قوم (ثمود) کی سرنوشت کو قاطع اور پر معنی عبارتوں کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”قوم ثمود نے سرکشی کی وجہ سے (اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی“۔ (کذبت ثمود بطغواھا)۔

”طغوی“ اور طغیانی “دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، اور وہ حد اور سرحد سے تجاوز کرنا ہے اور یہاں حدود الہی سے تجاوز کرنا اور اسکے فرامین کے مقابلہ میں سرکشی مراد ہے۔^(۱)

قوم ثمود، جن کے پیغمبر کا نام ”صلح“ تھا قدیم ترین اقوام میں سے ہے، جو ”حجاز“ اور ”شام“ کے درمیان ایک کوہستانی علاقے میں رہتی تھی۔ ان کی زندگی مرفہ الحال تھی، زمینیں آباد، ہموار میدان اور زراعت کے لئے عمدہ مٹی، شان و شوکت والے محلات، اور مضبوط و مستحکم گھر رکھتے تھے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ ان سب نعمتوں کا شکر ادا نہیں

کرتے تھے، بلکہ سرکشی کرتے ہوئے اپنے پیغمبر صالح علیہ السلام کی تکذیب کے لئے کھڑے ہو گئے، آیاتِ الہی کا مذاق اڑایا اور آخر کار خدا نے انہیں ایک آسمانی بجلی کے ذریعے نابود کر دیا۔

اس کے بعد اس قوم کی ایک ظاہری سرکشی کو پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: جبکہ ان کا ایک شقی ترین آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ ﴿اِذَا نَبِعثُ اشْقَاهَا﴾۔

”اشقی“ اس قوم کے شقی ترین اور سنگ دل ترین آدمی کے معنی میں ہے جو اس شخص کی طرف اشارہ ہے جس نے ناقہ صالح علیہ السلام کو ہلاک کیا تھا، وہی اونٹنی (ناقہ) جو ایک معجزہ کے طور پر اس قوم کے درمیان ظاہر ہوئی تھی اور اس کو ہلاک کرنا اس پیغمبر الہی کے ساتھ اعلانِ جنگ تھا۔

مفسرین اور مورخین کے قول کے مطابق اس شخص کا نام ”قدار بن سالف“ تھا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم اور حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: ”من اشقی الاولین؟“

”پہلی قوموں میں سب سے زیادہ شقی اور سنگ دل کون تھا“ علی علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا: ”عافر الناقة“ وہ جس نے ناقہ ثمود کی کوئیں کاٹ کر ہلاک کر دیا تھا“

پیغمبر نے فرمایا: ”صدقت، فمن اشقی الآخرين؟“

”تم نے سچ کہا۔ آخری اقوام میں شقی ترین آدمی کون ہے؟“

علی علیہ السلام کہتے ہیں: میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے معلوم نہیں ہے، تو پیغمبر نے فرمایا: ”الذی یضرب علی ہذہ و اشارہ الی یافوخہ“ جو شخص سر کے اس مقام پر ضرب لگائے گا“ اور پیغمبر نے آپ کی پیشانی کے اوپر والے حصہ کی طرف اشارہ کیا ”۳/۲“

بعد والی آیت میں قوم ثمود کی سرکشی کے بارے میں مزید تشریح پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اللہ کے رسول (حضرت صالح) نے ان سے کہا: خدا کے ناقہ کو اس کا پانی پینے کے لئے آزاد چھوڑ دو اور اس کی مزاحمت نہ کرو“۔ ﴿فَقَالَ رَسُولُ

اللہ ناقة و سقیها﴾۔ (۴)

یہاں ”رسول اللہ“ سے مراد قوم ثمود کے پیغمبر، حضرت صالح علیہ السلام ہیں، اور ناقہ اللہ (وہ اونٹنی جو خدا کی طرف منسوب ہے)۔ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اونٹنی کوئی معمولی اونٹنی نہیں تھی بلکہ صالح علیہ السلام کی صداقت کی ایک گویا اور ناطق سند اور معجزہ کے عنوان سے بھیجی گئی تھی۔ مشہور روایت کے مطابق اس کی ایک

خصوصیت یہ تھی کہ مذکورہ اونٹنی پہاڑ کے ایک پتھر کے اندر سے نکلی تھی تاکہ وہ ہٹ دھرم منکرین کے لئے ایک گویا و ناطق معجزہ ہو۔

قرآن مجید کی دوسری آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں یہ خبر دی تھی کہ بستی کے پینے کا پانی ان کے اور ناقہ کے درمیان تقسیم ہو۔ ایک دن ناقہ کے لئے ہوگا اور ایک بستی والوں کے لئے ہوگا، اور ان میں سے ہر ایک اپنی باری پر پانی سے فائدہ اٹھائے گا۔ اور ایک دوسرے کے لئے مزاحم نہیں ہوگا:

”﴿وَنَبِّئِهِمْ اَنْ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلٌّ شَرْبٌ مَّخْتَصِرٌ﴾“ (قر۔ ۲۸)

اور انہیں خصوصیت کے ساتھ بتلادیا گیا: اگر تم نے اس ناقہ کو ہاتھ لگایا تو عذاب الہی تمہارے دامن گیر ہو جائے گا: ”﴿وَلَا تَمْسُوْهَا بِسَوْءٍ فَيَاْخُذْكُمْ عَذَابٌ يُّوْمٍ عَظِيْمٌ﴾“ (شعراء۔ ۱۵۶)

اور بعد والی آیت میں فرماتا ہے: اس سرکش قوم نے اس عظیم پیغمبر کے کلمات اور اس کی تنبیہات کی کوئی پرواہ نہ کی، اس کی تکذیب کی اور ناقہ کو ہلاک کر دیا ”﴿فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا﴾“۔

”﴿عَقَرُوْهَا﴾“ ”عقر“ کے مادہ سے (جو ظلم کے وزن پر ہے) کسی چیز کی اصل اور جڑ بنیاد کے معنی میں، اور عقر ناقہ کا معنی اس کی جڑ کاٹنے اور ہلاک کرنے کے معنی میں ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد اس کی کونچیں یعنی اس جانور کے پاؤں کے نچلے حصہ کو کاٹنا اور اسے زمین پر پھینکنا ہے کہ اس کا نتیجہ بھی اس حیوان کی موت ہی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جس شخص نے ناقہ کو ہلاک کیا تھا وہ ایک ہی تھا جسے قرآن نے ”اشقی“ سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اوپر والی آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس عمل کی قوم ثمود کے تمام سرکشوں اور طغیان گروں کی طرف نسبت دی گئی ہے، اور ”عقر وہا“ جمع کے صیغہ کی صورت میں آیا ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس طرح سے اس کام میں حصہ دار تھے، کیونکہ اولاً اس قسم کی سازشیں عموماً گروہ اور جمیعت کے توسط سے پیش ہوتی ہیں اس کے بعد معین آدمی یا چند افراد کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ ثانیاً چونکہ دوسروں کی رضا اور خشنودی سے انجام پاتی ہیں تو وہ ان کی اس کام میں شرکت کا سبب بن جاتا ہے، یعنی رضامندی نتیجہ میں شرکت کا سبب بنتی ہے۔

اسی لئے امیر المومنین علی علیہ السلام کے فصیح و بلیغ کلام میں آیا ہے:

”ناقہ ثمود کو صرف ایک ہی شخص نے ہلاک کیا تھا، لیکن خدا نے عذاب میں سب کو شامل کیا ہے کیونکہ وہ سب اس امر پر راضی تھے، اسی لئے فرماتا ہے:

”ان (سب نے) ناقہ کو ہلاک کیا، اور اس کے بعد وہ سب اپنے کئے پر نادم ہوئے۔“ (لیکن اس وقت جب پشیمانی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔^(۵))

اس تکذیب اور شدید مخالفت کے بعد خدا نے انہیں ایسی سزا دی کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا، جیسا کہ اسی آیت کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے: ”ان کے پروردگار نے ان کے اس گناہ کی بناء پر جس کے وہ مرتکب ہوئے تھے سب کو نابود کر دیا، اور ان کی سرزمین کو صاف اور ہموار بنا دیا“ ﴿فدمدم علیہم ربحم بذنبہم فسواھا﴾۔

صاعقہ یعنی اس عظیم آسمانی چیخ نے چند ہی لمحوں کے اندر اندر ان کی سرزمین کو ہلاک کر دیا اور ایسا زلزلہ پیدا کیا کہ ان کے سارے کے سارے مکانات زمین بوس ہو گئے، اور ان کے گھروں کو ان کی قبروں میں بدل کر رکھ دیا۔ ”دمدم“ ”دمدمۃ“ کے مادہ سے، کبھی ہلاک کرنے کے معنی میں آیا ہے، اور کبھی عذاب اور نامکمل سزا کے معنی میں، بعض اوقات کوٹنے اور نرم کرنے کے معنی میں آیا ہے، اور کبھی جڑ سے اکھاڑنے کے معنی میں اور کبھی غضب ناک ہونے کے معنی میں یا احاطہ کرنے اور گھیر لینے کے معنی میں،^(۶)

اور زیر بحث میں یہ سب معانی صادق آتے ہیں کیونکہ اس وسیع عذاب کا سرچشمہ غضب الہی ہے، اور ان سب کی اس نے سرکوبی کی، انہیں کمزور کیا اور انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

”سواھا“ ”تسویہ“ کے مادہ سے، ممکن ہے کہ صحیحہ عظیم اور صاعقہ و زلزلہ کی وجہ سے ان کے گھروں کا صفایا کرنے اور ان کی زمینوں کو صاف کرنے کے معنی میں ہو، یا اس گروہ کو ایک طرف ٹھکانے لگانے کے معنی میں ہو، یا ان سب کی سزا و عذاب میں مساوات کے لئے ہو اس طرح کہ ان میں سے کوئی بھی اس ماجرے سے صحیح و سالم نہ بچا۔ ان معانی کے درمیان بھی جمع ممکن ہے۔

”سواھا“ میں ضمیر ”قبیلہ“ ثمود کی طرف لوٹی ہے، یا ان کے شہروں اور آبادیوں کی طرف، جنہیں خدا نے مٹی میں ملا کر یکساں کر دیا۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ”دمدم“ کی طرف لوٹتی ہے جو بعد والے جملہ سے معلوم ہوتی ہے، یعنی خدا نے اس خشم و غضب و ہلاکت کو ان کے درمیان یکساں قرار دیا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے یہ ”دمدم“ کی طرف لوٹتی ہے جو بعد

والے جملہ سے معلوم ہوتی ہے، یعنی خدا نے اس خشم و غضب و ہلاکت کو ان کے درمیان یکساں قرار دیا، اور اس طرح سے کے تمام کو اس نے گھیر لیا۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سزا اور عذاب ان کے گناہ کا نتیجہ، اور اس کے ساتھ مناسبت رکھتا تھا اور یہ عین عدالت و حکمت ہے۔

بہت سی اقوام کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ وہ آثار عذاب کے ظہور کے وقت پشیمان ہو گئیں، اور توبہ کی راہ اختیار کر لی، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جس وقت صلح علیہ السلام کی قوم نے عذاب کی نشانیاں دیکھیں تو وہ صلح علیہ السلام کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے کہ جہاں کہیں بھی وہ مل جائیں انہیں ہلاک کر دیں۔

(۷)

اور یہ خدا اور پیغمبر کے مقابلہ میں ان کے عصیان و سرکشی کے شدید ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن خدا نے صلح علیہ السلام کو نجات دی اور اس قوم کو ہلاک کر دیا، اور ان کی زندگی کے دفتر کو کلی طور پر پلٹ دیا۔

انجام کار آخری آیت میں ان تمام لوگوں کو جو اسی راستہ پر چلتے ہیں، سخت تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اور خدا کو اس کام کے انجام کا کوئی خوف نہیں ہے“۔ ﴿وَلَا يَخَافُ عِقَابَا﴾۔

بہت سے حاکم ہیں جو سزا دینے پر قدرت رکھتے ہیں، لیکن وہ ہمیشہ اس کے نتیجہ اور انجام سے ڈرتے رہتے ہیں، اس کے رد عمل اور عکس العمل سے خوف زدہ رہتے ہیں اور اسی بناء پر اپنی قدرت سے فائدہ اٹھاتے، اور زیادہ صحیح تعبیر میں ان کی قدرت ضعف و ناتوانائی کے ساتھ اور ان کے علم و جہالت کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان میں اس کے برے نتائج کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو۔

لیکن خداوند قادر متعال جس کا علم ان تمام امور اور ان کے عواقب و آثار پر احاطہ رکھتا ہے، اور اس کی قدرت میں حوادث کے برے نتائج کے مقابلہ میں کسی قسم کے ضعف و ناتوانی کی آمیزش نہیں ہوتی۔ اور اسی بناء پر انتہائی قدرت اور قاطعیت کے ساتھ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے انجام دے تا ہے۔

سرکشوں کو بھی اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑے گی، لہذا انہیں اپنے اعمال کی وجہ سے خدا کے خشم و غضب کا مشمول ہونے سے خود کو بچانا چاہیئے۔

”عقبی“ اختتام، انتہا اور انجام کار کے معنی میں ہے اور ”عقباھا“ کی ضمیر ”دممہ“ اور ہلاکت کی طرف لوٹتی ہے۔

۱۔ بعض علماء لغت کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ”طغیان“ ناقص وادی کی صورت میں بھی آیا ہے اور ناقص پانی کی صورت میں بھی۔ ”طغوی“ ناقص وادی کے مادہ سے لیا گیا ہے، اور ”طغیان“ ناقص پانی سے (غور کیجئے)

۲۔ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۹۹، یہی معنی کچھ مختصر صورت میں تفسیر قرطبی میں بھی آیا ہے، جلد ۶ ص ۷۱۶۸۔

۳۔ ”یافوخ“ سر کے اس اگلے حصہ کو کہا جاتا ہے، جو بچوں میں بالکل نرم ہوتا ہے، اور آہستہ آہستہ ہڈی کی صورت اختیار کرتا ہے، اور مضبوط، اور وہ سر کا حساس ترین مقام ہے۔

۴۔ ”ناقة الله“ منصوب ہے، ایک فعل محذوف سے اور تقدیر میں اس طرح ہے، ذرو اناقة الله و سقياھا، اس کے مشابہ کو جو سورہ اعراف کی آیہ ۷۳ اور سورہ ہود کی آیہ ۶۴ میں آیا ہے۔

۵۔ نبج البلاغہ خطبہ ۲۰۱۔

۶۔ مفردات راغب، لسان العرب، مجمع البیان اور تفسیر کی دوسری کتابیں۔

۷۔ روح البیان، جلد ۱۰، ص ۴۴۶۔

۱۔ قوم ثمود کی سرگزشت کا خلاصہ

قوم ”ثمود“ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، مدینہ اور شام کی درمیانی سرزمین میں (جس کا نام وادی القریٰ ہے) زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کا دین و مذہب بت پرستی تھا اور وہ انواع و اقسام کے گناہوں میں ملوث تھے خدا کے عظیم پیغمبر صالح علیہ السلام ان میں مبعوث ہوئے اور ان کی ہدایت اور نجات کے لئے کمر ہمت باندھی، لیکن ناتویہ لوگ بت پرستی سے دست بردار ہوئے اور نہ ہی انہوں نے سرکشی اور گناہ کے بارے میں اپنا نظریہ بدلا۔

جب انہوں نے معجزہ کا تقاضا کیا تو خدا نے ایک ناقہ (اونٹنی) اعجاز آمیز اور خارق العادہ طریقے سے پہاڑ کے اندر سے نکالی، لیکن اس بناء پر کہ اس بارے میں ان کی آزمائش کرے یہ حکم دیا کہ اس بستی کا ایک دن کا سارا پانی اس اونٹنی کے لئے رہے گا اور دوسرے دن کا پانی خود استعمال کریں گے یہاں تک کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جب وہ پانی سے محروم رہتے تھے تو اونٹنی کے دودھ سے فائدہ اٹھاتے تھے، لیکن عظیم معجزہ بھی ان کی ہٹ دھرمی اور فسق و فجور میں کمی نہ کر سکا۔

لہذا انہوں نے ناقہ کو نابود کرنے کا منصوبہ بنایا اور حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کا بھی، کیونکہ وہ انہیں اپنی خواہشات اور ہوا و ہوس میں مزاحم سمجھتے تھے۔

ناقہ کی نابودی کا منصوبہ ایک بہت ہی بے رحمی اور شقی آدمی ”قدار بن سالف“ کے ذریعے عمل میں آیا ہے اور اس نے کئی ضربوں کے ساتھ ناقہ کو زمین پر ڈھیر کر دیا۔

یہ بات حقیقت میں خدا کے ساتھ اعلان جنگ تھی، کیونکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ناقہ کو ختم کر دینے سے، جو صالح علیہ السلام کا معجزہ تھی، نور ہدایت کو خاموش کر دیں گے۔ اس موقع پر حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ تین دن تک اپنے گھروں میں جس نعمت سے لذت حاصل کرنا چاہیں کر لیں، لیکن وہ اچھی طرح جان لیں کہ تین دن کے بعد عذاب الہی سب کو گھیر لے گا۔ (سورہ ہود - ۶۵)

یہ تین دن آخری غور و فکر کے لئے مہلت تھی، اور توبہ و بازگشت کے لئے ایک آخری فرصت۔ لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ تجدید نظر نہیں کی، بلکہ ان کے طغیان و سرکشی میں اضافہ ہو گیا۔ اس موقع پر عذاب الہی ان پر نازل ہوا اور

”صیحه آسمانی“ ﴿وَإِذَا الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ﴾ (ہود - ۶۷)۔

وہ ایسے نابود ہوئے، اور ان کی سر زمین اس طرح خاموش ہوئی کہ گویا ہر گزہر گزان گھروں میں کوئی رہتا ہی نہیں تھا۔
لیکن خدا نے صالح اور ان کے مومن اصحاب کے اس مہلکے سے نجات بخشی (ہود- ۶۶)
قوم ثمود کی سرگزشت کی مزید تفصیل کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۵ ص ۳۱۲ سے آگے مطالعہ کریں

۲۔ اشقی الاولین“ و اشقی الاخرین“

شیعہ و سنی بزرگ علماء کی ایک جماعت منجملہ ثعلبی، واحدی، ابن مردویہ، خطیب بغدادی، طبری موصلی اور احمد حنبل وغیرہ نے اپنی اپنی اسناد کے ساتھ عمار یاسر (رض) جابر بن سمرہ (رض) اور عثمان (رض) بن صہیب کی وساطت سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح نقل کیا ہے کہ آپ نے علی علیہ السلام سے فرمایا:

”یا علی ! اشقی الاولین عاقر الناقة، اشقی الاخرین قاتلک، و فی رواية من یحضب هذه من هذا:

”اے علی ! پہلے لوگوں میں سے بد بخت ترین شخص وہ تھا جس نے ناقہ صالح کو قتل کیا، اور پچھلے لوگوں میں سے بد بخت ترین آدمی تیرا قاتل ہے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ جو اس سے رنگین کرے گا، (جو اس طرف اشارہ ہے کہ تیری داڑھی کو تیرے سر کے خون سے خضاب کرے گا)۔“^(۱)

حقیقت میں ناقہ صالح کی کونچیں کاٹنے والے ”قدابن یوسف“ اور امیر المومنین کے قاتل ”عبدالرحمن بن ملجم مرادی“ کے درمیان ایک شبابہت موجود تھی، ان دونوں میں سے کسی کو بھی ذاتی رنجش نہیں تھی، مسلمان بھی امیر المومنین علی کی شہادت کے بعد جابر اور بیداد گری بنی امیہ کی حکومت کے زیر تسلط دردناک ترین عذابوں کے شاہد ہوئے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”حاکم جسکانی“ نے شواہد التنزیل“ میں اس سلسلہ میں بہت زیادہ روایت نقل کی ہیں، جو مضمون و مطالب کے لحاظ سے اوپر والی روایت کے مشابہ ہیں^(۲)

۱۔ ”تفسیر نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۵۸۷۔

۲۔ شواہد التنزیل“ جلد ۲ ص ۳۵ تا ۳۴۳۔

۳۔ تہذیب نفس ایک عظیم خدائی وظیفہ ہے

جس قدر قرآنی قسمیں کسی چیز کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ محکم ہوں وہ اس موضوع کی اہمیت کی دلیل ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ زیادہ طولانی اور زیادہ تاکیدی قسمیں اسی سورہ میں ہیں، خصوصاً خدا کی ذات پاک کی قسم کا اس میں تین مرتبہ تکرار ہوا ہے۔ اور انجام کار اس مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے کہ فلاح و رست گاری تزکیہ نفس میں ہے۔ اور محرومیت اور شکست و بد بختی تزکیہ کے ترک کر دینے میں ہے۔

حقیقت میں انسانی زندگی کا اہم ترین مسئلہ بھی یہی مسئلہ ہے۔ اور حقیقتاً قرآن نے اوپر والے معنی کے ساتھ مفہوم کو واضح کر دیا ہے کہ انسان کی نجات و رست گاری تصورات اور خیالوں کی مرہون منت نہیں ہے، نہ ہی مال و ثروت اور مقام و منصب کے سایہ میں اور نہ ہی دوسرے اشخاص کے اعمال کے ساتھ وابستہ ہے۔ (جیسا کہ عیسائی خیال کرتے ہیں کہ ہر شخص کی نجات عیسیٰ مسیح کی فداکاری کی مرہون منت ہے) اور نہ ہی اس قسم کی دوسری باتوں میں۔ بلکہ نجات انسانی ایمان و عمل صالح کے سایہ میں روح و جان کی پاکیزگی اور بلندی کی مرہون منت ہے۔

انسان کی بد بختی اور شکست بھی نہ ہو تو اجباری قضا و قدر میں ہے، اور نہ ہی الزامی سرنوشتوں میں، اور نہ ہی دوسروں کے لئے ہوئے کاموں میں، بلکہ وہ صرف اور صرف گناہ کی آلودگی سے بچے رہنے میں ہے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرنے میں ہے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) نے، جب یوسف خزانوں کے مالک اور سرزمین مصر کے حاکم بن گئے، ان سے ملاقات کی اور کہا:

”ان الحرص و الشهوة تصیر الملوک عبیداً، وان الصبر و التقویٰ یصیر العبد ملوکاً، فقال یوسف قال اللہ تعالیٰ انہ من یتق و یصبر فان اللہ لایضیع اجر المحسنین“۔

”حرص و شہوت بادشاہوں کو غلام بنادیتے ہیں اور صبر و تقویٰ غلاموں کو بادشاہ بنادیتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے اس کی بات کی تصدیق کی، اور یہ کلام اسے یاد دلایا: ”جو شخص تقویٰ اور صبر و شکیبائی اختیار کرے گا تو خدا نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔“^(۱)

یہی مطلب ایک دوسری عبارت میں نقل ہوا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی ایک راہ گزر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ یوسف کی سواری وہاں سے گزری، تو زلیخا نے کہا: الحمد للہ الذی جعل الملوک بمعصیتهم عبیداً، و جعل العبید بطاعتهم ملوکاً: ”سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں کہ جس نے بادشاہوں کو معصیت اور نافرمانی کی بناء پر غلام بنا دیا، اور غلاموں کو اطاعت و فرماں برداری کی وجہ سے بادشاہ“۔^(۲)

ہاں نفس کی بندگی انسان کی غلامی کا سبب ہے، اور تقویٰ و تہذیبِ نفس عالم ہستی پر حکومت کرنے کا سبب ہے۔ ایسے افراد کتنے زیادہ ہیں جو خدا کی بندگی اور طاعت کی وجہ سے ایسے بلند مقام تک پہنچے ہیں کہ ولایتِ تکوینی کے مالک بن گئے، خدا کے اذن سے اس عالم کے حوادث میں اثر انداز ہو سکتے ہیں اور کرامات و خوارقِ عادات پر دسترس رکھ سکتے ہیں۔

خداوند! ہوائے نفس کے ساتھ مبارزہ کرنے میں تو ہامری مدد اور نصرت فرما۔

پروردگار! تو نے ہمیں ”فجور“ و ”تقویٰ“ کا الہام کیا ہے۔ ہمیں اس الہام سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عنایت فرما۔ بارِ الہا! شیطان کے مکرو فریب انسان کے نفس میں مخفی و پوشیدہ ہیں، ہمیں ان مکروں کی شناخت سے آشنا کر دے!

آمین یا رب العالمین

۱۔ ”مجتہ البیضاء“ جلد ۵ ص ۱۱۶۔

۲۔ ”مجتہ البیضاء“ جلد ۵ ص ۱۱۷۔

سورہ اللیل

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اس کی ۲۱ آیات ہیں

سورہ ”اللیل“ کے مضامین

یہ سورہ جو مکی سورتوں میں سے ہے اور مکی سورتوں کی خصوصیات کا حامل ہے، مختصر آیات کے ٹکڑوں میں ہے، لیکن ان کے مضامین گرما گرم اور تیز ہیں، اور زیادہ ترقیامت، خدائی جزا و سزا اور اس کے عوامل و اسباب کے بارے میں ہیں۔ ابتداء میں تین قسموں کو ذکر کے لئے کے بعد لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ تقویٰ کے ساتھ انفاق کرنے والے۔

۲۔ وہ بخیل جو قیامت کے اجر و پاداش کے منکر ہیں، پہلے گروہ کا انجام کار خوش بختی اور راحت و آرام ہے جب کہ دوسرے گروہ کا انجام سختی، تنگی اور بد بختی ہے۔

اس سورہ کے دوسرے حصہ میں اس معنی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہ بندوں کو ہدایت کرنا خدا کا کام ہے، سب لوگوں کو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرایا ہے۔

اور آخری حصہ میں، ان لوگوں کے، جو اس آگ میں جلیں گے، اور اس گروہ کے جو اس سے نجات پائیں گے، اوصاف بیان کرتے ہوئے تعارف کرایا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبر اکرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”من قرائها اعطاه الله حتى یرضی، و عافاه من العسر و یسر له الیسر“^(۱)

”جو شخص اس سورہ کی تلاوت کرے گا خدا اسے اس قدر عطا کرے گا کہ وہ راضی اور خوش ہو جائے گا، اور اسے سختیوں سے نجات دے گا اور زندگی کی راہوں کو اس کے لئے آسان کر دے گا۔“

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱

﴿بسم الله الرحمن الرحيم﴾

۱۔ ﴿و اللیل اذا یغشی﴾ - ۲۔ ﴿و النہار اذا تجلی﴾ - ۳۔ ﴿وما خلق الذکر و الانثی﴾ - ۴۔ ﴿انّ سعیکم لشتی﴾ -

۵۔ ﴿فَامَا مِنْ اَعْطٰی وَاَنْقٰی﴾ - ۶۔ ﴿وَصَدَقَ بِالْحَسَنٰی﴾ - ۷۔ ﴿فَسَنِيْسِرْهٖ لِّلِيْسِرٰی﴾ - ۸۔ ﴿وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاَسْتَغْنٰی﴾ -

۹۔ ﴿كَذَبَ بِالْحَسَنٰی﴾ ۱۰۔ ﴿فَسَنِيْسِرْهٖ لِّلِيْسِرٰی﴾ ۱۱۔ ﴿وَمَا يَغْنٰی عَنْهٖ مَا اِذَا تَرَدَّدٰی﴾

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

۱۔ قسم ہے رات کی جبکہ وہ عالم کو ڈھاپ لے - ۲۔ اور قسم ہے دن کی جب کہ وہ تجلی کرے - ۳۔ اور قسم اس کی جس نے مذکر مونث پیدا کئے -

۴۔ کہ تمہاری سعی و کوشش مختلف ہے - ۵۔ پس وہ خدا کہ جو (راہ خدا میں انفاق کرے اور پرہیزگاری) اختیار کرے -

۶۔ اور (خدا کی) نیک جزا کی تصدیق کرے - ۷۔ ہم اس کی راہوں کو آسان بنادیں گے -

۸۔ لیکن جو شخص بخل کرے، اور اس طریقہ سے بے نیاز ہونا چاہے - ۹۔ اور (خدا کی) اچھی جزاؤں کی تکذیب کرے -

۱۰۔ ہم عنقریب اس کی راہوں کو دشوار بنادیں گے -

۱۱۔ اور جس وقت وہ (جہنم یا قبریں) گرے گا تو اس کے اموال اس کی حالت کے لئے مفید ہوں گے -

سورہ ”واللیل کا شان نزول

مفسرین نے اس سالم سورہ کے لئے ابن عباس (رض) سے ایک شانِ نزول نقل کی ہے۔ ہم اس شانِ نزول کو مرحوم طبرسی کی ”مجمع البیان“ سے نقل کرتے ہیں:

مسلمانوں میں سے ایک شخص کے کھجور کے درخت کی ایک شاخ ایک فقیر عیال دار کے گھر کے اوپر پہنچی ہوئی تھی۔ کھجور والا جب خرے اتارنے کے لئے کھجور پر چڑھتا تو بعض اوقات خرے کے کچھ دانے اس فقیر آدمی کے گھر میں جا گرتے اور اس کے بچے انہیں اٹھا لیتے وہ شخص کھجور کے درخت سے اتر کر خرے چھین لیتا، (اور وہ اتنا بخیل اور سنگ دل تھا کہ) اگر ان میں سے کسی کے منہ میں بھی خرے کا دانہ دیکھتا تو اس کے منہ میں انگلی ڈال کر نکال لیتا۔ اس مرد فقیر نے پیغمبر کی خدمت میں شکایت کی: حضور نے فرمایا: تم جاو میں تمہارا یہ کام کرتا ہوں: اس کے بعد آپ نے کھجور

والے سے ملاقات کی یہ درخت جس کی شاخیں فلاں شخص کے گھر کے اوپر پہنچی ہوئی ہیں، مجھے دے دے تاکہ اس کے مقابلہ میں جنت میں ایک درخت دوں۔ اس نے کہا میرے پاس کھجور کے بہت سے درخت ہیں لیکن کسی کے خرے اس درخت کے جیسے اچھے نہیں ہیں۔ (لہذا میں یہ سودا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں)۔ اصحاب پیغمبر میں سے کسی نے یہ گفتگو سن لی۔ اس نے عرض کیا: اے رسول اللہ اگر میں جا کر یہ درخت اس شخص سے خرید لوں، اور آپ کو دیدوں تو آپ وہی چیز جو اس کو دے رہے تھے مجھے عطا فرمائیں گے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اس شخص نے جا کر درخت والے سے ملاقات کی اور اس سے اس سلسلہ میں بات کی، کھجور کے مالک نے کہا: کیا تجھے معلوم ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے بدلے میں جنت میں کھجور کا ایک درخت مجھے دینے کے لئے تیار تھے۔ (لیکن میں نے قبول نہیں کیا)۔ اور میں نے انہیں یہ کہہ دیا کہ میں اس کے خرے سے بہت لذت اندوز ہوتا ہوں، میرے پاس بہت سے کھجور کے درخت ہیں لیکن کسی کے خرے اتنے اچھے نہیں ہیں۔

خریدار نے کہا کیا تو بیچنا چاہتا ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: میں اسے نہیں بیچوں گا، مگر صرف اس صورت میں کہ تو اتنی رقم مجھے دے دے کہ کوئی نہیں دے گا۔ اس نے کہا: تو کتنی رقم لینا چاہتا ہے؟ اس نے کہا چالیس درخت۔ خریدار نے تعجب کرتے ہوئے کہا: تو ایسے کھجور کے درخت کی جو ٹیڑھا ہو چکا ہے بہت ہی بھاری قیمت مانگتا ہے۔ چالیس کھجور کے درخت!

پھر تھوڑے سے سکوت کے بعد اس نے کہا: بہت اچھا، میں خرے کے چالیس درخت تجھے دیتا ہوں۔ بیچنے والے (لاالچی) نے کہا اگر تو سچ کہتا ہے تو کچھ آدمیوں کو گواہی کے لئے بلا لے! اتفاقاً کچھ لوگ وہاں سے گزر رہے تھے اس نے انہیں آواز دی اور انہیں اس معاملہ پر گواہ بنایا۔

اس کے بعد وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: اے رسول خدا! وہ کھجور کا درخت میری ملکیت میں آگیا ہے، اور میں اسے آپ کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں۔

پیغمبر اکرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقیر کے گھر والوں کے پاس گئے اور صاحب خانہ سے کہا: ”یہ کھجور کا درخت تیرا اور تیرے بچوں کا ہے۔ اس موقع پر سورہ ”واللیل“ نازل ہوئی (اور بخیلوں اور سخیوں کے بارے میں ان کے لائق باتیں کہیں)۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس خریدار کا نام ”ابوالاحداح“ تھا۔^(۲)

تقویٰ اور خدائی امدادیں

اس سورہ کے آغاز میں ہم پھر تین فکر انگیز (مخلوقات اور خالقِ عالم کی) قسموں کا سامنا کر رہے ہیں، فرماتا ہے: ”قسم ہے رات کی جبکہ وہ سارے جہاں کو ڈھانپ لے“۔ ﴿وَاللَّیْلِ إِذَا یَغْشَى﴾۔
 ”یغشی“ کی تعبیر ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ رات کی تاریکی پردہ کی طرح آدھے کرہ زمین پر پڑتی ہے، اور اسے اپنے نیچے ڈھانپ لیتی ہے۔

یا اس بنا پر کی دن کا چہرہ یا آفتابِ عالم تاب کا چہرہ اس کے پہنچ جانے سے ڈھک جاتا ہے۔ بہر حال یہ رات کی اہمیت اور انسانوں کی زندگی میں اس کے اثرات کی طرف سورج کے اعتدال سے لمے کمر، اس کے سائے میں تمام زندہ موجودات کے آرام و سکون اور شب زندہ دار، بیدار دل اور آگاہ افراد کے مسئلہ تک ایک اشارہ ہے۔
 اس کے بعد دوسری قسم کو بیان کرتا ہے اور مزید کہتا ہے: ”اور قسم ہے دن کی جب کہ وہ آشکار و ظاہر ہو“۔ ﴿النَّهَارِ إِذَا تَجَلَّى﴾^(۱)

اور یہ اس لمحہ کی بات ہے جب سپیدہ صبح رات کے ظلماتی پردہ کو چیر دیتا ہے اور تاریکیوں کو پیچھے دھکیل کر سارے صفحہ آسمانی پر حاکم بن جاتا ہے۔ اور ہر چیز کو نور اور روشنی میں نہلا دیتا ہے۔ وہی نور و روشنی جو حرکت و حیات کی رمز اور تمام زندہ موجودات کی پرورش کا سبب ہے۔

قرآن مجید میں ”نور“ و ”ظلمت“ کے نظام کے مسئلہ اور ان کی انسانی زندگی پر تاثیر کی طرف بہت زیادہ توجہ دی گئی، کیونکہ یہ عظیم دائمی نعمتیں پروردگار کی اہم آیات میں سے دو آتیں ہیں۔
 اس کے بعد آخری قسم کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اور قسم ہے اس ذات کی جس نے مذکر و مونث کی جنس کو پیدا کیا“۔ ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّکَرُ وَالْأُنْثَى﴾۔

کیونکہ عالم ”انسان“ و ”حیوان“ اور ”نبات“ میں ان دونوں جنسوں کا وجود، اور وہ تغیرات جو انعقادِ نطفہ سے لے کر تولد تک راہ نما ہوئی ہیں، اور وہ خصوصیات و صفات جو دونوں جنسوں میں ان کی فعالیتوں اور پروگراموں کی نسبت سے پائی جاتی ہیں اور وہ بہت سے اسرار جو جنسیت کے مفہوم میں چھپے ہوئے ہیں، یہ سب عظیم عالمِ آفرینش کی نشانیاں اور آیات ہیں جن کے ذریعے ان کے پیدا کرنے والے سے واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔

”ما“ (وہ چیز) کی تعبیر یہاں خدا کے بارے میں اس کی ذات پاک کی حد سے زیادہ عظمت سے کنایہ ہے، اور یہ وہ ابہام ہے جو اس لحاظ سے یہاں اس طرح حکم فرماتا ہے کہ وہ اسے خیال قیاس و گمان و وہم سے برتر کر دیتا ہے۔
بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ”ما“ یہاں مصدر یہ ہے، تو اس بناء پر اس جملہ کا معنی یہ ہوگا: قسم ہے مذکر و مونث کی خلقت کی لیکن یہ احتمال بھی ضعیف نظر آتا ہے۔

حقیقت میں پہلی اور دوسری دو قسمیں آیات آفاقی کی طرف اشارہ ہیں، اور تیسری قسم آیات انفسی کی طرف اشارہ ہے۔

آخر کار ان قسموں کے ہدف کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”زندگی کے لئے تمہاری سعی و کوشش گونا گوں ہے۔“
﴿اِنَّ سَعِيَكُمْ لَشْتٰی﴾۔

ان کوششوں کی سمت، اور ان کے نتائج بھی مکمل طور پر مختلف اور متفاوت ہیں، جو اس طرف اشارہ ہے کہ تم بہر حال زندگی میں سکون و آرام سے نہیں رہو گے، اور یقینی طور پر سعی و کوشش کے لئے ہاتھ پاؤں مارو گے، اور خداداد قوتوں اور توانائیوں کو، جو تمہارے وجود کا سرمایہ ہیں۔ کسی نہ کسی راستہ میں خرچ کرو گے اب تم خود دیکھو گے کہ تمہاری سعی و کوشش کس راستے، کس سمت اور کس نتیجہ کی حامل ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے سرمایوں اور صلاحیتوں کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ ڈالو، یا فضول مفت میں ضائع کر بیٹھو۔

”شتی“ ”شیت“ کی جمع ہے جو ”شت“ (بر وزن شط) کے مادہ سے جمعیت کو پر اکندہ کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں کیفیت و مقصد حصول اور انکے نتیجہ کے لحاظ سے لوگوں کی کوششوں کے اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کی خصوصیت کو شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”پس وہ شخص جو راہ خدا میں بخشش کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے“۔ ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی﴾۔

”اور راہ خدا کی اچھی جزا پر ایمان رکھتا ہو“ ﴿صَدَقَ بِالْحَسَنٰی﴾۔

”ہم اس کے لئے راستہ کو آسان بنا دیں گے اور بہشت جاوداں کی طرف ہدایت کریں گے۔“ ﴿فَسَنِّسِرْہُ

لِلْیَسْرِی﴾۔

”اعطی“ سے مراد وہی راہ خدا میں خرچ کرنا اور حاجت مندوں کی مدد کرنا ہے۔

اور اس کے بعد تقویٰ کے لئے تاکید ممکن ہے کہ پاک نیت، اور خرچ کرتے وقت قصدِ خالص، اور مشروع طریقہ سے اموال کا حصول اور انہیں مشروع و جائز طریقہ سے خرچ کرنا اور ہر قسم کا احسان جتانے اور اذیت و آزار پہنچانے سے خالی ہونے کے لزوم کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان اوصاف کا مجموعہ تقویٰ کے عنوان میں جمع ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ”اعطی“ مالی عبادتوں کی طرف اشارہ ہے اور ”اتقی“ باقی تمام عبادتوں کی طرف، اور واجبات کو انجام دینے اور محرمات کو چھوڑ دینے کی طرف، لیکن پہلی تفسیر ظاہر آیت کے ساتھ سازگار ہے، اور شانِ نزول کے ساتھ بھی جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔

”﴿حَسَنٰی﴾“ کی تصدیق (”حسنی“ ”احسن“ کی مونث ہے) جو زیادہ اچھے کے معنی میں ہے۔

یہ خدا کی اچھی جزاؤں پر ایمان رکھنے کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ شانِ نزول میں بیان ہوا ہے کہ ”ابو الدحداح“ نے خدا کی جزاؤں پر ایمان رکھتے ہوئے اپنے اموال خرچ کئے۔ سورہ نساء کی آیہ ۹۵ میں آیا ہے: وَكُلًّا وَعْدَ اللَّهِ الْحَسَنٰی: ”خدا نے ان میں سے ہر ایک کو اچھے اجر اور جزاؤں کا وعدہ دیا ہے۔ (اس آیت میں بھی حسنی اچھی جزا کے معنی میں ہے۔)

اور بعض نے اس کی کلمہ لا الہ الا اللہ یا شہادتین کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

لیکن سیاقِ آیات، شانِ نزول، اور بہت سی آیاتِ قرآنی میں حسنی کا اچھی جزا کے معنی میں ہونے کے ذکر کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

”﴿فَسَنِيْسِرْهَ لِّلْیَسْرِ﴾“ کا جملہ ممکن ہے توفیقِ الہی، اور ایسے اشخاص پر امر اطاعت کے آسان کرنے کی طرف اشارہ ہو، یا ان کی طرف جنت کی راہ کھولنے اور تحیت و سلام کے ساتھ ملائکہ اور فرشتوں کے استقبال کرنے، یا ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہو۔

یہ بات یقینی ہے کہ جو لوگ انفاق و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں اور عظیم خدائی جزاؤں پر گرم جوشی کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں، ان کے لئے مشکلات آسان ہو جاتی ہیں اور وہ دنیا و آخرت میں ایک خاص قسم کے سکون و آرام کے حامل ہوتے ہیں۔

ان سب سے قطع نظر ممکن ہے کہ مالی انفاق ابتداء میں انسان کی طبیعت و مزاج کے لئے شاق اور مشکل ہو، لیکن تکرار کرنے اور مسلسل جاری رکھنے سے اس پر راستہ اس طرح آسان ہو جاتا ہے کہ وہ اس سے لذت اٹھاتا ہے۔

کتنے ہی سخی لوگ ایسے ہیں جو اپنے دسترخوان پر مہمان کی موجودگی میں خوش ہوتے ہیں، لیکن اس کے برعکس اگر کسی دن ان کے پاس مہمان نہ آئے تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں اور یہ بھی مشکلات آسان کرنے کی ایک قسم ہے۔ اور اس نکتہ سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے کہ اصولی طور پر خدائی عظیم جزاؤں پر ایمان، انسان کے لئے انواع و اقسام کی مشکلات کی برداشت کو آسان اور سہل بنا دیتا ہے، نہ صرف مال بلکہ وہ اپنی جان کو بھی اخلاص کے مطابق گزارتا ہے اور عشق شہادت میں میدان جہاد میں شرکت کرتا ہے، اور اپنی اس قربانی اور ایثار سے لذت حاصل کرتا ہے۔

”یسری“ ”یسر“ کے مادہ سے اصل میں گھوڑے پر زین کسنے، اسے لگام دینے اور سواری کے لئے آمادہ و تیار کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس کا ہر سہل اور آسان کام کے لئے اطلاق ہوا ہے۔^(۲)

بعد والی آیات میں اس گروہ کے نقطہ مقابل کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”لیکن وہ شخص جو بخل کرے اور اس طریقے سے بے نیازی چاہے“۔ ﴿وَامَّا مَن بَخِلَ وَاسْتَغْنَى﴾ ہم عنقریب راستوں کو اس پر دشوار اور مشکل بنا دیں گے۔ ﴿فَسَنِيْسِرُهُ لِّلْعُسْرَى﴾

”بخل“ یہاں ”اعطاء“ کا نقطہ مقابل ہے، جو پہلے گروہ (سعادت مند سختیوں کے گروہ) میں بیان ہوا ہے۔ ”و استغنی“ (بے نیازی چاہے) یا بخل کرنے کے لئے ایک بہانہ، یا مال جمع کرنے کے لئے ایک وسیلہ ہے، اور یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خدائی جزاؤں سے اپنے آپ کو بے نیاز شمار کرتا ہے، پہلے گروہ کے برعکس، جن کی آنکھ ہمیشہ لطفِ خدا پر لگی رہتی ہے یا وہ اپنے آپ کو خدا کی اطاعت سے بے نیاز سمجھتا ہے، اور ہمیشہ گناہ میں آلودہ رہتا ہے۔ ان تینوں تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ اگرچہ تینوں تفاسیر کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔ ”حسنی“ کی تکذیب سے مراد وہی قیامت کی جزاؤں کا انکار ہے، یا پیغمبروں کے دین و آئین اور نیک روش کا انکار ہے۔

”﴿فَسَنِيْسِرُهُ لِّلْعُسْرَى﴾“ کی تعبیر جو واقعی طور پر دو ظاہراً متضاد تعبیریں ہیں (ہم ان کی راہ کو مشکلات کی طرف آسان کر دیں گے)۔

”فسنیسرہ للیسری“ کا نقطہ مقابل ہے، اس طرح سے کہ خدا پہلے گروہ کو تو اپنی توفیقات کا مشمول قرار دے گا اور ان کے لئے اطاعت و انفاق کی راہ کو طے کرنا آسان بنا دے گا تاکہ وہ زندگی کی مشکلات سے رہائی حاصل کر لیں لیکن دوسرے گروہ کی توفیقات سلب ہو گئی ہیں، لہذا ان کے لئے طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اور انہیں دنیا و آخرت میں

سختیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اصولی طور پر ان بے ایمان بخیلوں کے لئے نیک اعمال کو انجام دینا، خصوصاً راہ خدا میں انفاق کرنا سخت اور دشوار کام ہے، جب کہ پہلے گروہ کے لئے نشاط آور اور، روح افزا ہے۔^(۲)

اور آخری زیر بحث آیت میں ان دل کے اندھے بخیلوں کو خبردار کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”جب وہ قبریا جہنم میں جا گرے گا، تو اس کے اموال اس کے کچھ کام نہ آئیں گے۔“ ﴿وَمَا يَغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى﴾۔
 نہ تو وہ ان اموال کو دنیا سے اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے اور اگر وہ گروہ لے بھی جائے تو وہ اس کے جہنم کی آگ میں جانے سے مانع نہیں ہوں گے۔

”ما“ اس آیت کے آغاز میں ممکن ہے ”نافیہ“ ہو (جیسا ہم نے اوپر بیان کیا ہے) یا استفہام انکاری کے لئے ہو، یعنی اس کے اموال قبریا دوزخ میں جا کرنے کے وقت اسکو کیا فائدہ دیں؟

”تردّی“ ”ردّت“ اور ”ردّی“ کے مادہ سے ہلاکت کے معنی میں ہے اور بلندی سے گرنے کے معنی میں بھی آیا ہے جو ہلاکت کا سبب ہو۔ بلکہ بعض تو اس کی اصل ہی سقط کے معنی میں سمجھتے ہیں،، اور چونکہ جگہ سے گرنا ہلاکت کا سبب ہوتا ہے، لہذا ہلاکت کے معنی میں بھی آیا ہے اور زیر بحث آیت میں ممکن ہے کہ قبریا دوزخ میں گرنے کے معنی میں ہو یا ہلاکت عذاب کے معنی میں ہو۔

اس طرح قرآن ان آیات میں دو گروہوں کے بارے میں گفتگو گو کرتا ہے، ایک گروہ مومن، متقی اور سخی اور دوسرے گروہ بے ایمان، بے تقویٰ اور بخیل، اور ان دونوں گروہوں کا نمونہ شانِ فزول میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

پہلا گروہ توفیقاتِ الہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنی راہ کو سہولت کے ساتھ طے کرتا ہے، اور جنت اور اس کی نعمتوں کی طرف بڑھا چلا تا جا ہے، جب کہ دوسرا گروہ زندگی میں بے شمار مشکلات میں گھرا ہوا ہوتا ہے، بہت سال مال جمع کرتا ہے اور یہیں پر چھوڑ کر آگے چلا جاتا ہے، اور سوائے حسرت، اندوہ و بال اور خدائی عذاب کے انہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، اور وہ اس سے کوئی چیز نہیں خریدتے

۱۔ قابل توجہ بات یہ ہے ”غشی“ فعل مضارع کی صورت میں ذکر ہوا ہے، لیکن ”تجلی“ فعل ماضی کی صورت میں ہے۔ بعض نے کہا ہے: یہ اس بناء پر ہے کہ اس زمانہ میں جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا آغاز تھا تو جاہلیت کی تاریکی نے ہر جگہ کو گھیر رکھا تھا۔ لیکن اس صورت میں ایسی ظلمت و تاریکی کی قسم کھانا کچھ اچھا دکھائی نہیں دیتا۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ فعل ماضی چونکہ ”اذا“ شرطیہ کے بعد واقع ہوا ہے: لہذا فعل مضارع کا معنی دیتا ہے، یا یہ اصل میں ”تجلی“ تھا اور اسکی ایک ”تاء“

حذف ہو گئی ہے، لیکن اس صورت میں فعل مونث ہو جائے گا، اور پھر ”نہار“ (دن) اس کا فاعل نہیں ہو سکتا بلکہ پھر تقدیر میں اس طرح ہونا چاہیے۔ ”اذا تجلی الشمس فيه“
”جب اس میں سورج آشکار و ظاہر ہو۔“

۲۔ ”تفسیر کشاف“ جلد ۴، ص ۷۶۲۔

۳۔ ”یسری“ و ”عسری“ دونوں مونث کے صیغہ ہیں (ان کا مذکر ”الیسر“ و ”اعسر“ و ”اعسر“ ہے) اور ان دونوں کا مونث کے صیغہ کی صورت میں ذکر کرنا تو اس بناء پر ہے کہ
ان کا موصوف (افعال کا مجموعہ) ہے اور تقدیر میں اس طرح ہوگا۔ ”فسنیسره الاعمال یسری۔ او۔ لا اعمال عسری یا تمام مسائل اور زندگی میں پیش آنے والے واقعات
میں، اور اگر اس کا موصوف مفرد ہو تو ممکن ہے کہ ”طریقتہ“ یا ”خلتہ“ یا اس قسم کا کوئی لفظ ہو۔

آیات ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲

- ۱۲۔ ﴿إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ﴾ - ۱۳۔ ﴿وَإِنَّ لَنَا لِلْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ﴾ - ۱۴۔ ﴿فَأَنْذَرْتَكُمْ نَارًا تَلْظَىٰ﴾ -
 ۱۵۔ ﴿لَا يَصْلُهَا إِلَّا الْاَشْقَىٰ﴾ - ۱۶۔ ﴿الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ﴾ - ۱۷۔ ﴿وَسَيَجْجِبُهَا الْاِنْتَقَىٰ﴾ -
 ۱۸۔ ﴿الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ﴾ - ۱۹۔ ﴿وَمَا لَاحِدٍ عَنْهُ مِنْ نَّعْمَةٍ تُجْزَىٰ﴾ - ۲۰۔ ﴿إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلَىٰ﴾ -
 ۲۱۔ ﴿وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ﴾ -

ترجمہ

- ۱۲۔ یقیناً ہدایت کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ ۱۳۔ اور دنیا و آخرت ہمارے لئے۔ ۱۴۔ اور میں تمہیں شعلہ نکالنے والی آگ سے ڈراتا ہوں۔
 ۱۵۔ بد بخت ترین لوگوں کے سوا کوئی شخص اس میں داخل نہیں ہوگا۔ ۱۶۔ وہی شخص جس نے آیاتِ (خدا کی) تکذیب کی اور پیٹھ پھیر لی۔
 ۱۷۔ اور زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والے عنقریب اس سے دور رہیں گے۔
 ۱۸۔ وہی شخص جو اپنے مال کو (خدا کی راہ میں) بخش دیتا ہے تاکہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔
 ۲۰۔ اور کسی شخص کا اس کے پاس کوئی حقِ نعمت نہیں ہے تاکہ وہ (اس انفاق کے ذریعے) اس کا بدلہ دے۔ ۲۰:
 سوائے اپنے بلند و برتر پروردگار کی رضا مندی چاہنے کے لئے۔
 ۲۱۔ اور وہ عنقریب راضی و خوشنود ہو جائے گا۔

انفاق اور جہنم کی آگ سے دوری

گزشتہ آیات میں لوگوں کی دو گروہوں: مومنِ سخاوت مند اور ایمان بخیل، میں تقسیم کرنے، اور ان میں سے ہر ایک کی سرنوشت بیان کرنے کے بعد زیر بحث آیات میں، پہلے اس بات کو بیان کرتا ہے کہ ہمارا کام ہدایت کرنا ہے کسی کو مجبور کرنا نہیں ہے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ مردانہ وار راستہ پر گامزن ہو جاؤ۔ علاوہ از این اس راستہ کو طے کرنا خود تمہارے نفع میں ہے اور ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
 فرماتا ہے: یقیناً ہدایت کرنا ہمارے ہی ذمہ ہے۔ “ ﴿إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ﴾ -

چاہے تکوین (فطرت و عقل) کے طریق سے ہدایت ہو، اور چاہے تشریح (کتاب و سنت) کے طریق سے ہو۔ اس سلسلہ میں جو کچھ ضروری تھا وہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور اس کا حق ادا کر دیا۔

”اور یقینی طور پر آخرت اور دنیا ہماری ہی ملکیت ہے“۔ ﴿وَاِنْ لَنَا لِلْآخِرَةِ وَالْأُولٰٓئِیۡ﴾^(۱)

ہمیں تمہارے ایمان و اطاعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، نہ تمہاری اطاعت ہمیں کوئی فائدہ پہنچاتی ہے اور نہ ہی تمہاری نافرمانی سے ہمیں کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ یہ تمام پروگرام تمہارے فائدے کے لئے ہیں اور خود تمہارے لئے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق یہاں ہدایت ”ارائہ طریق“ کے معنی ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ان دو آیات کا ہدف سخاوت کرنے والے مومنین کو شوق دلانا اور اس معنی پر تاکید ہو کہ ہم انہیں مزید ہدایت کا مشمول قرار دیں گے، اور اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی راستہ کو ان پر آسان کر دیں گے، اور چونکہ دنیا و آخرت ہمارے ہی ملکیت ہے لہذا ہم اس کام کو انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ زمانہ کے لحاظ سے دنیا آخرت پر مقدم ہے، لیکن اہمیت اور ہدف اصلی کے لحاظ سے مقصود اصلی آخرت ہے، اور اسی بناء پر اسے مقدم رکھا گیا ہے۔

اور چونکہ ہدایت کے شعبوں میں سے ایک خبردار کرنا اور ڈرانا ہے، لہذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: اب جب کہ یہ بات کہ میں تمہیں اس آگ سے ڈراتا ہوں جو شعلہ ور ہوگی “﴿فَانذِرْ تَكْمُ نَارًا تَلْظٰی﴾۔

”تَلْظٰی“ ”لظی“ (بروزن قضا) کے مادہ سے، خالص شعلہ کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خالص شعلوں میں کو ہر قسم کے دھوئیں سے خالی ہوں زیادہ گرمی اور حرارت ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات لفظ ”لظی“ کا خود بھی اطلاق ہوتا ہے۔^(۲)

اس کے بعد اس گروہ کی طرف، جو اس بھڑکتی ہوئی اور جلانے والی آگ میں داخل ہوں گے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”بد بخت ترین آدمی کے سوا اس میں کوئی بھی داخل نہیں ہوگا۔ ﴿لَا یَصْلٰہَا اِلَّا الْاَشْقٰی﴾۔

اور شقی کی توصیف میں فرماتا ہے: ”وہی شخص جو آیات الہی کی تکذیب کرتا ہے اور ان سے پیٹھ پھیر لیتا ہے“۔

﴿الذی کَذَّبَ وَتَوَلٰی﴾۔

اس بناء پر خوش بختی و بد بختی کا معیار وہی کفر و ایمان ہے یا وہ عملی نتائج جو ان دونوں کے ہوتے ہیں، اور وہ واقعاً جو شخص ہدایت کی ان نشانیوں، اور ایمان و تقویٰ کے امکانات و وسائل کو نظر انداز کر دے تو وہ ”اشقی“ کا مصداق، اور بد بخت ترین شخص ہے۔

”الذین کذب و تولیٰ“ کے جملہ میں ممکن ہے کہ ”تکذیب“ تو کفر کی طرف اشارہ ہو، اور ”تولیٰ“ اعمال صالح کے ترک کرنے کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ کفر کا لازمہ یہی ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترک ایمان کی طرف اشارہ ہوں۔ اس طرح سے کہ پہلے تو پیغمبر کی تکذیب کرتے ہیں، اور اس کے بعد پیٹھ پھیر کر ہمیشہ کے لئے اس سے دور ہو جاتے ہیں۔

بہت سے مفسرین نے یہاں ایک اعتراض پیش کیا ہے اور اس کا جواب دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اوپر والی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ جہنم کی آگ کفار کے ساتھ جہنم مخصوص ہے۔ یہ بات اس چیز کے مخالف ہے جو قرآن کی دوسری آیات اور مجموعہ روایات اسلامی سے معلوم ہوتی ہے کہ گنہگار مومن بھی جہنم کی آگ میں حصہ دار بنیں گے، لہذا منحرف گروہوں میں سے بعض نے، جو یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ ضرر نہیں پہنچاتا انہوں نے اپنے مقصود پر ان آیت سے استدلال کیا ہے۔ (اس گروہ کا نام ”مرجئہ“ ہے۔

اس کے جواب میں دو نکتوں کی طرف توجہ کرانا چاہئے: پہلا یہ کہ یہاں جہنم میں ورود سے مراد وہی ”خلود“ ہمیشہ رہنا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ خلود کفار کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ اس بات کا قرینہ وہ آیات ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ غیر کفار بھی جہنم میں وارد ہوں گے۔

دوسرا یہ کہ اوپر والی آیات اور بعد والی آیات یہ کہتی ہیں کہ جہنم کی آگ سے دوری ”اتقی“ (زیادہ متقی افراد) سے مخصوص ہے، یعنی مجموعی طور پر وہ یہ چاہتا ہے کہ صرف دو گروہوں کی حالت بیان کرے:

(۱) بے ایمان بخیل گروہ اور

(۲) زیادہ تقویٰ رکھنے والے سخاوت مند مومن۔

ان دونوں گروہوں میں سے صرف پہلا گروہ جہنم میں وارد ہوگا، اور دوسرا گروہ بہشت میں داخل ہوگا، اور اس طرح سے تیسرے گروہ یعنی گنہگار مومنین کے بارے میں تو اصلاً کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہاں ”حصر“ ”حصر اضافی“ ہے۔ گویا جنت صرف دوسرے گروہ کے لئے، اور جہنم کے لئے، اور جہنم صرف پہلے گروہ کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس بیان سے ایک دوسرے اعتراض کا جواب بھی، زیر بحث آیات اور ان آئندہ آنے والی آیات کے رابطہ سے ہوا ہے، جو نجات کو ”اتقی“ سے مخصوص کرتی ہیں، واضح ہو جاتا ہے اس کے بعد اس گروہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو اس جلائے والی شعلہ و راک سے دور ہے، فرماتا ہے: ”عنقریب سب سے زیادہ تقویٰ کرنے والا آدمی اس بھرکتی ہوئی آگ سے دور رکھا جائے گا۔“ ﴿وَسَيَجْنِبُهَا الْاَتَقٰی﴾۔ وہی آدمی جو اپنے مال کو راہ خدا میں انفاق کرتا ہے اور اس کا مقصد رضائے خدا کا حصول، تزکیہ نفس، اور اموال کو پاک کرنا ہوتا ہے، ﴿الذی یوتی مالہ یتزکی﴾۔

”یتزکی“ کی تعبیر حقیقت میں قصدِ قربت اور نیتِ خالص کی طرف اشارہ ہے، چاہے یہ جملہ معنوی و روحانی رشد و نمو کے حصول کے معنی میں ہو یا اموال کی پاکیزگی کے حاصل کرنے کے معنی میں، کیونکہ ”تزکیہ“ ”نمودینے“ کے معنی میں بھی آیا ہے، اور ”پاک کرنے“ کے معنی میں بھی، سورہ توبہ کی آیہ ۱۰۳ میں آیا ہے: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾: ”ان کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کر لے تاکہ اس کے ذریعے تو انہیں پاک کرے اور ان کی پرورش کرے، اور (زکوٰۃ لیتے وقت) اس کے لئے دعا کر کیونکہ تیری دعا ان کے سکون و آرام کا باعث ہے۔“

اس کے بعد ان کے خلوصِ نیت کے مسئلہ پر، جو وہ خرچ کرنے میں رکھتے ہیں، تاکید کے لئے مزید فرماتا ہے: ”کسی شخص کا اس کے اوپر حقِ نعمت نہیں ہے کہ اس انفاق کے ذریعے اس کی جزادی جائے“: ﴿وَمَا لَاحِدٌ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰی﴾ بلکہ اس کا مقصد تو اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی رضا حاصل کرنا ہے۔ ﴿الِابْتِغَاءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی﴾۔

دوسرے لفظوں میں لوگوں کی درمیان بہت سے انفاق ایسے ہوتے ہیں جو ویسے ہی انفاق کا جواب ہوتے ہیں جو طرفِ مقابل کی طرف سے پہلے سے کئے ہوئے ہوتے ہیں، البتہ حق شناسی اور احسان کا احسان کے ساتھ جواب دینا ایک اچھا کام ہے، لیکن اس کا حساب پرہیزگاروں کے مخلصانہ انفاق سے جدا ہے۔ اوپر والی آیات کہتی ہیں کہ پرہیزگار مومنوں کا دوسروں پر خرچ کرنا نہ تو ریاکاری کی وجہ سے ہوتا ہے، اور نہ ہی ان کی سابقہ خدمات کے جواب کے طور پر، بلکہ اس کا سبب صرف اور صرف خدا کی رضا کا حاصل کرنا ہوتا ہے اور یہی چیز ان انفاقوں کو حد سے زیادہ قدر و منزلت عطا کرتی ہے۔

”وجہ“ کی تعبیر یہاں ”ذات“ کی معنی میں ہے اور اس سے مراد اس کی پاک ذات کی رضا و خوشنودی ہے۔

”ربہ الاعلیٰ“ کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ انفاق پوری معرفت کے ساتھ صورت پذیر ہوتا ہے، اور اس حالت میں ہوتا ہے کہ وہ پروردگار کی ربوبیت سے بھی آشنا ہوتا ہے، اور اس کے مقامِ اعلیٰ سے بھی باخبر ہوتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ استثناء ہر قسم کی انحرافی نیتوں کی بھی نفی کرتا ہے، مثلاً نیک نامی، لوگوں کی توجہ مبذول کرنے، اور معاشرے میں مقام و حیثیت وغیرہ حاصل کرنے کے لئے خرچ کرنا، کیونکہ اس کا مفہوم ان اموال کے انفاق کا محرک، پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے میں ہے۔^(۳) انجام کار اس سورہ کی آخری آیت میں اس گروہ کی عظیم و بے نظیر جزاؤں کو پیش کرتے ہوئے ایک مختصر سے جملہ میں فرماتا ہے: ”اور ایسا آدمی عنقریب راضی و خوشنود ہو جائے گا۔“

﴿لسوف یرضی﴾۔ ہاں! جس طرح وہ رضائے الہی خدا کے لئے کام کرتا ہے، خدا بھی اس کو راضی کرے گا، ایسی رضا جو مطلق اور بے مطلق اور بے قید و شرط ہوگی، ایسی رضا جو وسیع و غیر محدود ہوگی، ایسی پر معنی رضا جس میں تمام نعمتیں جمع ہوگی، ایسی رضا جس کا تصور کرنا بھی آج ہمارے لئے غیر ممکن ہے اور وہ کون سی نعمت ہوگی اس سے برتر بالاتر ہوگی۔ بعض مفسرین نے بھی یہی احتمال دیا ہے کہ ”یرضی“ کی ضمیر خدا کی طرف لوٹتی ہے، یعنی عنقریب خدا اس گروہ سے راضی ہو جائے گا کہ وہ بھی ایک عظیم و بے نظیر انعام ہے کہ خدائے بزرگ اور پروردگار برتر اس قسم کے بندے سے راضی و خوشنود ہو جائے۔ وہ بھی ایسی رضا جو مطلق عظیم و بے قید و شرط ہو، اور یقینی طور پر اس رضائے الہی کے پیچھے اس باایمان اور باتقویٰ بندہ کی رضایت ہے، کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں جیسا کہ سورہ بینہ کی آیہ ۸ میں آیا ہے، ﴿رضی اللہ عنہم و رضو عنہ﴾، یا سورہ فجر کی آیہ ۲۸ میں آیا ہے، راضیۃ مرضیۃ، لیکن تفسیر اول زیادہ مناسب ہے۔

۱۔ ”للاخرة“ کا ”لام“ اور اسی طرح (گزشتہ آیت میں ”للہدی“ کا ”لام“ ظاہراً لام تاکید ہے جو یہاں ”اسم ان“ کے اوپر ہے، اگرچہ عام طور پر خبر کے اوپر داخل ہو اکرتی ہے، یہ اس بناء پر ہے کہ بعض ادب کی کتابوں کی تصریح کے مطابق جب ”ان“ کی خبر مقدم ہو تو اس کے اسم پر لام داخل ہوتی ہے۔

۲۔ ”تلظی“ اصل میں ”تلظی“ تھا، دو ”تا“ میں سے ایک ”تا“ تخفیف کے لئے گر گئی ہے۔

۳۔ ”الابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ“ کے جملہ میں استثناء، استثناء منقطع ہے، البتہ پہلی آیت میں ایک تقدیر ہے جو اس طرح ہے۔ (وما لاحد عنده من نعمة تجزى فلا ینفق ماله لنعمة الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ)۔ کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے لہذا وہ اپنا مال کسی احسان کے بدلے میں خرچ نہیں کرتا مگر اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی خوشنودی کے لئے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ استثناء متصل ہو، ایک محذوف کو نظر نظر میں رکھتے ہوئے اور تقدیر اس طرح ہو: لا ینفق لنعمة عنده ولا لغير ذالک الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ (غور کیجئے)۔

سورہ واللیل کے شان نزول کے بارے میں ایک بات

فخر رازی: ”مفسرین اہل سنت عموماً یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ”سجّنبھا الماتقی“ میں ”اتقی“ سے مراد حضرت ابو بکر (رض) ہیں، اور شیعہ عام طور پر اس بات کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔^(۱)

اس کے بعد وہ اپنے مخصوص انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: امت اسلامی (عام اس سے کہ اہل سنت ہوں یا شیعہ) اس چیز پر اتفاق رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد افضل ترین شخص یا ابو بکر (رض) ہے یا علی، اور علی علیہ السلام پر منطبق نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ قرآن اس فرد اتقی کے بارے میں کہتا ہے: وما لاحد عنده من نعمۃ تجزئ کوئی شخص اس پر کوئی حق نہیں اور احسان نہیں رکھتا، کہ جس کی جزادی جائے اور یہ صفت علی علیہ السلام پر تطبیق نہیں کرتی کیونکہ پیغمبران پر حق نعمت رکھتے تھے، لیکن پیغمبر اکرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف یہ کہ ابو بکر (رض) پر کوئی مادی حق نعمت نہیں رکھتے تھے، بلکہ اس کے برعکس وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتفاق کرتے تھے اور حق نعمت رکھتے تھے!

اس کا نتیجہ یہ بنتا ہے کہ ”اتقی“ کا مصداق ابو بکر (رض) ہے، اور چونکہ اتقی کا معنی سب لوگوں سے زیادہ پرہیزگار ہے، لہذا اس کی افضلیت ثابت ہے۔^(۲)

اگرچہ ہم اس تفسیر کے مباحث میں، اس قسم کے مسائل میں وارد ہونے کی طرف زیادہ مائل نہیں ہیں لیکن بعض مفسرین کا اپنے پہلے سے کئے ہوئے فیصلہ کو قرآن کی آیات کے ذریعے ثابت کرنے پر اصرار اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ وہ ایسی تعبیریں کرنے لگے ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبہ، اور بلند مقام کے لائق نہیں ہے۔ لہذا اسی سبب سے ہم بھی یہاں چند نکات کا ذکر کرتے ہیں۔

اولاً: یہ جو فخر رازی کہتا ہے کہ اہل سنت کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ یہ آیت ابو بکر (رض) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس چیز کے برخلاف جسے اہل سنت کے مشہور و معروف مفسرین نے صراحت کے ساتھ نقل کیا ہے، منجملہ ”قرطبی“ اپنی تفسیروں میں ابن عباس (رض) سے ایک روایت میں نقل کرتا ہے کہ یہ سارا سورہ (سورہ لیل) ”ابو الدحداح“ کی شان میں نازل ہوا ہے۔ (جس کی داستان ہم نے سورہ کے آغاز میں بیان کر دی ہے)۔^(۳)

خاص طور پر جب وہ آیہ ﴿وَسَيَجْنِبُهَا الْاَتَقَى﴾ پر پہنچتا ہے تو پھر دوبارہ کہتا ہے کہ اس سے مراد ”ابو الدحداح“ ہے اگرچہ اکثر مفسرین سے اس نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ (ان کے نزدیک) یہ ابو بکر (رض) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن خود اس نے اس نظریہ کو قبول نہیں کیا۔

ثانیاً: جو اس نے کہا ہے کہ شیعوں ک اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ بہت سے مفسرین نے وہی ابو الدحداح کی داستان ہی بیان کی ہے اور اسے قبول کیا ہے۔ البتہ بعض روایات میں امام جعفر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ ”اتقی“ سے مراد ان کے پیروکار اور شیعہ ہیں اور الذی یوتی مالہ یتزکی سے مراد امیر المومنین علی علیہ السلام،

لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ باتیں شانِ نزول کا پہلو نہیں رکھتیں، بلکہ یہ واضح اور روشن مصداق کی تطبیق کی قبیل سے ہیں۔
 ثالثاً: اس میں شک نہیں کہ اوپر والی آیت میں لفظ ”اتقی“ لوگوں میں سے زیادہ تقویٰ رکھنے والے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس مفہوم وہی متقی ہونا ہے، اور اس بات کا واضح گواہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں ”اشقی“ لوگوں میں سے بد بخت ترین کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ کافر ہیں جو انفاق سے بخل کرتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ تھے، تو کیا ابو بکر (رض) کو پیغمبر سے بھی مقدم رکھا جاسکتا ہے؟ پہلے سے کئے ہوئے فیصلوں اور ذہنیتوں کی بناء پر ایسی تعبیر کیوں کریں جو پیغمبر تک کے مقام بلند کو بھی ضرب لگائیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ پیغمبر کا معاملہ الگ ہے، تو پھر ہم کہتے ہیں کہ آیہ واما عند من نعمۃ تجزئ میں ان کے معاملے کو کیوں الگ نہیں رکھا گیا اور علی علیہ السلام کو آیت کے مورد سے خارج کرنے کے لئے کیوں کہا گیا کہ چونکہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مادی نعمتوں کے مشمول ہیں لہذا وہ اس آیت میں داخل نہیں ہیں۔

رابعاً: ایسا کونسا آدمی ہے جس سے اس کی زندگی میں کسی نے محبت کی ہی نہ ہو اور کسی نے بھی نہ اسے ہدیہ دیا ہو نہ کبھی دعوت کی ہو۔ کیا واقعاً ایسا ہو ہے کہ ابو بکر (رض) اپنی ساری عمر میں نہ تو کسی کی مہمانی پر گئے اور نہ ہی کبھی کسی کا کوئی ہدیہ قبول کیا اور نہ ہی کوئی اور دوسری مادی خدمت کس سے قبول کی کیا یہ چیز باور کرنے کے لائق ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ آیہ واما عند من نعمۃ تجزئ سے مراد یہ نہیں ہے کہ کسی بھی شخص کا اس پر کوئی حق نعمت ہے ہی نہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان سے انفاق کرنا کسی حق نعمت کی بناء پر نہیں ہے۔

یعنی اگر وہ کسی پر انفاق کرتے ہیں تو وہ صرف خدا کے لئے ہوتا ہے، نہ کہ وہ کسی خدمت کی بناء پر اسے اجر و پاداش دینا چاہتے ہیں۔

خامساً: اس سورہ کی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ یہ سورہ ایک ایسے ماجرے کے بارے میں، جس کے دو قطب ہیں، نازل ہوا ہے، ایک ”اتقی“ کے قطب میں تھا اور دوسرا ”اشقی“ کے قطب میں۔ اگر ہم ”ابو الدحداح“ کی داستان کو شانِ نزول سمجھیں تو مسئلہ حل شدہ ہے لیکن اگر ہم کہیں کہ مراد ابو بکر (رض) تھے تو ”اشقی“ کی مشکل باقی رہ جاتی ہے کہ اس سے مراد کون شخص ہے؟

شیعوں کو اس بات پر کوئی اصرار نہیں ہے کہ یہ آیت خصوصیت کے ساتھ علی علیہ السلام کے بارے میں ہے۔ ان کی شان میں آیات بہت زیادہ ہیں، لیکن اگر اس کی تطبیق علی پر کی جائے تو ”اشقی“ کی مشکل حل ہے، کیونکہ سورہ شمس کی آیہ ۱۲ ﴿اذنبعت اشقاها﴾ کے ذیل میں اہل سنت کے طرق سے کافی روایات نقل ہوئی ہیں کہ ”اشقی“ سے مراد علی بن ابی طالب کا قاتل ہے۔ (ان روایات کو، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، کہ حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں جمع کیا ہے۔)

خلاصہ یہ ہے کہ فخر رازی کی گفتگو اور اس آیت کے بارے میں اس کی تحلیل بہت ہی کمزور اور بہت سے اشتباہات پر مشتمل ہے۔ اسی لئے اہل سنت کے بعض مشہور مفسرین مثلاً آلوسی تک نے بھی روح المعانی میں اس تجزیہ کو پسند نہیں کیا، اور اس پر اعتراض کیا ہے، جیسا کہ وہ کہتا ہے:

”و استدلل بذالک الامام علی انه (ابو بکر) افضل الامة و ذکر ان فی الایات ما یأبى قول الشیعة انھافی علی و اطلال الکلام فی ذالک و اتی بما لا یخلو عن قبیل و قال:

”امام فخر رازی نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ ابو بکر (رض) افضل امت ہیں، اور مزید کہا ہے کہ آیات میں بعض قرآن ایسے ہیں جو شیعوں کے قول کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔ اور یہاں گفتگو کو طول دیا ہے اور ایسے مطالب بیان کئے ہیں جو قلیل (اور اشکال) سے خالی نہیں ہیں۔ ۳

۱۔ ”تفسیر فخر رازی“ جلد ۳۱، صفحہ ۲۰۴۔

۲۔ تفسیر قرطبی“ جلد ۷۱۸۰-۳۔ تفسیر قرطبی“ جلد ۷۱۸۰۔

۲۔ انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت

راہ خدا میں انفاق اور بخشش کرنا، محروم، خصوصاً آبرو مند لوگوں کی مالی امداد کرنا، جو خلوص نیت سے لی ہوئی ہو، ایسے امور میں ہے جس کا قرآن مجید کی آیات میں بار بار ذکر ہوا ہے، اور اس کو ایمان کی نشانیوں سے لیا گیا ہے۔ اس بارے میں اسلامی روایات بھی تاکید سے بھری ہوئی ہیں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلامی معاشرے اور تمدن میں مالی انفاق کرنا، بشرطیکہ اس کا محرک پروردگار کی رضا کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، اور وہ ہر قسم کی ریا کاری، احسان جتانے اور آزار سے خالی ہو، تو بہترین اعمال میں سے ہے۔

ہم اس بحث کو چند معنی خیز احادیث کے ذکر کے ساتھ مکمل کرتے ہیں۔

۱۔ ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

”ان احب الاعمال الى الله ادخال السرور على المؤمن ، شعبة مسلم او قضاء دينه“

”خدا کے نزدیک محبوب ترین عمل ضرورت مند مومن کے دل کو خوش کرنا ہے، اس طرح سے کہ اسے سیر کیا جائے

یا اس کا قرض ادا کیا جائے۔“^(۱)

۲۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

”من الايمان حسن الخلق ، و اطعام الطعام ، و اراقة الدماء“

حسن خلق، کھانا کھانا، اور خون بہانا (راہ خدا میں قربانی) ایمان کے اجزاء میں سے ہیں۔^(۲)

۳۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”ما اری شيئاً يعدل زيادة المؤمن من الاطعامه، وحق على الله ايطعم من اطعم مؤمناً من طعام الجنة“:

”میرے نزدیک کوئی چیز مومن کے دیدار اور زیارت کے برابر نہیں ہے سوائے اس کو کھانا کھلانے کے۔ اور جو

شخص کسی مومن کو کھانا کھلائے خدا پر لازم ہے کہ وہ اسے جنت کے کھانوں میں سے کھانا کھلائے۔“^(۳)

۴۔ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کی سواری کی مہار پکڑ لی اور عرض کیا: اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ای اعمال افضل؟ تمام اعمال

میں کون سا عمل افضل ہے۔“

”اطعام الطعام ، و اطياب الكلام“ :

”لوگوں کو کھانا کھلانا اور خوش کلام ہونا“۔^(۴)

۵۔ اور آخر میں ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

”من عال اهل بيت من المسلمين يومهم وليلتهم غفر الله ذنوبه“ :

”جو شخص مسلمانوں کے گھرانے کی ایک رات دن پذیرائی کرے تو خدا اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے“۔^(۵)

خدا وندا! ہم سب کو توفیق دے تاکہ ہم اس عظیم کارِ خیر میں قدم رکھیں۔

پروردگارا! تمام اعمال میں ہمارے خلوص نیت میں اضافہ فرما۔

بار الہا ہم تجھ سے دعا کرتے ہیں کہ تو ہمیں اپنی نعمت و رحمت کا اس طرح سے مشمول قرار دے کہ تو بھی ہم سے

خوش ہو اور ہم بھی خوش اور راضی ہوں۔

آمین یا رب العالمین

۱۔ ”بحار الانوار“ جلد ۷۴ حدیث ۳۵ ص ۳۶۵۔

۲۔ ”بحار الانوار“ جلد ۷۴ حدیث ۳۵ ص ۳۶۵۔

۳۔ ”بحار الانوار“، جلد ۷۴، صفحہ ۳۷۸، حدیث ۷۹، »اصول کافی«، جلد ۲، صفحہ ۲۰۳، باب اطعام المؤمن

۴۔ ”بحار الانوار“ جلد ۷۴ ص ۱۱۳۔

۵۔ ”بحار الانوار“ جلد ۷۴ حدیث ۲۔

سورہ ضحیٰ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۱۱ آیات ہیں۔

سورہ ”الضحیٰ“ کے مضامین اور اس کی فضیلت

یہ سورہ جو مکی سورتوں میں ہے، اور بعض روایات کے مطابق اس وقت نازل ہوا جب پیغمبر وحی کے وقتی طور پر منقطع ہو جانے اور تاخیر سے پریشان تھے، اور دشمنوں کی زبان کھلی ہوئی تھی،۔ تو یہ سورہ نازل ہوا، اور بارانِ رحمت کی طرح پیغمبر کے قلب پاک پر اُترا، اور انہیں نئی تاب و توان بخشی اور بد زبانوں کی زبان کو بند کر دیا۔ اس سورہ کی دو قسموں کے ساتھ ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد پیغمبر کو بشارت دیتا ہے کہ خدا نے آپ کو ہر گز نہیں چھوڑا۔

اس کے بعد آپ کو یہ خوشخبری دیتا ہے کہ خدا آپ کو اس قدر عطا کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔ اور آخری مرحلہ میں، پیغمبر کی گزشتہ زندگی کو آپ کی نظر میں مجسم کرتا ہے کہ خدا نے ہمیشہ آپ کو کس طرح اپنی انواع و اقسام کی رحمت کا مشمول قرار دیا ہے، اور زندگی کے سخت ترین لمحات میں اس نے آپ کی حمایت کی ہے۔ اور اسی لئے آخری آیات میں آپ کو حکم دیتا ہے کہ (خدا کی ان عظیم نعمتوں کے شکرانہ کے طور پر) یتیموں اور حاجت مندوں پر مہربانی کریں اور خدا کی نعمت کو یاد کرتے رہیں

اس سورہ کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت میں یہی بات کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے:

”من قرأھا کان ممن یرضاه اللہ، ولحمد (ص) ان یشفع لہ ولہ عشر حسنات بعدد کل یتیم و سائل!“

”جو شخص اس کی تلاوت کرے گا وہ اے سے لوگوں میں سے ہوگا جن سے خدا راضی ہوگا، اور وہ اس لائق ہوگا کہ محمد اس کی شفاعت کریں اور ہر یتیم اور سوال کرنے والے مسکین کے برابر دس حسنات اس کے لئے ہوں گے۔“^(۱)

اور یہ سب فضائل اس کے لئے ہیں جو اسے پڑھے اور اس پر عمل کرے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ متعدد روایات کے مطابق یہ سورہ اور اس کے بعد والا سورہ (سورہ الم نشرح) ایک ہی سورہ ہیں اور چونکہ ہر رکعت میں الحمد کے بعد ایک مکمل سورہ پڑھنا چاہیے، لہذا ان دونوں سورتوں کو اکٹھا ملا کر پڑھنا چاہیے، (یہی بات ”سورہ فیل“ اور ”الایلاف“ کے بارے میں کہی گئی ہے)۔

اور اگر ہم صحیح طور پر ان دونوں سورتوں کے مطالب میں غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان دونوں کے مطالب ایک دوسرے سے اتنے ہی ملتے جلتے ہیں کہ یقینی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تسلسل قائم ہے اگرچہ ان دونوں کے درمیان ”بسم اللہ“ کا فاصلہ ہے۔

اس بارے میں کہ کیا یہ دونوں سورتیں ہر لحاظ سے ایک ہی ہیں؟ یا انہیں خصوصیت کے ساتھ نماز میں ایک سورے کے حکم میں شمار کرنا چاہیئے؟ اس میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل کا فقہ کی کتابوں میں (قرأت نماز کی بحث میں) مطالعہ کرنا چاہیئے، لیکن بہر حال علماء کا اجماع اس بات پر ہے کہ قرأت نماز میں ان میں سے ایک سورہ پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵

﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم﴾

۱۔ ﴿و الضحٰی ۲ و الیل اذا سجٰی﴾ - ۳۔ ﴿ماودّعک ربک و ما قلی﴾ - ۴۔ ﴿و للآخرۃ خیر لک من

الاولی﴾ -

۵۔ ﴿ولسوف یعطیک ربک فترضی﴾ -

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

۱۔ قسم ہے دن کی جب کہ سورج نکل آئے (اور ہر جگہ کو گھیر لے)۔

۲۔ اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ ساکن ہو جائے۔

۳۔ کہ ہرگز نہ تو خدا نے تجھے چھوڑا ہے اور نہ ہی تجھ سے غصہ ہوا ہے۔

۴۔ اور یقینی طور پر تیرے لئے آخرت دنیا سے بہتر ہے۔

۵۔ اور عنقریب تیرا رب تجھے اس قدر دے گا کہ تو راضی ہو جائے گا۔

شان نزول

اس سورہ کے شان نزول کے بارے میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں، جن میں سب سے زیادہ واضح ذیل کی

روایت ہے۔

”ابن عباس (رض)“ کہتے ہیں: پندرہ دن گزر گئے اور پیغمبر پر وحی نازل نہ ہوئی۔ مشرکین نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے پروردگار نے اسے چھوڑ دیا ہے اور اس کا دشمن ہو گیا ہے۔ اگر اس کی یہ بات سچ ہے کہ اس کی ماموریت خدا کی جانب سے ہے تو پھر اس پر مسلسل وحی نازل ہوتی۔ اس موقع پر اوپر والی سورت نازل ہوئی (اور اس کی باتوں کا جواب دیا)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث کے مطابق یہ سورہ نازل ہوا تو پیغمبر نے جبریل سے فرمایا: ”تو نے دیر لگادی حالانکہ میں شدت سے تیرا مشتاق تھا“، تو جبریل نے کہا: وانا كنت اشد اليك شوقا: ”میں تو خود آپ کا مشتاق تھا، لیکن میں بندہ مامور ہوں اور پروردگار کی حکم کے بغیر نازل نہیں ہوتا۔“

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت اقدس میں آئی اور ”ذی القرنین“ و ”اصحاب کہف“ اور ”روح“ کی خلقت کے بارے میں سوال کیا: پیغمبر نے فرمایا:

”میں کل بتاؤں گا“، اور انشاء اللہ نہ کہا، لہذا اسی وجہ سے وحی الہی کئی دن تک منقطع رہی“ اور دشمنوں کی زبان شمت سے کھل گئی، اور اس بناء پر پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم غمگین ہو گئے، تو یہ سورہ نازل ہوا تاکہ پیغمبر کے دل کی تسلی کا باعث ہو (لیکن شان نزول بعید نظر آتی ہے، کیونکہ یہودیوں کا پیغمبر سے آکر ملنا اور اس قسم کے سوالات کرنا عام طور پر مدینہ میں تھا نہ کہ مکہ میں)۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے عرض کیا، اے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم آپ پر وحی کیوں نازل نہیں ہوتی؟ آپ نے فرمایا: ”کیف ينزل على الوحى واتم لاتنقون براجمکم والتقلمون اظفارکم“

”مجھ پر وحی کیسے نازل ہو جب کہ تم اپنی انگلیوں کے جوڑوں کو پاک و صاف نہیں رکھتے، اور ناخن نہیں کترواتے!؟“

(۲)

اس بارے میں کہ انقطاع وحی کی مدت کس قدر تھی؟ مختلف روایات ہیں۔ بعض نے بارہ دن، بعض نے پندرہ دن، بعض نے پچیس دن اور بعض نے چالیس دن تک نقل کئے ہیں، اور ایک روایت میں صرف دو تین شب و روز بھی نقل ہوئے ہیں۔

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۰۳۔

۲۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۰۴، (تھوڑی سی تلخیص اور اقتباس کے ساتھ)۔

تجھے اس قدر عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا

اس سورے کے آغاز میں بھی دو قسمیں کھائیں گئی ہیں :

۱۔ ”تور“ (روشنی) کی قسم

۲۔ ”ظلمت“ (تاریکی) کی قسم، فرماتا ہے: ”قسم ہے دن کی جب کہ سورج نکل آئے اور ہر جگہ کو گھیر لے“ (و الضحیٰ) ”اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ ساکن اور ہر جگہ کو سکون و آرام میں غرق کر دے“ (و للیل اذا سجد)۔ ”ضحیٰ“ دن کے پہلے حصہ کے معنی میں ہے جب کہ سورج آسمان پر اونچا ہو جائے، اور اس کی روشنی ہر جگہ مسلط ہو جائے،

اور یہ درحقیقت دن کا بہترین وقت ہوتا ہے۔

اور بعض کی تعبیر کے مطابق یہ فصل جوانی کے حکم میں ہے، جب کہ گرمیوں کی ہوا ابھی گرم نہیں ہوتی، اور سردیوں میں ہوا کی سردی ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے اور انسان کی روح و جان اس موقع پر ہر قسم کی فعالیت کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ ”سجدی“ ”سجد“ (بروزن سرد، اور بروزن غلو) کے مادہ سے اصل میں سکون و آرام کے معنی میں ہے، اور چھپانے ”اور“ تاریک ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے، اسی لئے جب ”میت“ کو کفن میں لپیٹ دیتے ہیں تو اسے ”مسجدی“ کہا جاتا ہے۔

لیکن یہاں یہ وہی اصلی معنی دیتا ہے جو سکون و آرام ہے۔ اسی وجہ سے ان راتوں کو جن میں ہوا نہ چلے ”لیلۃ ساجیۃ“ (آرام و سکون کی رات) کہتے ہیں، اور طوفان و امواج خروشاں سے خالی سمندر کو ”بحر ساج“ (پر سکون سمندر) کہا جاتا ہے۔

بہر حال جو چیز رات کے سلسلہ میں اہم بات ہے وہی سکون و آرام ہے جو اس پر حکم فرما ہے، اور طبعاً انسان کے اعصاب اور روح کو سکون و آرام میں ڈبو دیتی ہے اور کل اور آئندہ آنے والے دنوں میں سعی اور کوشش کے لئے آمادہ و تیار کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ بہت ہی اہم نعمت ہے اور اس لائق ہے کہ اس کی قسم کھائی جائے۔

ان دونوں قسموں اور آیت کے مضمون کے درمیان شباهت اور ایک قریبی ربط موجود ہے۔ دن تو پیغمبر کے پاک دل پر وحی کے نور کے نزول کی مانند ہے اور رات وقتی طور پر وحی کے انقطاع کے مانند ہے جو بعض مقاطع اور اوقات میں

ضروری ہے۔ ان دونوں عظیم قسموں کے بعد نتیجہ اور جواب قسم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”تیرے پروردگار نے ہرگز تجھے چھوڑا نہیں ہے، اور نہ ہی تجھ سے غصہ ہوا ہے۔“ ﴿مَادَعَكَ رَبِّكَ وَمَا قَلَىٰ﴾۔

”ودع“ ”تودیع“ کے مادہ سے، چھوڑنے اور وداع کر دینے کے معنی میں ہے۔

”قلی“ ”قلا“ (بروزن صدا) کے مادہ سے شدت بعض و عداوت کے معنی میں، اور مادہ ”قلو“ (بروزن سرو) پھینکنے اور دھکا دینے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

راغب کا نظریہ یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ جو شخص کسی سے دشمنی کرتا ہے تو گویا دل اسے دھکا دے دیتا ہے، اور اسے قبول نہیں کرتا۔^(۱)

بہر حال یہ تعبیر پیغمبر کی ذات کے لئے ایک دل داری اور تسلی کے طور پر ہے کہ اچھی طرح یہ جان لیں کہ اگر کبھی فزول وحی میں تاخیر ہو جائے تو وہ کچھ مصلح کی بناء پر ہوتی ہے جسے خدا ہی جانتا ہے، اور ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ دشمنوں کے قول کے مطابق خدا اس سے خشمگیں اور غصہ ہو گیا، یا اس کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہمیشہ ہی خدا کے خاص لطف و کرم اور عنایات کے مشمول ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس کی خاص حمایت کے زیر سایہ رہتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”بیشک عالم آخرت تیرے لئے اس دنیا سے بہتر ہے۔“ ﴿وَلِلْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّكَ مِنَ الْاُولٰٓئِ﴾ اور تو اس دنیا میں بھی اس کے الطاف کا مشمول ہے، اور آخرت کی دراز مدت میں خلاصہ یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو دنیا میں بھی محترم ہے اور آخرت میں بھی محترم ہے، البتہ دنیا میں عزیز و محترم تر ہے۔

بعض مفسرین نے ”آخرت“ اور ”اولیٰ“ کی پیغمبر کی عمر کے آغاز و انجام کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تو اپنی آخری عمر میں زیادہ موافق اور زیادہ کامیاب ہو گا۔ اور یہ اسلام کی وسعت اور پھیلاؤ اور مسلمانوں کی دشمنوں پر بار بار کی کامیابیوں اور جنگوں میں ان کی فتوحات اور اسلام کے پودے باور ہونے اور شرک و بت پرستی کے آثار کے ہٹ جانے کی طرف اشارہ ہے

ان دونوں تفسیر کے درمیان جمع میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

اور آخری زیر بحث آیت میں پیغمبر کو افضل و برتر خوش خبری دیتے ہوئے مزید فرماتا ہے: ”عنقریب تیرا پروردگار تجھے اس قدر عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا۔“ ﴿وَلَسَوْفَ يَعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی﴾۔

یہ خدا کا اپنے بندہ خاص محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بالاترین احترام و اکرام ہے کہ فرماتا ہے: اس قدر تجھے بخشوں گا کہ تو راضی ہو جائے گا۔

دنیا میں تو دشمنوں پر کامیاب ہو جائے گا اور تیرا دین عالم گیر ہو جائے گا، اور آخرت میں بھی تو عظیم ترین نعمتوں کا مشمول ہو گا۔

اس میں شک نہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، خاتم انبیاء اور عالم بشریت کا رہبر ہونے کی حیثیت سے صرف اپنی ہی نجات پر خوش ہو سکتے، بلکہ آپ اس وقت راضی و خوش ہوں گے جب آپ کی شفاعت آپ کی امت کے بارے میں قبول ہو جائے گی، اس بناء پر روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت امید بخش ترین آیت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے قبول ہونے کی دلیل ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ زین العابدین علیہ السلام سے انہوں نے اپنے چچا ”محمد بن حنفیہ“ سے، انہوں نے اپنے باپ امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”قیامت کے دن میں موقف شفاعت میں کھڑا ہو جاؤں گا اور گناہ گاروں کی اس قدر شفاعت کروں گا، کہ خدا فرمائے گا:

”ارضیت یا محمد؟!“ اے محمد کیا تم راضی ہو گئے؟! تو میں کہوں گا، رضیت، رضیت: ”میں راضی ہو گیا، میں راضی ہو گیا!“ اس کے بعد امیر المومنین علیہ السلام نے اہل کوفہ کی ایک جماعت کی طرف رخ کیا اور مزید فرمایا۔ تمہارا یہ نظریہ ہے کہ قرآنی آیات میں سب سے زیادہ امید بخش آیت ”﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ اسْرِفُوا عَلَىٰ انْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ﴾“ ہے (یعنی اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو)۔ اس جماعت نے کہا: جی ہاں! ہم اسی طرح ہیں: آپ نے فرمایا: ”لیکن ہم اہل بیت یہ کہتے ہیں کہ آیات قرآنی میں سب سے زیادہ امید بخش آیت ”ولسوف يعطيك ربك فترضى“ ہے۔ (۲)

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ پیغمبر کی شفاعت کے لئے کچھ شرائط ہیں، نہ تو آپ ہر شخص کے لئے شفاعت کریں گے اور نہ ہیں ہر گنہگار اس کی توقع رکھ سکتا ہے۔ (اس کی بحث کی تفصیل جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۴۸ میں مطالعہ فرمائیے)۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

”رسول خدا فاطمہ کے گھر میں داخل ہوئے، جب کہ آپ کی بیٹی اونٹ کی اون کا سخت لباس پہنے ہوئے تھیں، ایک ہاتھ سے چکی پیس رہی تھیں، اور دوسرے ہاتھ سے اپنے فرزند کو دودھ پلارہی تھیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا، بیٹی! دنیا کی تلخی کو آخرت کی شیرینی کے مقابلہ میں برداشت کر، کیونکہ خدا نے مجھ پر یہ نازل کیا ہے کہ تیرا پروردگار اس قدر تجھے دے گا کہ تو راضی ہو جائے گا۔“

﴿ولسوف يعطيك ربك فترضى﴾^(۳)

۱۔ یہ مادہ ”ناقص یائی“ کی صورت میں بھی آیا ہے اور ”ناقص“ واوی کی صورت میں بھی پہلی صورت میں بغض و عداوت کے معنی میں ہے، اور دوسری صورت میں بھینکنے اور دھکا دینے کے معنی میں ہے، اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے دونوں معنی ایک ہی جڑ اور ریشہ کی طرف لوٹتے ہیں۔

۲۔ ”ابو الفتوح رازی“ جلد ۱۲، صفحہ ۱۱۰۔

۳۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۵۰۵۔

انقطاع وحی کا فلسفہ

اوپر والی آیات کے مجموعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی جانب سے ہے، یہاں تک کہ نزول وحی میں بھی آپ اپنی طرف سے کوئی اختیار نہیں رکھتے، جس وقت خدا چاہے وحی کو منقطع کر دے، اور جس وقت چاہے برقرار کر دے اور شاید انقطاعِ وحی بھی اسی مقصد کے لئے تھا، تاکہ ان لوگوں کا جواب ہو جو پیغمبرِ اکرم صلی علیہ وآلہ وسلم سے اپنے من مانے اور اپنے میلان کے مطابق معجزوں کا تقاضا کرتے تھے، یا آپ سے فرمائش کرتے تھے کہ فلاں حکم فلاں آیت کو بدل دیجئے، اور آپ ان سے یہ فرماتے کہ میں ان امور میں اپنی طرف سے کوئی اختیار نہیں رکھتا، (جیسا کہ سورہ یونس کی آیہ ۱۵ میں آیا ہے)۔

آیات ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱

- ۶۔ ﴿الْم يَجِدُكَ يَتِيمًا فَالْوٰی﴾ - ۷۔ ﴿وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰی﴾ - ۸۔ ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰی﴾ -
 ۹۔ ﴿فَإِمَّا يَنْتَهِمِ فَلَا تَقْهَرْ﴾ - ۱۰۔ ﴿وَإِمَّا السَّآئِلُ فَلَا تَنْهَرْ﴾ - ۱۱۔ ﴿وَإِمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ -

ترجمہ

- ۱۔ کیا تجھے یتیم نہیں پایا تو پھر پناہ دی؟ - ۷۔ اور تجھے گمشدہ پایا تو راہنمائی کی - ۸۔ اور تجھے فقیر پایا تو بے نیاز کیا۔
 ۹۔ اب جب کہ یہ بات ہے تو یتیم کو حقیر نہ سمجھ - ۱۰۔ اور سوال کرنے والے کو نہ دھتکار - ۱۱۔ اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کو یاد کر۔

ان تمام نعمتوں کے شکرانے میں جو خدا نے تجھے دی ہیں

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس سورہ میں ہدف اور مقصد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی و دلداری اور آنحضرت کے لئے الطافِ الہی کا بیان ہے۔ لہذا گزشتہ آیات کو جاری کرتے ہوئے، جن میں اس مطلب کو بیان کیا گیا تھا، زیر بحث آیات میں پہلے تو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خدا کی تین خاص نعمتوں کا ذکر کرتا ہے، اور اس کے بعد انہیں سے مربوط تین اہم حکم انہیں دیتا ہے۔

فرماتا ہے: کیا خدا نے تجھے یتیم نہیں پایا تو تجھے اس نے پناہ دی؟ ﴿الْم يَجِدُكَ يَتِيمًا فَالْوٰی﴾ -

تو ابھی شکم مادر ہی میں تھا کہ تیرا باپ اس دنیا سے چل بسا، تو میں نے تجھے تیرے جد عبدالمطلب (سردارِ مکہ) کی آغوش میں میں پرورش کرائی۔

تو چھ سال کا تھا تیری ماں دنیا سے چل بسی اور اس لحاظ سے بھی تو اکیلا رہ گیا، لیکن ہم نے تیرے عشق و محبت کو ”عبدالمطلب“ کے دل میں زیادہ کر دیا۔

تو آٹھ سال کا ہوا تو تیرا دادا ”عبدالمطلب“ بھی دنیا سے رخصت ہو گیا، تو ہم نے تیرے چچا ”ابوطالب“ کو تیری خدمت و حمایت کے لئے مقرر کر دیا، تاکہ تجھے جانِ شیریں کی طرح رکھے اور تیری حفاظت کرے۔
ہاں! تو یتیم تھا اور میں نے تجھے پناہ دی۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے کچھ اور دوسرے معنی بیان کئے ہیں جو اس کے ظاہر کے ساتھ سازگار نہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ یتیم سے مراد وہ شخص ہے جو شرافت و فضیلت میں اپنا مثل و نظیر نہ رکھتا ہو، جیسا کہ بے نظیر موتی کو ”در یتیم“ کہتے ہیں، لہذا اس جملہ کا معنی یہ ہوگا کہ خدا نے تجھے شرافت و فضیلت میں بے نظیر پایا۔ اس لئے تجھے انتخاب کیا اور مقامِ نبوت بخشا۔ دوسرا یہ کہ تو خود ایک دن یتیم تھا لیکن آخر کار تو یتیموں کو پناہ گاہ اور انسانوں کا رہبر ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ پہلا معنی ہر لحاظ سے زیادہ مناسب ہے اور ظاہر آیت کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔
اس کے بعد دوسری نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اور تجھے گمشدہ پایا تو تیری راہنمائی کی“ ﴿ووجدک ضالاً فہدی﴾

ہاں! تو ہرگز نبوت و رسالت سے آگاہ نہیں تھا، اور ہم نے یہ نور تیرے دل میں ڈالا، تاکہ تو اس کے ذریعہ انسانوں کو ہدایت کرے، جیسا کہ ایک دوسری جگہ فرماتا ہے: ﴿ما کنتم مالا لکتاب و لا الیمان و لکن جعلناہ نوراً نھدی بہ من نشاء من عبادنا﴾: ”نہ تو تو کتاب ہی کو جانتا ہے اور نہ ہی ایمان کو“ (یعنی فزول وحی سے پہلے تو اسلام و قرآن کے مطالب سے آگاہ نہیں تھا) لیکن ہم نے اس کو ایک ایسا نور قرار دیا ہے کہ جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں جسے چاہیں ہدایت کرتے ہیں“ (شورہ ۵۲)

یہ بات واضح ہے کہ پیغمبر کے پاس مقامِ نبوت و رسالت تک پہنچنے سے پہلے یہ الہی فیض نہیں تھا۔ خدا نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر ہدایت فرمائی اور اس مقام تک پہنچا دیا، جیسا کہ سورہ یوسف کی آیہ ۳ میں آیا ہے: ﴿نحن نقص علیک احسن

القصص بما اوحينا اليك القرآن و ان كنت من قبله لمن الغافلين﴾: ”ہم نے قرآن کی وحی کے ذریعہ ایک بہترین داستان تیرے لئے بیان کی ہے، اگر تو اس سے پہلے اس سے آگاہ نہیں تھا۔

یقیناً اگر ہدایت الہی اور غیبی امدادیں پیغمبر کے ہاتھ کو نہ پکڑتیں تو وہ ہرگز منزل مقصود کا راستہ نہ پاتے۔ اس بناء پر یہاں ”جلالت“ سے مراد ایمان، توحید، پاکیزگی اور تقویٰ کی نفی نہیں ہے، بلکہ ان آیات کے قرینہ سے جن کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے، اسرارِ نبوت اور قوانینِ اسلام سے آگاہی کی نفی، اور ان حقائق سے عدم آشنائی تھی، جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے لیکن بعثت کے بعد پروردگار کی مدد سے ان تمام امور سے واقف ہو گئے اور ہدایت پائی، (غور کیجئے)۔

سورہ بقرہ کی آیہ ۲۸۲ میں قرضوں کی سند لکھنے کے مسئلہ میں متعدد گواہوں کے فلسفہ کو ذکر کرتے وقت فرماتا ہے: ﴿ان تضل احدهما فتذكر احدهما الاخرى﴾: ”یہ اس بناء پر ہے کہ اگر ان دونوں میں سے ایک گمراہ ہو جائے اور بھول جائے تو دوسرا، اسے یاد دلا دے۔“

اس آیت میں ”ضلالت“ صرف صرف بھول جانے کے معنی میں ہے ”فتذكر“ کے جملہ کے قرینہ سے۔ یہاں اس آیت کے لئے اور بھی کئی تفاسیر بیان ہوئی ہیں، منجملہ ان کے یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تو بے نام و نشان تھا، خدا نے تجھے اس قدر بے نظیر نعمتیں عطا کیں کہ تو ہر جگہ پہچانا جانے لگا۔

ہاں اس سے مراد یہ ہے کہ تو اپنے بچپن میں کئی مرتبہ گم ہوا۔ (ایک دفعہ مکہ کے دروں میں جب کہ تو عبد المطلب کی پناہ میں تھا، اور دوسری مرتبہ اس وقت جب تیری رضاعی ماں ”حلیہ سعدیہ“ دودھ پلانے کی مدت کے اختتام پر تجھے مکہ کی طرف لا رہی تھی تاکہ تجھے عبد المطلب کے سپرد کر دے تو راستہ میں گم ہو گیا، اور تیسری مرتبہ اس وقت جب تو اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ اس قافلہ میں جو شام کی طرف جا رہا تھا، ایک تاریک اور اندھیری رات میں گم ہو گیا تھا) اور خدا نے ان تمام موارد میں تیری راہنمائی کی اور تجھے تیرے جد یا چچا کی محبت بھری آغوش میں تک پہنچا دیا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”ضال“ لغت کے لحاظ سے دو معنی کے لئے آیا ہے: ۱۔ ”گم شدہ“ ۲۔ ”گم راہ“ مثلاً کہا جاتا ہے کہ: الحکمة ضالة المؤمن: حکمت و دانش مومن کی گم شدہ چیز ہے۔“

اور اسی مناسبت سے مخفی اور غائب کے معنی میں بھی آیا ہے جیسا کہ سورہ سجدہ کی آیہ ۱۰ میں آیا ہے: منکران معاد کہا کرتے تھے:

﴿اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ اَنَا لَفِي خَلْقٍ﴾ جدید: کہ جب ہم زمین میں پنہاں اور غائب ہو جائیں گے تو پھر نئی خلقت اختیار کریں گے؟۔

اگر زیر بحث آیت میں ”ضال“ گم شدہ کے معنی میں ہو تو پھر کوئی مشکل پیش نہیں آتی، (یعنی تو گمشدہ تھا، لوگ تیری عظمت و شرافت سے ناواقف تھے، پس ہم نے انہیں تیری طرف ہدایت کی،) (مترجم)

اور اگر یہ ”گمراہ کے معنی میں ہو تو اس مراد بعثت سے پہلے راہ نبوت و رسالت تک دسترس نہ رکھتا ہوگا، یا دوسرے لفظوں میں پیغمبر اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں رکھتے تھے، جو کچھ تھا وہ خدا کی طرف سے تھا، اس بناء پر دونوں ہی صورتوں میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

اس کے بعد تیسری نعمت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: خدا نے تجھے فقیر یا غنی و بے نیاز کر دیا۔“ ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا﴾ (۱)۔

جناب ”خدیجہ (رض)“ جیسی مخلص و با وفا خاتون کی توجہ تیری طرف مبذول کی، تاکہ وہ اپنی عظیم ثروت و دولت کو تیرے اختیار میں دے دے اور تیرے عظیم اہداف و مقاصد کے لئے وقف کر دے، اور اسلام کے غلبہ کے بعد جنگوں میں بکثرت مال ہائے غنیمت تجھے عطا کئے، اس طرح سے کہ تو اپنے عظیم مقاصد تک پہنچنے کے لئے بے نیاز ہو گیا۔

ایک روایت میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے ان آیات کی تفسیر میں اس طرح فرمایا:

”﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاَوٰى قَالَ: فَرَدًّا لَا مِثْلَ لَكَ فِي الْمَخْلُوْقِيْنَ، فَاَوٰى النَّاسَ الْيَلَّ، وَوَجَدَكَ ضَالًّا اٰى ضَالَةً فِيْ قَوْمٍ لَا يَعْرِفُوْنَ فَضْلَكَ فَهَدَاهُمْ اِلَيْكَ، وَوَجَدَكَ عَائِلًا تَعُوْلُ اَقْوَامًا بِالْعِلْمِ فَاَغْنَاهُمْ بِكَ﴾:“

”کیا ہم نے تجھے اپنی مخلوق کے اندر یتیم یعنی بے نظیر فرد نہیں پایا تو ہم نے لوگوں کو تیری پناہ میں دے دیا، اور تجھے اپنی قوم کے درمیان گمشدہ اور نا پہچانا ہوا پایا، جو تیرے مقام فضل کو نہیں پہچانتے تھے، تو خدا نے انہیں تیری طرف ہدایت کی اور تجھے علم و دانش میں اقوام عالم کا سرپرست قرار دیا اور انہیں تیرے ذریعے بے نیاز کر دیا۔“ (۲)

البتہ یہ حدیث آپ کے بطون کو بیان کرتی ہے ورنہ آیت کا ظاہر وہی ہے، جو اوپر بیان کیا گیا۔

لیکن یہ تصور نہیں ہونا چاہئے کہ یہ امور جو آیت کے آخر میں بیان ہوئے ہیں۔ پیغمبر کے مقام بلندیں کمی اور نقص کا سبب ہیں، یا آپ کے بارے میں پروردگار کی طرف سے منفی تو صیف ہے۔ بلکہ یہ تو حقیقت میں الطاف الہی اور اس عظیم پیغمبر کے بارے میں اس کے اکرام و احترام کا بیان ہے، جب محبوب و لباختہ عاشق کے بارے میں اپنے لطف و

کرم کی بات کرتا ہے تو یہ خود ایک لطف و کرم کی بات کرتا ہے تو یہ خود ایک لطف و محبت ہے اور اس کے لطف خاص کی دلیل ہے اور اسی بناء پر محبوب کی طرف سے ان الفاظ کی سننے سے اس کی روح تازہ ہو جاتی ہے، اور ان کی جان میں صفا پیدا ہوتی ہے، اور اس کے دل کو آرام و سکون حاصل ہوتا ہے۔

بعد والی آیات میں گزشتہ آیات کا نتیجہ نکالتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تین احکام دیتی ہے، اگرچہ ان میں مخاطب رسول اللہ کی ذات گرامی ہے، لیکن یقیناً وہ سب کو شامل ہیں، پہلے فرماتا ہے، : جب معاملہ یہ ہے کہ تو پھر یتیم کی تحقیر و تذلیل نہ کر“ ﴿فاما الیتیم فلا تقهر﴾۔

”تقهر“ ”قهر“ کے مادہ سے ”مفردات“ میں ”راغب“ کے قول کے مطابق، اس غلبہ کے معنی میں ہے جس کے ساتھ تحقیر ہو، لیکن ان دو معانی میں سے ہر ایک کے لئے علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے، اور یہاں مناسب وہی ”تحقیر“ ہی ہے۔ یہ چیز اس بات کی نشاۃ ہی کرتی ہے کہ یتیموں کے بارے میں اگرچہ اطعام و انفاق کا مسئلہ بھی اہم ہے لیکن اسے سے بھی زیادہ اہم دل جوئی و نوازش اور شفقت کی کمی کو رفع کرنا ہے۔ اسی لئے ایک مشہور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”من مسح علی رأس یتیم کان له بكل شعرة تمر علی یده نور يوم القيامة“۔

”جو شخص نوازش و مہربانی کے ساتھ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے تو ہر بال کی تعداد کے مطابق جس پر اس کا ہاتھ پھرے گا قیامت میں ایک نور ہوگا“۔ (۳)

گویا پیغمبر سے فرماتا ہے: تو خود بھی یتیم تھا، اور تو نے بھی یتیمی کا رنج اور تکلیف اٹھائی ہے، تو اب تو دل و جان سے یتیموں کی نگہبانی کر، اور ان کی پیاسی روح کو محبت کے ساتھ سیراب کر۔ اور بعد والی آیت میں دوسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اور سوال کرنے والے کو نہ دھتکار“ ﴿و اما السائل فلا تنهر﴾۔

”لا تنهر“ ”نهر“ کے مادہ سے سختی کے ساتھ دھتکارنے کے معنی میں ہے۔ اور بعید نہیں ہے کہ اس کی اصل ”نهر“ ہو اور جاری پانی کو نہر کے معنی کے ساتھ ایک ہو، کیونکہ وہ بھی پانی کی شدت کے ساتھ دھکیلتی ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں ”سائل“ سے کون مراد ہے؟ چند تفسیریں موجود ہیں، پہلی یہ کہ اس سے ایسے افراد مراد ہیں جو علمی، اعتقادی اور دینی مسائل میں سوالات رکھتے ہیں، اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ یہ حکم اس چیز پر جو گزشتہ آیات میں

آیا ہے متفرع ہے، ”ووجدك ضالا فهدى“ خدا نے تجھے گم شدہ پایا تو تجھے ہدایت کی، پس اس ہدایتِ الہی کے شکرانے کے طور پر ہدایت کے نیاز مندوں کے لئے کوشاں راہ، اور اس کسی ہدایت کا تقاضا کرنے والے کو اپنے پاس سے نہ دھتکار۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو مادہ لحاظ سے فقیر ہیں اور وہ تیرے پاس آتے ہیں، تو جتنی تجھ میں طاقت ہے اس کے مطابق عمل کر اور انہیں مایوس نہ کر اور اپنے پاس سے نہ دھتکار۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ یہ فقرِ علمی اور فقرِ مادی دونوں کو بیان کر رہی ہے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ ہر قسم کا سوال کرنے والے کو مثبت جواب دے، یہ معنی پیغمبر کے لئے خدا کی ہدایت کے ساتھ بھی مناسبت رکھتا ہے، اور ان کی یتیمی کے زمانے میں ان کی سرپرستی سے بھی مناسبت رکھتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ سائل سے مراد یہاں صرف علمی مسائل کے بارے میں سوال کرنے والا ہے، کہا ہے کہ ”سائل کی تعبیر قرآن مجید میں ہرگز مالی تقاضا کرنے والوں کے لئے نہیں آئی۔“ (۴)

حالانکہ یہ قرآن میں بارہا اس معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ سورہ ذاریات کی آیہ ۱۹ میں آیا ہے: ﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾: ”ان کے مالوں میں سائل اور محروم کے لئے حق ہے اور یہی معنی سورہ معارج کی آیہ ۲۵ اور سورہ بقرہ آیہ ۱۷۷ میں بھی آیا ہے۔

اور آخر میں تیسرے اور آخری حکم میں فرماتا ہے: اور باقی رہیں تیرے پروردگار کی نعمتیں تو تو ان کو بیان کر“ (واما بنعمۃ ربک فحدث)۔

نعمت کو بیان کرنا کبھی تو زبان سے ہوتا ہے اور ایسی تعبیروں سے جو انتہائی شکر و سپاس کی ترجمان ہوتی ہیں، نہ کہ غرور و تکبر اور برتری کے خیال سے، اور کبھی عمل سے بھی ہوتا ہے اس طرح کے اس سے راہِ خدا میں انفاق و بخشش کرے، ایسی بخشش جو اس بات کی نشان دہی ہو کہ خدا نے اسے فرواں نعمت عطا کی ہے۔

یہ سخی اور کریم لوگوں کی سنت ہے کہ انہیں کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ اسے بیان کرتے ہیں اور خدا کا شکر بجالاتے ہیں

اور ان کا عمل بھی اس حقیقت کی تائید و تاکید کرتا ہے، پست ہمت بخیلوں کے برعکس جو ہمیشہ نالہ و فریاد کرتے ہیں ، اور اگر ساری دنیا بھی انہیں دے دیں تو بھی نعمتوں پر پردہ پوشی ہی کرتے رہتے ہیں۔ ان کا چہرہ فقیرانہ اور ان کی باتیں آہ و زاری کے ساتھ، اور ان کا عمل بھی فقر و فاقہ کو بیان کرنے والا ہوتا ہے۔

یہ اس حالت میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی اَنْعَمَ عَلٰی عَبْدِهِ نِعْمَةً یَّحِبُّ اَنْ یَّرٰی اَثَرَ النِّعْمَةِ عَلَیْهِ“

”خداوند عالم جب کسی بندہ کو کوئی نعمت دیتا ہے، تو وہ اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ اس پر نعمت کے آثار دیکھے“ (۵)

اس بناء پر آیت کا ماحصل اس طرح ہے: اس بات کے شکر اُن کے میں کہ تو فقیر تھا اور خدا نے تجھے بے ازکیا ہے، تو بھی نعمت کے آثار کو آشکار، اور گفتار و عمل سے اس خدائی نعمت کو بیان کر۔

لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں ”نعمت“ سے مراد صرف معنوی نعمتیں ہیں، منجملہ ان کے نبوت یا قرآن مجید ہے کہ پیغمبر اسکی تبلیغ کے ذمہ دار تھے، اور نعمت کو بیان کرنے سے مراد یہی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تمام مادی و معنوی نعمتوں کو شامل ہو۔

لہذا ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: کہ آیت کا معنی اس طرح ہے:

حدث بما اعطاک اللہ ، وفضلک ، و رزقک، و احسن الیک وهداک:

”جو کچھ خدا نے تجھے بخشا ہے، برقری دی ہے، روزی عطا کی ہے، اور تیرے ساتھ نیکی اور احسان کیا ہے اور تجھے ہدایت کی ہے، ان سب کو بیان کر“ (۶)

اور بالآخرہ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک دستور کلی کے عنوان سے آیا ہے:

”من اعطی خیراً فلم یر علیہ، سمی یغیض اللہ معادیاً لنعم اللہ“

”جس شخص کو کوئی خیر و نعمت دی جائے، لیکن اس کی شخصیت میں اس کے آثار نظر آئیں تو اسے خدا کا دشمن اور اس کی نعمتوں کا مخالف شمار کرنا چاہیے۔“ (۷)

ہم اس گفتگو کو امیر المومنین کی ایک دوسری حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

”اِنَّ اللّٰهَ جَمِیْلٌ یَّحِبُّ الْجَمَالَ ، و یحِبُّ اَنْ یَّرٰی اَثَرَ النِّعْمَةِ عَلٰی عَبْدِهِ“۔

”خدا جمیل ہے اور وہ جمال و زیبائی کو دوست رکھتا ہے، اور اسی طرح سے وہ اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ اپنے بندے پر نعمت کے آثار دیکھے“۔^(۸)

۱۔ ”عائل“ اصل میں عیال دار شخص کے معنی میں ہے، چاہے وہ غنی و توانگر ہو، لیکن یہ لفظ فقیر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور زیر بحث آیت میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ ”راغب“ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ”عال“ اجوف یا ئی ہو تو فقیر کے معنی میں ہے، اور اجوف واوی ہو تو کثیر العیال کے معنی میں ہوتا ہے، (لیکن ان دونوں کا لازم و ملزوم ہونا بعید نہیں ہے)۔

۲۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۵۰۶۔

۳۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۵۰۶۔

۴۔ ”تفسیر عمدہ، جزء عم، ص ۱۱۳۔

۵۔ ”نہج الفصاحتہ“ حدیث ۶۸۳۔

۶۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۵۰۷۔

۷۔ ”تفسیر قرطبی“ جلد ۱۰، ص ۷۱۹۲، اسی معنی کے قریب قریب کافی جلد ۶۔ کتاب الذی والتجمل حدیث ۲ میں بھی آیا ہے۔

۸۔ فروع کافی جلد ۶، ص ۴۳۸ حدیث۔

۱۔ مصائب و آرام کے درمیان سے مبعوث ہونے والا پیغمبر

اوپر والی آیات جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خدا کی نعمتوں کی تشریح و تفصیل کو بیان کرتی ہیں، ضمنی طور پر اس نکتہ کو بھی بیان کرتی ہیں کہ آپ بچپن کے آغاز سے ہی یتیم تھے، مادی لحاظ سے سخت و شدید حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے، مصائب و آلام میں گھرے ہوئے تھے اور انہیں مصائب میں مبعوث ہونے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

ایک دانی اور انسانی رہبر کو زندگی کی تلخیوں کو چکھنا، پریشانیوں کو ذاتی طور پر لمس کرنا، اور اپنے سارے وجود کے ساتھ تلخیوں کا احساس کرنا چاہیئے، تاکہ معاشرے کے محروم طبقات کی صحیح طور پر قدر کر سکے، اور ایسے لوگوں کے حالات سے جو مصائب و آلام میں مبتلا ہیں باخبر ہو سکے۔

پھر بچپن میں ہی باپ (کی شفقت) سے محروم ہو جائے، تاکہ اپنے یتیم بچوں کو مصیبت سے باخبر کرے، دن اس کے بھوک میں گزریں اور راتوں کو بھوکا سونے تاکہ بھوکوں کو درد اور تکلیف کو اپنے سارے وجود کے ساتھ محسوس کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کسی یتیم کو دیکھتے تھے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ اسے اپنی گود میں بٹھاتے تھے، اس سے نوازش و شفقت کرتے تھے، اور جان شریں کی طرح اپنی آغوش میں لے لیتے تھے۔

اور پھر اس نے معاشرے کے تمدن میں فقر کو اچھی طرح سے درک کیا ہو، تاکہ جو لوگ علم و دانش کے حصول کے لئے اس کی خدمت میں آئیں ان کا احترام کرے، اور کھلی آغوش کے ساتھ ان کی پذیرائی کرے۔

نہ صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلکہ شاید تمام انبیاء مصائب اور محرومیوں کے پروردہ تھے، اور نہ صرف انبیاء بلکہ تمام سچے اور موفق رہبر ایسے ہی ہوئے ہیں اور انہیں ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

جس شخص نے ناز و نعمت کے درمیان پرورش پائی ہو، شان و شوکت والے محلوں میں زندگی بسر کی ہو، اس نے جب بھی کوئی خواہش کی ہو وہ پوری ہو گئی ہو، وہ محروم لوگوں کے درد و تکلیف کو کس طرح سے درک کر سکتا ہے، اور فقراء و مساکین کے کاشانوں اور یتیموں کے گھروں کا منظر اس کی نظروں میں کیسے مجسم ہو سکتا ہے اور وہ ان کی کمک اور مدد کے لئے بے تابی کے ساتھ کیسے آگے بڑھ سکتا ہے؟!

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

”ما بعث الله نبياً قط حتى يستترعيه الغنم يعلمه بذلك رعية الناس“

”خدا نے ہرگز کسی نبی کو مبعوث نہیں کیا جبکہ اس سے بھیڑ بکریوں کی چوپانی کا کام نہیں کرایا، تاکہ وہ اس طریقہ سے انسانوں کی نگہبانی کا طریقہ سیکھ سکیں۔“^(۱)

یعنی ایک تورنج و تکلیف برداشت کیا، دوسرے کم شعور افراد سے مقابلہ میں صبر و تحمل کا تجربہ کیا اور کوہ و صحرا اور فطرت و مادہ کی آغوش میں توحید و عرفان کے عظیم سبق حاصل کئے۔

اور ایک حدیث میں آیا ہے ”موسیٰ بن عمران“ نے اپنے خدا سے سوال کیا کہ میں کس بناء پر اس مقام تک پہنچا؟ خطاب قدرت ہوا، کیا تجھے وہ دن یاد ہے جب گوسفند کا ایک بچہ تیرے گلہ سے بھاگ گیا تھا؟ پھر تو اس کو دوش پر اٹھا کر گوسفندوں کے گلہ میں واپس لے آیا، میں نے اسی بناء پر تجھے مخلوق کا سرپرست بنا دیا ہے۔ (ایک جانور کے مقابلہ میں تیرا یہ عجیب و غریب تحمل و حوصلہ، تیری عظیم روحی قدرت کی دلیل ہے۔ لہذا تو اس عظیم مقام کے لائق ہے)۔

۲۔ یتیموں پر نوازش و شفقت

چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کا وجود، جو بچپن میں اپنے باپ (کی شفقت) سے محروم ہو چکے ہوں، ہر معاشرے میں اجتناب ناپذیر ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی کئی جہات سے حمایت ہونی چاہیئے۔

شفقت و مہربانی کے لحاظ سے بہت سے محرومیاں ہوتی ہیں۔ اگر ان کے وجود کا خلا اس لحاظ سے پر نہ ہو تو غیر صحیح، غیر سالم، اور بہت سے مواقع ہر سنگ دل، مجرم اور خطرناک بچے پر و ان چڑھتے ہیں۔ علاوہ ازیں عواطف انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ تمام لوگ ان کی طرف معاشرے کے تمام بچوں کی طرح توجہ اور حمایت کریں۔ اور ان تمام باتوں سے قطع نظر لوگ اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں، جو ممکن ہے انہیں حالات سے دوچار ہو جائیں، مطمئن ہوں۔ بہت سے موارد میں یتیم بچے ایسے مال کے مالک ہوتے ہیں جسے وقت و امانت کے ساتھ ان کے مستقبل کے لئے محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اور بہت سے موارد میں ان کے ہاں مالی امکانات و وسائل کا فقدان ہوتا ہے۔ لہذا انہیں اس لحاظ سے بھی مورد توجہ ہونا چاہیئے اور دوسرے لوگوں کو، مہربان ماں باپ کی طرح، ان کی روح سے یتیمی کے رنج اور تکلیف کو دور کرنا چاہیئے اور تنہائی کے گرد و غبار کو ان کے چہرے سے ہٹا دینا چاہیئے۔

اسی لئے قرآن مجید کی آیات، اور بہت سی اسلامی روایات میں اس مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے جس میں اخلاقی پہلو بھی ہے اور معاشرتی اور انسانی پہلو بھی۔

یہ حدیث پیغمبر اکرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معروف ہے کہ آپ نے فرمایا:

”ان الیتیم اذا بکی اھتز لبکائھ عرش الرحمن“

”جب یتیم روتا ہے کہ خدائے رحمن کا عرش لرز اٹھتا ہے۔“

”خدا اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: اے میرے فرشتو! اس یتیم کو جس کا باپ مٹی میں روپوش ہو گیا ہے، کس نے رلادیا؟ فرشتے کہتے ہیں: خدا یا تو زیادہ بہتر طور سے جانتا ہے تو خدا فرماتا ہے: اے میرے فرشتو! میں تمہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جو شخص اس کو رونے سے خاموش کرے گا اور اس کے دل کو خوش کرے گا، میں قیامت کے دن اسے خوش کروں گا۔“ ۱

اس سے بالاتر ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

”اذا بكى اليتيم وقعت دموعه فى كف الرحمن“۔

”جب یتیم روتا ہے تو اس کے آنسوؤں خدائے رحمن کے ہاتھ میں پڑتے ہیں۔“ (۲)

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”انا و کافل الیتیم کھاتین فى الجنة اذا اتقى الله عزوجل و اشار بالسبابة والوسطی“

”میں اور یتیم کا سرپرست ان دو کی طرح جنت میں ہوں گے، بشرطیکہ وہ خوفِ خدا اور تقویٰ رکھتا ہو۔ پھر آپ نے

انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کیا، ۳

اس موضوع کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنے مشہور وصیت نامہ میں یتیموں کی

طرف توجہ اور دھیان دینے کو نماز و قرآن کی طرف توجہ کرنے کے ساتھ قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

”اللہ اللہ فى الايتام فلا تغلبوا افواههم ولا يضيعوا بحضرتکم“:

”خدا کو یاد رکھو، خدا کو یاد رکھو! یتیموں کو کبھی سیر اور کبھی بھوکا نہ رکھو اور تمہارے سامنے وہ ضائع نہ ہوں۔“ (۴)

ایک حدیث میں پیغمبر کے ایک صحابی سے آیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم رسول خدا کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک

بچہ آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: ”میں ایک یتیم بچہ ہوں، میری ایک یتیم بہن ہے، اور ایک بیوہ ماں ہے، جو جو

کچھ خدا نے آپ کو کھانے کے لئے دیا ہے اس میں سے ہمیں بھی کھلائے تاکہ خدا کے پاس جو کچھ ہے اس میں سے وہ

آپ کو اس قدر دے کہ آپ راضی ہو جائیں!“

”بیٹا تم نے کتنی اچھی بات کہی ہے! پھر آپ نے حضرت بلال (رض) کی طرف رخ کیا جاو اور جو کچھ ہمارے

پاس ہے وہ لے آو۔ بلال اکیس (۲۱) خرے کے دانے لے آئے پیغمبر نے فرمایا: سات دانے تیرے اور سات دانے

تیری بہن کے اور سات دانے تیری ماں کے لئے۔“

”معاذ بن جبل (رض)“ اٹھے اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا: خدا تیری یتیمی کی تلافی کرے اور تجھے اپنے باپ کا اچھا

جانشین بنائے۔ (یتیم بچہ مہاجرین کی اولاد میں سے تھا)۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ”معاذ“ کی طرف رخ کر کے فرمایا:

”تیرے اس کام کا سبب کیا تھا؟“ اس نے عرض کیا: محبت اور رحمت تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”جو شخص تم میں سے کسی یتیم کی سرپرستی اپنے ذمہ لے، اور اس کا حق ادا کرے، اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے تو خدا ہر بال کی تعداد میں اس کے لئے ایک نیکی تحریر کرے گا، اور ہر بال کی تعداد میں اس کی برائیوں کو محو کر دے گا، اور ہر بال کے بدلے اس کو ایک درجہ عطا کرے گا۔“ (۵)

البتہ ایسے وسیع معاشروں میں جیسا کہ آج کے معاشرے ہیں، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں انفرادی کاموں پر قناعت نہ کریں، بلکہ انہیں چاہیے کہ اپنی توانائیوں کو یکجا طور پر استعمال کرتے ہوئے یتیموں کو اقتصادی، علمی اور تربیتی پروگراموں کے ذریعے کارآمد بنائیں اور انہیں اسلامی معاشرے کے لائق افراد بنائیں۔ اور یہ اہم کام عمومی تعاون کا محتاج ہے۔

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۰۶۔

۲۔ ”تفسیر فخر رازی“ جلد ۳۱ ص ۲۱۹۔

۳۔ ”نور الثقلین“ جلد ۵، ص ۵۹۷ حدیث ۲۳۔

۴۔ ”نبج البلاغہ خط نمبر ۴۷ حصہ خطوط۔

۵۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۵۰۔

۳۔ نعمتوں کو بیان کرنا

وہ حکم جو اس سلسلہ میں اوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے، اگر وہ خدا کے شکر و سپاس کے عنوان سے ہو، اور خود کو بڑا کر کے دکھانے اور فخر کے عنوان سے نہ ہو، تو وہ نہ صرف انسان کو پروردگار کے مقامِ عبودیت میں تکامل و ارتقاء بخشا ہے اور اجتماعی مثبت اثرات رکھتا ہے، بلکہ انسان کی روح و جان میں بھی آرام بخش اثر چھوڑتا ہے۔

خدا کی نعمتوں کے ذکر کرنے سے انسان اپنے پاس کسی چیز کے کم ہونے کا احساس ہی نہیں کرتا، بیماری کا شکوہ نہ کرنے سے دوسرے اعضاء کی سلامتی پر شکر گزار ہوتا ہے، کسی چیز کے کھوئے جانے پر جزع و فزع نہ کرنے سے وہ اپنے باقی امکانات و وسائل کو بیان کرتا ہے۔

اس قسم کے افراد زندگی کی سختیوں اور طوفان میں یاس و ناامیدی میں گرفتار نہیں ہوتے اور نہ ہی مضطرب و پریشان ہوتے ہیں۔ ان کی روح سکون و آرام میں، اور دل مطمئن ہوتا ہے۔ اور مشکلات سے مقابلہ کرنے میں ان میں زیادہ توانائی ہوتی ہے۔

خداوند! تیری نعمتیں اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں بیان کیا جاسکے، ان کو ہم سے سلب نہ کرنا، اور اپنے فضل و کرم سے ان میں اضافہ فرمانا۔

پروردگار! ہم اس دنیا میں تیرے احسان میں غرق ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس جہاں میں بھی اسی طرح ہوں۔
بارالہا! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم ہمیشہ محروم لوگوں کے پشتیان اور یتیموں کے حقوق کے محافظ ہوں۔

آمین یا رب العالمین

سورہ الم نشرح

یہ مکہ میں نازل ہوا اس میں ۸ آیات ہیں

سورہ ”الم نشرح“ کے مضامین

مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ، سورہ والضحیٰ کے بعد نازل ہوا ہے اور اسکے مضامین بھی اسی مطلب کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ اس سورہ میں بھی پھر سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خدا کی نعمتوں کے ایک حصہ کو شمار کیا گیا ہے۔ حقیقت میں تین قسم کی عظیم نعمتیں سورہ والضحیٰ میں آئی تھی اور تین ہی عظیم نعمتیں سورہ الم نشرح میں آئی ہیں۔ گزشتہ نعمتوں میں تو بعض مادی اور بعض معنوی تھیں، لیکن اس سورہ کی تمام نعمتیں معنوی پہلو رکھتی ہیں اور یہ سورہ خصوصیت کے ساتھ تین محوروں کے گردش کرتا ہے:

ایک تو انہی تینوں نعمتوں کا بیان ہے، دوسرا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مستقبل میں ان کی دعوت کی مشکلات کے برطرف ہونے کے لحاظ سے بشارت ہے، اور تیسرا خداوندیگانہ کی طرف اور اس کی عبادت و بندگی کی طرف تحریر ص و ترغیب۔

اسی بناء پر روایات اہل بیت میں --- جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی سورہ شمار ہوتی ہیں۔ اسی لئے قرأت نمازیں اسی بناء پر کہ ایک مکمل سورت پڑھی جائے، دونوں کو اکٹھا پڑھتے ہیں۔ اہل سنت میں بھی بعض حضرات اسی نظریہ کے طرف دار ہیں جیسا کہ فخر رازی نے طاووس اور عمر بن عبد العزیز سے نقل کیا ہے کہ وہ بھی یہی کہا کرتے تھے کہ یہ دونوں سورتیں ایک ہی سورت ہیں اور وہ ایک رکعت میں دونوں کو تلاوت کیا کرتے تھے، البتہ وہ ان دونوں کے درمیان بسم اللہ کو حذف کر دیتے تھے۔ (لیکن ہمارے فقہاء کے مطابق بسم اللہ دونوں میں ہونا چاہیئے، اور یہ جو مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ ہمارے فقہاء بسم اللہ کو حذف کر دیتے ہیں درست نظر نہیں آتا)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ فخر رازی ان لوگوں کا قول نقل کرنے کے بعد، جو ان دونوں کو ایک سورہ کہتے ہیں، کہتا ہے کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کے مضامین ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سورہ والضحیٰ اس وقت نازل ہوا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار کی اذیت رسانی پریشان تھے اور زندگی سختی اور غم و اندوہ میں بسر کر رہے

تھے، حالانکہ دوسری سورت اس وقت نازل ہوئی جب کہ پیغمبر خوش حال و شادمان تھے، تو یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔^(۱)

لیکن یہ استدلال عجیب ہے کیونکہ دونوں سورتیں پیغمبر کی گزشتہ زندگی کی بات کر رہی ہیں، اور اس وقت کی بات ہے جبکہ آپ بہت ہی مشکلات کو پیچھے چھوڑ چکے تھے، اور آپ کا پاک دل امید و سرور میں غرق تھا۔ یہ دونوں سورتیں خدا کی نعمتوں کی بات کر رہی ہیں، اور سختی اور مشکلات سے پر ماضی کی یاد دلا رہی ہیں، تاکہ پیغمبر کے دل کی تسلی اور زیادہ سے زیادہ کامل امید کا باعث ہو۔

بہر حال ان دونوں سورتوں کے مضامین کا قریبی تعلق ایسی چیز نہیں ہے جو شک اور تردید کے قابل ہو، اسی معنی کی نظیر سورہ فیل اور سورہ قریش میں بھی آئے گی۔ انشاء اللہ۔

اس سورے کے بارے میں کہ یہ سورہ ﴿الم نشرح﴾ مکہ میں نازل ہوا ہے یا مدینہ میں، اوپر بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوا ہے، لیکن آیہ ﴿ورفعنا لک ذکرک﴾ ”ہم نے تیرے ذکر کو بلند کیا“ کی طرف توجہ کرتے ہوئے بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوا ہے، اس وقت جب کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی شہرت، چاروں طرف پھیل چکی تھی لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ دلیل اطمینان بخش نہیں ہے کیونکہ پیغمبر کی شہرت ان تمام مشکلات کے باوجود، جو آپ کو مکہ میں درپیش تھیں۔ ہر طرف پھیل چکی تھی، اور تمام محفلوں میں آپ کے قیام، رسالت اور دعوت کے بارے میں چرچے ہو رہے تھے اور حج کے سالانہ اجتماع کے ذریعے یہ شہرت حجاز کے دوسرے علاقوں خصوصاً مدینہ میں پہنچ چکی تھی۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلے میں ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”من قرأ اعطى من الاجر کمین لقی محمداً (ص) مغتماً ففرض عنہ“
 ”جو شخص اس سورہ کو پڑھے اس کو اس شخص کا اجر ملے، گا جس نے محمد کو غمگین دیکھا اور آپ کے قلب مبارک سے غم و اندوہ کو دور کیا ہو۔“^(۱)

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸

﴿بسم الله الرحمن الرحيم﴾

- ۱۔ ﴿الم نشرح لك صدرك﴾ - ۲۔ ﴿ووضعنا عنك وزرك﴾ - ۳۔ ﴿الذي انقض ظهرك﴾ -
- ۴۔ ﴿ورفعنا لك ذكرك﴾ - ۵۔ ﴿فان مع العسر يسراً﴾ - ۶۔ ﴿ان مع العسر يسراً﴾ -
- ۷۔ ﴿فاذا فرغت فانصب﴾ - ۸۔ ﴿و الي ربك فارغب﴾ -

ترجمہ

اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

- ۱۔ کیا ہم نے تیرے سینہ کو کشادہ نہیں کیا؟ ۲۔ اور تجھ سے بھاری بوجھ برطرف نہیں کیا؟
- ۳۔ اور وہی بوجھ جو تیری پشت کو جھکائے دے رہا تھا۔ ۴۔ اور تیرے ذکر کو ہم نے بلند کیا۔
- ۵۔ اس بناء پر یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے۔ ۶۔ اور یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے۔
- ۷۔ پس جب تو ایک اہم کام سے فارغ ہو جائے تو دوسری مہم کو شروع کر دے۔ ۸۔ اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ اور رغبت کر۔

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۰۷۔

ہم نے تجھے انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کی ہیں،

آیات کا لب و لہجہ پروردگار کے حد سے زیادہ لطف و محبت، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی و دلداری کے پہلو رکھتا ہے۔

پہلی آیت میں خدا کی اہم ترین نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”کیا ہم نے تیرے سینہ کو کشادہ نہیں کیا۔“

﴿الم نشرح لک صدرك﴾۔

”نشر“ ”شرح“ کے مادہ سے، مفردات میں راغب کے قول کے مطابق اصل میں گوشت کے ٹکڑوں کو کشادہ کرنے اور زیادہ نازک اور پتلے ورق بنانے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ شرح صدر سے مراد نور الہی اور خدا داد سکون و آرام کے ذریعے اس کو وسیع کرنا ہے، اور اس کے بعد کہتا ہے: گفتگو اور کلام کی مشکلات کی شرح کرنا، اس کو پھیلانے اور اس کے مخفی معانی کو وضاحت کرنے کے معنی میں ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں شرح صدر سے مراد اس کا کائناتی معنی ہے۔ اور وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح و فکر کو وسعت دینا ہے، اور یہ وسعت ممکن ہے کہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہو، جو وحی و رسالت کے طریق سے پیغمبر کے وسعتِ علم کو بھی شامل رکھتا ہو اور دشمنوں اور مخالفین کی ہٹ دھرمیوں اور کار شکنیوں کے مقابلہ میں آ کے تحمل و استقامت میں وسعت و کشادگی کو بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہو۔

اسی لئے جب موسیٰ بن عمران علیہ السلام، فرعون جیسے سرکش کی دعوت پر مامور ہوئے ”﴿اذھب الی فرعون انھ طغی﴾“ ”فرعون کے پاس جا کہ وہ سرکش ہو گیا ہے“، تو بلا فاصلہ عرض کرتے ہیں: ”﴿ربِّ شرح لی صدري ويسر لی امری﴾“ ”پروردگار میرے سینہ کو کشادہ کر دے اور میرے کام کو آسان کر دے“۔ (طہ۔ ۲۵-۲۶)۔

دوسرے مقام پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے فاصبر لحکم ربک ولا تکن کصاحب الحوت اب جبکہ یہ حال ہے تو اپنے پروردگار کے حکم کے منتظر رہو، اور استقامت اور صبر و شکیبائی اختیار کرو اور یونس کی طرح نہ ہو (جو ضروری و لازمی صبر و شکیبائی کو ترک کرنے کی بناء پر ان تمام مشکلات اور تلخیوں میں گرفتار ہوا ہے)۔ (قلم۔

شرح صدر حقیقت میں ضیق صدر کا نقطہ مقابل ہے جیسا کہ سورہ حجر کی آیہ ۹۷ میں آیا ہے۔ ولقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولون: ”ہم جانتے ہیں کہ تیرا سینہ ان کی (مغرضانہ) باتوں سے تنگ ہو جاتا ہے۔“ اصولی طور پر کوئی عظیم رہبر شرح صدر کے بغیر مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اور وہ شخص جس کی رسالت سب سے زیادہ عظیم ہے۔ (جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی) تو اس کا شرح صدر سب سے زیادہ ہونا چاہئیے۔ ابتلاؤں کے طوفان اس کی روح کے سمندر کے سکون و آرام کو درہم برہم نہ کریں، اور مشکلات سے اس کے گھٹنے نہ ٹک جائیں، دشمنوں کی کارشکنیاں اسے مایوس نہ کریں، پیچیدہ مسائل کے سوالات اسے ہر طرف سے مجبور کر کے لاجواب نہ کر دیں، اور یہ خدا کا رسول اللہ کے لئے ایک عظیم ترین ہدیہ تھا۔

اسی لئے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”میں نے اپنے پروردگار سے ایک درخواست کی، حالانکہ میں چاہتا تھا کہ یہ درخواست نہ کرتا۔ میں نے عرض کیا مجھ سے پہلے پیغمبروں میں سے بعض کو ہوا کے چلنے پر اختیار دیا، بعض مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ خدا نے مجھ سے فرمایا: کیا تو یتیم نہیں تھا تو میں نے تجھے پناہ دی؟ میں نے عرض کیا، ہاں! فرمایا: کیا تو گمشدہ نہیں تھا، میں نے تجھے ہدایت کی؟ میں نے عرض کیا، ہاں! اے میرے پروردگار، فرمایا: کیا میں نے تیرے سینہ کو کشادہ اور تیرے پیش کے بوجھ کو ہلکا نہیں کیا؟ میں نے عرض کیا، ہاں! اے پروردگار!“^(۱)

یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ ”شرح صدر“ کی نعمت انبیاء کے معجزات سے مافوق تھی، اور واقعاً اگر کوئی شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات کا باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرے اور آپ کے شرح صدر کا اندازہ آپ کی زندگی کے دور کے سخت اور پیچیدہ حوادث سے لگائے، تو وہ یقین کر لے گا کہ یہ چیز عام طریقہ سے ممکن نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تائید الہی اور توفیق ربانی ہے۔

اس مقام پر بعض نے یہ کہا ہے کہ اس شرح صدر سے مراد وہی حادثہ ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بچپن یا جوانی میں پیش آیا تھا کہ آسمان سے فرشتے اترے، آپ کا سینہ شگافتہ کیا، اُن کے دل کو باہر نکال کر اسے پاک و صاف کیا، اور اس کو علم و دانش اور رافت و رحمت سے بھر دیا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس حدیث سے مراد جسمانی دل نہیں ہے، بلکہ روحانی اور پیغمبر کے عزم و ارادہ کی تقویت، اور اس کی ہر قسم کے اخلاقی نقائص، اور وسوسہ شیطانی سے پاک سازی کے لحاظ سے خدائی امدادوں کی طرف، ایک کنایہ اور اشارہ ہے۔

لیکن بہر حال ہمارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ زیر بحث آیت خاص طور پر اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، بلکہ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ یہ داستان بھی اس کا ایک مصداق شمار ہو سکتی ہے۔

اسی شرح صدر کی بناء پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رسالت کی مشکلات کو اعلیٰ ترین صورت میں برداشت کیا اور اس طریقہ میں اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے نبھایا۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے:

”کیا ہم نے تیرے سنگین بوجھ کو اٹھا نہیں لیا؟“ ﴿وَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ﴾۔

”وہی بوجھ جو تیری پشت پر سخت گرانی کر رہا تھا۔“ ﴿الَّذِي انْقَضَ ظَهْرُكَ﴾۔

”وزر“ لغت میں بوجھ کے معنی میں ہے۔ ”وزیر“ کا لفظ بھی اسی معنی سے مشتق ہوا ہے چونکہ وہ حکومت کے سنگین بوجھ اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے، اور گناہوں کو بھی اسی معنی پر ”وزر“ کہتے ہیں، کیونکہ وہ گنہگار کے دوش پر ایک سنگین بوجھ ہوتا ہے۔ ”انقض“ ”نقض“ کے مادہ سے، رسی کی گرہ کو کھولنے کے معنی میں ہے، یا کسی عمارت کے ایک دوسرے میں گھسے ہوئے حصوں کو الگ کرنے کے معنی میں ہے، اور ”انتقاض“ اس آواز کو کہا جاتا ہے جو کسی عمارت کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے وقت کان میں پڑتی ہے۔ یا کمر کے مہروں کی اس آواز کو کہتے ہیں جو سنگین بوجھ کے زیر بار آنے کے وقت آتی ہے۔

یہ لفظ عہد و پیمان اور معاہدوں کو توڑنے کے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے نقضِ عہد کیا۔

اس طرح اوپر والی آیت یہ کہتی ہے کہ: ”خدا نے وہ سنگین اور کمر توڑنے والا بوجھ تجھ سے اٹھالیا۔“ یہ کون سا بوجھ جو خدا نے پیغمبر کی پشت سے اٹھالیا؟ اور اس آلودہ ماحول سے فساد کے آثار کو ختم کرنا ہے، نہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلکہ سارے سارے انبیاء کا دعوت کے آغاز میں اس قسم کے عظیم مشکلات سے سامنا رہا، اور وہ

صرف خدائی امدادوں سے ہی ان پر کامیاب ہوتے تھے، البتہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماحول اور زمانے کے حالات کئی جہات سے زیادہ سنگین تھے۔

بعض نے ”وزر“ کی تفسیر آغاز نزول میں ”وحی“ کے بار سنگین کے معنی میں بھی کی ہے۔
بعض نے مشرکین کی ضلالت و گمراہی اور عناد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ بھی۔
اور بعض نے ان کی حد سے زیادہ اذیت و آزار سے۔

اور بعض نے اس غم و اندوہ سے جو آپ کے چچا حضرت ابو طالب علیہ السلام کی اور آپ کی زوجہ حضرت خدیجہ کی وفات سے پیدا ہوا تھا۔

اور بعض نے گناہ سے عصمت و پاکیزگی کے مسئلہ سے تفسیر کی ہے۔
لیکن ظاہر اُوہی پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے اور یہ سب اس کے شاخ و برگ ہیں۔
اور تیسری نعمت کے بارے میں فرماتا ہے: ”ہم نے تیرے ذکر کو بلند کیا“ ﴿ورفعنا لک ذکرک﴾^(۱)

تیرا نام اسلام اور قرآن کے ساتھ ہر جگہ پہنچا، اور اس سے بہتر یہ ہے کہ تیرا نام ہر صبح و شام اذان کے گلدستوں پر اور اذان کے وقت اللہ کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اور تیری رسالت کی شہادت خدا کی توحید و یگانگت کی شہادت کے ساتھ اسلام کا نشان اور اس پاک دین کے قبول ہونے کی دلیل ہے۔

اس سے بڑھ کر فخر کی بات اور رفعت مقام کا اس سے بالاتر تصور اور کیا ہوگا؟! ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”جبرائیل نے مجھ سے کہا ہے کہ خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: جس وقت میرا نام لیا جاتا ہے تو اس وقت تیرا نام بھی میرے ہی ساتھ لیا جاتا ہے۔“ (اور تیرے مقام کی عظمت کے لئے یہی کافی ہے)۔

”لک“ (تیرے لئے) کی تعبیر اس بات کی تاکید کے لئے ہے کہ ہم نے تیرے نام اور شہرت کو ان تمام کارشکنیوں اور دشمنیوں کے باوجود بلند کیا۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا ہے، جب کہ اسلام کا پھیلنا اور پیغمبر کے کاندھے سے رسالت کے بوجھ کا ہلکا ہونا اور اطراف عالم میں آپ کے نام کا بلند ہونا مدینہ میں ہوا ہے۔

اس سوال کے جواب میں بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی بشارت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلے سے دے دی گئی تھی، اور اسی چیز نے آپ کے دل سے غم و اندوہ کا بوجھ ہٹا دیا تھا۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ یہاں فعل ”ماضی“ ”مستقبل“ کا معنی دیتا ہے، اور یہ آئندہ کے لئے ایک خوشخبری ہے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ ان امور میں سے بعض، مکہ میں ہی خصوصاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تیرہ سالہ دور کے آخری حصہ میں ہی، جب کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں لوگوں کو دعوت دینے میں مشغول تھے، پورے ہو چکے تھے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں ایمان و اسلام نفوذ کر چکا تھا اور مشکلات نسبتاً کم ہو چکی تھیں، اور پیغمبر اکرم کا نام اور کام ہر جگہ پہنچ چکا تھا، اور آئندہ کی عظیم کامیابیوں کی تمہید فراہم ہو چکی تھی۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”حسان بن ثابت“ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور شاعر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں اس آیت کے مضمون کی طرف بڑے خوبصورت انداز میں اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

ضم الالہ اسم النبی الی اسمہ

اذا قال فی الخمس الموذن اشہد

وشق له من اسمہ لیجعلہ

فدو العرش ”محمود“ و لهذا ”محمد“

”خدا نے پیغمبر کا نام اپنے نام کے ساتھ ضم کر دیا ہے“

جب موذن پانچ مرتبہ اشہد کہتا ہے،

اس نے اپنے نام سے اس کے نام کو مشتق کیا ہے تاکہ اس کا احترام برقرار رکھے۔

لہذا صاحب عرش خدا تو ”محمود“ ہے اور وہ ”محمد“ ہے

سیمرغ فہم ہیچکس از انبیاء زلفت

آنجا کہ تو بہ بال کرامت پریدہ ای

ہر یک بقدر خویش بجائی رسید اند

آنجا کہ جائے نیست بجائی رسیدہ ای

انبیاء میں کسی کا بھی طائر فکر و فہم وہاں تک نہیں پہنچا

جہاں آپ کرامت و بزرگی کے پروبال سے پہنچے ہیں

ان میں سے ہر ایک اپنی قدر و منزلت کے ایک مقام پر پہنچا ہے
 جہاں کسی کے لئے کوئی مقام نہیں ہے آپ اس مقام پر پہنچے ہیں
 بعد والی آیت میں اپنے پیغمبر کو اہم ترین بشارت دیتا ہے اور آپ کے قلب پاک میں امید کے انوار کی روشنی پیدا کرتا
 ہے اور فرماتا ہے: ”یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے“۔ ﴿فان مع العسر يسراً﴾

اس کے بعد پھر تاکید کرتا ہے، یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے۔ ﴿ان مع العسر يسراً﴾۔
 غم نہ کھاویہ مشکلات اور سختیاں ایسی شکل میں باقی نہیں رہیں گی، دشمنوں کی کار شکنیاں ہمیشہ کے لئے جاری نہیں
 رہیں اور مادی محرومیاں، اقتصادی مشکلات اور مسلمانوں کا فقر و فاقہ اس صورت میں باقی نہیں رہے گا۔
 جو شخص مشکلات کو برداشت کرتا ہے، اور طوفان کے مقابلہ میں ڈٹ جاتا ہے، وہ ایک دن اس کا میٹھا پھل بھی کھاتا
 ہے۔ جس دن دشمنوں کی چیخ و پکار بند ہو جائے، اور ان کی کار شکنیاں ختم ہو جائیں گی، ترقی و تکامل کے راستے صاف
 صاف ہو جائیں گے اور راہ حق کو طے کرنا آسان ہو جائے گا۔

اگرچہ بعض مفسرین نے ان آیات کو ظہور اسلام کے آغاز میں مسلمانوں کے عمومی فقر و فاقہ کی طرف اشارہ شمار
 کیا ہے لیکن آیات کے مفہوم کی وسعت تمام مشکلات کو شامل ہے یہ دونوں آیات اس طرح سے پیش کی گئی ہیں کہ نہ تو
 پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اختصاص رکھتی ہیں اور نہ ہی آپ کے زمانہ سے، بلکہ یہ ایک قاعدہ کلی کی
 صورت میں اور سابقہ مباحث کی ایک علت کے طور پر پیش کی گئی ہیں، یہ تمام مخلص اور مومن اور سعی و کوشش
 کرنے والے انسانوں کو نوید ہے اور خوش خبری دیتی ہیں کہ ہمیشہ سختیوں کے ساتھ آسانیاں ہوتی ہیں، یہاں تک کہ ”بعد“
 کی تعبیر نہیں کرتا بلکہ ”مع“ (ساتھ) کی تعبیر کرتا ہے، جو ہمراہ ہونے کی علامت ہے۔

ہاں! اسی طرح ہے، ہر مشکل کے ساتھ آسانی ملی ہوئی ہے اور سختی کے ساتھ سہولت ہے، یہ دونوں ہمیشہ ایک
 دوسرے کے ساتھ رہے ہیں اور رہیں گے۔

یہ ایسی نوید اور وعدہ الہی ہے، جو دل کو نور و صفا بخشتا ہے، اور کامیابیوں کا امیدوار بناتا ہے، اور یاس و ناامیدی
 کے گرد و غبار کو انسان کے صفحہ روح سے صاف کر دیتا ہے ۳

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

و اعلم ان مع العسر يسراً، و ان مع الصبر النصر، و ان الفرج مع الكرب“

”جان لو کہ سختیوں کے ساتھ آسانی ہے، اور صبر کے ساتھ کامیابی، اور غم و اندوہ کے ساتھ کشائش و خوش حالی ہے“۔^(۴)

ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے آیا ہے:

ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے شوہر کی شکایت کی کہ وہ مجھے کوئی خرچہ نہیں دیتا، جب کہ اس کا شوہر واقعتاً تنگ دست تھا، حضرت علی علیہ السلام نے اس کے شوہر کو زندان میں ڈالنے کی بجائے اس کے جواب میں فرمایا: ﴿ان مع العسر یسراً﴾ (اور اسے صبر کی تلقین کی)^(۵)

ہاں!

صبر و ظفر ہر دو دوستان قدیمند

بر اثر صبر نوبت ظفر آید

”صبر اور کامیابی دونوں قدیمی دوست ہیں

صبر کے بعد ہی کامیابی کی نوبت آتی ہے“

اس کے بعد اس سورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے: ”پس جب تم کسی اہم کام سے فارغ ہو جاؤ تو دوسرے کام میں

لگ جاؤ“ ﴿فاذا فرغت فانصب﴾۔

ہر گز کبھی بیکار نہ رہو، تلاش و کوشش کو نہ چھوڑو، ہمیشہ جدوجہد میں مشغول رہو، اور ہر اہم کام کے ختم کرنے کے ساتھ ہی دوسرے اہم کام کو شروع کر دیا کرو۔

اور ان تمام حالات میں خدا پر بھروسہ رکھو“ اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ رکھو“ ﴿والی ربک فارغب﴾۔

اس کی رضا و خوشنودی طلب کر اور اس کے قرب و جوار کی طرف جلدی کر۔

جو کچھ بیان کیا گیا اس کے مطابق آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے، جو مفہوم سے فارغ ہونے اور دوسری مہم کو شروع کرنے کو شامل ہے، اور تمام کوششوں کا رخ پروردگار کی طرف کرنے کا حکم دیتی ہے، لیکن بہت سے مفسرین نے اس آیت کے لئے محدود معانی ذکر کئے ہیں، جن میں سے ہر ایک کو اس کے ایک مصداق کے عنوان سے قبول کیا جا سکتا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تو واجب نماز سے فارغ ہو جائے تو دعائیں مشغول ہو جا، اور خدا سے درخواست کر کہ تیری حاجت کو پورا کر دے۔

یا یہ کہا کہ جب تو فرائض سے فارغ ہو جائے تا نافلہ شب کے لئے کھڑا ہو جا۔

یا یہ کہا کہ جب تو دنیا کے کاموں سے فارغ ہو جائے تو آخرت کے امور، عبادت اور اپنے پروردگار کی نماز میں مشغول ہو جا۔

یا یہ کہا کہ جب تو واجبات سے فارغ ہو جائے، تو جہاد نفس کے لئے کھڑا ہو جا۔

یا یہ کہ جب تو دشمن سے جہاد کرنے سے فارغ ہو جائے تو جہاد نفس کے لئے کھڑا ہو جا۔

یا یہ کہا کہ جب تو ادائے رسالت سے فارغ ہو جائے تو شفاعت کی درخواست کرنے کے لئے کھڑا ہو جا۔

متعدد روایات میں، جنہیں اہل سنت کے مشہور عالم حافظ ”حاکم حسکانی“ نے ”شواہد التنزیل“ میں نقل کیا ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس طرح آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

یعنی: ”جب تو فارغ ہو جائے تو علی علیہ السلام کی ولایت کے لئے نصب کر دے“۔ (۶)

اس بات کی طرف توجہ کمرتے ہوئے کہ آیہ شریفہ میں فراغت کا موضوع معین نہیں ہوا ہے اور ”فانصب“ ”نصب“ کے مادہ سے (نسب کے وزن پر) تعب اور زحمت کے معنی میں ہے، یہ آیت ایک ہمہ گیر اصل کلی کو بیان کرتی ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبر کو کسی ایک مہم کے ختم ہونے کے بعد آرام سے بیٹھ جانے سے روکے اور انہیں ایک نمونہ اور مثال کے طور پر زندگی میں ہمیشہ مسلسل طور پر سعی و کوشش میں مصروف رہنے کی تلقین کرے۔

اس معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ اوپر والی تمام تفاسیریں صحیح ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک اس وسیع اور عام معنی کے ایک مصداق کے عنوان سے ہے۔

اور کای ہی اصلاحی اور موثر پروگرام ہے، جس میں کامیابی اور تکامل و ارتقاء کی رمز چھپی ہوئی ہے۔ اصولی طور پر بیکار رہنا اور مکمل طور پر فارغ ہو کر بیٹھ رہنا تھکاوٹ، خوشی کے کم ہونے اور سستی و فرسودگی کا سبب ہوتا ہے، اور بہت سے مواقع میں فساد و تباہی اور انواع و اقسام کے گناہوں کا باعث بنتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اعداد و شمار اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ تعلیمی اور اداروں کی تعطیلات کے زمانے میں بعض اوقات فتنہ و فساد کی تعداد سات گنا تک پہنچ جاتی ہے۔

بہر حال یہ سورہ مجموعی طور پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خدا کی خاص عنایت اور مصائب و آلام میں تسلی اور رسالت کے کام کی مشکلات اور نشیب و فراز کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک تائید و نصرت کا وعدہ ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ تمام انسانوں اور راہ حق پر چلنے والوں کے ایک امید بخش، اصلاحی اور حیات آفرین مجموعہ ہے۔

چند نکات

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، متعدد روایات میں آیا ہے کہ (ایک اہم مصداق کے بیان کے عنوان سے) ”**فاذا فرغت فانصب**“ کی آیت سے مراد کارِ رسالت کی انجام دہی کے بعد امیر المومنین علیہ السلام کو خلافت کے لئے نصب کرنا ہے

”آلوسی“ ”روح المعانی“ میں بعض امامیہ (شیعہ) کی گفتگو کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے، انہوں نے ”فانصب“ کو ”ص“ کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے، بالفرض اگر ایسا ہو بھی تو وہ اس بات کی دلیل نہیں بنتا کہ اس سے علی بن ابی طالب علیہ السلام کو نصب کرنا مراد ہو۔ اس کے بعد وہ زمخشری کی کشف سے نقل کرتا ہے کہ اگر شیعوں کے لئے اس قسم کی تفسیر ممکن ہو تو ”ناصبی“ (دشمنانِ علی علیہ السلام) بھی اس کی نصب کے دستور کے عنوان سے (بغض علی بن ابی طالب کے معنی میں) تفسیر کر سکتے ہیں۔^(۷)

کیونکہ ”انصب“ (ص کی زبر کے ساتھ) خود کو مشقت میں ڈالنے اور جد جہد کرنے کے معنی میں آیا ہے، جب کہ ”انصب“ (ص کی زبر کے ساتھ) نصب کرنے، اوپر جانے اور قائم کرنے کا حکم دینے کے معنی میں ہے۔

ان مفسرین نے یہ خیال کر لیا ہے کہ شیعہ مسئلہ ولایت پر استدلال کرنے کے لئے آیت کی قرائت کو تبدیل کر دیتے ہیں، حالانکہ اس قسم کی تبدیلی کی ہر گز کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ مذکورہ تفسیر کے لئے وہی مشہور اور جانی پہچانی قرائت ہی کافی ہے کیونکہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ رسالت کے اہم امر سے فارغ ہو جانے کے بعد دوسرے اہم امر کے لئے جیسا کہ ولایت ہے، سعی و کوشش کر اور یہ ایک اعتبار سے مکمل طور پر قابل قبول ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر مشہور حدیث غدیر اور دوسری بہت سے احادیث کے مطابق، جو تمام علماء اسلام کی کتابوں میں آئی ہیں، ہمیشہ مسلسل طور پر کوشش کرتے رہتے تھے، لیکن کتنی قابل افسوس اور دکھ دینے والی بات ہے کہ زمخشری جیسا عالم جو علی علیہ السلام کو پیغمبر کا چوتھا جانشین اور اسلام کا عظیم پیشوا سمجھتا ہے، یہ کہنے کے لئے تیار ہو گیا کہ ناصبی بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ آیت کو علی بن

ابی طالب علیہ السلام کے بغض کے ساتھ تفسیر کریں، یہ کتنی رلیک اور چھنے والی تعبیر ہے؟ وہ بھی ایسے مفسر سے؟ واقعاً تعصب سے بھی کیسے کیسے گل کھلاتا ہے؟

۲۔ مشہور معتزلی علّام ”ابن ابی الحدید“ ’ہج البلاغہ“ کی شرح میں ”زبیر بن بکار سے جو اس کے قول کے مطابق نہ شیعہ تھا اور نہ معاویہ سے دشمنی رکھتا تھا، بلکہ علی علیہ السلام سے جدا ہو کر گوشہ گیر ہو گیا تھا، اور آپ کے مخالفین سے جاملا تھا، روایت کی ہے کہ وہ مغیرہ بن شربہ کے بیٹے سے نقل کرتا ہے کہ میرا باپ ”مغیرہ“ معاویہ کی عقل اور سمجھ کے بارے میں بہت باتیں کیا کرتا تھا اور اس کے طرز فکر پر حیران ہو ا کرتا تھا، لیکن رات وہ اسکے پاس سے بہت غمگین اور پریشانی کی حالت میں آیا، میں سمجھ گیا کہ کوئی اہم مسئلہ پیش آگیا ہے، میں نے اس سے سوال کیا تو اس نے معاویہ کو سخت برا بھلا کہنا شروع کر دیا جب میں نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا آج رات جب میں اور وہ خلوت میں تھے تو میں نے اس سے کہا، تو جس مقام و مرتبہ کا خواہش مند تھا وہ تو نے حاصل کر لیا ہے۔ اب تو عدل و انصاف اور نیکی کرنے میں کوشش کر، کیونکہ تیری عمر بھی اب بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ لہذا اپنی ہاشم کے بارے میں نیکی کر کیونکہ اب تجھے ان سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ اور یہ بات تیرے لئے نیک نامی کا سبب بن جائے گی۔

تو اس نے جواب میں کہا: بیہات اب میرے لئے کون سی نیک نامی باقی رہ جائے گی، خلیفہ اول و دوم نے کتنے کام کئے تو ان کا کون سا نام باقی رہ گیا، لیکن تم ”ابن ابی کبشہ“ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھو کہ لوگ اس کا نام ہر روز پانچ مرتبہ گلدستہ اذان پر ”اشہد ان محمداً رسول اللہ“ کی صورت میں باقی ہیں، اے بیچارے! اب اس کے بعد کون سا کام باقی رہ گیا ہے، اور ہمارا کون سا نام باقی رہ جائے گا، نہیں خدا کی قسم نہیں، سوائے اس صورت کے کہ یہ حالت بدل جائے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام دفن ہو جائے۔^(۸)

لیکن ورفعنا لک ذکرک کے مقتضی کے مطابق خدا نے چاہا ہے کہ یہ مبارک نام ساری دنیا نے تاریخ اور تمام عالم بشریت میں بلند اور مشہور ہے، چاہے دوسرے لوگ پسند کریں یا پسند نہ کریں؟ خوش ہوں یا ناخوش؟ اگر ہم ان تعبیرات کو کھول کر دیکھیں تو ان کا کیا معنی ہوگا؟ لا حول ولا قوۃ الا باللہ!

خدا وندا! ہمارے دل کو حب ذات سے خالی کر دے اور پانے عشق و محبت سے پر کر دے۔
پروردگار! تو نے خود کو وعدہ دیا ہے کہ ہر مشکل کے ساتھ راحت اور آسودگی ہے، اس زمانہ کے مسلمانوں کو ان عظیم سخت مشکلات سے جو دشمنوں کی طرف سے انہیں پہنچ رہی ہیں، آسودہ کر دے۔

بار الہاتیری نعمتیں اور مواہب ہم پر بہت زیادہ ہیں ان کی شکر گزاری کی توفیق مرحمت فرما۔

آمین یا رب العالمین

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۱۸۔

۲۔ ”رفع“ کی ”وضع“ کے بعد، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ایک دوسرے کی ضد ہیں، یہاں ایک خاص لطف دیتی ہے۔

۳۔ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے واضح ہو گیا کہ ”العصر“ میں الف لام جنس کے لئے ہے، اور عہد کے لئے نہیں ہے اور ”یسر“ کا لفظ اگرچہ نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے لیکن وہ بھی جنس کے معنی دیتا ہے، اور ایسے مقام پر نکرہ ہونا عظمت کے بیان کے لئے ہوتا ہے۔

۴۔ ”تفسیر نور الثقلین“ صفحہ ۶۰۴ حدیث ۱۱-۱۳۔

۵۔ ”تفسیر نور الثقلین“ صفحہ ۶۰۴ حدیث ۱۱-۱۳۔

۶۔ شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۳۴۹ (احادیث ۱۱۱۶ تا ۱۱۱۹)

۷۔ ”روح المعانی“ جلد ۳ ص ۱۷۲۔ ”تفسیر کشاف“ جلد ۴ ص ۷۷۲۔

۸۔ شرح نہج البلاغہ جلد ۵ ص ۱۲۹۔ (ابن ابی الحدید) کی عبارت یہاں اس طرح ہے: فای عمل یبقی؟ و ای کرم یدوم بعد لہذا؟ لا اباً لک، لا و اللہ دفناً دفناً!

سورہ التین

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۸ آیات ہیں۔

سورہ ”التین“ مطالب اور فضیلت

یہ سورہ حقیقت میں انسان کی خلقتِ زیبا، اور اس کے تکامل و ارتقاء اور انحطاط و پستی کے گرد گھومتا ہے اور یہ مطلب سورہ کے شروع میں پر معنی قسموں کے ساتھ شروع ہوا ہے، اور انسان کی نجات اور کامیابی کے عوامل کو شمار کرنے کے بعد آخر میں مسئلہ معاد اور خدا کی حاکمیتِ مطلقہ کی تاکید پر ختم ہوتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آیا ہے:

”من قرأھا اعطاه اللہ خصلتین: العادیۃ و الیقین مادام دی دار الدنیا، فاذا مات اعطاه اللہ من الاجر بعدد من قرأ هذه السورة صیام یومًا!“:

”جو شخص اس سورہ کو پڑھے گا جب تک وہ دنیا میں رہے گا خدا اس کو دو نعمتیں عطا کرے گا: سلامتی اور یقین، اور جب دنیا سے رخصت ہو جائے گا، تو ان تمام لوگوں کی تعداد کے برابر جنہوں نے اس سورہ کو پڑھا ہے، ان سب کے ایک دن کے روزہ کا ثواب اجر کے طور پر اسے عطا کرے گا۔“^(۱)

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸

﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم﴾

۱۔ ﴿والتین و الزیتون﴾ ۲۔ ﴿و طور سینین﴾ ۳۔ ﴿و هذا البلد الامین﴾ ۴۔ ﴿لقد خلقنا الانسان فی احسن

تقویم﴾

۵۔ ﴿ثم رددنه اسفل سفلین﴾ ۶۔ ﴿الا الذین امنوا و عملوا الصلحت فلهم اجر غیر ممنون﴾۔

۷۔ ﴿نما یکذبک بعد بالذین﴾ ۸۔ ﴿الیس اللہ باحکم الحکمین﴾۔

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

۱۔ انجیر اور زیتون کی قسم (یا سرزینِ شام اور بیت المقدس کی قسم)۔

۲۔ اور طور سینین کی قسم۔ ۳۔ اور اس امن والے شہر (مکہ) کی قسم

۴۔ کہ ہم نے انسان کو بہترین صورت اور بہترین نظام میں پیدا کیا ہے۔

۵۔ پھر ہم نے اسے پست ترین مرحلہ کی طرف لوٹا دیا۔

۶۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لے آئے اور عملِ صالح بجالائے، تو ان کے لئے ایسا اجر و ثواب ہے جو منقطع

نہ ہوگا۔

۷۔ پس ان تمام چیزوں کے باوجود تیرے روزِ جزا کے تکذیب کرنے کا سبب کیا ہے؟!

۸۔ کیا خدا بہترین حکم کرنے والا نہیں ہے؟

ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔

اس سورہ کے آغاز میں بھی چار پر معنی قسمیں بیان کی گئی ہیں جو بہت ہی اہم معنی کے بیان کا مقدمہ ہیں۔

فرماتا ہے: ”انجیر و تین کی قسم ﴿والتین و الزیتون﴾۔“ اور طور سینین کی قسم ﴿و طور سینین﴾^(۱)

اور اس امن و امان والے شہر کی قسم ﴿و ہذا البلد الامین﴾۔

”تین“ لغت میں انجیر کے معنی میں ہے اور ”زیتون“ وہی معروف زیتون ہے جس سے ایک مفید روغنی مادہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں کہ کیا اس سے انہیں دو مشہور پھلوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو حد سے زیادہ غذائی اور دوائی خواص کے حامل ہیں، لیکن بعض کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد وہ دو پہاڑ ہیں جن پر شہر دمشق اور بیت المقدس واقع ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں مقامات بہت سے انبیاء اور خدا کے بزرگ پیغمبروں کے قیام کی سرزین ہیں، اور یہ دونوں قسمیں، تیسری اور چوتھی قسموں کے ساتھ، جو مقدس سر زمینوں کی قسمیں ہیں، ہم آہنگ ہیں۔

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ان دونوں پہاڑوں کی تین اور زیتون اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ ان میں سے ایک پر انجیر کے درخت اُگتے ہیں اور دوسرے زیتون کے درخت۔

اور بعض نے تین کو آدم علیہ السلام کے زمانہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، کیونکہ وہ لباس جو آدم علیہ السلام اور حوٰۃ جنت میں پہنتا تھا وہ انجیر کے درختوں کے پتوں کا تھا، اور زیتون کو نوح کے زمانہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، کیونکہ طوفان کے آخری مرحلوں میں نوح نے ایک کبوتر اس مقصد سے چھوڑا تھا تاکہ پانی کے نیچے سے خشکی کے ظاہر ہونے کو معلوم

کرے وہ (کبوتر) زیتون کی ایک شاخ لے کر واپس آیا تو نوح سمجھ گئے کہ طوفان تھم گیا ہے، اور خشکی پانی کے نیچے سے ظاہر ہو گئی ہے۔ (اس لیے زیتون صلح و امنیت کی رمز ہے)۔

بعض تین کو اس مسجد نوح کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جو کوہ جودی پر تعمیر کی گئی تھی۔ اور زیتون کو بیت المقدس کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

ابتدائی نظریں تو آیت کا ظاہر وہی دو مشہور پھل ہیں، لیکن بعد والی قسموں کی طرف توجہ کرتے ہوئے دو پہاڑ یا مورد احترام دو مقدس مراکز ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

اسی لئے ایک حدیث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا کہ خدا نے شہروں میں سے چار شہروں کو منتخب کیا ہے اور ان کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿التين و الزيتون و طور سينين و هذا البلد الامين﴾: ”تین“ مدینہ ہے، اور ”زیتون“ بیت المقدس، ”طور سینین“ کوہ ہے اور ”﴿هذا البلد الامين﴾“ ”مکہ“ (۳)

”طور سینین“ سے مراد ظاہر اُوی ”طور سینا“ ہے جسے مفسرین نے اسی مشہور کوہ ”طور“ کی طرف اشارہ سمجھا جاتا ہے جو صحرائے سینا میں ہے،، اور وہاں زیتون کے پر بار درخت موجود ہیں۔

”سینا“ کو برکتوں والا یاد رختوں سے پر یا خوبصورت پہاڑ سمجھتے ہیں، اور یہ وہی پہاڑ ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام مناجات کے وقت گئے تھے۔

بعض نے اسے کوہ کے نزدیک سرزمین نجف کا ایک پہاڑ بھی سمجھا ہے۔

اور بعض نے تصریح کی ہے کہ ”سینین“ اور ”سینا“ ایک ہی چیز ہے، اور اس کا معنی پر برکت ہے۔

باقی رہا ”﴿هذا البلد الامين﴾“ تو یہ یقیناً سرزمین مکہ کی طرف اشارہ ہے، وہ سرزمین جو زمانہ جاہلیت میں بھی منطقہ امن اور حرم خدا سمجھی جاتی تھی، اور کوئی شخص وہاں دوسرے پر تعرض کا حق نہیں رکھتا تھا، یہاں تک مجرم اور قاتل بھی جب اس سرزمین میں پہنچ جاتے تھے تو وہ بھی امن میں ہوتے تھے۔

یہ سرزمین اسلام میں حد سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، انسان تو رہے ایک اس کے جانور، درخت اور پرندے بھی خصوصیت کے ساتھ امن سے رہنے چاہئیں۔ (۴)

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ قرآن مجید میں لفظ ”تین“ صرف اسی جگہ استعمال ہوا ہے۔ جبکہ لفظ زیتون قرآن مجید میں چھ مرتبہ صراحت کے ساتھ آیا ہے، اور ایک دفعہ اشارہ کی صورت میں جہاں فرماتا ہے:

”وشجرة تخرج من طور سيناء تنبت بالدهن وصبغ للاكلين، اور وہ درخت جو طور سینا میں اُگا ہے، اس سے کھانے والوں کے لئے روغن اور سالن فراہم ہوتا ہے۔ (مومنون۔۲۰)

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۱۰۔

۲۔ ”بعض نے سینین“ کو ”سینہ“ کی جمع سمجھا ہے جو درخت کے معنی میں ہے، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”طور“ ”پہاڑ“ کے معنی میں ہے، تو اس کا معنی درختوں سے پہاڑ ہوگا، بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ”سینین“ ایک زمین کا نام ہے کہ جس پر وہ پہاڑ واقع ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ ”سینین“ پر برکت اور خوبصورت کے معنی میں ہے، اور یہ اہل حبشہ کی زبان کا لفظ ہے۔ (روح المعانی جلد ۳۰ ص ۱۷۳)

۳۔ تفسیر نواقلین جلد ۵ ص ۶۰۶ حدیث ۴ یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانہ میں کوفہ ایک بڑا شہر نہیں تھا، لیکن اس سرزمین سے دریائے فرات کے گزرنے کی وجہ سے یقینی طور پر بہت سی آبادیاں اس زمانہ میں بھی وہاں بھی موجود تھیں۔ (تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے بھی وہاں پر ایک شہر آباد تھا)۔ (دائرة المعارف مصاحب جلد ۲ مادہ کوفہ)۔

۴۔ لفظ ”امین“ ممکن ہے کہ یہاں ”فعل“ بمعنی ”فاعل“ ہو اور اس کا معنی ”ذوالامانہ“ ہو اور یا ”فعل“ بمعنی ”مفعول“ ہو، یعنی وہ سرزمین جس میں لوگ امن میں ہیں

انجیر اور زیتون کا فائدہ

اب اگر ان دونوں قسموں (تین وزیتون) کو ان کے ابتدائی معنی پر محمول کریں، یعنی معروف انجیر وزیتون پر، تو پھر بھی یہ ایک پر معنی قسم ہے کیونکہ:

”انجیر“ بہت زیادہ غذائی قدر و قیمت کا حامل ہے، اور ہر سن و سال کے لئے ایک مقوی اور غذا سے بھرپور نوالہ ہے، جس میں چھلکا، گٹھلی اور کوئی زائد چیز نہیں ہوتی۔

غذا کے ماہرین کہتے ہیں کہ: انجیر کو بچوں کے لئے طبعی شکر کے طور پر استعمال کرایا جاسکتا ہے اور ورزش یا محنت مشقت کرنے والے اور بڑھاپے اور کمزوری میں مبتلا لوگ اپنی غذا کے لئے انجیر سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ”افلاطون“ انجیر کو جذب کرنے والا اور نقصان دہ مادوں کو دفع کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ ”جالینوس“ نے انجیر سے پہلوانوں کے لئے ایک خاص قسم کی غذا تیار کی تھی، روم اور قدیم یونان کے پہلوانوں کو بھی انجیر دئے جاتے تھے۔

غذا شناس ماہرین کہتے ہیں کہ انجیر میں مختلف قسم کے بہت سے وٹامن اور شکر موجود ہے۔ اور بہت سی بیماریوں میں اس سے ایک دوا کے طور پر فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر انجیر اور شہد کو مساوی طور پر مخلوط کر دیں تو زخم معده کے لئے بہت ہی مفید ہے۔ خشک انجیر کا کھانا دماغ کو تقویت دیتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ انجیر میں معدنی عناصر کے وجود کی بنا پر جو قوائے بدن اور خون میں اعتدال کا سبب بنتے ہیں انجیر ہر سن و سال اور ہر قسم کے حالات میں غذا کے طور پر بہترین پھل ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے آیا ہے:

”التین یذهب بالبخر و یشد الفم و العظم، و ینبت الشعر و یذهب بالداء و لا یحتاج معہ الی دواء و قال علیہ

السلام: التین اشبه شیء بنبات الجنة:

”انجیر منہ کی بدبو کو دور کرتا ہے، مسوڑھوں اور ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے، بالوں کو اگاتا ہے درد اور تکلیف کو ہر طرف کرتا ہے۔ اور اس کے ہوتے ہوئے کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔

اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ انجیر جنت کے پھلوں سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ (۲) (۱)

باقی رہا ”زیتون“ تو اس کے بارے میں غذا شناس اور بڑے بڑے ماہرین جنہوں نے سا لہا سال تک پھلوں کے مختلف خواص کا مطالعہ کرنے میں اپنی عمریں صرف کی تھیں، زیتون اور اس کے تیل کی حد سے زیادہ اہمیت کے قائل ہیں، اور وہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ جو لوگ ہمیشہ صحیح و سالم رہنا چاہیں انہیں اس حیاتی اکسیر سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

روغن زیتون انسان کے جگر کا پکا اور مخلص دوست ہے۔ اور گردوں کی بیماریوں، صفراوی پتھریوں اور درد گردہ اور درد جگر کو دور کرنے اور خشکی کو رفع کرنے کے لیے بہت ہی موثر ہے۔

اسی بناء پر زیتون کے درخت کو قرآن مجید میں شجرہ مبارکہ کہا گیا ہے۔

روغن زیتون بھی انواع و اقسام کے وٹامن سے سرشار ہے اور اس فاسفورس، سلفر، کیلشیم، فیرم پوٹاشیم اور منگنز بھی پائی جاتی ہے۔

وہ مرہم جو روغن زیتون اور لہسن کے ساتھ بنائی جاتی ہے گٹھیا کے دردوں کے لیے، مفید بتائی جاتی ہے، پتہ کی پتھری روغن زیتون کے کھانے سے ختم ہو جاتی ہے۔^(۳)

ایک روایت میں امیر المومنین علیہ السلام سے آیا ہے:

”ما افقر بیت یا تدمون بالخل و الزيت و ذالک ادام الانبیاء“

”وہ گھر جس میں سرکہ اور زیتون سالن کے طور پر استعمال ہوتا ہے، وہ کبھی کھانے سے خالی نہ ہوگا اور یہ پیغمبروں کی غذا ہے۔“

اور ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے آیا ہے:^(۴)

”نعم الطعام الزيت: یطیب النکھة ویذهب بالبلغم، و یصفی اللون، یشد العصب و یذهب الوصب، ویطفیء

الغضب“:

”روغن زیتون ایک اچھی غذا ہے، منہ کو خوشبودار کرتا ہے، بلغم کو دور کرتا ہے، چہرے کے رنگ کو صاف کرتا ہے۔ اور تروتازہ بناتا ہے، اعصاب کو تقویت دیتا ہے، بیماری، درد اور ضعف کو دور کرتا ہے، اور غصہ کی آگ کو بجھاتا ہے۔“^(۵)

ہم اس بحث کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

”کلوا الزيت و ادھنوا به فانہ من شجرة مباركة“:

”روغن زیتون کھاو اور بدن پر اس کی مالش کرو کیونکہ یہ ایک مبارک درخت سے ہے۔“ (۶)

اس چار پر معنی قسموں کے ذکر کرنے کے بعد جواب قسم پیش کرتے ہوئے اس طرح فرماتا ہے: ”یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت اور نظام میں پیدا کیا ہے،،۔ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾۔

”تقویم“ کا معنی کسی چیز کو مناسب صورت، معتدل نظام اور شائستہ کیفیت میں لانا ہے۔ اور اس کے مفہوم کی وسعت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے انسان کو ہر لحاظ سے موزوں اور شائستہ پیدا کیا ہے، جسم کے لحاظ سے بھی، اور روحانی و عقلی لحاظ سے بھی، کیونکہ اس کے وجود میں ہر قسم کی استعداد رکھی گئی ہے اور اسے ایک بہت ہی عظیم قوس صعودی کو طے کرنے کے لئے آمادہ کیا گیا ہے، اور اس کے باوجود کہ انسان ایک ”جرم صغیر“ ہے، عالم کبیر“ کو اس میں جگہ دی گئی ہے، اسے اس قدر استعدادیں اور شائستگیاں بخشی ہیں وہ ولقد کرمنّا بنی آدم ”ہم نے بنی آدم کو کرامت و عظمت بخشی ہے“۔ (سورہ اسراء آیہ ۷۰) کی خلقت کے لائق ہو گیا ہے۔ وہی انسان جس کی خلقت کی تکمیل پر فرماتا ہے: فقبارک اللہ احسن الخالقین ”پس وہ خدا بہت ہی بزرگ و برتر اور برکتوں والا ہے جو بہترین خلق کرنے والا“! لیکن یہی انسان ان تمام امتیازات و اعزازات کے ہوتے ہوئے اگر حق کے راستے سے منحرف ہو جائے تو اس طرح سقوط کرتا ہے کہ ”اسفل السافلین“ میں جا پہنچا ہے، اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ”پھر ہم اس پست ترین مراحل میں لوٹا دیتے ہیں“۔ ﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ﴾

کہتے ہیں کہ ہمیشہ بلند پہاڑوں کے ساتھ بہت ہی گہری گھاٹیاں ہوتی ہیں اور انسان کی اس تکامل و ارتقاء کی قوس صعودی کے ساتھ ہی ایک وحشت ناک قوس نزولی بھی نظر آتی ہے ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ وہ ایک ایسا موجود ہے جو ہر قسم کی استعدادیں رکھتا ہے، اگر وہ ان سے صلاح و درستی کے لئے فائدہ اٹھائے تو افتخار کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ جاتا ہے اور اگر ان تمام استعدادوں کو فساد اور خرابی کی راہ پر ڈال دے تو اس میں عظیم ترین مفسدہ پیدا کر دیتا ہے، اور طبعی طور پر وہ ”﴿اسفل السافلین﴾“ کی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے۔

لیکن بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”مگر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیے ہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ ان کے لئے ایسا اجر و ثواب ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے“۔ ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصالحات فلهم اجر غیر ممنون﴾۔

”ممنون“ ”من“ کے مادہ سے یہاں ختم ہونے یا کم ہونے کے معنی میں ہے، اسی بناء پر ”غیر ممنون“ دائمی اور ہر قسم کے نقص سے خالی اجر و ثواب کے معنی میں ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ منت و احسان سے خالی مراد ہے، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

بعض نے ثم ردو ناہ اسفل سافلین کے جملہ کی بڑھاپے کے دور کے ضعف و ناتوانی اور حد سے زیادہ ہوش کی کسی کے معنی میں تفسیر کی ہے، لیکن اس صورت میں یہ بعد والی آیت کے استثناء کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس بناء پر قبل و بعد کی آیات کے مجموعہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے وہی پہلی تفسیر ہی درست نظر آتی ہے۔

بعد والی آیت میں اس ناشکرے اور معاد کے دلائل اور نشانیوں سے بے اعتناء انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کیا سبب ہے کہ تو ان تمام دلائل کے باوجود روز جزا کی تکذیب کرتا ہے؟! ﴿فما يكذبك بعد بالدين﴾۔

ایک طرف تو خود تیرے وجود کی ساخت اور دوسری طرف اس وسیع و عریض عالم کی عمارت اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ دنیا کی چند روزہ زندگی تیری خلقت اور اس عظیم جہان کی خلقت کا اصل ہدف نہیں ہو سکتی۔

یہ سب کچھ وسیع تر اور کامل تر جہان کے لیے ایک مقدمہ ہے اور قرآن کی تعبیر میں ”نشأۃ اولیٰ“ خود ”نشأۃ اخریٰ کی خبر دیتی ہے۔ تو پھر انسان متذکر کیوں نہیں ہوتا۔ ﴿ولقد علمتم النشأۃ الاولیٰ فلولا تذكرون﴾۔ (واقعہ - ۶۲) (۷)

عالم نباتات ہمیشہ اور نئے سال نئے سرے سے موت و حیات کے منظر کو انسان کی آنکھ کے سامنے مجسم کرتا ہے اور جنینی دور کی پے در پے خلقتیں ہر ایک معاد اور ایک نئی زندگی شمار ہوتی ہے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود یہ انسان روز جزاء کا کس طرح انکار کرتا ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں مخاطب نوع انسان ہے، اور یہ احتمال کہ یہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی ذات مخاطب ہے اور مراد یہ ہے کہ معاد کے دلائل کے باوجود کون شخص یا کون سی چیز تیری تکذیب کر سکتی ہے، بعید نظر آتا ہے۔

اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ ”دین“ سے مراد یہاں آئین و شریعت نہیں ہے، بلکہ وہی جزا اور روز جزا ہے۔ اس کے بعد والی آیت بھی اسی معنی کی گواہ ہے

جیسا کہ فرماتا ہے: ”کیا خدا بہترین حکم کرنے والا اور فیصلہ کرنے والا نہیں ہے۔“ ﴿الیس اللہ باحکم الحاکمین﴾۔

اور اگر ہم دین کو کل شریعت اور آئین کے معنی میں لیں تو پھر آیت کا مفہوم و معنی اس طرح ہوگا، ”کیا خدا کے احکام و فرامین سے سب سے زیادہ حکیمانہ اور قابل یقین نہیں ہیں“؟ یا یہ کہ انسان کے لئے خدا کی خلقت ہر لحاظ سے حکمت، علم اور تدبیر کے ساتھ آمیختہ ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورہ ”والتین“ کی تلاوت فرماتے تھے تو جیسے ہی آیہ ”الیس اللہ با حکم حاکمین“ پر پہنچتے تھے تو فرماتے تھے ”﴿بلی و انا علیٰ ذالک من الشاہدین﴾“۔

خدا وندا! تو نے ہماری خلقت کو بہترین صورت میں قرار دیا ہے۔ ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہمارا عمل اور ہمارے اخلاق بھی بہترین صورت میں ہوں۔

بار الہا! ایمان و عمل صالح کی راہ کو طے کرنا تیرے لطف و کرم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ہم پر اس راہ میں اپنا لطف و کرم فرما۔

آمین یا رب العالمین

۱۔ ”کافی“ جلد ۶ ص ۳۵۸۔ مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار جلد ۶۶ ص ۱۸۴ میں انجیر کے خواص کے بارے میں متعدد روایات نقل کی ہیں۔

۲۔ ”اولین دانش گاہ و آخرین پیغمبر“ جلد ۹ ص ۹۰ سے آگے۔

۳۔ ”اولین دانش گاہ و آخرین پیغمبر“ جلد ۹ ص ۱۳۰ کے بعد۔

۴۔ ”بحار الانوار“ جلد ۶۶ ص ۱۸۰ حدیث ۶۔

۵۔ ”بحار الانوار“ جلد ۶۶ ص ۱۸۳ حدیث ۲۲۔

۶۔ وہی ماخذ ص ۱۸۲ حدیث ۱۶۔

۷۔ جلد ۱۳ ص ۳۰۶ سے آگے سورہ واقعہ کی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے سات دلیلین بیان کی گئی ہیں۔

سورہ العلق

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۱۹ آیات ہیں

سورہ علق کے مطالب اور فضیلت

مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ یہ سورہ وہ پہلا سورہ ہے جو پیغمبر گرامی اسلام پر نازل ہوا اور اس کے مطالب بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں، اور یہ بات جو بعض نے کہی ہے کہ پہلا سورہ، سورہ، ”حمد“ یا سورہ ”مدر“ ہے، یہ بات قطعی مشہور نہیں ہے۔

یہ سورہ پہلے پیغمبر اکرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرأت و تلاوت کا حکم دیتا ہے اور اس کے بعد اس با عظمت انسان کی ایک بے قدر و قیمت قطرہ خون سے خلقت کی بات کرتا ہے۔

اور بعد کے مرحلہ میں پروردگار کے لطف و کرم کے سائے میں انسان کے تکامل و ارتقاء اور اس کے علم و دانش اور قلم سے آشنائی کے بارے میں بحث ہوتی ہے۔

اور اس کے بعد مرحلہ میں ان ناشکرے انسانوں کے بارے میں، جو ان تمام خدائی نعمتوں اور الطافِ الہی کے باوجود سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہیں، گفتگو کرتا ہے۔

اور آخر میں ان لوگوں کی دردناک سزا کی طرف اشارہ کرتا ہے جو لوگوں کو ہدایت اور نیک اعمال سے روکتے ہیں۔ اور سورہ کو ”سجدہ“ اور بارگاہ پروردگار میں تقرب حاصل کرنے کے حکم پر ختم کرتا ہے۔

اس سورہ کی قرأت کی فضیلت

اس سورہ کی قرأت کی فضیلت کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”من قرأ فی یومہ اولیلتہ اقرأ باسم ربک ثم مات فی یومہ اولیلتہ مات شہیداً و بعثہ اللہ شہیداً، و جیہ کمن ضرب بسیفہ فی سبیل اللہ مع رسول“۔

”جو شخص دن میں یا رات کو سورہ اقرأ باسم ربک پڑھے گا اور وہ اس رات یا دن میں مر جائے گا تو وہ دنیا سے شہید مرے گا اور خدا اسے شہید مبعوث کرے گا اور شہیدوں کی صف میں اسے جگہ دے گا، اور وہ قیامت میں اس شخص کی مانند ہو گا جس نے راہِ خدا میں پیغمبر اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں شمشیر سے جہاد کیا ہو“۔

یہ سورہ ان مختلف تعبیروں کی مناسبت سے جو اس سورہ کے آغاز میں آئی ہیں سورہ ”علق“ یا سورہ ”اقراً“ یا سورہ ”قلم“ کے نام سے موسوم ہوا ہے۔^(۱)

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ - ۲۔ ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ - ۳۔ ﴿اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ﴾ -

۴۔ ﴿الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ - ۵۔ ﴿عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ -

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

۱۔ پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے جہان کو پیدا کیا۔ ۲۔ وہی جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔

۳۔ پڑھ کہ تیرا پروردگار سب سے زیادہ مکرم و باعزت ہے۔ ۴۔ وہی جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔

۵۔ اور انسان کو وہ سب کو کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

شان نزول

جیسا کہ ہم نے سورہ کے مطالب کی تشریح میں اشارہ کیا ہے کہ اکثر مفسرین کے نظریہ کے مطابق یہ پہلا سورہ ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے، بلکہ بعض کے قول کے مطابق تو اوپر والی پانچ آیات سب ہی مفسرین کے نزدیک آغاز وحی میں ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں اور ان کا مضمون بھی اس معنی کی تاکید کرتا ہے۔

روایات میں آیا ہے کہ پیغمبر کوہِ صرا پر گئے ہوئے تھے کہ جبریل آئے اور کہا: اے محمد پڑھو: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

جبریل نے انہیں آغوش میں لے کر دبایا اور پھر دوبارہ کہا:

”﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ پانچوں آیات کے آخر تک۔“

جبرئیل یہ بات کہہ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ رسول خدا جو وحی کی پہلی شعاع کو حاصل کرنے کے بعد بہت تھکے ہوئے تھے خدیجہ کے پاس آئے اور فرمایا: ”زملونی و دثرونی“: مجھے اڑھا دو اور کوئی کپڑا میرے اوپر ڈال دو تاکہ میں آرام کروں۔^(۲)

”طبرسی“ بھی مجمع البیان میں یہ نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدیجہ سے فرمایا: ”جب میں تنہا ہوتا ہوں تو ایک آواز سن کر پریشان ہو جاتا ہوں۔“

حضرت خدیجہ نے عرض کیا: خدا آپ کے بارے میں خیر اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں کرے گا کیونکہ خدا کی قسم آپ امانت کو ادا کرتے ہیں اور صلہ رحم بجالاتے ہیں، اور جو بات کرتے ہیں اس میں سچ بولتے ہیں۔

”خدیجہ“ کہتی ہیں: اس واقعہ کے بعد ورقہ بن نوفل کے پاس گئے، (نوفل خدیجہ کا چچا زاد بھائی اور عرب کے علماء میں سے تھا)۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ ”ورقہ“ سے بیان کیا۔ ”ورقہ“ نے کہا: جس وقت وہ پکارنے والا آپ کے پاس آئے تو غور سے سنو کہ وہ کیا کہتا ہے اس کے بعد مجھ سے بیان کرنا۔

پیغمبر اکرم نے اپنی خلوت گاہ میں سنا کہ وہ کہہ رہا ہے: ”اے محمد کہو: ﴿بسم الله الرحمن الرحيم﴾

﴿الحمد لله رب العالمين الرحمن الرحيم مالک يوم الدين اياک نعبد و اياک نستعين اهدنا الصراط المستقيم صراط

الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم و لا الضالين﴾۔

اور کہو لا الہ الا اللہ، اس کے بعد آپ ورقہ کے پاس آئے اور اس ماجرے کو بیان کیا۔

”ورقہ“ نے کہا: آپ کو بشارت ہو، پھر بھی آپ کو بشارت ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی ہیں جن کی عیسیٰ بن مریم نے بشارت دی ہے، آپ موسیٰ علیہ السلام کی طرح صاحب شریعت ہیں اور پیغمبر مرسل (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔

آج کے بعد بہت جلد جہاد کے لیے مامور ہوں گے اور اگر میں اس دن تک زندہ رہا تو میں آپ کے ساتھ ہو کر جہاد کروں گا!“

جب ”ورقہ“ دنیا سے رخصت ہو گیا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”میں نے اس روحانی شخص کو بہشت (برزخی جنت) میں دیکھا ہے کہ وہ جسم پر ریشمی لباس پہنے ہوئے تھا کیونکہ وہ مجھ

پر ایمان لایا تھا اور میری تصدیق کی تھی“۔^(۳)

یقینی طور پر مفسرین کے بعض کلمات یا تاریخ کی کتابوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی اس فصل کے بارے میں ایسے ناموزوں مطالب نظر آتے ہیں جو مسئلہ طور پر جعلی، وضعی، گھڑی ہوئی روایات اور اسرائیلات سے ہیں، مثلاً یہ کہ پیغمبر مزول وحی کے پہلے واقعہ کے بعد بہت ہی ناراحت ہوئے اور ڈر گئے کہ کہیں یہ شیطانی القاب نہ ہوں، یا آپ نے کئی مرتبہ اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا کہ خود کو پہاڑ سے گرا دیں، اور اسی قسم کے فضول اور بے ہودہ باتیں جو نہ تو نبوت کے بلند مقام کے ساتھ سازگار ہیں اور نہ ہی پیغمبر کی اس عقل اور حد سے زیادہ دانش مندی، مدیریت، صبر و تحمل و شکیبائی، نفس پر تسلط اور اس اعتماد کو ظاہر کرتی ہیں جو تاریخوں میں ثبت ہے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس قسم کی ضعیف و رکیک روایت دشمنان اسلام کی ساختہ و پرداختہ ہیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو بھی مورد اعتراض قرار دے دیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کو بھی۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے آیات کی تفسیر پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ”تفسیر برہان“ جلد ۴ ص ۴۷۸۔

۲۔ ”ابو الفتوح رازی“ جلد ۱۲ ص ۹۶، (تھوڑی تلخیص کے ساتھ، اسی مطلب کو بہت سے مفسرین عامہ و خاصہ نے بہت سے شاخ و برگ اور پھول بوٹے لگا کر نقل کیا ہے، جن میں سے بعض بالکل قابل قبول نہیں ہے)۔

۳۔ ”تفسیر مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۱۴۔

اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ

پہلی آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: ”اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے سارے جہان کو خلق کیا ہے“۔ ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾۔^(۱)

بعض نے یہ کہا ہے کہ اوپر والے جملہ میں مفعول مخذوف ہے اور اصل میں اس طرح تھا اقرأ القرآن باسم ربك اپنے پروردگار کے نام سے قرآن مجید پڑھ، اور اسی بناء پر علماء نے اس آیت کو اس پر دلیل بنایا ہے کہ بسم اللہ قرآن کی سورتوں کا جز ہے۔^(۲)

اور بعض نے ”باء“ کو زائدہ سمجھا ہے اور یہ کہا ہے کہ اپنے پروردگار کے نام کو پڑھ ہے، لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے، کیونکہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے اپنے پروردگار کے نام کو یاد کر۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں سب سے پہلے پروردگار کی ”ربوبیت“ کے مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ ”رب“ ”مالک مصلح“ کے معنی میں ہے، یعنی وہ ہستی جو کسی چیز کی مالک بھی ہے اور اس کی اصلاح و تربیت بھی کرتی ہو۔

اس کے بعد پروردگار کی ربوبیت کی ثابت کرنے کے لئے عالم ہستی کو خلقت و آفرینش پر تکیہ ہوا ہے، کیونکہ اس کی ربوبیت کی بہترین دلیل اس کی خالقیت ہے، اور عالم کی تدبیر وہی کر سکتا ہے جس نے اس کو خلق کیا ہے۔ یہ حقیقت میں عرب کے مشرکوں کا جواب ہے جو خدا کی خالقیت کو تو قبول کرتے ہیں لیکن ربوبیت اور تدبیر کے ضمن میں بتوں کے قائل تھے۔

اس کے علاوہ نظام ہستی میں خدا کی ربوبیت اور اس کی تدبیر اس کی ذات مقدس کو ثابت کرنے کی بہترین دلیل ہے۔

اس کے بعد تمام مخلوقات میں سے عالم خلقت کے اہم ترین موجود اور آفرینش کے گل سرسبد یعنی انسان پر تکیہ کرتا ہے اور اس کی آفرینش کو ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہی خدا جس نے انسان کو جسے ہوئے خون سے پیدا کیا“۔ ﴿

خلق الانسان من علق﴾۔

”من علق“ اصل میں کسی چیز کے چپک جانے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے جسے ہوئے خون کو اور اسی طرح ”جو نک“ کو جو خون چوسنے کے لیے بدن سے چپک جاتی ہے ”علق“ کہتے ہیں، اور چونکہ نطفہ عالم جنین کا پہلا دور گزارنے کے بعد جسے ہوئے اور چپکے ہوئے خون کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جو ظاہر میں بہت ہی کم قدر و قیمت رکھتا ہے لہذا اس آیت میں انسان کی خلقت کا مبداء اسی ناچیز موجود کو شمار کرتا ہے تاکہ پروردگار کی عظیم قدرت نمائی واضح ہو جائے جس نے اس قسم کی بے قدر و قیمت موجود سے ایسی قابل قدر اور قیمتی مخلوق پیدا کر دی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ علق سے مراد یہاں آدم علیہ السلام کی مٹی ہے جو چپکنے کی حالت بھی رکھتی تھی، اور یہ بات واضح ہے کہ وہ خدا جو اس عجیب مخلوق کو اس ”چپکی ہوئی مٹی“ کے ایک ٹکڑے سے وجود میں لایا ہے، وہی ہر قسم کی حمد و ستائش کے لائق ہے۔

کبھی ”علق“ کو ”صاحبِ علاقہ“ وجود کے معنی میں لیا ہے جو انسان کی اجتماعی روح اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی طرف اشارہ ہے، اور یہ حقیقت میں تکامل بشر اور تمدنوں کی پیش رفت کا پایہ اصلی ہے۔

بعض ”علق“ کو نر کے نطفہ (سپرم) کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو ”جونک“ کے ساتھ بہت زیادہ مناسبت رکھتا ہے یہ خوردبینی موجود نطفہ کے پانی میں تیرتا ہے، رحم میں عورت کے نطفہ کی طرف بڑھتا ہے، اس کے ساتھ چپک جاتا ہے اور ان دونوں کی ترکیب سے انسان کا کامل و مکمل نطفہ وجود میں آتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانہ میں یہ مسائل تحقیق و دریافت نہیں ہوئے تھے، لیکن قرآن مجید نے علمی اعجاز کے طریق سے اس سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان چار تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے، اگرچہ تفسیروں کے درمیان جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ”انسان“ ایک تفسیر کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کے معنی میں ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق انسانوں کے معنی میں ہے۔

دوبارہ تاکید کے لئے مزید کہتا ہے: ”پڑھ کہ تیرا پروردگار ہر کریم سے زیادہ کریم اور ہر بزرگوار سے اور باعزت سے بڑھ کر بزرگوار اور باعزت ہے۔“ ﴿اقْرَأْ رَبِّكَ الْاَكْرَمَ﴾۔^(۲)

بعض کا نظریہ ہے کہ دوسرا ”اقْرَأْ“ اسی ”اقْرَأْ“ کی ایک تاکید ہے جو اس پہلی آیت میں ہے۔ اور بعض نے یہ کہا کہ یہ اس سے مختلف ہے۔ پہلے جملہ میں پیغمبر کا اپنے لیے پڑھنا مراد ہے، اور دوسرے جملہ میں لوگوں کے لیے پڑھنا۔

لیکن تاکید زیادہ مناسب نظر آتی ہے کیونکہ اس فرق پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔
 بہر حال اس آیت کی تعبیر حقیقت میں پیغمبر کی اس گفتگو کا جواب ہے کہ جو جبریل کے جواب میں آپ نے کہی تھی کہ
 میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ یعنی پروردگار کی برکت سے جو حد سے زیادہ کریم و بزرگوار ہے تو قرأت و تلاوت کی طاقت و توانائی
 رکھتا ہے۔

اس کے بعد اس خدا کی توصیف کرتے ہوئے جو سب کریموں سے بڑھ کر کریم و بزرگوار ہے، فرماتا ہے:

”وہی ہستی جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی ہے“۔ ﴿الذی علم الانسان بالقلم﴾

”اور انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا“۔ ﴿علم الانسان ما لم يعلم﴾۔

یہ آیات بھی درحقیقت پیغمبر کی اسی گفتگو کا جواب ہیں جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ: ”میں قرأت کرنے والا نہیں ہوں“۔
 یعنی وہی خدا جس نے انسان کو قلم کے ذریعے تعلیم دی ہے اور جو کچھ انسان نہیں جانتا تھا اسے سکھایا ہے، وہ اس
 بندے کو بھی جس نے کسی سے سبق نہیں پڑھا ہے قرأت و تلاوت سکھانے کی قدرت رکھتا ہے۔

”الذی علم بالقلم“ کے جملہ کے دو معنی نکلتے ہیں، ایک یہ کہ: خدا نے انسان کو لکھنا اور کتابت کرنا سکھایا، اور اس
 عظیم کام کی قدرت و توانائی، جو تاریخ بشر کا مبداء اور تمام علوم و فنون اور تمدنوں کا سرچشمہ ہے، اس میں ایجاد کی۔

دوسرا یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اس طریق سے اور اس وسیلہ سے علوم و فنون سکھائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تفسیر کے مطابق تو لکھنے کی تعلیم مراد ہے، اور دوسری تفسیر کے مطابق وہ علوم مراد ہیں جو کتابت
 کے ذریعہ انسان تک پہنچے ہیں۔

بہر حال یہ ایک ایسی پر معنی تعبیر ہے، جو نزول وحی کے ان حساس لمحات میں ان عظیم اور پر معنی آیات میں منعکس
 ہو گئی ہے۔

۱۔ ”راغب“ مفردات کہتا ہے ”قرأت“ حروف کلمات کو ایک دوسرے میں ملانے اور ضم کرنے کے معنی میں ہے، اس لیے حرف کو قرائت نہیں کہتے۔

۲۔ اس صورت میں ”باء“ ملا بست کے لیے ہے۔

۳۔ ”وربک الاکرم“ کا جملہ اسمیہ استینافیہ ہے اور ”بتدا“ اور ”خبر“ سے مرکب ہے۔

۱۔ وحی کا آغاز ایک حرکت علمی کے آغاز کے ساتھ ہوا۔

یہ آیات، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، اکثر مفسرین یا تمام مفسرین کے نظریہ کے مطابق، وہ سب سے پہلی آیات ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب پاک پر نازل ہوئی تھیں اور وحی کی پہلی شاعروں کی روشنی سے تاریخ بشریت میں ایک نئی فصل کا آغاز ہوا، اور نوع انسانی ایک عظیم ترین الطافِ الہی کی مشمول ہوئی، اور خدا کا وہ اکمل ترین دین، جو سارے دینوں کا نقطہ اختتام تھا، نازل ہوا، اور تمام احکام اور اسلامی تعلیمات کے نزول کے بعد ﴿الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً﴾۔ (ماندہ-۳) کے مطابق دین الہی کی تکمیل ہوئی اس کی نعمت حد، کمال کو پہنچ گئی اور اسلام خدا کا پسندیدہ دین قرار پایا۔ یہاں ایک بہت عمدہ موضوع ہے، (اور وہ یہ ہے) کہ باوجود اس بات یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ”امی تھے، اور آپ نے کسی سے درس نہیں لیا تھا، اور حجاز کے ماحول کو سراسر جہالت و نادانی کے ماحول نے گھیر رکھا تھا، وحی کی پہلی آیات میں ”علم“ اور ”قلم“ کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی، جو ان آیات میں خلقت و آفرینش جیسی عظیم نعمت کے فوراً بعد بلا فاصلہ ذکر ہوا ہے۔ حقیقت میں یہ آیات پہلے انسانی جسم کی ایک بے قدر و قیمت لوتھڑے ”علقہ“ جیسے موجود تکامل و ارتقاء کی خبر دیتی ہیں، اور دوسری طرف سے روح کے تکامل کی، تعلیم و تعلم کے ذریعے خصوصاً قلم کے ذریعہ بات کرتی ہیں۔ جس دن یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس دن نہ صرف حجاز کے ماحول میں، جو جہالت کا ماحول تھا، کوئی شخص قلم کی قدر و منزلت کا قائل نہ تھا بلکہ اس زمانہ کی متمدن دنیا میں بھی قلم کی کم ہی قدر کی جاتی تھی۔ لیکن آج کے زمانہ میں ہم جانتے ہیں کہ وہ تمام تمدن، علوم و فنون اور ترقیاں جو میدان میں نوعِ بشر کو نصیب ہوئی ہیں، قلم کے محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ”مدادِ علماء (علماء کے قلم کی سیاہی) دماءِ شہداء (شہداء کے خون) پر سبقت لے چکی ہے کیونکہ شہید کے خون کی بنیاد اور اس کی پشتپان علماء کے قلموں کی سیاہی ہی ہے، اور اصولی طور پر انسانی معاشروں کی سرنوشت پہلے درجہ میں قلم کی نوک سے ہی لکھی گئی ہے

انسانی معاشروں کی اصلاحی باتیں مومن و متمعد قلموں سے لکھی جاتی ہیں، اور معاشروں کے فساد اور تباہیوں کی باتیں بھی مسموم اور فاسد قلموں سے ہی تحریر میں آتی ہیں۔

یہ بات بلاوجہ نہیں ہے کہ قرآن مجید نے قلم کی اور جو کچھ قلم سے لکھتے ہیں، اس کی قسم کھائی ہے۔ یعنی ”آلہ“ کی قسم بھی کھاتا ہے اور جو کچھ اس سے حاصل ہوتا ہے اس کی قسم، جیسا کہ فرماتا ہے: ﴿وَالْقَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ﴾ (قلم ۱-)

ہم جانتے ہیں کہ بشر کی زندگی کے ادوار کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ تاریخ کا دور ۲۔ قبل از تاریخ کا دور

تاریخ کا دور وہ ہے جس میں قلم، پڑھنے اور لکھنے کا زمانہ شروع ہوا، اور انسان اس قابل ہو گیا کہ قلم کے ذریعہ اپنی زندگی کی کوئی چیز لکھ سکے، اور آنے والے انسانوں کی زندگی میں قلم کے اثرات کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۱۴ میں سورہ قلم کے آغاز میں ایک مفصل اور بسوط تشریح پیش کی ہے۔

اسی بناء ابتداء سے ہی اسلام کی بنیاد علم و قلم پر رکھی گئی ہے، اور یہ بات بلاوجہ نہیں ہے کہ اس قسم کی پس ماندہ قوم علوم و فنون میں اس قدر ترقی کر گئی کہ، دوست و دشمن کے اعتراف کے مطابق، انہوں نے ساری دنیا میں علم و دانش کو پھیلا دیا اور یورپ کے مورخین کے اعتراف کے مطابق یہ مسلمان کا نور علم و دانش ہی تھا جو قرون وسطیٰ میں تاریک یورپ کے صفحہ پر چمکا اور انہیں متمدن عصر میں داخل کر گیا۔

اور اس سلسلہ میں خود انہیں کی طرف سے بہت سے کتابیں ”تاریخ تمدن اسلام“ یا ”میراث اسلام“ کے عنوان سے لکھی گئی ہیں۔

کس قدر نامناسب بات ہے کہ اس قسم کی ملت اور ایسا دین علم و دانش کے میدان میں پیچھے رہ جائے اور دوسروں کا محتاج ہو جائے، یہاں تک کہ ان سے وابستہ ہو جائے۔

۲۔ ہر حال میں ذکرِ خدا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کی دعوت کا آغاز خدا کے نام کے ذکر سے شروع ہوا ہے ”اقرا باسم ربک“ اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ آپ کی بھرپور زندگی ذکرِ خدا اور یادِ خدا سے ملی ہوئی تھی۔

آپ کا ہر سانس ذکرِ خدا کے ساتھ وابستہ تھا۔ کھڑے ہوتے، بیٹھتے، سوتے، چلتے، اور سوار ہوتے، پیادہ چلتے یا توقف کرتے سب یادِ خدا کے ساتھ اور ”اللہ کے نام کے ساتھ تھا۔

جب نیند سے بیدار ہوتے تھے تو فرماتے تھے: ”الحمد لله الذی احیانا بعد ما ماتنا و الیہ النشور“

”حمد کے لائق وہی ہے جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی بخشی اور اسی کی جانب ہم سب نے لوٹ کر جانا ہے۔“
 ”ابن عباس (رض)“ کہتے ہیں کہ ایک رات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں سویا ہوا تھا۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ نے آسمان کی طرف سر کو بلند کیا اور سورہ آل عمران کی آخری دس آیات کی تلاوت فرمائی۔

﴿ان فی خلق السماوات و الارض و اختلاف اللیل و النهار﴾

پھر عرض کیا: اللہم لک الحمد انت نور السماوات و الارض و من فیہناللہم لک اسلمت و بک امنت و علیک توکلت و الیک انت

”خدا یا سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں، تو ہی آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کا نور ہے خدا یا میں تیرے سامنے سر تسلیم خم کر چکا ہوں، تجھ پر ایمان لا چکا ہوں، تجھ پر توکل کر چکا ہوں، اور تیری طرف لوٹ چکا ہوں۔“

جس وقت آپ گھر سے نکلتے تو فرماتے:

”بسم اللہ ، توکلت علی اللہ ، اللہم انی اعوذ بک ان اضل ، او اضل ، اوازل ، او ظلم ، او اظلم ، او جھل ، او یجھل علیّ۔“

”اللہ کے نام سے ، میں اللہ پر توکل کرتا ہوں ، خدا یا میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں گمراہ ہو جاؤں ، یا کسی کی گمراہی کا سبب بنوں ، یا میں پھسل جاؤں یا کسی پر ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤ ، یا جہالت سے کام لوں ، یا مجھ سے جہالت کا برتاؤ کیا جائے۔“

جب آپ مسجد میں داخل ہوتے تو فرماتے:

”اعوذ باللہ العظیم ، وبوجہہ الکریم و سلطانہ القدیم من الشیطان الرجیم۔“

میں عظیم خدا سے اور اس کی کریم ذات سے اور اس کی قدیم سلطنت کے ذریعہ راندہ درگاہ شیطان سے پناہ مانگتا ہوں۔“

اور جس وقت آپ نیا لباس زیب تن کرتے تو فرماتے:

”اللہم لک الحمد انت کسوتیہ اسئلک خیرہ وخیر ماصنع لہ و اعوذ بک من شرہ و شرما صنع لہ۔“

”خدا یا سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں۔ تو نے ہی یہ لباس مجھے پہنایا ہے۔ میں تجھ سے اس کی خیر چاہتا ہوں اور جس خیر کے لیے یہ بنا ہے اور تجھ سے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں اور جس شر کے لیے یہ بنا ہے۔“
اور جب گھر کی طرف لوٹتے تو فرماتے:

”الحمد الذی کفانی و اوانی و الحمد للہ الذی اطعمنی و اسقانی۔“

”حمد ہے اس اللہ کی جس نے میری کفالت کی اور مجھے پناہ دی، اور حمد ہے اس اللہ کی جس نے مجھے کھلایا اور پلایا۔
اور اسی طرح آپ کی تمام زندگی یاد خدا، نام خدا اور الطافِ خدا کے تقاضوں سے گوندھی ہوئی اور ملی ہوئی تھی۔“^(۱)

۱۔ ”فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۶۱۹ سے آگے (بہت زیادہ تلخیص کے ساتھ)۔

آیات ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴

- ۶۔ ﴿كَلاَّ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَّاظٍ﴾ ۷۔ ﴿أَنْ رَّاهُ اسْتَغْنَى﴾ ۸۔ ﴿إِنْ إِلَىٰ رَبِّكَ الرَّجْعَىٰ﴾ ۹۔ ﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ﴾
 ۱۰۔ ﴿عَبْدًا إِذَا صَلَّى﴾ ۱۱۔ ﴿أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدَىٰ﴾ ۱۲۔ ﴿أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ﴾
 ۱۳۔ ﴿أَرَأَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى﴾ ۱۴۔ ﴿أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ اللَّهَ يَرَى﴾

ترجمہ

- ۶۔ ایسا نہیں کہ انسان حق شناس ہو، یقیناً وہ سرکشی کرتا ہے۔ ۷۔ اس وجہ سے کہ وہ خود کو بے نیاز سمجھتا ہے۔
 ۸۔ یقینی طور پر سب کی بازگشت تیرے پروردگار کی طرف ہے۔ ۹۔ مجھے بتا کیا وہ شخص جو نہیں کرتا ہے۔
 ۱۰۔ بندہ کو جب وہ نماز پڑھتا ہے (کیا وہ مستحق عذاب الہی نہیں؟) ۱۱۔ مجھے بتا اگر یہ بندہ طریق ہدایت پر ہو۔
 ۱۲۔ یا لوگوں کو تقویٰ کا حکم دے (کیا اسے نہیں کرنا مناسب ہے؟)
 ۱۳۔ مجھے بتا اگر (یہ سرکش) حق کی تکذیب کرے اور اس کی طرف سے پشت پھیر لے (تو اس کی کیسی دردناک سر
 نوشت ہوگی؟)
 ۱۴۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ خدا اس کے تمام اعمال کو دیکھتا ہے؟

کیا تجھے معلوم نہیں کہ خدا تیرے تمام اعمال کو دیکھتا ہے؟

گزشتہ آیات کے بعد جن میں انسان کے لیے پروردگار کی مادی و معنوی نعمتوں کی طرف اشارہ ہوا تھا، اور ایسی وسیع نعمتوں کا لازمہ یہ ہے کہ انسان شکر ادا کرے اور خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دے، لہذا زیر بحث آیات میں فرماتا ہے: ایسا نہیں ہے کہ خدائی نعمتیں ہمیشہ ہی انسان میں شکر گزاری کی روح بیدار کرتی ہوں بلکہ وہ یقینی طور پر طغیان و سرکشی کرتا ہے۔ ﴿كَلاَّ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَّاظٍ﴾ (۱)

”اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتا ہے۔“ ﴿إِنْ رَّاهُ اسْتَغْنَى﴾ (۲)

یہ عام لوگوں کی فطرت ہوتی ہے، ان لوگوں کی فطرت اور عادت جنہوں نے عقل و وحی کے مکتب میں پرورش نہ پائی ہو، چنانچہ جب وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتے ہیں تو سرکشی و طغیان شروع کر دیتے ہیں۔

نہ تو خدا کا بندہ بنتے ہیں، نہ اس کے احکام کو قبول کرتے ہیں، نہ وجدان کی پکار پر کان دھرتے ہیں اور نہ ہی حق و عدالت کا خیال کرتے ہیں۔

انسان اور کوئی بھی دوسری مخلوق ہر گز بے نیاز اور مستغنی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ تمام ممکن موجودات ہمیشہ خدا کے لطف اور نعمتوں کے محتاج اور نیاز مند رہتے ہیں۔ اور اگر ایک لمحہ بھی اس کا فیض و کرم منقطع ہو جائے تو ٹھیک اسی لمحہ سب کے سب نابود و فنا ہو جائیں۔ البتہ انسان بعض اوقات غلطی سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتا ہے، اور آیت کی تعبیر لطیف بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے، جو یہ کہتی ہے کہ: ”وہ خود کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتا ہے۔“ یہ نہیں کہتی کہ وہ بے نیاز ہو جاتا ہے۔“

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں ”انسان“ سے مراد خصوصیت کے ساتھ ”ابو جہل“ ہے، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے آغاز ہی سے مخالفت کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن مسئلہ طور پر یہاں ”انسان“ ایک مفہوم کلی رکھتا ہے اور ”ابو جہل“ جیسے افراد اس کے مصادیق ہیں۔

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ پیغمبر کو یہ توقع رکھنی چاہیے کہ لوگ فوراً ہی ان کی دعوت قبول کر لیں گے۔ بلکہ انہیں چاہیے کہ وہ خود کو سرکش مستکبرین کے انکار اور مخالفت کے لیے آمادہ تیار و رکھیں اور یہ جان لیں کہ ایک نشیب و فراز سے بھرا ہوا راستہ ان کے سامنے ہے۔

اس کے بعد ان مستکبر سرکشوں کو تہدید کرتے ہوئے فرماتا ہے: یقیناً سب کی باز شکت تیرے پروردگار کی طرف ہے۔ ﴿ان الی ربک الرجعی﴾۔

اور وہی سرکشوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔

اصولی طور پر جس طرح کہ ہر چیز کی بازگشت اس کی طرف ہے اور سب مرجائیں گے، اور آسمان و زمین کی میراث اس کی پاک ذات کے لیے رہ جائے گی: ﴿وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (آل عمران - ۱۸۰) ابتداء میں بھی تمام چیزیں اسی کی طرف سے تھیں، اور اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان خود کو بے نیاز سمجھنے لگ جائے، اور مغرور ہو کر سرکش بن جائے۔

اس کے بعد مغرور سرکشوں کے کاموں کے ایک حصہ، یعنی راہ حق پر چلنے اور ہدایت و تقویٰ کے طریق کو طے کرنے سے روکنے کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: ”مجھے بتا کیا وہ شخص جو منع کرتا ہے۔“ ﴿اِنَّ الَّذِیْ یَنْہٰی﴾

”بندہ کو جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے۔“ ﴿عَبْدًا إِذَا صَلَّى﴾۔

کیا ایسا آدمی عذاب الہی کا مستحق نہیں ہے؟!

احادیث میں آیا ہے کہ ”ابو جہل“ نے اپنے اطرافیوں سے سوال کیا! کیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، تمہارے سامنے بھی (سجدہ کے لئے) مٹی پر چہرے کو رکھتا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! اس نے کہا: قسم ہے اس کی جس کی ہم قسم کھاتے ہیں، اگر میں اسے اس حالت میں دیکھوں گا تو اپنے پاؤں سے اس کی گردن کو کچل کر رکھ دوں گا۔ انہوں نے اس سے کہا: وہ دیکھو! وہ اس جگہ نماز پڑھنے میں مشغول ہے۔

ابو جہل چلاتا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گردن کو اپنے پاؤں کے نیچے کچلے۔ لیکن جب وہ قریب پہنچا تو پیچھے ہٹ گیا اور ایسا معلوم دیتا تھا جیسے کہ وہ کسی چیز کو اپنے ہاتھ سے ہٹا رہا ہے۔ ان لوگوں نے اس سے کہا، ہم تیری یہ حالت کیا دیکھ رہے ہیں؟

اس نے کہا: میں نے اچانک اپنے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق دیکھی ہے، اور ایک وحشت ناک منظر اور کچھ پروبال مشاہدہ کیے ہیں!

اس موقع پر پیغمبر نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر وہ میرے قریب آجاتا تو خدا کے فرشتے اس کے بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے اور اس کے ایک ایک عضو کو اچک کر لے جاتے!“

اس موقع پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں،^(۳)

ان روایات کے مطابق اوپر والی آیات آغازِ بعثت میں نازل ہوئیں، بلکہ اس وقت نازل ہوئیں جب اسلام کی دعوت بر ملا ہو چکی تھی۔ اسی لیے ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ اس سورت کی پہلی پانچ آیات ہی آغازِ بعثت میں نازل ہوئی تھیں، اور باقی کافی مدت کے بعد نازل ہوئیں۔

لیکن بہر حال یہ شانِ نزول آیت کے مفہوم کی وسعت سے مانع ہے۔

بعد والی آیت میں اور زیادہ تاکید کے لئے مزید کہتا ہے: ”مجھے بتا اگر نماز گزار بندہ طریقِ ہدایت پر ہو“۔ ﴿أَرَأَيْتَ إِنْ

كَانَ عَلَى الْهَدْيِ﴾۔

”یا لوگوں کو تقویٰ کا حکم دے“۔ ﴿وَ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَى﴾۔ کیا منع کرنا مناسب ہے، اور کیا اس قسم کے شخص کی سزا جہنم کی آگ کے علاوہ کچھ اور ہو سکتی ہے؟!

”کیا وہ نہیں جانتا کہ خدا اس کے تمام اعمال کو دیکھتا ہے، اور ان سب کو حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے ثبت و ضبط کر رہا ہے۔“ ﴿الم يعلم بان الله يرى﴾۔

اوپر والی آیات میں قضیہ شرطیہ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس مغرور سرکش کو کم از کم یہ احتمال تو دینا چاہیے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طریق ہدایت پر ہیں، اور ان کی دعوت تقویٰ کی طرف دعوت ہے، یہی احتمال اس کی سرکشی کو روکنے کے لیے کافی ہے۔

اس بناء پر ان آیات کا مفہوم، پیغمبر کی تقویٰ کی طرف دعوت، اور ہدایت میں تردید نہیں ہوگا، بلکہ یہ اوپر والے باریک نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

بعض مفسرین نے ”کان“ و ”مر“ کی ضمیر کو اسی نہی کرنے والے شخص کی طرف لوٹایا ہے، جیسا کہ ”ابو جہل“ تھا۔ اس بناء پر آیات کا مفہوم اس طرح ہو جائے گا، اگر وہ ہدایت کو قبول کر لے اور نماز سے منع کرنے کی بجائے تقویٰ کی دعوت کرے تو اس کی حالت کے لئے یہ کتنا مفید ہوگا؟ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

عالم ہستی محضر خدا میں ہے

اس واقعیت کی طرف توجہ کہ انسان جو کام بھی انجام دیتا ہے وہ خدا کے سامنے ہے، اور اصولاً، ”تمام عالم ہستی محضر خدا میں ہے“ اور انسان کے اعمال میں سے کوئی چیز بھی، یہاں تک کہ اس کی نیات بھی خدا سے پنہان نہیں ہیں، انسان کی زندگی کے پروگرام پر زیادہ اثر انداز ہو سکتی ہے، اور اس کی غلط کاروائیوں سے روک سکتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ واقعی اس مطلب پر ایمان رکھتا ہو اور اس نے ایک قطعی یقین کی صورت اختیار کر لی ہو۔ ایک حدیث میں آیا ہے:

”اعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك“

”خدا کی اس طرح عبادت کر گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے، اور اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔“

کہتے ہیں کہ ایک بیدار دل نے گناہ کے بعد توبہ کر لی تھی، لیکن ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ تو اتنا کیوں روتا ہے؟ کیا تو نہیں جانتا کہ خداوند تعالیٰ بخشنے والا ہے؟ اس نے کہا: ہاں ممکن ہے کہ وہ معاف کر دے، لیکن یہ خجالت و شرمساری کہ اس نے مجھے گناہ کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے، اس کو اپنے سے کیسے دور کروں؟! گیرم کہ تو از سرگنہ گزری زان شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چکنم؟ میں نے مانا کہ تو میرے گناہ کو ضرور معاف کر دے گا۔ لیکن اس شرم کا کیا کروں کہ تو نے یہ دیکھ لیا ہے میں نے کیا کیا ہے؟

۱۔ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ”کلا“ اس چیز کو روکنے کے لیے ہے جو گزشتہ آیات کے مضمون کا لازمہ ہے، اور بعض نے اسے ”حقاً“ کے معنی میں بھی لیا ہے جو تاکید کے لئے ہے۔

۲۔ ”ان زاه استغنیٰ“ کا جملہ مفعول لاجلہ ہے اور تقدیر میں لان ہے اور رویت یہاں علم کے معنی میں ہے، لہذا اس کے دو مفعول ہوئے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ رویت حسی کے معنی میں ہو اور ”استغنیٰ“ بمنزلہ ”حال“ کے ہو۔

۳۔ تفسیر ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۱۵۔

آیات ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹

۱۵۔ ﴿كَلَّا لئن لم ينته لنسفعا بالناصية﴾ - ۱۶۔ ﴿ناصية كاذبة خاطئة﴾ - ۱۷۔ ﴿فليدع ناديه﴾ -

۱۸۔ ﴿سندع زبانية﴾ - ۱۹۔ ﴿كَلَّا لَا تَطَّعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ -

ترجمہ

۱۵۔ جیسا کہ وہ خیال کرتا ہے ایسا نہیں ہے، اگر وہ اپنے کام سے دستبردار نہ ہوگا تو ہم اس کی ناصیہ (اس کے سر کے اگلے حصہ کے بال) پکڑ کر (عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے)

۱۶۔ وہی دروغ گو اور خطا کار ناصیہ (پیشانی)

۱۷۔ پھر وہ جسے چاہے پکارتا رہے (کہ وہ اس کی مدد کرے) ۱۸۔ ہم بھی عنقریب دوزخ کے مامورین کو پکاریں گے۔

۱۹۔ جیسا کہ وہ سمجھتا ہے، ایسا نہیں ہے، ہرگز اس کی اطاعت نہ کر، اور سجدہ کر، اور خدا کا تقرب حاصل کر۔

سجدہ کر اور تقرب حاصل کر!

اس بحث کے بعد، جو گشتہ آیات میں کافر سرکشوں، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نماز گزاروں کے لیے ان کی مزاحمت کے بارے میں آئی تھی۔ ان آیات میں ان پر سخت دھمکیوں کی بارش کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”جیسا کہ وہ خیال کرتا ہے ایسا نہیں ہے (وہ گمان کرتا ہے کہ وہ پیغمبر کی گردن پر ان کے سجدہ کے وقت پاؤں رکھ سکتا ہے، اور انہیں اس عبادتِ خدا سے روک سکتا ہے)۔“ ﴿کَلَّا﴾۔

”اگر وہ اپنے اس غرور اور جہالت سے دستبردار نہ ہوگا تو ہم اس کے سر کے اگلے حصہ کے بالوں کو پکڑ کر اسے عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔“ ﴿لئن لم ينته لنسفعا بالناصية﴾۔

وہی دروغ گو اور خطا کار کے سر کا اگلا حصہ (پیشانی) ﴿ناصية كاذبة خاطئة﴾۔

”لنسفعا“ سفع (بروزن عفو) کے مادہ سے بعض مفسرین کے قول کے مطابق مختلف معنی رکھتا ہے: پکڑنا، اور سختی کے ساتھ کھینچنا، منہ پر طمانچہ مارنا، منہ کو کالا کرنا (ان تین پتھروں کو بھی، جو دیگ کو آگ پر رکھتے وقت دیگ کے پایے

کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، سفح کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سیاہ اور دھوئیں سے آلودہ ہوتے ہیں۔ اور آخری بات نشان زدہ کرنے اور ذلیل کرنے کے لیے آیا ہے۔^(۱)

اور یہاں سب سے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی ہے۔ اگر زیر بحث آیت میں دوسرے معانی کا احتمال بھی ہے۔ بہر حال کیا اس سے مراد ہے کہ یہ ماجر اقیامت میں واقع ہوگا کہ ابو جہل جیسے افراد کے سر کے اگلے حصہ کے بالوں کو پکڑیں گے اور جہنم کی طرف کھینچ کر جائیں گے، یا دنیا میں پورا ہو جائے گا، یا دونوں باتیں ہوں گی؟ یہ بات بعید نہیں ہے کہ دونوں ہی مراد ہوں، اور اور اس کا گواہ ذیل کی روایت ہے۔

ایک رویت میں آیا ہے:

”جس وقت سورہ رحمن نازل ہوا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

”تم میں سے کون ہے؟ جو اس سورہ کو رو سائے قریش کے سامنے جا کر پڑھے۔“

حاضرین کچھ دیر کے لیے خاموش رہے چونکہ وہ سردارانِ قریش کی ایذا رسانی سے ڈرتے تھے۔

”عبد اللہ بن مسعود“ کھڑے ہو گئے اور کہا: اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں یہ کام کروں گا ابن مسعود

(رض) چھوٹے سے جثہ کے تھے اور جسمانی لحاظ سے کمزور بھی تھے، کھڑے ہو کر سردارانِ قریش کے پاس پہنچ گئے۔

انہیں دیکھا کہ وہ کعبہ کے ارد گرد بیٹھے ہیں، لہذا (ابن مسعود نے) سورہ رحمن کی تلاوت شروع کر دی۔

”ابو جہل“ نے کھڑے ہو کر ابن مسعود (رض) کے منہ پر ایسا تھپڑ مارا کہ ان کا کان پھٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔

ابن مسعود (رض) روتے ہوئے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب پیغمبر کی نگاہ ان پر پڑی تو آپ کو دکھ ہوا۔ آپ

نے سر نیچے کر لیا اور گہرے غم و اندوہ میں ڈوب گئے۔

اچانک جبریل نازل ہوئے جب کہ وہ خندان و مسرور رہے تھے، آپ نے فرمایا: اے جبریل تم کس لیے ہنس رہے ہو

جب کہ ابن مسعود رو رہا ہے؟ (جبریل نے) عرض کیا عنقریب آپ کو اس کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔

یہ ماجرا گزر گیا۔ جب مسلمان جنگ بدر کے دن کامیاب و کامران ہوئے تو ابن مسعود مشرکین کے مقتولین کے

درمیان گردش کر رہے تھے، ان کی نظر ابو جہل پر پڑی کہ وہ آخری سانس لے رہا تھا، ابن مسعود اس کے سینہ پر سوار

ہو گئے، جب اس کی نگاہ ان پر پڑی تو کہا: اے حقیر چرواہے تو کتنے بلند مقام پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ابن مسعود نے کہا:

”الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ:“ اسلام برتری حاصل کرے گا اور کسی چیز کو اسلام پر برتری حاصل نہیں ہوگی۔“

ابو جہل نے ان سے کہا اپنے دوست محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہہ دے: نہ تو زندگی میں کوئی شخص میری نظر میں اس سے زیادہ مبغوض تھا اور نہ ہی موت کی حالت میں۔
جب یہ بات پیغمبر کے کانوں تک پہنچی تو آپ نے فرمایا:

”میرے زمانے کا فرعون موسیٰ کے زمانے کے فرعون سے بدتر ہے۔ کیونکہ اس نے تو اپنی عمر کے آخری لمحات میں یہ کہا تھا: میں ایمان لے آیا ہوں، لیکن اس کی سرکشی اور بھی بڑھ گئی ہے۔“

اس کے بعد ابو جہل نے ابن مسعود (رض) کی طرف رخ کر کے کہا: میرا سر اس تلوار سے قطع کر جو زیادہ تیز ہے۔ جب ابن مسعود نے اس کا سر قلم کیا تو وہ اس کو اٹھا کر پیغمبر کی خدمت میں نہ لاسکے۔ (لہذا اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر زمین پر کھینچتے ہوئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور آیت کا مضمون اس دنیا میں پورا ہو گیا)۔^(۳)

”ناصبہ“ سر کے اگلے حصہ کے بالوں کو کہتے ہیں۔ اور ان بالوں کو پکڑنا ایسی جگہ بولا جاتا ہے جب کسی شخص کو کسی کام کے لئے ذلت و خواری کے ساتھ لے جائیں، کیونکہ جب کسی کے سر کے اگلے حصہ کے بالوں کو پکڑتے ہیں تو اس سے ہر قسم کی حرکت کی قدرت سلب ہو جاتی ہے اور اس کے لیے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ البتہ لفظ ”ناصبہ“ سر کے افراد و اشخاص کے لئے بھی اور نفیس اشیاء کے بارے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ ہم فارسی (اور اردو) زبان میں ”جمعیت کی پیشانی“ یا ”عمارت کی پیشانی“ سے تعبیر کرتے ہیں۔

”ناصبہ کا ذبہ خاطئہ“ کی تعبیر ایسے شخص کی طرف اشارہ ہے، جو یہ ناصیہ رکھتا ہے، جو چھوٹا بھی تھا اور خطا کار بھی، جیسا کہ ابو جہل تھا۔

ایک روایت میں ابن عباس (رض) سے آیا ہے کہ ایک دن ابو جہل رسول خدا کے پاس آیا جب کہ آنحضرت صلی اللہ و آلہ وسلم مقام ابراہیم کے پاس نماز میں مشغول تھے، اس نے پکار کر کہا کیا میں نے تجھے اس کام سے منع نہیں کیا تھا؟ حضرت نے اس کو جھڑک کر دھتکار دیا۔

ابو جہل نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! تم مجھے جھڑک تے ہو اور مجھے دھتکارتے ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس سر زمین میں میری قوم اور قبیلہ سب سے زیادہ ہے۔^(۳)

اس موقع پر بعد والی آیت نازل ہوئی: یہ جاہل و مغرور اپنی ساری قوم و قبیلہ کو پکار لے اور انہیں مدد کے لیے بلا لے

”ہم بھی اس مامورین دوزخ کو پکار لیں گے۔“ ﴿سندع زبانیۃ﴾۔

تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ اس بے خبر غافل سے کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا۔ اور مامورین عذاب کے چنگل میں پرکاش کی طرح ایک خوفناک طوفان کے درمیان میں ہے۔

”نادی“ ”ندا“ (پکارنا) کے مادے سے مجلس عمومی کے معنی میں ہے، اور بعض اوقات مرکز تفریح کو بھی نادی کہا جاتا ہے، چونکہ وہاں لوگ دوسرے کو پکارتے اور ندا دیتے ہیں۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ”ندا“ سے لیا گیا ہے جو بخشش کے معنی میں ہے، کیونکہ وہاں ایک دوسرے کی پذیرائی کرتے ہیں ’دار الندوة‘ بھی جو قریش کی مشہور مجلس مشاورت کہی جاتی تھی اسی معنی سے لی گئی ہے۔

لیکن یہاں ”نادی“ سے مراد وہ جماعت ہے جو اس مجلس میں جمع ہوتی تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں اس سے وہ قوم و قبیلہ اور دوست مراد ہیں جن کی قوت پر ابو جہل جیسے لوگ اپنے کاموں میں بھروسہ کرتے تھے۔

”زبانیۃ“ جمع ”زینہ“ (زاء کی زیر کے ساتھ) اصل میں یہ انتظامی مامورین کے معنی میں ہے جو ”زبن“ (بروزن متن) کے مادہ سے دفع کرنے، ضرب لگانے اور دور کرنے کے معنی میں، اور یہاں فرشتگان عذاب اور دوزخ کے مامورین کے معنی میں ہے۔

اس سورہ کی آخری آیت میں جو آیہ سجدہ ہے، فرماتا ہے: ”اس طرح نہیں ہے جیسا کہ وہ خیال کرتا ہے اور تیرے سجدہ کے ترک کرنے پر اصرار کرتا ہے“ ”کلا“

”ہرگز اس کی اطاعت نہ کر، اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سجدہ کر اور اس کا تقرب حاصل کر“ ﴿لَا تَطْعَمُهُ وَ اسجد و

اقترب﴾۔

دنیا زمانے کے ابو جہل اس سے کہیں زیادہ حقیر و ناچیز ہیں کہ تجھے سجدہ کرنے سے روک سکیں، یا تیرے دین و آئین کی ترقی میں روڑے اٹکا سکیں اور اس میں کوئی رکاوٹ ڈال سکیں۔ تو پروردگار پر توکل کرتے ہوئے اس کی عبادت و بندگی اور سجدہ کے ساتھ اس راستہ میں قدم بڑھانے جا، اور ہر روز اپنے اپنے خدا سے نزدیک سے نزدیک تر ہوتا چلا جا۔

ضمنی طور پر اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ سجدہ انسان کے لئے بارگاہِ خدا کے قرب اور نزدیکی کا باعث ہے۔ اور اسی لیے ایک حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا کہ آپ نے فرمایا:

”﴿اَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنَ اللَّهِ إِذَا كَانَ سَاجِدًا﴾“

”بندے کی خدا سے سب سے زیادہ قرب کی حالت اس وقت ہوتی ہے، جب وہ سجدہ میں ہوتا ہے۔“
البتہ ہمیں معلوم ہے کہ اہل بیت عصمت کی روایات کے مطابق قرآن مجید میں چار سجدے واجب ہیں ”الم سجدہ“
و ”حٰم سجدہ“ و ”النجم“ اور یہاں ”سورہٗ علق“ میں اور قرآن کے باقی سجدہ مستحب ہیں۔

۱۔ ”فخر رازی“ جلد ۳۲ ص ۲۳۔

۲۔ ”تفسیر فخر رازی“ جلد ۳۲ ص ۲۳ (تلخیص کے ساتھ)۔

۳۔ ”فی ظلال القرآن“ جلد ۱۰ ص ۶۲۴۔

سرکشی اور بے نیازی کا احساس

دنیا کے اکثر مفاسد اور خرابیاں مرفہ الحال اور مستکبر طبقوں سے قوت حاصل کرتی ہیں، اور انبیاء کے مقابلہ میں مخالفت کرنے والوں کی صف اول میں یہی لوگ ہوتے تھے، وہی لوگ جنہیں قرآن کبھی ”ملاً“ (اعراف۔ ۶۰) سے تعبیر کرتا ہے، اور کبھی ”مترفین“ (سبا۔ ۳۴) سے، اور کبھی ”مستکبرین“ (مومنون۔ ۶۷) کے ساتھ جن میں پہلا لفظ تو ان اشراف کی جمعیت کی طرف اشارہ ہے جن کا ظاہر آنکھوں کو بھلا لگتا ہے لیکن ان کا باطن خالی ہوتا ہے، اور دوسرا لفظ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو ناز و نعمت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور مست و مغرور ہو جاتے ہیں اور انہیں دوسروں کے دکھ درد کی کوئی خبر نہیں دیتی، اور تیسرا لفظ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو کبر و غرور کی سواری پر سوار ہو کر خدا اور خلق خدا سے دور ہو جاتے ہیں۔

اور ان سب کا سرچشمہ بے نیازی اور غنا کا احساس ہے، اور یہ کم ظرف لوگوں کی خصوصیات میں سے ہے کہ جب وہ کوئی نعمت، مال یا کوئی مرتبہ و مقام حاصل کر لیتے ہیں تو وہ ایسے مست ہو جاتے ہیں اور بے نیازی کا احساس کرنے لگ جاتے ہیں کہ جس سے خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہوا کے ایک ذرے جھونکے سے دفتر ربام درہم و برہم ہو جاتا ہے اور انسان کا سارا مال و دولت ایک ساعت سے بھی کم وقت میں نابود ہو سکتا ہے، یا سیلاب و زلزلہ اور بجلی کی کڑک سب کچھ برباد کر کے رکھ دیتی ہے اور انسان کی سلامتی بھی، پانی کے ایک گھونٹ کے گلے میں پھنس جانے سے، ایسی خطرے میں پڑ جاتی ہے کہ موت آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتی ہے

یہ کیسی غفلت ہے جو کچھ لوگوں کو دامن گیر ہو جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرنے میں لگ جاتے ہیں اور غرور کی سرکش سواری پر سوار ہو کر معاشرے کے میدان کو اپنی جولانگاہ بنا لیتے ہیں۔

اس جہل و نادانی، اور اس بے خبری اور خیرہ سری سے خدا کی پناہ

ایسی حالت سے بچنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انسان تھوڑا سا اپنے بے حساب ضعف و کمزوری اور پروردگار کی عظیم قدرت پر غور کرے، اور تھوڑا سا گزرے ہوئے لوگوں کی تاریخ کی ورق گردانی کر لے، اور ان اقوام کی سرگزشت کو جو اس سے زیادہ قوی اور طاقتور تھے، دیکھ لے تاکہ غرور کے سواری سے نیچے اتر آئے۔

خداوندا! ہمیں کبر و غرور سے، جو تجھ سے دوری کا اصل سبب ہے، محفوظ رکھ۔
پروردگارا! ہمیں دنیا و آخرت میں ایک لمحہ کے لیے بھی ہمارے اپنے سپرد نہ کرنا۔
بارلہا! ہمیں ایسی قدرت عطا فرما کہ ہم ان مغرور و مستکبرین کی ناک کو، جو تیرے سامنے سِدِّ راہ بنے ہوئے ہیں، رگڑ
کر رکھ دیں اور ان کے تمام منصوبوں کو مٹا دیں۔

آمین یا رب العالمین

سورہ القدر

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۵ آیات ہیں۔

سورہ قدر کے مطالب

اس سورہ کا مضمون، جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے، شب قدرِ قدر میں قرآن کا نزول ہے۔ اس کے بعد شب قدر کی اہمیت اور اس کے برکات و آثار کا بیان ہے۔

اس بارے میں کہ یہ سورہ ”مکہ“ میں نازل ہوا ہے یا ”مدینہ“ میں، مفسرین کے درمیان مشہور اس کا ”مکی“ ہونا ہے لیکن بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوا ہے کیونکہ ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ ”بنی امیہ“ آپ کے منبر پر چڑھ گئے ہیں۔ یہ چیز آپ پر گمراہی اور آپ رنجیدہ ہوئے تو سورہ قدر نازل ہوئی اور آپ کو تسلی دی، لہذا بعض علماء ”لیلۃ القدر خیر من الف شہر“ کو بنی امیہ کی حکومت کی طرف ناظر سمجھتے ہیں جو تقریباً ایک ہزار ماہ رہی (اور ہم جانتے ہیں کہ مسجد اور منبر مدینہ میں بنائے گئے تھے۔^(۱))

۱۔ ”روح المعانی“ جلد ۳۰ ص ۱۸۸ و ”در المنثور“ جلد ۶ ص ۳۷۱۔

اس سورہ کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت میں یہی کافی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

”من قرأها أعطى من الاجر كمن صام رمضان و احيا ليلة القدر“

”جو شخص اس کی تلاوت کرے گا تو وہ اس شخص کی طرح ہوگا جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے اور شب قدر

کو احیاء کیا ہو۔“^(۱)

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

”من قرأ انا انزلناه بجهر كان كشاً هر سيفه في سبيل الله، ومن قرأها، سرّاً كان كالمتشحط بدمه في سبيل الله“۔

”جو شخص سورہ انا انزلناه کو بلند آواز سے پڑھے وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے راہ خدا میں تلوار کھینچی اور جہاد کیا،

اور جو شخص اسے آہستہ اور پنہاں طور پڑھے وہ اس شخص کے مانند ہے جو راہ خدا میں اپنے خون میں لت پت ہو۔“^(۲)

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵

﴿بسم الله الرحمن الرحيم﴾

۱۔ ﴿اَنَا انزلناه في ليلة القدر﴾۔ ۲۔ ﴿وَمَا ادراك ما ليلة القدر﴾۔ ۳۔ ﴿ليلة القدر خير من الف شهر﴾۔

۴۔ ﴿تنزل الملائكة و الروح فيها باذن ربهم من كل امر﴾۔ ۵۔ ﴿سلام هي حتى مطلع الفجر﴾۔

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے ۱۔ ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ ۲۔ اور تو کیا جانے

شب قدر کیا چیز ہے؟ ۳۔ شب قدر ہزار مہینہ سے بہتر ہے۔

۴۔ فرشتے اور روح اس رات میں اپنے پروردگار کے اذن سے ہر کام (کی تقدیر) کے لیے اترتے ہیں۔

۱۔ ”مجمع البيان“ جلد ۱۰ ص ۵۱۶۔

۲۔ ”مجمع البيان“ جلد ۱۰ ص ۵۱۶۔

شب قدر نزولِ قرآن کی رات

قرآن کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید ماہ مبارک میں نازل ہوا ہے: ”شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن“ (بقرہ- ۱۸۵) اور اس تعبیر کا ظاہر یہ ہے کہ سارا قرآن اسی ماہ میں نازل ہوا ہے۔

اور سورہ قدر کی پہلی آیت میں مزید فرماتا ہے: ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا۔ ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ اگرچہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ قرآن کا نام ذکر نہیں ہوا، لیکن یہ بات مسلم ہے کہ ”اِنَّا انزلناه“ کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے اور اس کا ظاہری ابہام اس کی عظمت اور اہمیت کے بیان کے لیے ہے۔ ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ﴾ (ہم نے اسے نازل کیا ہے) کی تعبیر بھی اس عظیم آسمانی کتاب کی عظمت کی طرف ایک اور اشارہ ہے جس کے نزول کی خدا نے اپنی طرف نسبت دی ہے مخصوصاً صیغہ متکلم مع الغیر کے ساتھ جو جمع کا مفہوم رکھتا ہے، اور یہ عظمت کی دلیل ہے۔

اس کا شب ”قدر“ میں نزول وہی شب جس میں انسانوں کی سرنوشت اور مقدرات کی تعیین ہوتی ہے۔ یہ اس عظیم آسمانی کتاب کے سرنوشت ساز ہونے کی ایک اور دلیل ہے۔

اس آیت کو سورہ بقرہ کی آیت کے ساتھ ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شب قدر ماہ مبارک رمضان میں ہے، لیکن وہ کون سی رات ہے قرآن سے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن روایات میں اس سلسلہ میں بھی اور دوسرے مسائل کے بارے میں بھی گفتگو کریں گے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخی لحاظ سے بھی اور قرآن کے مضمون کے پیغمبر اکرم کی زندگی سے ارتباط کے لحاظ سے بھی یہ مسلم ہے کہ یہ آسمانی کتاب تدریجی طور پر اور ۲۳ / سال کے عرصہ میں نازل ہوئی ہے۔ یہ بات اوپر والی آیات سے جو یہ کہتی ہیں کہ ماہ رمضان میں اور شب قدر میں نازل ہوئی، کس طرح سازگار ہوگی؟ اس سوال کا جواب:- جیسا کہ بہت محققین نے کہا ہے۔ یہ ہے کہ قرآن کے دو نزول ہیں۔

۱۔ نزول دفعی: جو ایک ہی رات میں سارے کا سارا پیغمبر اکرم کے پاس قلب پر یا بیت المعمور پر یا لوح محفوظ سے نچلے آسمان پر نازل ہوا۔

۲۔ نزولِ تدریجی: جو تیس سال کے عرصہ میں نبوت کے دوران انجام پایا۔ (ہم سورہ دُخان کی آیہ ۳ جلد ۱۲ تفسیر نمونہ ص ۲۶ سے آگے اس مطلب کی تشریح کے چکے ہیں)۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آغازِ نزولِ قرآن شبِ قدر میں ہوا تھا، نہ کہ سارا قرآن، لیکن یہ چیز آیت کے ظاہر کے خلاف ہے، جو کہتی ہے کہ ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کے نازل ہونے کے سلسلے میں بعض آیات میں ”انزال“ اور بعض میں ”تنزیل“ تعبیر ہوئی ہے۔ اور لغت کے کچھ متنوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ”تنزیل“ کا لفظ عام طور پر وہاں بولا جاتا ہے جہاں کوئی چیز تدریجاً نازل ہو لیکن ”انزال“ زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے جو نزولِ دفعی کو بھی شامل ہوتا ہے۔^(۱)

تعبیر کا یہ فرق جو قرآن میں آیا ہے ممکن ہے کہ اوپر والے دو نزولوں کی طرف اشارہ ہو۔

بعد والی آیت میں شبِ قدر کی عظمت کے بیان کے لیے فرماتا ہے: ”تو کیا جانے کہ شبِ قدر کیا ہے“۔ ﴿وما ادراک

مالیلة القدر﴾۔

اور بلا فاصلہ کہتا ہے: ”شبِ قدر ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینے سے بہتر ہے“۔ ﴿لَیلة القدر خیر من الف

شہر﴾۔

یہ تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ اس رات کی عظمت اس قدر ہے کہ پیغمبر اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بھی اپنے اس وسیع و عریض علم کے باوجود آیات کے نزول سے پہلے واقف نہیں تھے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہزار ماہ اسی (۸۰) سال سے زیادہ ہے۔ واقعاً کتنی با عظمت رات ہے جو ایک پر برکت طولانی عمر کے برابر قدر و قیمت رکھتی ہے۔

بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نے لباسِ جنگ زیب تن کر رکھا تھا، اور ہزار ماہ تک اسے نہ اتارا، وہ ہمیشہ جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول (یا آمادہ) رہتا تھا، پیغمبر اکرم کے اصحاب و انصار نے تعجب کیا، اور آرزو کی کہ کاش اس قسم کی فضیلت و افتخار انہیں بھی میسر آئے تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں۔ اور بیان کیا کہ شبِ قدر ہزار ماہ سے افضل ہے۔ ۲

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر نے بنی اسرائیل کے چار افراد کو ذکر کیا جنہوں نے اسی سال بغیر معصیت کیے خدا کی عبادت کی تھی۔ اصحاب نے آرزو کی کہ کاش وہ بھی اس قسم کی توفیق حاصل کرتے تو اس سلسلہ میں اوپر والی آیات نازل ہوتیں۔ (۲)

اس بارے میں کہ یہاں ہزار کا عدد ”تعداد“ کے لئے ہے یا ”تکثیر“ کے لیے بعض نے کہا ہے: یہ تکثیر کے لیے ہے، اور شب قدر کی قدر و منزلت کئی ہزار ماہ سے بھی زیادہ ہے، لیکن وہ روایات جو ہم نے اوپر نقل کی ہیں وہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ عدد مذکور تعداد ہی کے لئے ہے اور اصولی طور پر بھی عدد ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے مگر یہ تکثیر پر کوئی واضح قرینہ موجود ہو، اور اس کے بعد اس عظیم رات کی مزید تعریف و توصیف کرتے ہوئے اضافہ کرتا ہے: ”اس رات میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے اذن سے ہر کام کی تقدیر کے لیے نازل ہوتے ہیں“۔ ﴿تَنْزِلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ﴾۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”تنزل“ فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے (جو اصل میں ”تنزل“ تھا)۔ واضح ہو جاتا ہے کہ شب قدر پیغمبر اکرم اور نزول قرآن کے زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، بلکہ یہ ایک امر مستمر ہے، اور ایسی رات ہے جو ہمیشہ آتی رہتی ہے اور ہر سال آتی ہے۔

اس بارے میں کہ روح سے کیا مراد ہے بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد ”جبرئیل امین“ ہے، جسے ”روح الامین“ بھی کہا جاتا ہے، اور بعض نے ”روح“ کی سورہ شوریٰ کی آیہ ۵۲ ”وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا“ جیسا کہ ہم نے گزشتہ انبیاء پر وحی کی تھی، اسی طرح سے تجھ پر بھی اپنے نافرمان سے وحی کی ہے۔“ کے قرینہ سے ”وحی“ کے معنی میں تفسیر کی ہے۔

اس بناء پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا ”فرشتے وحی الہی کے ساتھ، مقدرات کی تعیین کے سلسلہ میں، اس رات میں نازل ہوتے ہیں“۔ یہاں ایک تیسری تفسیر بھی ہے جو سب سے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ”روح“ ایک بہت بڑی مخلوق ہے جو فرشتوں سے مافوق ہے، جیسا کہ ایک امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے سوال کیا: کیا روح وہی جبرئیل ہے؟ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: ”جبرئیل من الملائكة، و الروح اعظم من الملائكة ان الله عز و جل يقول : تنزل الملائكة و الروح“۔

”جبرئیل تو ملائکہ میں سے ہے، اور روح ملائکہ سے زیادہ عظیم ہے، کیا خداوند تعالیٰ یہ نہیں فرماتا: ملائکہ اور روح نازل ہوتے ہیں،؟“ (۴)

یعنی مقابلہ کے قریب سے یہ دونوں آپس میں مختلف ہیں لفظ ”روح“ کے لئے یہاں دوسری تفاسیر بھی ذکر ہوئی ہیں کیونکہ ان کے لیے کوئی دلیل نہیں تھی، لہذا ان سے صرف نظر کی گئی ہے

”من کل امر“ سے مراد یہ ہے کہ فرشتے سر نوشتوں کی تقدیر و تعین کے لئے، اور ہر خیر و برکت لانے کے لئے اس رات میں نازل ہوتے ہیں، اور ان کے نزول کا مقصد ان امور کی انجام دہی ہے۔

یا یہ مراد ہے کہ ہر امر خیر اور ہر سر نوشت اور تقدیر کو اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ (۵)

”ربہم“ کی تعبیر کو، جس میں ربوبیت اور تدبیر جہاں کے مسئلہ پر بات ہوئی ہے، ان فرشتوں کے کام کے ساتھ قریبی مناسبت ہے، کہ وہ امور کی تدبیر و تقدیر کے لیے نازل ہوتے ہیں، اور ان کا کام بھی پروردگار کی ربوبیت کا ایک گوشہ ہے۔ اور آخری آیت میں فرماتا ہے: ”یہ ایک ایسی رات ہے، جو طلوع صبح تک سلامتی اور خیر و برکت و رحمت سے پر رہتی ہے۔“ ﴿سلام ہی حتی مطلع الفجر﴾۔

قرآن بھی اسی میں نازل ہوا، اس کا احیاء اور شب بیداری بھی ہزار ماہ کے برابر ہے، خدا کی خیرات و برکات بھی اسی شب میں نازل ہوتی ہیں، اس کی رحمت خاص بھی بندوں کے شامل حال ہوتی ہے، اور فرشتے اور روح بھی اسی رات میں نازل ہوتے ہیں۔

اسی بناء پر یہ ایک ایسی رات ہے جو آغاز سے اختتام تک سراسر سلامتی ہی سلامتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق تو اس رات میں شیطان کو زنجیر میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ لہذا اس لحاظ سے بھی یہ ایک ایسی رات ہے جو سالم اور سلامتی سے تو آم ہے۔

اس بناء پر ”سلام“ کا اطلاق، جو سلامت کے معنی میں ہے۔ (سالم کے اطلاق کے بجائے) حقیقت میں ایک قسم کی تاکید ہے، جیسا کہ بعض اوقات ہم کہہ دیتے ہیں کہ فلاں آدمی عین عدالت ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس رات پر ”سلام“ کا اطلاق اس بناء پر ہے کہ فرشتے مسلسل ایک دوسرے پر یا مومنین پر سلام کرتے ہیں، یا پیغمبر کے حضور میں اور آپ کے معصوم جانشین کے حضور میں جا کر سلام عرض کرتے ہیں۔ ان تفسیروں کے درمیان بھی ممکن ہے۔

بہر حال یہ ایک ایسی رات ہے جو ساری کی ساری نور و رحمت، خیر و برکت، سلامت و سعادت، اور ہر لحاظ سے بے نظیر ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ شب قدر کونسی رات ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔ ”کیف لانعرف و الملائكة تطوف بنا فیہا“
”ہم کیسے نہ جانیں گے جب کہ فرشتے اس رات ہمارے گرد طواف کرتے ہیں“۔^(۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں آیا ہے کہ خدا کے کچھ فرشتے آپ کے پاس آئے اور انہیں بیٹے کے تولد کی بشارت دی اور ان پر سلام کیا، (ہود۔ ۶۹)۔ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کی جو لذت ان فرشتوں کے سلام میں آئی، ساری دنیا کی لذتیں بھی اس کے برابر نہیں تھیں۔ اب غور کرنا چاہیے کہ جب شب قدر میں فرشتے گمروہ درگمروہ نازل ہو رہے ہوں، اور مومنین کو سلام کمر رہے ہوں، تو اس میں کتنی لذت، لطف اور برکت ہوگی؟! جب ابراہیم کو آتش نمرود میں ڈالا گیا، تو فرشتوں نے آکر آپ کو سلام کیا اور آگ ان پر گلزار بن گئی، تو کیا شب قدر میں مومنین پر فرشتوں کے سلام کی برکت سے آتش دوزخ ”برد“ و ”سلام“ نہیں ہوگی؟۔

ہاں! یہ امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کی نشانی ہے کہ وہاں تو خلیل پر نازل ہوتے ہیں اور یہاں اسلام کی اس امت پر۔^(۷)

۱۔ مفردات راغب مادہ نزل۔

۲۔ ”در المنثور“ جلد ۶ ص ۳۷۱۔

۳۔ ”در المنثور“ جلد ۶ ص ۳۷۱۔

۴۔ ”تفسیر برہان“ جلد ۴ ص ۴۸۱۔

۵۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ خدا کے امر و فرمان سے نازل ہوتے ہیں لیکن مناسب وہی پہلا معنی ہے۔

۶۔ ”تفسیر برہان“ جلد ۴ ص ۴۸۸ حدیث ۲۹۔

۷۔ ”تفسیر فخر رازی“ جلد ۳۲ ص ۳۶۔

۱۔ شب قدر میں کون سے امور مقدر ہوتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں کہ اس رات کو، شب قدر، کا نام کیوں دیا گیا ہے، بہت کچھ کہا گیا ہے: منجملہ یہ کہ:

۱۔ شب قدر کو نام شب قدر کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ بندوں کے تمام سال کے سارے مقدرات اسی رات میں تعین ہوتے ہیں، اس معنی کی گواہ سورہ دخان ہے جس میں آیا ہے کہ: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مَبْرُورَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ﴾ **فیا یفرق کل امر حکیم**۔ ہم نے اس کتاب مبین کو ایک پربرکت رات میں نازل کیا ہے، اور ہم ہمیشہ ہی انداز کرتے رہتے ہیں، اس رات میں ہر امر خداوند عالم کی حکمت کے مطابق تنظیم و تعین ہوتا ہے۔“ (دخان۔ ۳۔ ۴)

یہ بیان متعدد روایات کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو کہتی ہیں کہ اس رات میں انسان کے ایک سال کے مقدرات کی تعین ہوتی ہے اور رزق، عمریں اور دوسرے امور اسی مبارک رات میں تقسیم اور بیان کیے جاتے ہیں۔

البتہ یہ چیز انسان کے اردہ اور مسئلہ اختیار کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتی، کیونکہ فرشتوں کے ذریعے تقدیر الہی لوگوں کی شائستگیوں اور لیاقتوں، اور ان کے ایمان و تقویٰ اور نیت اعمال کی پاکیزگی کے مطابق ہوتی ہے۔

یعنی ہر شخص کے لیے وہی کچھ مقدر کرتے ہیں جو اس کے لائق ہے، یا دوسرے لفظوں میں، اس کے مقدمات خود اسی کی طرف سے فراہم ہوتے ہیں، اور یہ امر نہ صرف یہ کہ اختیار کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا، بلکہ یہ اس پر ایک تاکید ہے۔

۲۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس رات کا اس وجہ سے شب قدر نام رکھا گیا ہے کہ وہ ایک عظیم و قدر و شرافت کی حامل ہے (جس کی نظیر سورہ حج کی آیہ ۷۴ میں آئی ہے) (ماقدروا اللہ حق قدرہ) انہوں نے حقیقت میں خدا کی قدر و عظمت کو ہی نہیں پہچانا۔

۳۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اپنی پوری قدر و منزلت کے ساتھ، قدر و منزلت والے رسول پر اور صاحب قدر و منزلت فرشتے کے ذریعے اس میں نازل ہوا ہے۔

۴۔ یا یہ مطلب ہے کہ ایک ایسی رات ہے جس میں قرآن کا نازل ہونا مقدر ہوا ہے۔

۵۔ یا یہ کہ جو شخص اس رات کو بیدار رہے تو وہ صاحب قدر و مقام و منزلت ہو جاتا ہے۔

۶۔ یا یہ بات ہے کہ اس رات میں اس قدر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ ان کے لیے عرصہ زمین تنگ ہو جاتا ہے، کیونکہ تقدیر تنگ ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ و من قدر علیہ رزقہ (طلاق-۷)

ان تمام تفاسیر کا ”لیلۃ القدر“ کے وسیع مفہوم میں جمع ہونا پورے طور پر ممکن ہے اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب اور زیادہ مشہور ہے۔

۲۔ شب قدر کون سی رات ہے؟

اس بارے میں کہ ”لیلۃ القدر“ ماہ رمضان میں ہوتی ہے، کوئی شک و شبہ نہیں ہے کیونکہ قرآن کی تمام آیات اسی معنی کا اقتضا کرتی ہیں، ایک طرف تو وہ کہتی ہیں کہ قرآن ماہ رمضان میں نازل ہوا ہے (بقرہ-۱۸۵) اور دوسری طرف یہ کہتی ہیں کہ شب قدر میں نازل ہوا ہے۔ (آیات زیر بحث)۔

لیکن اس بارے میں کہ ماہ رمضان کی راتوں میں سے کون سی رات ہے، بہت اختلاف ہے، اور اس سلسلہ میں بہت سی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ منجملہ: پہلی رات سترھویں رات، انیسویں رات، اکیسویں رات، تیسویں رات، اور ستائیسویں رات اور اسیسویں رات۔

لیکن روایات میں مشہور و معروف یہ ہے کہ ماہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے اکیسویں یا تیسویں رات ہے۔ اسی لیے ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماہ مبارک کی آخری دس راتوں میں تمام راتوں کا اجاء فرماتے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ شب قدر اکیسویں یا تیسویں رات ہے، یہاں تک کہ جب راوی نے اصرار کیا کہ ان دونوں راتوں میں سے کون سی رات ہے اور یہ کہا کہ اگر میں ان دونوں راتوں میں عبادت نہ کر سکوں تو پھر کون سی رات کا انتخاب کروں۔ تو بھی امام نے تعین نہ فرمائی اور مزید کہا: ”مالیسر لیلین فیما تطلب“ اس چیز کے لیے جسے تو چاہتا ہے دو راتیں کس قدر آسان ہیں؟^(۱)

لیکن متعدد روایات میں جو اہل بیت کے طریقہ سے پہنچی ہیں زیادہ تر تیسویں رات پر تکیہ ہوا ہے۔ جب کہ اہل سنت کی زیادہ تر روایات ستائیسویں رات کے گرد گردش کرتی ہیں۔

ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”التقدير فى ليلة القدر تسعة عشر، و الابرار فى ليلة احدى و عشرين، و الامضاء فى ليلة ثلاث و عشرين“۔
”تقدير مقدرات تو انیسوں کی شب کو ہوتی ہے، اور ان کا حکم اکیسویں رات کو، اور ان کی تصدیق اور منظوری
تیسویں رات کو۔“ (۲)

اور اس طرح سے روایات کے درمیان جمع ہو جاتی ہے۔
لیکن بہر حال، اس وجہ کی بناء پر جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا، شب قدر کو ابہام کے ایک ہالے نے گھیر رکھا ہے۔

۱۔ ”تفسیر نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۶۲۵ حدیث ۵۸۔

۲۔ ”تفسیر نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۶۲۶ حدیث ۶۲۔

۳۔ شب قدر مخفی کیوں رکھی گئی؟

بہت سے علماء کا نظریہ یہ ہے کہ سال بھر کی راتوں یا ماہ مبارک رمضان کی راتوں میں شب قدر کا مخفی ہونا اس بناء پر ہے کہ لوگ ان سب راتوں کو اہمیت دیں۔ جیسا کہ خدا نے اپنی رضا و خوشنودی کی مختلف قسم کی عبادتوں میں پنہاں کر رکھا ہے تاکہ لوگ سب عبادتوں اور اطاعتوں کی طرف رخ کریں۔ اور اپنے غضب کو معاصی کے درمیان پنہاں رکھا ہے، تاکہ سب لوگ گناہوں سے پرہیز کریں، اپنے دوستوں کو لوگوں سے مخفی رکھا ہے تاکہ سب کا احترام کریں، اور دعاؤں کی قبولیت کو مختلف دعاؤں میں پنہاں رکھا ہے تاکہ دعاؤں کی طرف رخ کریں۔

اسم اعظم کو اپنے اسماء میں مخفی رکھا ہے تاکہ تمام اسماء کو بزرگ و عظیم سمجھیں۔ اور موت کے وقت کو مخفی رکھا ہے تاکہ ہر حالت میں آمادہ و تیار رہیں۔ اور یہ فلسفہ مناسب نظر آتا ہے۔

۴۔ کیا گزشتہ امتوں میں بھی شب قدر تھی؟

اس سورہ کی آیات کے ظاہر سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ شب قدر منزل قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں تھی۔ بلکہ دنیا کے اختتام تک اس کا ہر سال تکرار ہوتا رہے گا۔

فعل مضارع (تنزل) کی تعبیر، جو استمرار پر دلالت کرتی ہے، اور اسی طرح جملہ اسمیہ ”﴿سلام ہی حتی مطلع الفجر﴾“ کی تعبیر بھی، جو دوام کی نشانی ہے، اسی معنی کی گواہ ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی روایات بھی، جو شاید حدِ تواتر میں ہیں، اس معنی کی تائید کرتی ہیں۔ لیکن یہ بات کہ کیا گزشتہ امتوں میں بھی تھی یا نہیں؟ متعدد روایات کی تصریح یہ ہے کہ یہ امت پر مواہب الہیہ میں سے ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”اِنَّ اللہ وہب لامتی لیلۃ القدر لم یعطھا من کان قبلھم“ ”خدا نے میری امت کو شب قدر عطا کی ہے، گزشتہ امتوں میں سے کسی بھی یہ نعمت نہیں ملی تھی“۔^(۱)

اوپر والی آیات کی تفسیر میں بعض وارد شدہ روایات اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔

۵۔ شب قدر ہزار ماہ سے کیسے برتر ہے؟

ظاہر ہے کہ اس شب کا ہزار ماہ سے بہتر ہونا اس رات کو بیدار رہنے اور اس کی عبادت کی قدر و قیمت کی وجہ سے ہے ، اور لیلۃ القدر کی فضیلت اور اس میں عبادت کی فضیلت کی روایات، جو شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں فراوان ہیں، اس مطلب کی مکمل طور پر تائید کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ اس رات میں قرآن کا نزول اور اس میں برکات اور رحمت الہی کا نزول بھی اس بات کا سبب ہے کہ یہ ہزار ماہ سے برتر و بالاتر ہو۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے ”علی بن ابی حمزہ ثمالی“ سے فرمایا: شب قدر کی فضیلت کو اکیسویں اور تیسویں رات میں تلاش کرو، اور ان دونوں راتوں میں سے ہر ایک میں ایک سو رکعت نماز بجالاؤ۔ اور اگر تم سے ہو سکے تو ان دونوں راتوں کا طلوع صبح تک اچھا کرو، اور اس رات غسل کرو۔ ”ابو حمزہ“ کہتا ہے: میں نے عرض کیا: ”اگر میں کھڑے ہو کر یہ سب نمازیں نہ پڑھ سکوں۔“

آپ نے فرمایا: پھر بیٹھ کر پڑھ لو۔ میں نے عرض کیا اگر اس طرح بھی نہ پڑھ سکوں۔ آپ نے فرمایا: پھر بستر میں (لیٹ کر) پڑھ لو، اور رات کے پہلے حصہ میں تھوڑا سا سولینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے، اور اس کے بعد عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ ماہ رمضان میں آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور شیاطین طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں اور مومنین کے اعمال مقبول ہوتے ہیں، ماہ رمضان کتنا اچھا مہینہ ہے۔

۶۔ قرآن شب قدر میں کیوں نازل ہوا؟

کیونکہ شب قدر میں ایک سال کے لیے انسانوں کی سرنوشت ان کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مطابق مقدر کی جاتی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ انسان اس رات بیدار رہے۔ اور توبہ اور اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش کرے اور خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو کر خود میں اس کی رحمت کے لیے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر لیاقت پیدا کرے۔

ہاں! جن لمحات میں ہماری سرنوشت کی تعیین ہوتی ہے ان میں انسان کو سویا ہوا نہیں ہونا چاہیئے، اور نہ ہی ہر چیز سے غافل اور بے خبر رہنا چاہیئے کیونکہ اس صورت میں ایک غم ناک سرنوشت ہو جائے گی۔

قرآن چونکہ ایک سر نوشت ساز کتاب ہے، اور اس میں انسانوں کی سعادت و خوش بختی اور ہدایت کی باتوں کی وضاحت کی گئی ہے، لہذا ضروری ہے کہ سر نوشتوں کی تعیین کا پروگرام شب قدر میں نازل ہو۔ قرآن اور شب قدر کے درمیان کتنا خوبصورت رابطہ ہے، اور ان دونوں کا ایک دوسرے سے تعلق اور رشتہ کس قدر پر معنی ہے؟

۷۔ کیا مختلف علاقوں میں ایک ہی شب قدر ہوتی ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ تمام شہروں میں قمری مہینوں کا آغاز یکساں نہیں ہوتا اور یہ ممکن ہے کہ ایک علاقہ میں تو آج اول ماہ ہو، اور دوسرے علاقہ میں دوسری تاریخ ہو۔ اس بناء پر شب قدر سال میں ایک معین رات نہیں ہو سکتی، کیونکہ مثال کے طور پر مکہ کی تیسویں رات، ایران و عراق میں بائیسویں رات ہو سکتی ہے، اس طرح اصولی طور پر ہر ایک کی علیحدہ شب قدر ہوگی۔ کیا یہ بات اس چیز سے، جو آیات و روایات سے معلوم ہوتی ہے، کہ شب قدر ایک معین رات ہے، سازگار ہے؟!

اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ رات وہی کمرہ زمین کے آدھے سایہ کو ہی کہتے ہیں، جو کمرہ زمین کے دوسرے حصہ پر پڑتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ سایہ گردش زمین کے ساتھ حرکت میں ہے، اور اس کا ایک مکمل دورہ چوبیس گھنٹوں میں انجام پاتا ہے، اس بناء پر ممکن ہے کہ شب قدر رات کا زمین کے گرد ایک مکمل دورہ ہو۔ یعنی تاریکی کی چوبیس گھنٹے کی مدت جو زمین کے تمام نقاط کو اپنے سائے کے نیچے لے لے، وہ شب قدر ہے، جس کا آغاز ایک نقطہ سے ہوتا ہے، اور دوسرے نقطہ میں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ (غور کیجئے)۔

خداوند! ہمیں اس قسم کی بیداری و آگاہی عطا فرما کہ لیلۃ القدر کی فضیلت سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔
پروردگارا! ہماری چشم امید تیرے لطف و کرم پر لگی ہوئی ہے، ہمارے مقدرات کو اس کے موافق معین فرما۔
بار الہا! ہمیں اس مہینہ کے محرومین میں سے قرار نہ دے کہ جس سے بالاتر کوئی محرومیت نہیں ہے۔

آمین یا رب العالمین

سورہ بینہ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۸ آیات ہیں۔

سورہ بینہ کے مطالب

مشہور یہ ہے کہ سورہ بینہ مدینہ میں نازل ہوا ہے اور اس کے مطالب بھی اسی معنی کی گواہی دیتے ہیں، کیونکہ اس میں اہل کتاب کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اہل کتاب سے مسلمانوں کا زیادہ قریب و کار مدینہ میں ہی ہوا۔

اس سے قطع نظر نماز اور زکوٰۃ دونوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے، یہ ٹھیک ہے کہ زکوٰۃ کا شرعی حکم تو مکہ میں ہی ہو گیا تھا، لیکن اس کو قانونی صورت اور وسعت مدینہ میں دی گئی۔

بہر حال یہ سورہ پیغمبر اکرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے ہمہ گیر ہونے، اور اس کے روشن و واضح دلائل اور نشانیوں سے آمیختہ ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایسی رسالت جس کے لیے پہلے سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ لیکن جب ان کے پاس یہ رسالت پہنچی تو ایک گروہ نے اس بناء پر کہ ان کے مادی منافع خطرے میں پڑ رہے تھے، اس کی طرف سے پشت پھیر لی۔

ضمنی طور پر یہ اس حقیقت کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے کہ انبیاء کی دعوت کا اصول، مثلاً ایمان و توحید و نماز و روزہ، ایک ایسا اصول ہے جو ثابت اور جاودانی ہے اور یہ تمام آسمانی ادیان میں موجود رہا ہے۔

اس سورہ کے ایک دوسرے حصہ میں اہل کتاب اور مشرکین کے اسلام کے مقابلہ میں اعتراضات کو مشخص کرتا ہے کہ وہ گروہ جو ایمان لے آیا ہے اور اعمال صالح انجام دیتا ہے وہ تو بہترین مخلوق ہے۔ اور وہ گروہ جس نے کفر، شرک اور گناہ کی راہ اختیار کر لی ہے، وہ بدترین مخلوق شمار ہوتی ہے۔

اس سورہ کے مختلف نام ہیں، جو اس کے الفاظ کی مناسبت سے انتخاب ہوئے ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور سورہ ”بینہ“ و ”لم یکن“ و ”قیمۃ“ ہیں

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں اس طرح نقل ہوا ہے:-
”اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اس سورہ میں کون کون سی برکتیں ہیں تو وہ اپنے گھر والوں اور مال و منال کو چھوڑ کر اس کی

طرف بڑھتے۔“ قبیلہ ” خزاعہ“ کے ایک شخص نے عرض کیا: اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس کی تلاوت کا اجر و ثواب کیا ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”کوئی منافق اور وہ لوگ جن کے دل میں شک و شبہ ہے، اس کی تلاوت نہیں کریں گے۔ خدا کی قسم مقرب فرشتے اس دن سے جب سے سارے آسمان اور زمین پیدا ہوئے ہیں، اسے پڑھتے ہیں، اور اس کی تلاوت میں ایک لمحہ کے لیے بھی سستی نہیں کرتے جو شخص اسے رات کے وقت پڑھے گا، خدا ایسے فرشتوں کو مامور کرے گا، جو اس کے دین و دنیا کی حفاظت کریں گے، اور اس کے لیے بخشش اور رحمت طلب کریں گے، اور دن کے وقت پڑھے گا تو ان چیزوں کی مقدار میں جنہیں دن روشن کرتا ہے، اور رات انہیں تاریک بنا دیتی ہے، اسے ثواب دیں گے۔“^(۱)

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ، وَ الْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾۔

۲۔ ﴿رَسُولٌ مِنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُطَهَّرَةً ۚ فِيهَا كُتِبَ قِيَمَةٌ﴾۔

۴۔ ﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ الْأَمَّ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَةُ﴾۔

۵۔ ﴿وَمَا أَمْرٌ إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَ ذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ﴾۔

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

۱۔ اہل کتاب اور مشرکین میں کفار (کہتے تھے) جب تک ان کے لیے واضح دلیل نہ آجائے وہ اپنے دین سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

۲۔ خدا کی طرف ایسا رسول جو پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرے۔

۳۔ اور ان میں صحیح اور قابل قدر تحریریں ہوں۔

- ۴۔ لیکن اہل کتاب نے (خدا کے دین میں) اختلاف نہیں کیا مگر ان کے پاس واضح دلیل پہنچ جانے کے بعد۔
- ۵۔ حالانکہ انہیں کوئی حکم اس کے سوا نہیں دیا گیا تھا کہ وہ کمال اخلاص کے ساتھ خدا کی عبادت کریں، شرک سے توحید کی طرف لوٹیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اور یہی مستقیم اور صحیح دین ہے۔

یہ جاودانی دین ہے

سورہ کے شروع میں ظہور اسلام سے پہلے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اور مشرکین عرب کی حالت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ اس بات کا دعویٰ کیا کرتے تھے کہ جب تک کوئی واضح دلیل اور مسلمہ پیغمبران کے پاس نہ آجائے، وہ اپنے دین سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ ﴿لَمْ يَكُنِ الْاٰلِذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾۔

”ایسا پیغمبر جو خدا کی طرف سے ہو اور پاک و پاکیزہ صحیفوں کو ہمارے سامنے تلاوت کرے۔“ (رسول من اللہ یتلوا صحفاً مطهرة)۔

ایسے صحیفے جن میں موزوں، ثابت اور قابل قدر تحریریں ہوں۔ ﴿فِيْهَا كُتِبَ قِيَمَةٌ﴾۔
ہاں! وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور سے پہلے اسی قسم کے دعوے کیا کرتے تھے۔ لیکن آپ کے ظہور اور آپ کی کتاب آسمانی کے فزول کے بعد میدان بدل گیا اور وہ خدا کے دین میں اختلاف کرنے لگ گئے۔ ”اور اہل کتاب نے اختلاف نہیں کیا، مگر واضح دلیل اور سچا اور آشکار پیغمبران کے پاس آجانے کے بعد ﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اٰتَوْا الْكِتٰبَ الْاٰمَنَ بَعْدَ مَا جَاؤَتْهُمْ الْبَيِّنَةُ﴾

اسی طرح سے اوپر والی آیات اہل کتاب اور مشرکین کے دعوؤں کو بیان کر رہی ہیں کہ ابتداء میں تو نہیں یہ اصرار تھا کہ اگر کوئی پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ ہمیں دعوت دینے کے لئے آئے گا تو ہم قبول کر لیں گے۔
لیکن اس کے آجانے کے بعد اپنے قول سے پھر گئے اور اس کے مقابلہ میں جنگ و جدال کے لیے کھڑے ہو گئے، سوائے اس گروہ کے جنہوں نے ایمان کی راہ اختیار کر لی۔

اس بناء پر اوپر والی آیت اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورہ بقرہ کی آیہ ۸۹: ولما جاء کتاب من عند اللہ مصدق لما معہم وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاء ہم ماعرفوا کفروا بہ فلعنتہ اللہ علی الکافرین: میں آئی ہے یعنی جب خدا کی طرف سے ان کے پاس کتاب آئی جو ان نشانیوں کے موافق تھی جو ان کے پاس تھیں، اور اس سے پہلے وہ خود کو فتح کی خوش خبری دیا کرتے تھے۔ لیکن جب یہ کتاب اور پیغمبر جسے انہوں نے پہلے سے پہچانا ہوا تھا، ان کے پاس آیا تو وہ کافر ہو گئے، پس کافروں پر خدا کی لعنت ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ اہل کتاب اس قسم کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے، اور اصولی طور پر، مشرکین عرب بھی، جو اہل کتاب کو اپنے سے زیادہ عالم اور زیادہ آگاہ سمجھتے تھے، اس پروگرام میں ان کے ساتھ ہم آواز تھے لیکن جب ان کی آرزوئیں پوری ہو گئیں تو انہوں نے اپنے راستہ کو بدل لیا اور مخالفین کی صفوں میں جا ملے۔

مفسرین کی ایک جماعت کا ان آیات کی تفسیر کے بارے میں ایک دوسرا نظریہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ واقعاً وہ اپنے ادعا کے مطابق اپنے دین سے دستبردار نہیں ہوئے، اور اسے نہیں چھوڑا جب تک کہ واضح دلیل ان کے پاس نہ آگئی۔

لیکن اس بات کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس قسم کی واضح دلیل آجانے کے بعد وہ ایمان لے آئے گے۔ حالانکہ بعد والی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ یہ مطلب اس طرح نہیں تھا، مگر اس صورت میں کہ یہ کہا جائے کہ اس سے مراد ان میں سے ایک گروہ کا ایمان لانا ہے، چاہے وہ بالکل قلیل تعداد میں ہی ہوں، اور اصطلاح کے مطابق یہ ”موجبہ جزئیہ“ کی قبیل ہے۔

لیکن بہر حال یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے، اور شاید اسی بناء پر ”فخر رازی“ اپنی تفسیر میں پہلی آیت کو قرآنی آیات میں سب سے زیادہ پیچیدہ آیت شمار کرتا ہے، جو (اس کی سرطین) بعد والی آیات سے تضاد رکھتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے چند طریقے بیان کرتا ہے جن میں سے بہترین وہی ہے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔

یہاں ایک تیسری تفسیر بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا مشرکین اور اہل کتاب کو ان کی حالت پر نہیں چھوڑے گا، جب تک کہ ان پر اتمام حجت نہ کر دے اور کوئی دلیل ”بینہ“ نہ بھیجے، اور انہیں راستہ نہ بتا دے۔ اسی لیے پیغمبر اسلام کو ان کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔

حقیقت میں یہ آیت قاعدہ لطف کی طرف اشارہ ہے جو علم کلام میں بیان کیا جاتا ہے کہ خدا اتمام حجت کے لیے ہر قوم و ملت کے لیے واضح دلائل بھیجے گا۔^(۱)

بہر حال ”بینہ“ سے مراد یہاں واضح و روشن دلیل ہے جس کا مصداق دوسری آیت کے مطابق ”رسول اللہ“ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے جب کہ آپ کی زبان پر قرآن مجید تھا۔

”صحف“ ”صحیفہ“ کی جمع ہے، ایسے اوراق کے معنی میں ہے جن پر کوئی چیز لکھتے ہیں، اور یہاں اسے سے مراد ان اوراق کے مطالب ہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اکرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز کوئی چیز اوراق سے نہیں پڑھتے تھے۔

اور ”مطہرہ“ سے مراد، اس کا ہر قسم کے شرک، کذب، دروغ اور باطل سے پاک ہونا ہے اور شیاطین جن و انس کے اس میں دخل دینے سے پاک ہے۔

جیسا کہ سورہ حم سجدہ کی آیہ ۴۲ میں آیا ہے: لایاتہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ: ”اس کے پاس کسی قسم کا باطل نہ اس کے سامنے سے آیا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے۔“ ”فیہا کتب قیمۃ“ کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان صحف آسمانی میں ایسے مطالب لکھے ہوئے ہیں جن میں کسی قسم کا انحراف اور کجی نہیں۔ اس بناء پر تو ”کتب“ ”مکتوبات کے معنی میں ہے، یا یہ ان احکام و مقررات کے معنی میں ہے جو خدا کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں کیونکہ کتابت تعین حکم کے معنی میں بھی آئی ہے جیسا کہ فرماتا ہے: ﴿کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم﴾۔“

”روزہ تمہارے اوپر اسی طرح مقرر کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے والے لوگوں پر مقرر کیا گیا تھا“ (بقرہ۔ ۱۸۳) اور اس طرح ”قیمۃ“ صاف و مستقیم، یا محکم و پائیدار، یا قدر و قیمت والا کے معنی میں ہے، یا یہ سب مفاہیم اس میں جمع ہیں۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ چونکہ قرآن میں تمام گزشتہ کے مضامین و مطالب بہت سے اضافات کے ساتھ ہیں، لہذا یہ کہا گیا ہے کہ اس میں گزشتہ کتب قیمۃ ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں اہل کتاب کا ”مشرکین“ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، اور چوتھی آیت میں صرف اہل کتاب کا بیان ہے اور مشرکین کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں کی گئی، حالانکہ آیت دونوں کی طرف ناظر ہے۔ یہ تعبیرات ظاہراً اس وجہ سے ہیں کہ ان پروگراموں میں اہل کتاب اصل اور بنیادی حیثیت رکھتے تھے اور مشرکین ان کے تابع تھے۔

یا اس بناء پر کہ اہل کتاب زیادہ لائق مذمت تھے کیونکہ ان میں بہت سے علماء اور دانش مند موجود تھے اور وہ اس لحاظ سے مشرکین کی نسبت بلند سطح پر تھے۔ اس بناء پر ان کی مخالفت زیادہ قبیح اور زیادہ ناپسندیدہ تھی، لہذا وہ زیادہ سرزنش کے لائق تھے

اس کے بعد ”اہل کتاب“ کو اور ان کے تابع ”مشرکین“ کو ملامت کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”انہوں نے اس جدید دین میں اختلاف کیوں کیا کہ بعض تو ایمان لے آئے اور بعض کافر ہو گئے حالانکہ اس دین میں انہیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا کہ خدا کی عبادت کریں، اور اس کی عبادت کو اس کے غیر کی عبادت سے خالص رکھیں، اور ہر قسم کے شرک سے باز رکھیں اور توحید کی طرف مائل رہیں، نماز کو قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں۔“

﴿وَمَا أَمْرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيَتُوا الزَّكَاةَ﴾^(۲)۔

اس کے بعد فرماتا ہے: ”اور یہ ایک مستقیم و پائیدار دین ہے“ ﴿ذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ﴾۔

اس کے بارے میں کہ یہاں ”وما امروا“ سے کیا مراد ہے؟ ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب کے اپنے دین میں مسئلہ توحید اور نماز و زکوٰۃ موجود تھا، اور یہ ایسے مسائل ہیں جو ثابت ہیں، لیکن وہ ان احکام کے بھی وفادار نہیں رہے تھے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ دین اسلام میں سوائے خالص توحید، اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کے اور کوئی حکم نہیں آیا۔ اور یہ ایسے امور ہیں جنہیں وہ سب جانتے تھے۔ تو پھر وہ ان کو قبول کرنے سے روگردانی کیوں کرتے ہیں؟ اور ان کو ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔

دوسرا معنی زیادہ نزدیک دکھائی دیتا ہے، کیونکہ گزشتہ آیت کے بعد، جو دین جدید کے قبول کرنے میں ان کے اختلاف کرنے کی بات کر رہی تھی، مناسب یہی ہے کہ ”امروا“ جدید دین کی طرف ناظر ہو۔ اس سے قطع نظر پہلا معنی صرف اہل کتاب کے بارے میں صادق آتا ہے، اور مشرکین پر صادق نہیں آتا، جب کہ دوسرا معنی سب کو شامل ہے۔

بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق ”دین“ سے مراد جسے خدا کے لیے خالص کرنا چاہیے وہی ”عبادت“ ہے، اور ﴿إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ﴾ کا جملہ بھی، جو اس سے پہلے ذکر ہوا ہے، اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔

لیکن احتمال بھی ہے کہ اس سے دین و شریعت کا مجموعہ مراد ہو، یعنی اس بات پر مامور ہوئے تھے کہ خدا کی پرستش کریں اور ہر جہت سے اپنے دین و آئین کو خالص رکھیں۔ یہ معنی ”دین“ کے وسیع مفہوم کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔

اور بعد والا جملہ ”﴿وَذَلِكْ دِينُ الْقِيَمَةِ﴾“ جو دین وسیع معنی میں پیش کرتا ہے اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔ ”حفاء“ ”حنیف“ جمع ہے، جو ”حنف“ (بروزن کنف) کے مادہ سے ہے، اور مفردات میں ”راغب“ کے قول کے مطابق، گمراہی سے راہ مستقیم کی طرف مائل ہونے کے معنی میں ہے اور عرب ان تمام لوگوں کو جو ”حج“ بجالاتے تھے یا ”ختہ“ کیا کرتے تھے، ”حنیف“ کہا کرتے تھے (اور احنف) اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا پاؤں ٹیڑھا ہو۔

مجموعی طور سے لعنت کی مختلف کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں انحراف اور ٹیڑھے پن کے معنی میں تھا البتہ قرآن، اور اسلامی روایات میں شرک سے توحید و ہدایت کی طرف انحراف کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس تعبیر کا انتخاب ممکن ہے اصل میں اس بناء پر ہو کہ بت پرست معاشرے ہر اس شخص کو جو ان کے دین کو چھوڑ کر توحید کی طرف قدم بڑھاتا تھا، اسے ”حنیف“ (منحرف) شمار کرتے تھے، اور پھر آہستہ آہستہ یہ تعبیر راہ توحید کو طے کرنے والوں کے لئے ایک رائج تعبیر کے عنوان سے پہچانی گئی، اور حقیقت میں اس کا مفہوم ”ضلالت“ سے ہدایت کی طرف انحراف تھا۔ اور اس کا لازمہ، وہی توحید خالص اور اعتدالِ کامل اور ہر قسم کے افراط و تفریط سے اجتناب ہے، لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ سب اس نقطہ کے ثانوی معنوی ہیں۔

”﴿وَذَلِكْ دِينُ الْقِيَمَةِ﴾“ (۲)

کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اصول یعنی توحید خالص اور نماز (خالق کی طرف توجہ) اور زکوٰۃ (مخلوق کی طرف توجہ) تمام ادیان کے ثابت ہونے اور پائیدار اصول ہیں، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ انسان فطرت میں داخل ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو انسان کی سر نوشت مسئلہ توحید پر اور دوسری طرف سے اس کی فطرت منعم کا شکر ادا کرنے اور اس کی معرفت و شناخت کی دعوت دیتی ہے، اور تیسری طرف سے روح اجتماعی اور انسان کی مدنیت اسے محروم افراد کی مدد کے لیے پکارتی ہے۔

اس بناء پر ان احکام و دستورات کی جڑ بنیاد کلی طور پر فطرت کی جملہ گہرائیوں میں موجود ہے۔ اسی لیے یہ تمام گزشتہ انبیاء اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے۔

آیات ۶، ۷، ۸

۶۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَ الْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾۔

۷۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾ - ۸۔ ﴿جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرٰى مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ﴾ -

ترجمہ

۶۔ اہل کتاب اور مشرک کفار و دوزخ میں جائیں گے اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے، وہ بدترین مخلوق ہیں۔
۷۔ یقینی طور سے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیے ہیں، وہ (خدا کی) بہترین مخلوق ہیں۔

۸۔ ان کی جزاء ان کے پروردگار کے یہاں بہشتِ جاودانی کے باغات ہیں، جس کے درختوں کے نیچے نہریں ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی رہیں گے، خدا بھی ان سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی ہیں، اور یہ (بلند مقام) اس شخص کے لیے، جو اپنے پروردگار سے ڈرے۔

۱۔ اس بات پر توجہ کرنا چاہیے کہ ”منفکین“ جو ”منفک“ کی جمع ہے، ممکن ہے کہ اسم فاعل ہو، یا اسم مفعول ہو، پہلی اور دوسری تفسیر کی بناء پر اسم فاعل کے معنی دیتا ہے اور تیسری تفسیر کی بناء پر اسم مفعول کا (غور کیجئے)۔

۲۔ ”وما امروا“ کا جملہ کہ ”جملہ حالیہ“ ہو یا ”استینافیہ“ ہو اور ”لیعبدوا“ میں لام ”لام غرض“ ہو، اور یہاں اس سے مراد وہ مقصد اور نتیجہ ہو جو بندوں کی طرف لوٹتا ہے، نہ کہ وہ ہدف و نتیجہ جو خدا کی طرف لوٹے، جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے لام غرض ”کا انکار کیا ہے۔ اصولی طور پر خدا کے تمام افعال کی کوئی نہ کوئی غرض اور علت ہوتی ہے، لیکن وہ اغراض ایسے ہوتے ہیں جو بندوں کی طرف لوٹتے ہیں، اور بعض نے یہاں ”لام“ کو ”ان“ کے معنی میں سمجھا ہے جیسا کہ ”یرید اللہ لیبین لکم“ (نساء: ۲۶) میں ہے۔

۳۔ اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ ”دین القیمۃ“ اضافت کی صورت میں ہے، وصف کی صورت میں نہیں ہے۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ایک ایسا دین ہے جو گزشتہ (مستقیم اور قابل قدر) کتب قیمہ میں آیا ہے، یا یہ ایک ایسا دین ہے جس میں اسلام کے مستقیم اور قابل قدر احکام بیان ہوئے ہیں، اس بناء پر قیمہ کا مونث ہونا اس وجہ سے ہے کہ وہ ”کتب“ یا ملت و شریعت کا وصف ہے (غور کیجئے)

بہترین اور بدترین مخلوق

گزشتہ آیات میں آیا تھا کہ کفار اہل کتاب اور مشرکین اس انتظار میں تھے کہ خدا کی طرف سے کوئی واضح و روشن دلیل ان کے پاس آئے، لیکن واضح و روشن دلیل ”بینہ“ کے آجانے کے بعد وہ متفرق اور پراگندہ ہو گئے اور ہر ایک نے الگ الگ راہ اختیار کر لی۔

زیر بحث آیات میں اس دعوت الہی کے مقابلہ میں ”کفر کرنے والے“ اور ایمان لانے والے ”دونوں گروہوں اور ان سے ہر ایک کے انجام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ اس جدید دین سے کافر ہوئے ہیں وہ دوزخ کی آگ میں ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ وہ بدترین مخلوق ہیں۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾۔

”کفر“ کی تعبیر دین اسلام کے مقابلہ میں ان کے کفر کی طرف اشارہ ہے، ورنہ ان کا پہلے کا کفر و شرک کوئی نئی بات نہیں ہے۔

”﴿أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾“ (وہ بدترین مخلوق ہیں) کی تعبیر ایک لرزہ خیز تعبیر ہے، جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ تمام چلنے پھرنے والی مخلوق، اور نہ چلنے پھرنے والی مخلوق میں سے، ان لوگوں سے بڑھ کر مردود اور دھتکاری ہوئی مخلوق اور کوئی نہیں ہے، جنہوں نے حق کے واضح ہوتے ہوئے اور اتمام حجت کے بعد سیدھی راہ کو چھوڑ دیا اور ضلالت و گمراہی کی راہ اختیار کر لی۔ اور یہ بات حقیقت میں اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورہ انفال کی آیہ ۲۲ میں بیان ہوئی ہے: ﴿إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصَّمَّ الْبَكْمَ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ﴾: ”خدا کے نزدیک بدترین جاندار وہ لوگ ہیں جو نہ سننے والے کان رکھتے ہیں، نہ گویا زبان اور نہ ہی بیدار فکر و اندیشہ“

یا جو کچھ سورہ اعراف کی آیہ ۱۷۹ میں بیان ہوا ہے، جہاں دوزخیوں کے گروہ کو ان ہی اوصاف کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے: ﴿أُولَئِكَ كَالْإِنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾: وہ چوپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ اور غافل ہیں۔

زیر بحث آیت کا مطلب ان سے بھی کچھ آگے ہے کیونکہ یہ ان کا بدترین مخلوق ہونے کے ساتھ ان کا تعارف کراتی ہے اور حقیقت میں ان کے جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کی ایک دلیل کے طور پر ہے۔ وہ بدترین مخلوق کیوں نہ ہوں گے جب کہ سعادت کے تمام دروازے ان کے سامنے کھلے ہوئے تھے لیکن وہ کبر و غرور اور عناد و ہٹ دھرمی کی وجہ سے جان بوجھ کر مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔

اس آیت میں بھی ”اہل کتاب“ کو مشرکین پر مقدم رکھنے کی وجہ بھی ممکن ہے یہ ہو کہ وہ کتابِ آسمانی کے حامل اور دانشمند تھے۔

اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں ان کی کتابوں میں صراحت کے ساتھ آئی تھیں۔ اس بناء پر ان کا مخالفت کرنا زیادہ قبیح و بدتر تھا۔

بعد والی آیت میں دوسرے گروہ کی طرف، جو ان کے مخالف نقطہ مقابل اور قوسِ صعودی میں واقع ہوئے ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیئے ہیں، وہ خدا کی بہترین مخلوق ہیں: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾۔

اس کے بعد ان کی جزا اور پاداش کو چند مختصر سے جملوں میں اس طرح بیان کرتا ہے: ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس بہشت کے جاودانی باغات میں، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے ﴿جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾۔

”خدا بھی ان سے خوش اور راضی ہے، اور وہ بھی خدا سے خوش اور راضی ہیں“۔ ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾۔

”یہ بلند و والا مقام اور اہم و بے نظیر جزائیں اس شخص کے لئے ہیں جو اپنے پروردگار سے ڈرے“۔ ﴿ذَٰلِكَ لِمَنْ

خَشِيَ رَبَّهُ﴾۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مومنین کے بارے میں اعمالِ صالح کی گفتگو بھی درمیان آئی ہے، جو حقیقت میں ایمان کے درخت کا پھل ہے۔ اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنا اکیلا کافی نہیں ہے، بلکہ انسان کے اعمال بھی اس کے ایمان پر گواہ ہونا چاہئیں، لیکن کفر اکیلا ہی، چاہے اس کے ساتھ غیر صالح اعمال نہ بھی ہوں، سقوط و بد بختی کا سبب ہے۔ اس سے قطع نظر کفر عام طور پر انواع و اقسام کے گناہوں، جرائم اور غلط اعمال کا مبداء بھی ہوتا ہے۔

”﴿اولئك هم خير البرية﴾“ کی تعبیر اچھی طرح اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ مومن اور اعمال صالح بجالانے والے انسان فرشتوں تک سے بھی بالاتر ہیں، کیونکہ آیت مطلق ہے، اور اس میں کسی قسم کا استثناء نہیں ہے۔ قرآن کی دوسری آیات بھی اسی معنی کی گواہ ہیں مثلاً: فرشتوں کے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کی آیات، اور آیہ ﴿و لقد کرّمنا بنی آدم﴾ (اسراء ۷۰)

بہر حال اس آیت میں پہلے تو ان کے مادی و جسمانی صلہ، جو جنت کے پر نعمت باغات ہیں، کا ذکر کرتا ہے، اور اس کے بعد ان کی معنوی و روحانی جزاء کو بیان کرتا ہے کہ خدا بھی ان سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی اور خوش ہیں۔

وہ خدا سے راضی اور خوش ہیں کیونکہ جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ اس نے انہیں دیا ہے، اور خدا ان سے راضی اور خوش ہے چونکہ وہ جو کچھ چاہتا تھا وہ انہوں نے انجام دیا، اور اگر ان سے کوئی لغزش ہو بھی گئی تو اس نے اپنے لطف و کرم سے اس سے صرف نظر کی، اس سے بڑھ کر اور کون سی لذت ہو سکتی ہے کہ اسے اس بات کا احساس ہو جائے کہ اس کے کاموں کو معبود نے قبول کر لیا ہے اور اس کا محبوب اس سے راضی اور خوش ہے۔ اور اسے اس کی لقاء حاصل ہو گئی ہے۔

دارند ہر کس از تو مرادے و مطلبے

مقصود ما ز دنیا عقبی لقای تو است

”ہر شخص تجھ سے کوئی نہ کوئی خواہش اور مطلب رکھتا ہے لیکن ہمارا مقصد دنیا میں تیری لقاء ہے۔“

ہاں! انسان کے جسم کی جنت تو اس جہاں کے جاودانی باغات ہیں، لیکن اس کی روح کی بہشت خدا کی رضا اور لقائے محبوب ہے ”ذلک لمن خشی ربہ“ کا جملہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ان تمام برکات کا سرچشمہ خدا کا خوف، خشیت اور ڈر ہے، کیونکہ یہی خوف ہی ہر قسم کی اطاعت، تقویٰ اور اعمال صالح کی طرف حرکت کرنے کا سبب بنتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو سورہ فاطر کی آیہ ۲۸۔ ﴿انما یخشی اللہ من عباده العلماء﴾ ”صرف علماء ہی خدا سے

ڈرتے ہیں“ کے ساتھ ملا کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بہشت پر حقیقتاً علماء اور آگاہ دانش مند لوگوں کا مسلہ حق ہے۔

البتہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خشیت اور خوفِ خدا کے کئی درجے اور مرتبے ہوتے ہیں اور علم و دانش و آگاہی میں بھی کئی درجے اور مرتبے ہوتے ہیں اس بات کا مفہوم واضح اور روشن ہو جاتا ہے۔
 ضمنی طور پر بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ”مقام خشیت“ مقامِ خوف سے بالاتر ہوتا ہے، کیونکہ خوف تو ہر قسم کے ڈر پر بولا جاتا ہے، لیکن خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو تعظیم و احترام کے ساتھ ہو۔

۱۔ علی علیہ السلام اور ان کے شیعہ خیر البریہ ہیں

بکثرت روایات میں، جو اہل سنت کے طریقوں سے ان کی مشہور کتابوں میں اور اسی طرح شیعوں کی مشہور کتابوں میں نقل ہوئی ہیں آیہ ﴿اولئک ہم خیر البریۃ﴾ (وہ خدا کی بہترین مخلوق ہیں) کی علی علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔

”حاکم حسانی“ نیشاپوری نے، جو پانچویں صدی ہجری کے مشہور علماء اہل سنت میں سے ہیں، ان روایات کو اپنی مشہور کتاب ”شواہد التنزیل“ میں مختلف اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے، اور ان کی تعداد بیس ہزار روایات سے زیادہ ہے جن میں سے ہم چند روایات کو نمونہ کے طور پر آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ”ابن العباس“ کہتے ہیں جس وقت آیہ ﴿الذین امنوا و عملوا الصالحات اولئک ہم خیر البریۃ﴾ نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم نے علی علیہ السلام سے فرمایا: ﴿هو انت و شیعتك تأتی انت و شیعتك یوم القیامۃ راضیین مرضیین و یأتی عدوک غضباناً مقمحين﴾ ”اس آیت سے مراد تو اور تیرے شیعہ ہیں جو روز قیامت عرصہ محشر میں اس حال میں وارد ہوں گے کہ تم بھی خدا سے راضی ہو گے اور خدا بھی تم سے راضی ہوگا، اور تیرا دشمن غصہ کی حالت میں عرصہ محشر میں وارد ہوگا اور زبردستی اس کو جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔“ (حدیث کے بعض نسخوں میں مقمحين آیا ہے، جس کا معنی طوق و زنجیر کے ذریعہ سر کو اونچا رکھنا ہے)۔ (شواہد التنزیل“ جلد ۲ ص ۳۵۷ حدیث ۱۱۲۶)

۲۔ ایک دوسری حدیث میں ”ابو بزرہ“ سے آیا ہے کہ جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی تو فرمایا:

﴿هم انت و شیعتك یا علی و میعاد ما بینی و بینک الحوض﴾

”اے علی! وہ تو اور تیرے شیعہ ہیں، اور تیری اور میری وعدہ گاہ حوض کوثر ہے۔“ (۱)

۳۔ ایک اور حدیث میں ”جابر بن عبد اللہ انصاری“ سے آیا ہے کہ ہم خانہ خدا کے پاس پیغمبر اکرم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ علی علیہ السلام ہماری طرف آئے، جس وقت پیغمبر کی نگاہ ان پر پڑی تو فرمایا: ”قد اتاكم اخي“ میرا بھائی تمہاری طرف آرہا ہے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانہ خدا کی طرف رخ کیا اور فرمایا:

﴿فقال ورب هذه البنية ان هذا و شيعته هم الفائزون يوم القيامة﴾

”اس کعبہ کے خدا کی قسم یہ شخص اور اس کے شیعہ قیامت کے دن رست گار اور کامیاب ہوں گے“
اس کے بعد ہماری طرف رخ کیا اور فرمایا:

﴿اما و الله انّه أولكم إيماناً بالله ، و اقومكم بامر الله و اوفاكم بعهد الله ، و اقضاكم بحكم الله و قسمكم

بالسوية، و اعدلكم فى الرعية، و اعظمكم عند الله منزية﴾۔

قال ” جابر“: فانزل الله : ﴿انّ الذّن آمنوا و عملوا الصالحات اولئك هم خير البرية﴾“ فكان اذا اقبل قال

اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) قد اتاكم خير البرية بعد الرسول :

”خدا کی قسم یہ تم سب میں سے پہلے خدا پر ایمان لایا ہے اور اس نے خدا کے حکم سے تم سب میں پہلے قیام کیا ہے، خدا کے عہد کو تم سب سے زیادہ وفا کرنے والا ہے، اور وہ تم سب سے زیادہ اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے کرنے والا ہے اور وہ (بیت المال) کی تقسیم میں سب سے زیادہ مساوات کرنے والا ہے، رعیت میں سب سے زیادہ عدل کرنے والا ہے، اور اس کا مقام و مرتبہ خدا کے نزدیک تم سب سے زیادہ ہے۔“

جابر کہتے ہیں کہ اس موقع پر خدا نے آیہ ”﴿انّ الذین آمنوا و عملوا الصالحات اولئك هم خير البرية﴾“

نازل فرمائی۔ اس کے بعد جب بھی کبھی علی علیہ السلام آتے تو اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انہیں آتا ہوا

دیکھ کر کہتے: رسول اللہ کے بعد خدا کی مخلوق میں جو سب سے زیادہ بہتر وہ آرہا ہے۔ (۳)

اس آیت کا خانہ کعبہ کے پاس فزول اس سورہ کے مدنی ہونے کے ساتھ منافات نہیں رکھتا، کیونکہ ممکن ہے کہ یہ نزول مجدد کے قبیل سے ہوا، یا تطبیق کے عنوان سے ہو، علاوہ ازیں بعید نہیں ہے کہ ان آیات کا فزول ان سفروں میں ہوا ہو جن میں پیغمبر مدینہ سے مکہ کی طرف آئے تھے، خصوصاً جب کہ اس روایت کا راوی ”جابر بن عبد اللہ انصاری“ ہے جو مدینہ میں آپ کے ساتھ ملحق ہوئے تھے، اور اس قسم کی آیات پر مدنی ہونے کا اطلاق بعید نہیں ہے۔

ان احادیث میں سے بعض کو ”ابن حجر“ نے کتاب ”صواعق محرقہ“ میں نقل کیا ہے۔ بعض کو شبلینجی نے ”نور الابصار“ میں ذکر کیا ہے۔^(۳)

”جلال الدین سیوطی“ نے ”در المنثور“ میں بھی آخری روایت کا عمدہ حصہ ”ابن عساکر“ سے جابر بن عبد اللہ انصاری سے نقل کیا ہے۔^(۴)

۴۔ ”در المنثور“ میں آیا ہے کہ جس وقت آیہ ”اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ هُم خِیْر الْبَرِیَّةِ“ نازل ہوئی، تو پیغمبر نے علی علیہ السلام سے فرمایا:

”هو انت و شیعتهک يوم القيامة راضین مرضین“

”وہ تو اور تیرے شیعہ ہیں، قیامت کے دن تم خدا سے راضی ہو گے اور خدا تم سے راضی ہوگا۔“^(۵)

۵۔ مذکورہ مولف نے ایک دوسری حدیث میں ”ابن مردویہ“ کے واسطے سے علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرام نے مجھ سے فرمایا:

الم تسمع قول الله : اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ هُم خِیْر الْبَرِیَّةِ؟ انت و شیعتهک و موعدی و موعدکم الحوض، اذات جنت الامر للحساب تد عون غرا محجلین:^(۶)

”کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ فرماتا ہے: لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیے وہ بہترین مخلوق ہیں؟ یہ تم اور تمہارے شیعہ ہیں۔ اور میری اور تمہاری وعدہ گاہ حوض کوثر کا کنارہ ہے۔ جب میں امتوں کے حساب کے لیے آؤں گا تو تمہیں ”غیر مجلین“ (سفید پشانی والے) کہہ کر پکارا جائے گا۔

اہل سنت کے اور بھی بہت سے دوسرے علماء نے اسی مضمون کو اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، منجملہ ”خطیب خوارزمی“ نے ”مناقب“ میں ”ابو نعیم اصفہانی“ نے ”کفایت الخصاص“، میں ”علامہ طبعی“ نے اپنی مشہور تفسیر میں ”ابن صباغ مالکی“ نے ”فصول المهمہ“ میں علامہ شوکانی نے ”فتح القدیر“ میں ”شیخ سلیمان قندوزی“ نے ”ینایع والمودة“ اور ”آلوسی“ نے ”روح المعانی“ میں زیر بحث آیات کے ذیل میں، اور بہت سے دوسرے علماء نے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اوپر والی حدیث میں بہت ہی مشہور و معروف احادیث میں سے ہے کہ جسے اکثر دانش مندوں اور علماء اسلام نے قبول کیا ہے، اور یہ علی علیہ السلام اور ان کے شیعوں کی ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔

ضمنی طور پر ان روایات سے یہ حقیقت اچھی طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ لفظ ”شیعہ“ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے ہی آنحضرت کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان نشر ہوا، اور یہ امیر المومنین علی علیہ السلام کے خاص پیروکاروں کی طرف اشارہ ہے۔ لہذا وہ لوگ جو یہ گمان کرتے ہیں ”شیعہ“ کی تعبیر صدیوں بعد وجود میں آئی ہے، بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

۱۔ وہی مدرک ص ۳۵۹ حدیث ۱۱۳۰۔

۲۔ وہی مدرک ص ۳۶۲ حدیث ۱۱۳۹۔

۳۔ ”صواعق محرقہ“ ص ۹۶ ”نور الابصار“ ص ۷۰، ۱۰۱۔

۴۔ ”در المنثور“ جلد ۶ ص ۳۷۹۔

۵۔ ”در المنثور“ جلد ۶ ص ۳۷۹۔

۶۔ ”در المنثور“ جلد ۶ ص ۳۷۹۔

۲۔ عبادت میں خلوص نیت لازم ہے

اصول فقہ کے بعض علماء نے آیہ ”﴿وَمَا أَمْرُو إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾“ سے عبادات میں قصدِ قربت کے لازم ہونے پر استدلال کیا ہے اور یہ اوامر میں اصل ان کا تعبدی ہونا ہے نہ کہ توصلی ہونا۔ اور یہ اس سے وابستہ ہے کہ یہاں ”دین“ کا معنی عبادت ہو، تاکہ یہ عبادات میں خلوص کے لازم ہونے کی دلیل بنے اور ”امر“ کو ہم اس آیت میں مطلق قرار دیں، تاکہ اس کا مفہوم تمام اوامر میں قصدِ قربت کا لازم ہونا ہے، (سوائے ان موارد کے جو دلیل کی وجہ سے خارج ہوں) حالانکہ آیت کا مفہوم، ظاہر کے اعتبار سے، ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود شرک کے مقابلہ میں توحید کا اثبات ہے۔ یعنی انہیں توحید کے سوال اور کسی چیز کی دعوت نہیں دی گئی ہے اور اس حال میں اس کا احکام فرعی کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

۳۔ انسان کی عجیب قوس صعودی و نزولی

اس سورہ کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ عالم میں کسی بھی مخلوق کے قوس صعودی و نزولی کا فاصلہ انسان کے قوس صعودی و نزولی کے برابر نہیں ہے۔ اگر انسان ایمان لے آئے اور اعمالِ صالح بجالائے (اس بات پر توجہ رہے کہ ”﴿عَمَلُوا الصَّالِحَاتِ﴾“ تمام اعمالِ صالح کو شامل ہے، نہ کہ بعض کو) تو وہ خدا کی مخلوق میں سے زیادہ افضل اور برتر ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ کفر و ضلالت اور ہٹ دھرمی اور عناد کا راستہ اختیار کر لے، تو اتنا گر جاتا ہے کہ خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ بدترین جاتا ہے! انسان کے ”قوس صعودی“ و ”نزولی“ کا یہ عظیم، فاصلہ اگرچہ ایک حساس اور خطرناک مسئلہ ہے لیکن یہ نوعِ بشر کے مقامِ عظمت اور اس کے تکامل و ارتقاء کی قابلیت پر دلالت کرتا ہے، اور یہ ایک طبعی و فطری چیز ہے کہ اس قسم کی حد سے زیادہ قابلیت و استعداد کے ہوتے ہوئے، تنزل و سقوط کا امکان بھی حد سے زیادہ ہو۔ خدا وندا! ہم ”خیر البریہ“ کے بلند مقام تک پہنچنے کے لیے تیرے لطف و کرم سے مدد طلب کرتے ہیں۔ پروردگار! ہمیں اس عظیم اور بزرگ ہستی کے شیعوں اور پیروکاروں میں سے قرار دے جو اس کے لیے سب سے زیادہ لائق اور شائستہ ہے۔

بار الہا! ہمیں اس قسم کا خلوص مرحمت فرما کہ ہم تیرے سوال کسی کی پرستش نہ کریں اور تیرے غیر سے محبت نہ رکھیں۔

آمین یا رب العالمین

سورہ الزلزال

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۸ آیات ہیں۔

سورہ زلزلہ کے مطالب اور فضیلت

اس بارے میں کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہو یا مدینہ میں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بہت سے اسے مدنی سمجھتے ہیں جب کہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوا ہے۔ اس کی آیات کالب و لہجہ جو ”معاد“ اور ”قیامت“ کی شرائط کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، ملکی سورتوں سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، لیکن ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت یہ سورہ نازل ہوا تو ”ابو سعید خدری“ نے پیغمبر اکرام سے آیہ فمن يعمل مثقال ذرة کے بارے میں سوال کیا، اور ہم جانتے ہیں کہ ”ابو سعید“ مدینہ میں مسلمانوں سے ملحق ہوئے تھے۔^(۱)

لیکن اس سورہ کا مکی یا مدنی ہونا اس کے مفہم اور تفسیر پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

بہر حال یہ سورہ خصوصیت کے ساتھ تین محوروں کے گرد گردش کرتا ہے۔

پہلے ”الشرائط الساعة“ اور قیامت کے وقوع کی نشانیوں سے بحث کرتا ہے۔

اور اس کے بعد انسان کے تمام اعمال کے بارے میں زمین کی گواہی کی گفتگو ہے۔

اور تیسرے حصہ میں لوگوں کی دو گروہوں ”نیکو کار“ اور بدکار“ میں تقسیم، اور ہر ایک شخص کے اپنے اعمال کا نتیجہ پانے کی بات ہے۔

اس سورہ کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت میں اسلامی روایات میں اہم تعبیریں آئی ہیں منجملہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے: ﴿مَنْ قَرَأَهَا فَكَانَ قَرَأَ الْبَقْرَةَ وَاعْطِيَ مِنَ الْاَجْرِ كَمَنْ قَرَأَ رُبْعَ الْقُرْآنِ﴾: جو شخص اس کی تلاوت کرے گویا اس نے سورہ بقرہ کی قرائت، اور اس کا اجر ثواب اس شخص کے برابر ہے جس نے قرآن کے چوتھے حصہ کی قرائت کی ہو۔^(۱)

اور ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: سورہ ”اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ“ کی تلاوت کرنے سے ہرگز خستہ نہ ہونا، کیونکہ جو شخص اس کو نافلہ نمازوں میں پڑھے گا وہ ہرگز زلزلہ میں گفتار نہ ہوگا اور نہ ہی اس کی وجہ سے مرے گا۔ اور مرتے دم تک صاعقہ اور آفات دنیا میں سے کسی آفت میں گفتار نہ ہوگا۔^(۲)

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

- ۱۔ ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زُلْزَالَهَا﴾ - ۲۔ ﴿وَاُخْرِجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا﴾ - ۳۔ ﴿وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا﴾
- ۴۔ ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا﴾ - ۵۔ ﴿بَانَ رُبُكٌ اَوْحٰی لَهَا﴾ - ۶۔ ﴿يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّیُرَوْا اَعْمَالَهُمْ﴾ -
- ۷۔ ﴿فَمَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرْهَ﴾ - ۸۔ ﴿وَمَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرْهَ﴾

ترجمہ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

- ۱۔ جس وقت زمین شدت کے ساتھ لرزنے لگے گی۔ ۲۔ اور زمین اپنے سنگین بوجھ کو باہر نکال کر رکھ دے گی۔
- ۳۔ اور انسان کہے گا کہ زمین کو کیا ہو گیا ہے۔ (کہ اس طرح لرز رہی ہے)
- ۴۔ اس دن زمین اپنی تمام خبروں کو بیان کر دے گی۔ ۵۔ کیونکہ تیرے پروردگار نے اسے وحی کی ہے۔
- ۵۔ اس کے لوگ مختلف گروہوں کی صورت میں قبروں سے نکلیں گے، تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں۔
- ۷۔ پس جس شخص نے ایک ذرہ کے وزن کے برابر بھی اچھا کام انجام دیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا۔

۸۔ اور جس نے ایک ذرہ کے وزن کے برابر بر اکام کیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا۔

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۲۴۔

۲۔ ”اصول کافی“ (مطابق نواتقلین جلد ۵ ص ۳۴۷)۔

جس دن انسان اپنے تمام اعمال دیکھے گا

جس طرح سورہ کے مطالب کے بیان میں اشارہ ہوا ہے یہ سورہ اس جہان کے اختتام اور قیامت کے شروع کے بعض ہولناک اور وحشت ناک حوادث کے بیان کے ساتھ شروع ہوا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: ”جس وقت زمین شدت کے ساتھ ہلنے لگے گی۔“ ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾^(۱)

اور اس طرح زیر و زبر ہوگی کہ ”وہ سارے سنگین بوجھ“ جو اس کے اندر ہیں، باہر نکال کر رکھ دے گی۔ ﴿وَاُخْرِجَتِ الْاَرْضُ اِنْقَالَهَا﴾۔

”زلزالھا“ (اس زلزلہ) کی تعبیر یا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن سارا کمرہ زمین لرزے لگے گا۔ (عام زلزلوں کے برخلاف جو سب کے سب کسی خاص موضع یا علاقہ میں ہوتے ہیں)۔ اور زلزلہ معبود یعنی زلزلہ قیامت کی طرف اشارہ ہے۔^{(۲)(۳)}

اس بارے میں کہ ”انقال“ (سنگین بوجھ) سے کیا مراد ہے، مفسرین نے متعدد تفاسیر بیان کی ہیں، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد انسان ہیں جو قیامت کے زلزلہ سے قبروں کے اندر سے باہر اچھل پڑیں گے، جیسا کہ سورہ انشقاق کی آیہ ۴ میں آیا ہے۔ ﴿الْقَت مَافِيهَا وَتَخَلَّتْ﴾

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ اپنے اندرونی خزانوں کو باہر پھینک دے گی۔ اور بے خبر دنیا پرستوں کے لئے حسرت کا سبب بنے گی۔^(۴)

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد زمین کے اندر بہنے والے بھاری مواد کو باہر پھینکنا ہے جن کی کچھ مقدار عام طور پر آتش فشاں اور زلزلوں کے وقت باہر نکلتی ہے

عالم کے اختتام پر جو کچھ زمین کے اندر ہے وہ اس زلزلہ عظیم کے بعد باہر آجائے گا۔

پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اگر ان تفاسیر کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے۔

بہر حال اس دن انسان اس آن دیکھے منظر کو دیکھ کر سخت متوحش ہوگا، اور کہے گا: ”یہ کیا ہو گیا ہے کہ زمین اس

طرح لرز رہی ہے، اور جو کچھ اس کے اندر تھا اسے باہر پھینک دیا ہے“۔ ﴿وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا﴾۔

اگرچہ بعض نے یہاں انسان کی کافر انسانوں کے ساتھ تفسیر کی ہے، کیونکہ زمین کے اوضاع و احوال سے تعجب اس دن کفار کے ساتھ مخصوص نہیں ہوگا۔

کیا یہ تعجب، اور اس سے پیدا ہونے والا سوال ”نفخہ اولیٰ“ سے مربوط ہے یا ”نفخہ دوم“ سے؟ ظاہر یہ ہے کہ یہ وہی پہلا نفخہ ہے جو اس عالم کے اختتام کا نفخہ ہے۔ کیونکہ یہ زلزلہ عظیم اختتام جہاں پر آئے گا۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد نفخہ قیامت اور مردوں کے زندہ ہونے اور ان کے زمین سے باہر پھینک دینے کا نفخہ ہے کیونکہ بعد والی آیات بھی سب کی سب نفخہ دوم کے ساتھ مربوط ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن کی آیات میں ان دونوں نفخوں کے حوادث بارہا اکٹھے ذکر ہوئے ہیں، لہذا اختتام جہاں پر وحشت ناک زلزلہ کے بیان کی طرف توجہ کمرتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اور اس صورت میں کے ”اِثْقَالَ“ سے مراد معدنیات، خزانے اور اس کے اندر موجود پگھلے ہوئے مواد ہیں۔ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ”زمین اس دن اپنی ساری خبریں بیان کرے گی“ ﴿یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾۔

جو خوبیاں اور برائیاں، اور خیر و شر کے اعمال روئے زمین پر واقع ہوئے ہیں، وہ ان سب کو ظاہر کر دے گی۔ اور اس دن انسان کے اعمال کے گواہوں میں سے اہم ترین گواہ بھی زمین ہوگی جس پر ہم اپنے اعمال انجام دیتے ہیں۔ اور جو ہماری شاہد و ناظر ہے۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ﴿اتَدْرُونَ مَا اخْبَارَهَا﴾؟ ”کیا تم جانتے ہو کہ زمین کے اخبار سے یہاں کیا مراد ہے؟“

”قالوا: الله و رسوله اعلم“: انہوں نے کہا: خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔“

آپ نے فرمایا: اخبارھا ان تشهد علی کل عبد و امة بما عملوا علی ظہرها، تقول عمل کذا و کذا، یوم کذا، فہذا اخبارھا:

”زمین کے خبر دینے والے سے مراد یہ ہے کہ زمین ہر مرد اور عورت کے اعمال کی، جو انہوں نے روئے زمین پر انجام دیے ہیں، خبر دے گی، وہ کہے گی کہ فلاں شخص نے فلاں دن فلاں کام کیا ہے، یہ ہے زمین کا خبر دینا“۔^(۵)

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے:

حافظوا علی الوضوء و خیر اعمالکم الصلوة فتحفظوا من الارض فانھا امکم، ولیس فیہا احد یعمل خیراً او شراً الا و ہی مخبرة بہ۔“

”وضوء اور اپنے اعمال میں سے بہترین عمل، نماز کی حفاظت کمر، اور زمین کی طرف دیکھتے رہو، کیونکہ وہ تمہاری ماں ہے، کوئی انسان بھی اچھا یا برا کام انجام نہیں دیتا مگر یہ کہ زمین اس کی خبر دیتی ہے۔“ (۶)

ابو سعید خدری سے نقل ہوا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: جب کبھی تم بیابان میں ہو، تو بلند آواز کے ساتھ اذان دو، کیونکہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”لا یسمعه جن ولا انس ولا حجر الا یشہد“ کوئی جن و انس، اور پتھر کو کوئی ٹکڑا اسے نہیں سنتا، مگر یہ کہ (قیامت میں) اس کے لیے گواہی دے گا۔“ (۷)

کیا واقعاً خدا کے حکم سے زمین کی زبان کھل جائے گی اور وہ بات کرے گی؟ یا اس سے مراد روئے زمین پر انسان کے اعمال کے آثار کا ظاہر ہونا، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان جو عمل بھی انجام دیتا ہے، وہ خواہ مخواہ اس کے اطراف میں کچھ آثار چھوڑتا ہے۔ چاہے وہ آج ہمارے لیے محسوس نہ ہوں۔ ٹھیک ایک دوست یا دشمن کی انگلیوں کے انہیں آثار کے مانند، جو دروازے کے قبضہ پر رہ جاتے ہیں، اور اس دن یہ سب کے سب آثار ظاہر ہو جائیں گے، اور زمین کا بات کرنا اس عظیم ظہور کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم کسی خواب آلود شخص سے کہتے ہیں، کہ تیری آنکھیں بتلا رہی ہیں کہ تو کل رات سویا نہیں ہے۔ یعنی بے خوابی کے آثار اس میں نمایاں ہیں۔

بہر حال یہ کوئی غیر مانوس بات نہیں، کیونکہ موجودہ زمانے میں انسان کے علم و دانش کی پیش رفت کی وجہ سے ایسے آلات و وسائل اختراع ہو چکے ہیں جو ہر جگہ اور ہر لمحہ انسان کی آواز کو گرفت میں لے سکتے ہیں، یا انسان اور اس کے اعمال و افعال کی تصویریں کھینچ سکتے ہیں، اور ایک مسلم سند کے عنوان سے اسے عدالت میں پیش کر سکتے ہیں، اس طرح کہ انکار کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

اگر لوگ گزشتہ زمان میں زمین کی گواہی سے تعجب کرتے تھے، تو موجودہ زمانہ میں ایک پتلی سی ریل (فیتہ) یا (ریکارڈ) ضبط کے کرنے کی مشین جو ایک بٹن کی صورت میں لباس سے ٹکی ہوئی ہوتی ہے، بہت سے مسائل کو بیان کر سکتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں علی علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”صلوا المساجد فی بقاع مختلفة، فان کل بقعة تشهد للمصلی علیہا یوم القیامة“ ”مساجد کے مختلف حصوں میں نماز پڑھا کرو، کیونکہ زمین کا ہر ٹکڑا، اس شخص کے لیے جو اس پر نماز پڑھتا ہے، گواہی دے گا۔“ (۸)

ایک اور دوسری حدیث میں آیا ہے، کہ امیر المومنین علی علیہ السلام جب بیت المال تقسیم فرماتے تھے، اور وہ خالی ہو جاتا تھا تو ہاں دو رکعت نماز بجالاتے اور فرماتے: ”اشھدی انی ملأتک بحق و فرغتک بحق“ (قیامت کے دن) ”گو ابی دینا کہ میں نے تجھے حق کے ساتھ پر کیا تھا اور حق کے ساتھ ہی خالی کیا ہے۔“ (۹)

بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے: یہ اس خبر (نباء) پر ہے کہ تیرے پروردگار نے زمین کی وحی کی ہے۔ ﴿بان ربک اوحی لھا﴾ (۱۰)

اور زمین اس فرمان کے اجزاء میں کوتاہی کرے گی، ”اوحی“ کی تعبیر یہاں اس بناء پر ہے کہ اس قسم کی اسرار آمیز گفتگو کرنا زمین کی طبیعت کے خلاف ہے۔ اور یہ چیز ایک وحی الہی کے طریقے کے سوا ممکن نہیں ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ زمین کو وحی کرے گا کہ جو کچھ اس کے اندر ہے وہ باہر پھینک دے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح اور مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے: ”اس دن لوگ مختلف گروہوں کی صورت میں قبروں سے نکل کر عرصہ محشر میں وارد ہوں گے، تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں۔ ﴿یومئذ یصدر الناس اشتتاً لیروا اعمالہم﴾۔

”اشتتات“ ”شت“ (بروزن شط) کی جمع ہے، پراگندہ اور متفرق کے معنی میں ہے، یہ اختلاف و پراگندگی ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ ہر مذہب والے الگ عرصہ محشر میں وارد ہوں گے، یا زمین کے علاقوں میں سے ہر علاقے کے لوگ جدا جدا وارد ہوں گے، یا یہ ہے کہ ہر ایک گروہ تو ہشاشباش، شاد و خندان، حسین و خوبصورت چہروں کے ساتھ آئے گا اور ایک گروہ تیوری چڑھائے تیرہ و تاریک چہروں کے ساتھ محشر میں وارد ہوگا۔

یا ہر امت اپنے امام، رہبر اور پیشوا کے ساتھ ہوگی جیسا کہ سورہ اسراء کی آیہ ۷۱ میں آیا ہے، : یوم ندعوا کل انا ساس باہم“: ”اس دن ہم ہر گروہ کو اس کے امام و پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔ یا یہ ہے کہ مو منین، مو منین ساتھ، اور کفار، کفار کے ساتھ محشر ہوں گے۔ ان تمام تفاسیر کے درمیان جمع بھی پورے طور پر ممکن ہے کیونکہ آیت کا مفہوم وسیع ہے۔ ”یصدر“ ”صدر“ (بروزن صبر) کے مادہ سے اونٹوں کے پانی والی جگہ سے نکلنے کے معنی میں ہے، انبؤہ کی صورت میں ہیجان میں آئے ہوئے باہر آتے ہیں ”ورود“ کے برعکس جو پانی کی جگہ میں داخل ہونے کے معنی میں ہے۔ اور یہاں مختلف قوموں کے قبروں سے نکلنے اور حساب دینے کے لیے محشر میں آنے سے کنایہ ہے۔

پہلا معنی گزشتہ آیات کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

”﴿لِيرُوا اَعْمَالَهُمْ﴾“ (تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں) کے جملہ سے مراد اعمال کی جزا کا مشاہدہ ہے۔

یا نامہ اعمال کا مشاہدہ مراد ہے جس میں ہر نیک و بد عمل ثبت ہے۔

یا مشاہدہ باطنی مراد ہے جس کا معنی ان کے اعمال کی کیفیت کی معرفت و شناخت ہے۔

یا ”تجسم اعمال“ کی صورت میں خود اعمال کا مشاہدہ مراد ہے۔

آخری تفسیر ظاہر آیہ کے ساتھ سب سے زیادہ موافق ہے، اور یہ آیت مسئلہ تجسم اعمال پر روشن قرین آیات میں سے شمار ہوتی ہے کہ اس دن انسان کے اعمال مناسب صورتوں میں مجسم ہو کر اس کے سامنے حاضر ہوں گے، اور ان کی ہم نشینی خوشی کا موجب یا رنج و بلا کا باعث ہوگی۔

اس کے بعد ان دونوں گروہوں مومن و کافر، نیکو کار و بدکار کے انجام کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”پس جس شخص نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا۔“ ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾۔

اور جس شخص نے ذرہ برابر برا کام کیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا۔“ ﴿وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾۔

یہاں بھی مختلف تفسیریں ذکر ہوئی ہیں کہ کیا اعمال کی جزا کو دیکھے گا، یا نامہ اعمال کا کا مشاہدہ کرے گا، یا عمل کو۔ ان آیات کا ظاہر بھی قیامت کے دن ”تجسم اعمال“ اور خود عمل کے مشاہدہ کے مسئلہ پر، نئے سرے سے ایک تاکید ہے، چاہے وہ عمل نیک ہو یا برا، یہاں تک کہ اگر ایک سوئی کے برابر بھی نیک یا برا کام ہوگا تو وہ بھی اپنے کمرے والے کے سامنے مجسم ہو جائے گا، اور وہ اس کا مشاہدہ کرے گا۔

”مثقال“ لغت میں بوجھ اور سنگینی کے معنی میں بھی آیا ہے، اور اس ترازو کے معنی میں بھی جس سے چیزوں کو تولد جاتا ہے، اور یہاں یہ پہلے معنی میں ہی ہے۔

”ذرة“ کے لیے بھی لغت اور مفسرین کے کلمات میں مختلف تفسیریں ذکر ہوئی ہیں، کبھی تو چھوٹی چیونٹی کے معنی میں، اور کبھی اس گرد و غبار کے معنی میں جو زمین پر ہاتھ رکھ کر اٹھانے کے بعد اس سے چپک جاتا ہے اور کبھی غبار کے ان چھوٹے چھوٹے ذرات کے معنی میں تفسیر ہوئی ہے جو فضا میں معلق ہوتے ہیں اور جب سورج کی شعاعیں کسی سوراخ سے تاریک کمرے میں پڑے تیں ہیں تو وہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ”ذرہ“ کا ”ایٹم“ پر بھی اطلاق کرتے ہیں۔ اور ایٹم بم کو ”القنبلة الذرية“ کہتے ہیں۔

”ایٹم“ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ نہ تو وہ عام آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی دقیق ترین خوردبینوں کے ذریعے قابل مشاہدہ ہے، اور صرف اس کے آثار کا ہی مشاہدہ کمرتے ہیں، اور اس کا حجم اور وزن علمی حساب و کتاب کے ذریعے ہی ناپا تو لاجاتا ہے، اور وہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ سوئی کی ایک نوک پر لاکھوں کی تعداد میں سما جاتے ہیں۔

ذرہ کا مفہوم چاہے جو بھی ہو یہاں مراد سب سے چھوٹا وزن ہے۔

بہر حال یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو آدمی کی پشت میں لمرزہ پیدا کردیتی ہے، اور اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ اس دن حساب و کتاب حد سے زیادہ دقیق اور حساس ہوگا۔ اور قیامت میں ناپ تول کا ترازو اس قدر ظریف ہوگا، کہ وہ انسان کے چھوٹے سے چھوٹے اعمال کا وزن اور اس کا حساب کر لے گا۔

۱۔ ”اذا“ یہاں شرطیہ ہے، اور اس کے بارے میں کہ جزائے شرط کیا ہے کئی احتمال دئے گئے ہیں، بعض اس کی جزا ”یومئذ تحدث اخبارها“ کو سمجھتے ہیں، بعض ”یومئذ یصدر الناس اشتاتاً“ کو، اور بعض نے جزا کو محذوف جانا ہے۔ اس طرح کہ لوگ یہ سوال کرتے تھے کہ متی الساعۃ (قیامت کب واقع گی) تو جواب میں فرمایا: جب وہ عظیم زلزلہ آئے گا، یعنی اس وقت قیامت واقع ہوگی۔

۲۔ پہلی صورت میں اضافت عمومی معنی رکھتی ہے اور دوسری صورت میں عہد کے معنی دیتی ہے۔

۳۔ ”زلزال“ ”زا“ کی زیر کے ساتھ مصدری معنی دیتا ہے اور زلزال (زا کی زیر کے ساتھ) اسم مصدر کے معنی دیتا ہے اور یہ وضع عام طور پر ان افعال میں آتی ہے جو مضاعف کی صورت میں استعمال ہوتے ہیں، مثلاً ”صلصال“ اور ”وسواس“۔

۴۔ ”اثقال“ جمع ہے ”ثقل“ (بروزن فکر) کی جو ”بار“ کے معنی میں ہے، اور بعض نے اسے ”ثقل“ (بروزن عمل) کی جمع سمجھا ہے جو وسائل خانہ یا وسائل مسافر کے معنی میں ہے، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

۵۔ ”نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۶۴۹۔

۶۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱ ص ۵۲۶۔

۷۔ وہی مدرک۔

۸۔ ”لئالی الاخبار“ جلد ۵ ص ۷۹ چاپ جدید۔

۹۔ ”لئالی الاخبار“ جلد ۵ ص ۷۹ چاپ جدید۔

۱۰۔ ”بان“ میں ”باء“ سببیت کے لئے ہے اور لہا میں ”لام“ ”الی“ کے معنی میں ہے کہ جیسا کہ سورہ ”نحل“ کی آیہ ۶۸ میں آیا ہے ”واولئیک الی النحل“

۱: قیامت کے حساب و کتاب میں دقت اور سخت گیری

نہ صرف اس سورہ کی آخری آیات سے، بلکہ قرآن کی مختلف آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں اعمال کی حساب رسی میں حد سے زیادہ دقت اور موشگافیاں ہوں گی۔ سورہ لقمان کی آیہ ۱۶ میں آیا ہے: یا بنیٰ انھا ان تک مثقال جتہ من خردل فتکن فی صخرۃ او فی السماوات او فی الارض یأت بھا اللہ ان اللہ لطیف خبیر: ”اے بیٹے! اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی (نیک یا بد عمل ہوگا) اور وہ پتھر کے اندر یا آسمان یا زمین کے کسی گوشہ میں چھپا ہوا ہوگا، تو خدا (قیامت میں) حساب رسی کے لیے اسے لے آئے گا، بے شک خدا لطیف و خبیر ہے۔

”خردل“ رائی کا دانہ، جو بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے، اور وہ چھوٹے ہونے میں صرف ضرب المثل ہے۔

یہ تعبیریں اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ اس حساب رسی میں چھوٹے چھوٹے کاموں کا بھی محاسبہ ہوگا۔ ضمنی طور پر یہ آیات اس بات کی تنبیہ کرتی ہیں کہ نہ تو چھوٹے گناہوں کو کم اہمیت شمار کریں، اور نہ ہی چھوٹے نیک کاموں کو وہ چیز جس کا خدا حساب لے گا، چاہے کچھ بھی ہو کم اہمیت نہیں ہے۔

اس لیے بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں ہیں جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض صحابہ تھوڑے مال کے خرچ کرنے کے سلسلہ میں بے اعتنا تھے، وہ یہ کہتے تھے کہ اجر و ثواب تو ان چیزوں پر دیا جاتا ہے جنہیں ہم دوست رکھتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی چیزیں ایسی نہیں ہوتیں جن سے ہمیں کچھ لگاؤ اور محبت ہو، اور اسی طرح سے وہ چھوٹے چھوٹے گناہوں کے سلسلہ میں بھی بے اعتنا تھے، لہذا یہ آیات نازل ہوئیں، اور انہیں چھوٹی اور کم خیرات کرنے کی بھی ترغیب دی، اور چھوٹے چھوٹے گناہ کرنے سے ڈرایا۔

۲۔ ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان آیات کے مطابق انسان قیامت میں اپنے اعمال، چاہے وہ اچھے ہوں یا برے، چھوٹے ہوں یا بڑے، دیکھے گا۔ یہ معنی آیات ”اجباط“ و ”تکفیر“ اور آیات ”عفو“ و ”توبہ“ کے ساتھ کیسے سازگار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آیات ”اجباط“ تو یہ کہتی ہیں کہ بعض عمل مثلاً ”کفر“ انسان کی تمام نیکیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ لٰن اشرکت تجبطن عملک (زمرہ۔ ۶۵) اور آیات ”تکفیر“ کے مطابق بعض اوقات نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ ﴿ان الحسنات یذھبن السيئات﴾ (ہود ۱۱۴) اور عفو و توبہ کی آیات یہ کہتی ہیں کہ عفو الہی کے سائے میں۔ یا توبہ کرنے

سے: گناہ محو ہو جاتے ہیں، یہ سارے مفہوم تمام نیک و بد اعمال کا مشاہدہ کرنے کے مسئلہ کے ساتھ کیسے مطابقت کرتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ: وہ دو اصول جو اوپر والی آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ انسان اچھے اور برے کام کا ایک ایک ذرہ تک دیکھے گا، ایک قانون کلی کی صورت میں ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ ہر قانون میں کچھ مستثنیات ہو سکتے ہیں۔ لہذا آیات عفو و توبہ، اور اجابا و تکفیر حقیقت میں اس قانون کلی میں استثناء کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ”اجابا“ و ”تکفیر“ کے سلسلہ میں درحقیقت موازنہ اور ایک عجز و انکسار رونما ہوتا ہے، اور یہ ٹھیک مطالبات اور قرضوں کے مانند ہے، جن میں ایک دوسرے منہا ہو جاتے ہیں، جس وقت انسان اس موازنہ کا نتیجہ دیکھتا ہے تو حقیقت میں اس نے اپنے تمام اچھے اور برے اعمال کو دیکھ لیا ہے۔ یہی بات ”عفو“ و ”توبہ“ میں بھی جاری ہے، کیونکہ عفو لیاقت و شائستگی کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتا، اور توبہ خود ایک نیک عمل ہے۔

بعض نے یہاں ایک اور جواب دیا ہے، جو صحیح نظر نہیں آتا، اور وہ یہ ہے کہ کافر اپنے اچھے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں دیکھ لیں گے، جیسا کہ مومن اپنے برے اعمال کی سزا اسی جہان میں پالیتے ہیں۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ زیر بحث آیات قیامت کے ساتھ مربوط ہیں نہ کہ دنیا کے ساتھ، علاوہ ازیں یہ کوئی کلیہ نہیں کہ ہر مومن و کافر اپنے اعمال کا نتیجہ دنیا میں دیکھے۔

۳۔ قرآن کی سب سے زیادہ جامع آیات

عبداللہ بن مسعود (رض) سے نقل ہوا ہے کہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ محکم آیات ”من یعمل مثقال ذرۃ خیراً میرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شراً میرہ“ ہی ہیں۔ اور وہ انہیں ”جامعہ“ سے تعبیر کیا کرتے تھے، اور سچی بات یہ ہے کہ ان کے مطالب پر گہرا ایمان، اس بات کے لیے کافی ہے کہ انسان کو راہ حق پر چلائے اور ہر قسم کی فساد و شر سے روکے۔ اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی: ”علمنی مما علمک اللہ“ جو کچھ خدا نے آپ کو تعلیم دی ہے اس میں سے مجھے بھی تعلیم دیجئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اپنے اصحاب میں سے ایک کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اسے قرآن کی تعلیم دے۔ اور اس نے اسے سورہ اذا زلزلت الارض کی آخر تک تعلیم دی۔ وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا: میرے

لیے تو یہی کافی ہے۔ (اور ایک اور دوسری روایت میں آیا ہے کہ اس نے کہا: ”تکفینی هذه الآية“ ”یہی ایک آیت میرے لیے کافی ہے۔) پیغمبر اکرم نے فرمایا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ ایک مرد فقیہ ہو گیا ہے۔ (اور ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: ”رجع فقیھا“ وہ فقیہ ہو کر لوٹا ہے) اس کی وجہ بھی واضح ہے، کیونکہ جو شخص یہ جانتا ہو کہ ہمارے اعمال، چاہے ایک ذرہ کے برابر ہوں، یا رائی کے ایک دانہ کے برابر، ان کا حساب لیا جائے گا، تو وہ آج ہی سے اپنے حساب و کتاب میں مشغول ہو جائے گا اور اس کا اس تربیت پر سب سے زیادہ اثر ہوگا۔ ۱

اس کے باوجود ”ابو سعید خدری“ سے آیا ہے کہ جس وقت آیہ فمن يعمل نازل ہوئی تو میں نے عرض کیا: اے رسول خدا کیا میں اپنے تمام اعمال کو دیکھوں گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں میں نے کہا: ان بڑے بڑے کاموں کو؟ فرمایا: ہاں میں نے کہا: چھوٹے چھوٹے کام بھی؟ فرمایا: ہاں! میں نے کہا: وائے ہو مجھ پر، میری ماں میری عزائمیں بیٹھے، فرمایا: اے ابو سعید! تجھے بشارت ہو، کیونکہ نیکیاں دس گناہ شمار ہوں گی، جو سات سو تک ہو سکتی ہیں اور خدا جس چیز کے لیے چاہے گا اس سے بھی کئی گناہ کر دے گا لیکن ہر گناہ کے لیے صرف ایک ہی گناہ کی سزا ملے گی، یا خدا معاف کر دے گا، اور جان لے کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے نجات نہیں پائے گا (مگر یہ کہ خدا کا کرم اس کے شامل حال ہو) میں نے عرض کیا: اے رسول خدا کیا آپ بھی؟ فرمایا: ہاں میں بھی مگر یہ کہ خدا مجھے اپنی رحمت کا مشمول قرار دے۔ ۲

خدا وندا! جب تیرا پیغمبر اس عظمت و بزرگی کے باوجود صرف تیری بخشش اور عفو پر دل بستہ ہے تو پھر ہماری حالت تو واضح ہے۔

پروردگار! اگر ہمارے اعمال ہماری نجات کا معیار ہوں تو وائے ہے ہماری حالت پر، اور اگر تیرا کرم ہمارا یار و مددگار ہو تو پھر خوشحال ما۔

بار الہا! جس دن ہمارے سارے چھوٹے بڑے گناہ ہمارے سامنے مجسم ہو جائیں گے، اس دن کے لیے ہم صرف تیرے ہی لطف و کرم پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

آمین یا رب العالمین

۱۔ ”تفسیر روح البیان“ جلد ۱۰ ص ۴۹۵۔ یہی مضمون ”نور الثقلین“ جلد ۶۰ میں بھی آیا ہے۔

۲۔ ”در المنثور“ جلد ۶ ص ۳۸۱۔

سورہ الغدیت

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اس میں ۱۱ آیات ہیں

سورہ العادیات کے مطالب

اس برے میں کہ یہ سورہ مکہ “میں نازل ہوا، یا مدینہ“ میں مفسرین کے درمیان شدید اختلاف ہے۔ بہت سوں نے تو اسے مکی شمار کیا ہے جب کہ ایک جماعت اسے مدنی سمجھتی ہے آیات کے مقطع کا مختصر اور چھوٹا ہونا اور قسموں پر تکیہ، اور اسی طرح مسئلہ معاد کے بارے میں بیان ایسے قرائن ہیں جو اس کے مکی ہونے کی تاکید کرتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف سے اس سورہ کی قسموں کا مضمون، جہاد کے مسائل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، جیسا کہ انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا، اسی طرح وہ روایات جو کہتی ہیں کہ یہ سورہ جنگِ ذات السلاسل کے بعد نازل ہوا ہے۔

(یہ وہ جنگ ہے جو ہجرت کے آٹھویں سال واقع ہوئی تھی، اور اس میں کفار کے بہت سے گروہ قیدی بنائے گئے تھے، اور انہیں محکم رسیوں سے باندھا گیا تھا، لہذا اس کا نام ذات السلاسل ہو گیا، جس کی تفصیل انشاء اللہ آیات کی تفصیل میں آئے گی)۔

یہ اس سورہ کے مدنی ہونے پر گواہ ہے، یہاں تک کہ اگر ہم اس سورہ کے آغاز کی قسموں کو حاجیوں کے منی و مشعر کی طرف جانے پر ناظر سمجھیں، تب بھی یہ مدینہ ہی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مراسم حج اپنی اکثر فروع کے ساتھ زمانہ جاہلیت کے عربوں میں بھی۔ سنتِ ابراہیمی کی اقتداء کرنے کی وجہ سے رواج رکھتے تھے لیکن وہ خرافات کے ساتھ ایسے آلودہ ہو چکے تھے کہ یہ بات بعید نظر نہیں آتی ہے کہ قرآن نے ان کی قسم کھائی ہو۔

ان تمام جہات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم اس کے مدنی ہونے کو ترجیح دیتے ہیں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے سورہ کے مطالب بھی واضح ہو گئے ہیں۔ کہ آغاز میں کچھ بیدار کرنے والی قسموں کا ذکر کرتا ہے۔ اور اس کے بعد

نوع انسان کی چند کمزوریوں، مثلاً بخل اور دنیا پرستی کو درمیان میں لے آتا ہے، اور انجام کار مسئلہ معاد پر ایک مختصر اور گویا اشارے اور بندوں پر خدا کے علمی احاطہ پر سورہ کو ختم کرتا ہے

اور اس کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے:

”من قرأھا اعطی من الاجر عشر حسنات، بعد من بات بالمزوفلہ، و شہد جمعاً:

”جو شخص اس کی تلاوت کرے گا تو ان تمام حاجیوں کی تعداد (جو عید قربان کی رات) ”مزدلفہ“ میں توقف کرتے ہیں، اور وہاں حاضر رہتے ہیں، دس گنا زیادہ نیکیاں اسے دی جائیں۔“^(۱)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام آیا ہے:

”من قرأھا والعاذیات و ادمن قرائتھا بعثہ اللہ مع امیر المومنین (سلام اللہ علیہ) یوم القیامۃ خاصہ، و کان فی حجرہ ورفقائہ:

”جو شخص سورہ والعاذیات کو پڑھے گا، اور اس کی مداومت کرے گا، تو خدا اسے قیامت کے دن خصوصیت کے ساتھ امیر المومنین (سلام اللہ علیہ) کے ہمراہ مبعوث کرے گا، اور وہ آپ کی جماعت میں اور آپ کے دوستوں کے درمیان ہوگا۔“^(۲)

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورہ والعاذیات نصف قرآن کے برابر ہے۔^(۳)

یہ بات کہے بغیر ظاہر و واضح ہے کہ یہ تمام فضیلتیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو اس کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنالیں گے، اور اس کے تمام مطالب و مضامین پر ایمان رکھیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱

﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم﴾

۱۔ ﴿و العاذیات ضبحاً﴾ - ۲۔ ﴿فالموریات قدحاً﴾ - ۳۔ ﴿فالمغیرات صبحاً﴾ - ۴۔ ﴿فائرثن بہ نقعاً﴾ - ۵۔ ﴿فوسطن بہ جمعاً﴾۔

۶۔ ﴿انّ الانسان لربہ لکنود﴾ - ۷۔ ﴿و انّہ علی ذلک لشہید﴾ - ۸۔ ﴿و انّہ لحب الخیر لشدید﴾۔

۹۔ ﴿افلا یعلم اذا بعثر مافی القبور﴾ - ۱۰۔ ﴿و حُصل مافی الصدور﴾ - ۱۱۔ ﴿انّ ربهم بهم یومئذٍ لخبیر﴾۔

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

۱۔ ان فراٹے بھرتے ہوئے سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم (جو میدان جہاد کی طرف پیش رفت کرتے ہیں)۔

۲۔ اور ان کی قسم جو (اپنے سموں سے پتھروں پر ٹاپ مارتے ہوئے) چنگاریاں نکالتے ہیں۔

۳۔ اور صبح ہوتے ہی دشمن پر یلغار کر دیتے ہیں۔ ۴۔ اور اس سے ہر طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار کر دیتے ہیں۔

۵۔ اور یکا یک دشمن کے دل بادل میں گھس جاتے ہیں۔ ۶۔ بیشک انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کے سامنے ناشکرا اور بخیل ہے۔

۷۔ اور وہ خود بھی اس معنی پر گواہ ہے۔ ۸۔ وہ مال کے ساتھ شدید لگاؤ اور محبت رکھتا ہے۔

۹۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ اس دن جو بھی قبروں میں ہیں وہ سب زندہ ہو جائیں گے۔

۱۰۔ اور جو کچھ سینوں کے اندر (چھپایا ہوا) ہے، وہ آشکار اور ظاہر ہو جائے گا۔ ۱۱۔ اس دن ان کا پروردگار ان سے مکمل طور پر باخبر ہے۔

شان نزول

ایک حدیث میں آیا ہے کہ یہ سورہ جنگ ”ذات السلاسل“ کے بعد نازل ہوا، اور اس کا واقعہ اس طرح ہے۔

ہجرت کے آٹھویں سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی کہ بارہ ہزار سوار سرزمین ”یالیس“ میں جمع ہیں، اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ یہ عہد کیا ہے کہ جب تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کو قتل نہ کریں اور مسلمانوں کی جماعت کو منتشر نہ کر دیں آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔

پیغمبر اکرم نے اپنے اصحاب کی ایک بہت بڑی جماعت کو بعض صحابہ کی سرگردگی میں اس کی جانب روانہ کیا، لیکن وہ کافی گفتگو کے بعد بغیر کسی نتیجہ کے واپس لوٹ آئے۔

آخر کار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی السلام کو مہاجرین و انصار کے ایک گروہ کثیر کے ساتھ ان سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ دشمن کے علاقہ کی طرف روانہ ہونے اور رات بھر میں سارا سفر طے کر کے

صبحدم دشمن کو اپنے محاصرہ میں لے لیا۔ پہلے تو ان کے سامنے اسلام کو پیش کیا۔ جب انہوں نے قبول نہ کیا تو ابھی فضا تاریک ہی تھی کہ ان پر حملہ کر دیا اور انہیں درہم برہم کر کے رکھ دیا، ان میں سے کچھ کو قتل کیا، ان کی عورتوں کو اسیر کر لیا اور بکثرت مال غنیمت کے طور پر حاصل کیا۔

سورہ ”والعادیات“ نازل ہوئی حالانکہ ابھی سربازانِ اسلام مدینہ کی طرف لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ پیغمبر خدا اس دن نماز صبح کے لیے آئے تو اس سورہ کی نماز میں تلاوت کی۔ نماز کے بعد صحابہ نے عرض کیا، یہ تو ایسا سورہ ہے جسے ہم نے آج تک سنا نہیں ہے۔

فرمایا: ہاں! علی علیہ السلام دشمنوں پر فتح یاب ہوئے ہیں اور جبریل نے گزشتہ رات یہ سورہ لا کر مجھے بشارت دی ہے

کچھ دن کے بعد علی علیہ السلام غنائم اور قیدیوں کے ساتھ مدینہ میں وارد ہوئے۔^(۴)
بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ واقعہ اس سورہ کے واضح مصداق میں سے ایک ہے۔ یہ اس کا شانِ نزول نہیں ہے۔

۱۔ ”جمع“ و ”مشعر الحرام“ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اس بناء پر کہ لوگ وہاں جمع ہوتے ہیں، یا وہاں نماز مغرب و عشاء فاصلہ کے بغیر پڑھی جاتی ہے۔

۲۔ ”مجمع البیان“ آغاز سورہ عادیات جلد ۱۰ ص ۴۲۱۔

۳۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۲۷۔

۴۔ ”بحار الانوار“ جلد ۲۱ ص ۶۶ سے آگے، ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۲۸ اور بعض دوسری کتب تاریخ۔

بیدار مجاہدین کی قسم

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورہ بیدار کرنے والی قسموں سے شروع ہوا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: ”ان فرائے بھرے ہوئے سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم (جو میدان جہاد کی طرف پیش رفت کرتے ہیں)۔ ﴿وَالْعَادِيَاتِ صَبْحًا﴾^(۲) یا حاجیوں کے ان اونٹوں کی قسم جو ہانپتے ہوئے سرزمین عرفات سے مشعر الحرام سے مشعر سے منیٰ کی طرف چلتے ہیں۔

”عادیات“ ”عادیہ“ کی جمع ہے، جو عدو“ (بروزن صبر) کے مادہ سے ہے، اصل میں گزرنے اور جدا ہونے کے معنی میں ہے، چاہے دل سے ہو، جسے ”عداوت“ کہتے ہیں، یا خارجی حرکت اور چلنے سے ہو جسے ”عدو“ (دوڑنا) کہتے ہیں، اور کبھی یہ معاملات میں ہوتی ہے۔ جسے ”عدوان“ کہتے ہیں، اور یہاں وہی سرعت اور تیزی کے ساتھ دوڑنا مراد ہے۔ ”ضبح“ (بروزن مدح) تیزی اور سرعت کے ساتھ دوڑنے والے کے سانس کی آواز کے معنی میں ہے جو اس کے دوڑنے کے وقت کانوں میں آتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اس آیت کی تفسیر میں دو نظریے موجود ہیں۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ اس سے مراد ان اونٹوں کی قسم ہے جو حج حیمے عظیم فریضہ میں موافقت اور اماکن مقدس میں سرعت اور تیزی کے ساتھ چلتے ہیں، اس بناء پر وہ ایک تقدس کے حامل بن جاتے ہیں اور قسم کے لائق ہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ”ابن عباس (رض)“ سے روایت ہے کہ، انہوں نے فرمایا: ”میں خانہ کعبہ کے پاس حجر اسماعیل میں تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے آیہ ”والعادیات ضبحاً“ کے بارے میں میں مجھ سے سوال کیا“ میں نے کہا: ”اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو راہ جہاد میں حملہ کرتے ہیں اور رات کو اپنے آرام کرنے جگہ پر لوٹ جاتے ہیں، اور وہ غازی لڑنے والے مجاہدین ہیں جو آگ روشن کرتے ہیں اور اپنے لیے کھانا پکاتے ہیں۔“

وہ شخص میرے پاس سے چلا گیا اور علی علیہ السلام کے پاس پہنچا، آپ اس وقت چاہ زمزم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے آپ سے بھی اس آیت کے بارے میں سوال کیا۔

آپ نے فرمایا: کیا تو نے مجھ سے پہلے بھی کسی شخص سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا ہے؟ اس نے عرض کیا: ہاں! میں نے ابن عباس سے پوچھا ہے اور انہوں نے کہا ہے اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو راہ جہاد میں حملہ کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: جاو اور اسے میرے پاس بلاؤ۔

جب میں حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں آیا تو آپ نے فرمایا: جو بات تم نہیں جانتے اس کے بارے میں لوگوں کو فتوے کیوں دیتے ہو۔ اسلام میں سب سے پہلا غزوہ جنگِ بدر تھا، اور ہمارے پاگھوڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک گھوڑا ”زبیر“ کے پاس اور دوسرا گھوڑا ”مقداد“ کے پاس تو ”عادیات“ سے مراد گھوڑے کیسے ہو سکتے ہیں؟ ایسا نہیں ہے۔ اس سے مراد اونٹ ہیں جو عرفات سے مشعر کی طرف اور مشعر سے منیٰ کی طرف جاتے ہیں۔ ابن عباس (رض) کہتے ہیں: جب میں نے یہ سنا تو میں نے اپنا نظریہ بدل لیا اور امیر المومنین علی علیہ السلام کے نظریہ کو قبول کر لیا۔^(۲) یہ احتمال بھی ہے کہ ”عادیات“ ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ لہذا یہ مجاہدوں کے گھوڑوں کو شامل ہے اور حاجیوں کے اونٹوں کو بھی، اور اوپر والی روایت سے مراد یہ ہو کہ اس کے معنی کو گھوڑوں میں محدود نہیں کرنا چاہئیے کیونکہ یہ معنی تمام مقامات پر صادق آتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ واضح مصداق حاجیوں کے اونٹ ہیں۔ یہ تفسیر کئی جہات سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”قسم ہے ان کی جو آگ کی چنگاریاں نکالتے ہیں“۔ ﴿فَالْمُورِيَاتُ قَدْحًا﴾۔

مجاہدین کے وہ گھوڑے جو میدان جنگ کی طرف اتنی تیزی کے ساتھ جاتے ہیں کہ ان کے سموں کے پتھروں پر ٹکرانے سے چنگاریاں نکلتی ہیں، یا وہ اونٹ جو سرعت کے ساتھ مواقفِ حج میں دوڑتے ہیں اور ان کے پاؤں کے نیچے سے کنکریاں اور ریت اڑتی ہے اور ان کے دوسرے سنگریزوں کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ یا وہ قبیلے اور گروہ جو مواقفِ حج میں کھانا پکانے کے لئے آگ جلاتے ہیں، یا ان لوگوں سے کنایہ ہے جو جنگ اور جہاد کی آگ بھڑکاتے ہیں یا ان زبانوں کی طرف اشارہ ہے جو اپنے چبھنے والے بیان سے دشمن کے دل میں آگ لگا دیتے ہیں، یا بعض مفسرین کے قول کے مطابق اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی حاجات کو انجام دینے کے لیے کوشش کرتے ہیں اور اپنا مقصود حاصل کر لیتے ہیں جیسے کہ آگ چقماق کے پتھر سے باہر آتی ہے۔ لیکن یہ سارے احتمالات بعید نظر آتے ہیں اور آیت کا ظاہر وہی پہلی دو تفاسیر ہیں۔ ”موریات“ ”ایراء“ کے مادہ سے ”موریہ“ کی جمع ہے جو آگ بھڑکانے

کے معنی میں ہے اور ”قدح“ چنگاری نکالنے کے لیے پتھر یا لکڑی یا لوہے یا چقماق کو ایک دوسرے پر مارنے کے معنی میں ہے۔

اس کے بعد تیسری قسم میں فرماتا ہے: ”اور صبح ہوتے ہی دشمن پر حملہ کرنے والوں کی قسم“ (فالمغیرات صبحاً)۔ عربوں کی عادت۔ جیسا کہ طبرسی نے مجمع البیان میں لکھا ہے۔ یہ تھی کہ وہ رات کے وقت دشمن کے علاقے کے قریب جا کر گھات میں بیٹھ جاتے تھے تاکہ صبح سویرے ان پر حملہ کر دیں۔

ان آیات کی شان فزول (یا اس کے ایک واضح مصداق) میں یہ آیا ہے کہ لشکر اسلام علی علیہ السلام کی کمان میں رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میدان کی طرف بڑھتا چلا گیا اور دشمن کے قبیلہ کے قریب پہنچ کر گھات لگا کر بیٹھ گیا اور صبح سویرے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان پر حملہ کر دیا، اور دشمن کے رد عمل دکھانے سے پہلے پہلے ان کی طاقت کو درہم برہم کر دیا۔

اور اگر ہم ان قسموں کو حاجیوں کے اونٹوں کی طرف اشارہ سمجھیں تو پھر اس آیہ سے مراد اونٹوں کے قافلوں کا عید کی صبح مشعر سے منیٰ کی طرف دوڑتے ہوئے آنا ہے۔

”مغیرات“ ”اغارة“ کے مادہ سے ”مغیرۃ“ کی جمع ہے، جو ہجوم کرنے اور دشمن پر حملہ کرنے کے معنی میں ہے۔ چونکہ بعض اوقات یہ ہجوم اور حملہ مال لوٹنے کی غرض سے ہوتا ہے لہذا یہ لفظ بعض اوقات فارسی میں عام معنی یعنی غارت کرنے اور دوسروں کا مال چھیننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس لفظ کے مادہ میں گھوڑے کے ساتھ ہجوم اور حملہ کرنا چھپا ہوا ہے، لیکن اس کے مواد استعمال اچھی طرح اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اگر ابتداء میں یہ قید موجود تھی بھی تو تدریجاً اب ختم ہو گئی ہے۔

اور یہ جو بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہاں ”مغیرات“ سے مراد وہ ہجوم کرنے والے طوائف و قبائل ہیں جو میدان جنگ کی طرف، یا عجلت اور تیزی کے ساتھ منیٰ کی طرف چلتے ہیں، بعید نظر آتا ہے کیونکہ آیہ ”و العادیات ضبحاً“ یقینی طور پر گھوڑوں یا اونٹوں کی توصیف ہے نہ کہ ان کے سواروں کی، اور یہ آیت بھی اسی مطلب کی جاری رکھے ہوئے ہے۔

اس کے بعد ان مجاہدوں کی سواریوں کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: ”دشمن پر اس قدر تیزی کے ساتھ دوڑ جاتے ہیں کہ جس کی وجہ سے ہر طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار کمر دیتے ہیں۔“ ﴿فَاثْرَنَ بِهِ نَفْعًا﴾۔ (۳)

یہ کہ حاجیوں کے اونٹوں کے مشعر سے منی کی طرف ہجوم کے زیر اثر ہر طرف سے گرد و غبار اٹھتا ہے۔ ”اثرن“ ”اثرہ“ کے مادہ سے ”غبار“ یا ”دھوئیں“ کو پرانہ کرنے کے معنی میں ہے۔ اور بعض اوقات ہیجان میں لانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اسی طرح فضا میں آواز کی لہروں کے پھیلنے کے معنی آیا میں ہے۔ نفع بروزن (نفع) غبار کے معنی میں ہے اور اس مادہ کی اصل پانی کے نیچے چلے جانا، یا کسی کے پانی کے نیچے چلے جانے کے معنی میں ہے اور چونکہ ”غبار“ میں ڈوب جانا بھی اس سے مشابہت رکھتا ہے لہذا اس لفظ کا اس پر اطلاق ہوا ہے ”نفع“ ساکن اور کھڑے ہوئے پانی کو کہا جاتا ہے۔

ان کی خصوصیات میں سے آخری خصوصیات کے بارے میں فرماتا ہے: ”وہ اسی صبح دشمن کے درمیان پہنچ گئے۔“ ﴿فَسُوْطَنَ بِهِ جَمْعًا﴾۔ (۴)

انہوں نے غفلت کی حالت میں دشمن پر ایسی برق رفتاری کے ساتھ حملہ کیا کہ چند ہی لمحوں کے اندر صفوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا، ان کے قلب لشکر پر حملہ کر کے ان کی جمیعت کو تتر بتر کر دیا اور یہ اسی سرعتِ عمل، بیداری، آمادگی، شہامت اور شجاعت کا نتیجہ ہے۔

یہ حاجیوں کے ”مشعر“ سے ”منی“ میں ورود کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد دشمن کو محاصرہ میں لے لینا ہے۔ لیکن یہ تفسیر اسی صورت میں صحیح ہوگی جب ”فوسطن“ کا جملہ ”سین“ کی تشدید کے ساتھ پڑھا جائے جب کہ مشہور قرأت اس طرح نہیں ہے۔ اس بناء پر صحیح وہی پہلی معنی ہی ہے۔

مجموعی طور پر اس سارے مضمون کو یکجا کر کے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان مذکورہ گھوڑوں کی قسم جو پہلے تو بڑی سرعت کے ساتھ فراٹے بھرتے، سانس نکالتے، میدانِ جہاد کی طرف پیش رفت کرتے ہیں، پھر ان کی سرعت میں ایسی تیزی آتی ہے کہ پتھروں پر ان کے سموں کی ٹاپوں سے چنگاریاں نکلتی ہیں، جو رات کی تاریکی کو چیر دیتی ہیں اور اس کے بعد جب وہ دشمن کے علاقے میں پہنچ جاتے ہیں تو ابھی وہ غفلت میں ہی ہوتے ہیں کہ فضا کے صاف اور روشن ہوتے ہی

ان پر حملہ کر دیتے ہیں، ایسا حملہ، جس سے فضا میں گرد و غبار چھا جاتا ہے، اور انجام کار وہ دشمن کی جمیعت کے قلب میں وارد ہو کر ان کی صفوں کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔

ان طاقتور اور پر قدرت گھوڑوں کی قسم
ان شجاع اور بہادر سواروں کی قسم
مجاہدین کے گھوڑوں کی فراٹے بھرنے کی قسم
ان کی چنگاریوں کی قسم جو ان کے سموں سے نکلتی ہیں۔
غفلت کی حالت میں ان کے حملے کی قسم
گرد و غبار کے ان ذرات کی قسم جو فضا میں پھیل جاتے ہیں۔

اور انجام کار ان کے دشمن کی صفوں کے قلب میں وارد ہو کر انہیں درہم برہم کر کے فتح یاب ہونے کی قسم۔
اگرچہ وہ تمام باتیں جو بیان کی گئی ہیں وہ ان قسموں کے معنی میں نہیں آتی ہیں، لیکن کلام کی ضمنی دلالت میں یہ سب جمع ہیں۔

اور یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاد اس قدر عظمت رکھتا ہے کہ مجاہدین کے گھوڑوں کا فراٹے بھرنا اور سانس لینا تک بھی لائق قسم ہے۔

اسی طرح پتھروں پر ان کی ٹاپوں سے نکلنے والی چنگاریاں اور اسی طرح وہ گرد و غبار جو فضا میں اڑاتے ہیں، ہاں! ہاں! میدان جہاد کا گرد و غبار بھی قابل قدر اور عظمت ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان قسموں سے مراد احتمالاً وہ نفوس ہیں جو اپنے کمالات کو دوسروں کی طرف منتقل کر سکیں اور اپنے افکار سے علم و دانش کی چنگاریاں نکالیں اور ہوا و ہوس پر حملہ آور ہوں اور اپنے اندر اور دوسروں میں خدا کا شوق پیدا کریں۔ اور انجام کار ساکنین علین کے قلب میں مقام حاصل کریں۔^(۵)

لیکن یہ بات واضح ہے کہ ان باتوں کو اوپر والی آیات کی تفسیر کے عنوان سے قبول نہیں کیا جاسکتا، یہ وہ تشبیہات ہیں جو آیت کی تفسیر سے مناسبت کی وجہ سے ذہن میں آتی ہیں۔

ان عظیم قسموں کے بعد، یعنی وہ چیز جس کے لیے قسمیں کھائی گئی ہیں، پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”بیشک انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کے بارے میں ناشکرا اور بخیل ہے“۔ ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ﴾۔

وہی غیر تربیت یافتہ انسان وہی انسان جس کے دل پر معارف الہی اور انبیاء کی تعلیمات کے انوار نہیں چمکے، اور وہی انسان جس نے خود کو خواہشاتِ نفسانی اور سرکش شہوتوں کا تابع بنا لیا ہے، یقیناً وہ ”ناشکرا“ اور بخیل“ ہے۔

”کنود“ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز نہیں اگتی۔ ناشکرے اور بخیل انسان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

مفسرین نے کنود کے لیے بہت سے معنی بیان کیے ہیں۔ ”ابو الفتوح رازی“ نے تقریباً پندرہ معانی اس سلسلہ میں نقل کیے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر اسی اصل معنی کے شاخ و برگ ہیں جو اوپر بیان ہوا ہے۔ مزید معانی یہ ہیں:

۱۔ کنود اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی مصیبتوں کو تو بڑھا چڑھا کر بیان کرے لیکن نعمتوں کو بھول جائے۔

۲۔ کنود اس شخص کو کہتے ہیں جو خدا کی نعمتوں کو اکیلا ہی کھاتا ہے اور دوسروں کو روکتا ہے۔ جیسے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے: ”اتدرون من الکنود“

”کیا تم جانتے ہو کہ کنود کسے کہتے ہیں؟“!

لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں، تو آپ نے فرمایا:

”الکنود الذی يأکل وحده، ویمنع رفقہ یضرب عبده“

۲۔ کنود اس شخص کو کہتے ہیں جو اکیلے ہی اکیلے کھاتا ہے اور دوسروں سے عطا و بخشش کو روکتا ہے اور اپنے ماتحت

غلاموں کو مارتا ہے۔“ (۴)

۳۔ کنود وہ شخص ہے جو مشکلات و مصائب میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہمدردی نہیں کرتا۔

۴۔ کنود وہ ہے جس کی نیکیاں بہت ہی کم ہوں۔

۵۔ کنود اس شخص ہے کہ جب اسے کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ اسے دوسروں کو نہیں دیتا اور اگر کسی مشکل میں گرفتار

ہو جائے تو بے صبری دکھاتا اور بہت گرگڑاتا ہے

۶۔ کنود وہ شخص ہے جو اللہ کی نعمتوں کو معصیت میں صرف کرتا ہے۔

۷۔ کنود وہ شخص ہے جو اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، یہ سب معانی اسی ناشکری اور بخل کی شاخ و برگ اور مصادیق ہیں۔

ایسے موارد میں ”انسان“ کی تعبیر، بدکار، ہوا پرست، سرکش اور باغی انسانوں کے معنی میں ہے، اور بعض نے اس

کی کافر انسان سے تفسیر کی ہے ورنہ یقیناً ہر انسان ایسا نہیں ہے کیونکہ بہت سے انسان ایسے ہیں کہ جن کی روح میں شکر

گزاری اور عطا و بخشش گندھی ہوئی ہے، اور وہ ناشکری اور بخل سے بیزار ہیں۔ اسی طرح وہ انسان جنہوں نے اللہ پر ایمان کے سائے میں خود خواہی اور خود پرستی کو چھوڑ دیا ہے، اور پروردگار کے اسماء و صفات کی معرفت اور اخلاق الہی کی فضا میں آسمان پر بلند پروازی کر رہے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اور وہ خود بھی اسی معنی پر گواہ ہے“۔ ﴿وَ اِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِيدٌ﴾۔ کیونکہ انسان اپنے نفس کے بارے میں اچھی طرح آگاہ ہے اور اگر وہ اپنی اندرونی صفات کو ہر شخص سے چھپا سکتا ہو تو خدا اور اپنے وجدان سے مخفی نہیں رہ سکتا، چاہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ”انہ“ کی ضمیر ”خدا“ کی طرف لوٹتی ہے، یعنی خدا انسان میں کنود کی صفت کے وجود کا گواہ ہے۔

لیکن قبل و بعد کی آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جن میں اس سے مشابہ ضمیریں انسان کی طرف لوٹتی ہیں، یہ احتمال بہت ہی بعید نظر آتا ہے، اگرچہ بہت سے مفسرین نے اس تفسیر کو ترجیح دی ہے۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کی اپنے گناہوں اور عیوب پر قیامت میں گواہی دینا ہے، جیسا کہ قرآن کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

اس تفسیر کے لیے بھی یہاں کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو اس دنیا میں بھی اس کے کفران اور بخل پر گواہی کو شامل ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات انسان اپنی شناخت سے عاجز ہو جاتا ہے، اور اصطلاح کے مطابق اپنے وجدان کو دھوکا دیتا ہے اور شیطانی آرائش و زیبائش اس کی مذموم صفات کو اس کی نظر میں خوب صورت بنا کر جلوہ گر کر دیتی ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ کفران و بخل کے بارے میں مطلب اس قدر واضح ہے کہ اس کی پردہ پوشی نہیں کی جاسکتی اور اپنے وجدان کو دھوکا نہیں دے سکتا۔

بعد الی آیت میں مزید کہتا ہے: وہ مادی چیزیں اور مال سے شدید لگاؤ اور محبت رکھتا ہے“۔ ﴿وَ اِنَّهٗ لَحَبِ الْخٰیْرِ

لَشَدِیدٌ﴾۔ (۷)

اور مال و دولت کے ساتھ اس کا یہی شدید اور اکثریت سے لگاؤ اس کے بخل، ناشکری اور کفران کا سبب بن جاتا

ہے۔

البتہ ”خیر“ ایک ایسا وسیع معنی رکھتا ہے، جو ہر قسم کی نیکی کو شامل ہے۔ اور یقینی طور پر بہت سی نیکیوں اور اچھی چیزوں مثلاً علم و دانش، تقویٰ اور بہشت و سعادت سے لگاؤ اور محبت کوئی ایسا مذموم مطلب نہیں ہے کہ قرآن اوپر والی تعبیر کے ساتھ اس کی مذمت کرے۔

اسی لیے اس کی یہاں ”مال“ کے معنی سے تفسیر کی ہے، جس پر قرینہ مقام اور گزشتہ آیت بھی گواہ ہے، اور قرآن کی بعض دوسری آیات بھی، اس کی گواہی دیتی ہیں)۔ مثلاً بقرہ کی آیہ ۱۸۰، جس میں فرماتا ہے: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ أَنْ تَرَكَ خَيْرًا لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ﴾ ”تم پر فرض ہے کہ اگر تم میں سے کوئی کچھ مال چھوڑ جائے تو وہ باپ، ماں اور نزدیکوں کے لئے وصیت کرے۔“

مسئلہ طور پر ”مال“ پر خیر کا اطلاق اس بنا پر ہے کہ مال اپنی ذات کی حد تک اچھی چیز ہے۔ اور وہ انواع و اقسام کی نیکیوں کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن ناشکرا اور بخیل انسان اس کو اس کے اصلی ہدف سے روک کر خود پسندی اور خود غرضی کی راہ میں استعمال کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک استفہام انکاری کی صورت میں جو تہدید کے ساتھ توأم ہے، فرماتا ہے: ”کیا یہ ناشکرا، بخیل اور دنیا پرست انسان یہ نہیں جانتا کہ جب وہ سب کے سب جو قبروں میں ہیں، زندہ و جائیں گے“۔ ﴿أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ﴾۔ اور جب وہ تمام چیزیں جو سینوں میں ہیں، جیسے کفر و ایمان، اخلاص و ریا، تکبر و غرور، تواضع و انکسار اور اچھی اور بری نیتیں، سب آشکار ہو جائیں گی“۔ ﴿وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ﴾۔

”اس دن پروردگار ان سے اور ان کے اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے“۔ اور اس کے مطابق ہی انہیں جزا و سزا دے گا۔ ﴿إِنَّ رَحْمَہُمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ﴾۔

”بعثر“ ”بعثرة“ (بروزن منقبتہ) کے مادہ سے اصل میں زیر و زمر کرنے، باہر نکالنے اور استخراج کرنے کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ مردوں کو زندہ کرنے کے وقت قبریں زیر و زبر ہوں گی، اور جو کچھ ان میں ہے وہ ظاہر ہو جائے گا، لہذا اوپر والی آیات میں یہ تعبیر قیامت کے بارے میں استعمال ہوئی ہے۔

”﴿مافی القبور﴾“ کی تعبیر (اس بات کی طرح توجہ کرتے ہوئے کہ ”ما“ عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آیات ہے) یا تو اس بناء پر ہے کہ اس میں یہ بات مد نظر ہے کہ مردے ابھی مٹی ہیں، یا یہ اس ابہام کی بناء پر ہے جو اس پر حاکم ہے کہ معلوم نہیں کون سے اشخاص ہیں؟

”قبر“ (قبروں) کی تعبیر اس سے کوئی منافات نہیں رکھتی کہ لوگوں کا ایک گروہ اصولاً قبر نہیں رکھتا مثلاً وہ لوگ دریا میں ڈوب جائیں، یا ان کی قبر ایک مدت کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور ان کی مٹی بکھر جاتی ہے کیونکہ ان لوگوں کی اکثریت مد نظر ہے جو قبر رکھتے ہیں علاوہ ازیں ممکن ہے کہ قبر یہاں ایک وسیع معنی رکھتی ہو، یعنی وہ جگہ جہاں لوگوں کی مٹی موجود ہو اگرچہ وہ عام قبر کی صورت میں نہ ہو۔

”حاصل“ تحصیل کے مادہ سے اصل میں ”چھلکے“ سے ”مغز“ کو نکالنے کے معنی میں ہے۔ اسی طرح معادن کو صاف کرنے اور سونے وغیرہ کو کان کے پتھر سے نکالنے پر بولا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ایک وسیع معنی یعنی مطلق استخراج کرنے اور الگ کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا، اور زیر بحث آیت میں اس خیر و شر اور نیکی و برائی کو جدا کرنا مراد ہو، جو دلوں میں چھپی ہوئی ہے چاہے وہ ایمان و کفر ہو، یا صفات حسنہ و رذیلہ، یا اچھی اور بری نیتیں، وہ سب کی سب اس دن ایک دوسرے سے جدا اور ظاہر و آشکار ہو جائیں گی۔ اور ہر شخص کو ان کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔

جیسا کہ سورہ طارق کی آیہ ۹ میں آیا ہے: یوم تبلی السرائر: ”اس دن سارے اندرونی بھید ظاہر و آشکار ہو جائیں گے۔“ ”یومئذ“ کی تعبیر اور اس معنی پر تکیہ کہ خدا ”اس دن“ ان کے اعمال اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے آگاہ ہو گا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا ہمیشہ ان مسائل سے آگاہ ہے، اس بناء پر ہے کہ وہ دن روز جزا ہے، اور وہ انہیں ان کے اعمال و عقائد کی جزا دے گا۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق اس تعبیر کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص دوسرے سے تہدید کے طور پر کہے ساعر ف لک امرک میں عنقریب تجھے تیرے عمل کا تعارف کراؤں گا۔“ حالانکہ آج بھی اس قسم کا تعارف موجود ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اس کا نتیجہ اور بدلہ تجھے دوں گا۔

ہاں! خدا ہمیشہ اور ہر حالت میں اندر اور باہر کے اسرار سے مکمل طور پر آگاہ ہے، لیکن اس آگاہی کا اثر قیامت میں اجر و ثواب اور جزا و سزا کے وقت زیادہ ظاہر اور زیادہ آشکار ہو جائے گا۔ اور یہ تمام انسانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ اگر واقعاً وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو یہ چیز ان کے گناہوں کے درمیان ایک طاقتور سد بن جائے گی، چاہے وہ گناہ آشکار ہوں یا پنہاں، اندرونی گناہ ہو یا بیرونی، اور اس اعتقاد کا تربیت پر کیا اثر پڑتا ہے کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۱۔ قاعدہ کی رو سے ”والعادیات عدو“ کہنا چاہیے، لیکن چونکہ عدو (دوڑنے) کا لازمہ سانس نکالنا ہے، لہذا اس کے بجائے ”ضبحاً“ کہا گیا ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ آیت میں ایک مخذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ (والعادیات یضبحن ضبحاً)۔

۲۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۲۹۔ اس روایت کو ”قرطبی“ نے بھی اپنی تفسیر کی جلد ۱۰ ص ۷۲۴۵ میں نقل کیا ہے۔

۳۔ ”بہ“ کی ضمیر ”عدو“ (دوڑنے) کی طرف لوٹتی ہے جس کا ”والعادیات ضبحاً“ کے جملہ سے استفادہ ہوتا ہے۔ اس بناء پر ”باء“ یہاں ”سببیت“ کے معنی میں ہے، یعنی اس دوڑنے کے سبب گرد و غبار فضا کو پر کر دیتا ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ اس زمانہ یا مکان کی طرف لوٹتی ہے جس میں یہ تاخت و تاز انجام پائی ہے۔ اس بناء پر ”باء“ ظرفیت کے معنی میں ہے، لیکن صحیح وہی پہلا معنی ہے۔

۴۔ ”بہ“ کی ضمیر کے مرجع اور ”باء“ کے معنی کے سلسلہ میں یہاں وہی بحث ہے جو پہلی آیت میں تھی۔

۵ تفسیر «بیضاوی»، صفحہ ۴۶۵۔

۶۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۳۔

۷۔ ”لحب الخیر“ کی ”لام“ ممکن ہے ”لام تعدیہ“ ہو یا لام علت، پہلے احتمال کی بناء پر اسکی تفسیر وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے، اور دوسرے احتمال کی بناء پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے، انسان مال کی محبت کی وجہ سے بخیل ہے، لیکن مسلمہ طور پر پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

اس سورہ کی قسموں اور اس کے ہدف کے درمیان ربط

اس سورہ کے سلسلہ میں جو سوالات سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مجاہدین کے گھوڑوں کی قسم اور ”ان الانسان لربہ لکنود“ کے جملہ کے درمیان کیا ربط ہے؟ کیونکہ قرآن کی آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ قسموں اور مقسم بہ

(جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے) کے درمیان ایک قسم کا ربط موجود ہوتا ہے، اور اصولی طور پر قرآن کی وضاحت و بلاغت بھی اس قسم کے مطلب کا اقتضا کرتی ہے۔

زیر بحث آیات میں ممکن ہے اس طرح کا ربط ہو کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ ایسے ایثار کرنے والے انسان بھی موجود ہیں جو جہاد کے راستہ میں بے پرواہ ہو کر پیش رفت کرتے ہیں اور کسی قسم کی فداکاری میں کوتاہی نہیں کرتے، اور اپنی جان و مال خدا کی راہ میں دے دیتے ہیں لیکن بعض لوگ اتنے بخیل اور ناشکرے کیوں بن جاتے ہیں کہ نہ تو وہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں خدا کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی راہ میں ایثار کرتے ہیں؟

یہ ٹھیک ہے کہ قسم تو گھوڑوں ہی کی کھائی گئی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ وہ مجاہدین کے لئے ایک آلہ ہیں، اور حقیقت میں مجاہدین کے جہاد کی قسم کھائی گئی ہے۔ (اور اسی طرح اگر یہ حاجیوں اور خانہ خدا کے زائرین کے اونٹوں کی قسم ہو)۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ربط اس طرح سے حاصل ہوتا ہے کہ یہ جانور حق تعالیٰ کی راہ میں سرعت کے ساتھ جاتے ہیں۔ پس اے انسان تو کیوں اس کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا جب کہ تو اشرف المخلوقات ہے اور اس کے لائق ہے؟

لیکن پہلی مناسبت زیادہ واضح ہے

۲۔ کیا انسان طبعاً ناشکر اور بخیل ہے؟

ممکن ہے کہ لوگ ان انسان لربہ لکنود کے جملہ سے مفہوم لیں کہ ”کنود“ کی حالت میں ہونا یعنی ناشکری اور بخل کرنا سب انسانوں کی طبیعت کا جزء ہے تو پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ امر بیدار وجدان اور فطری شعور کے ساتھ، انسان کو شکرِ منعم اور ایثار و قربانی کی دعوت دیتا ہے، کیسے سازگار ہو سکتا ہے؟

اس قسم کا سوال، قرآن مجید کی بہت سی آیات میں، جو انسان کی کمزوریوں کے واضح نقاط کو بیان کرتی ہیں، سامنے آتا ہے۔

ایک جگہ انسان کو ”(ظلم و جھول)“ شمار کیا گیا ہے۔ (احزاب - ۷۲)

دوسری جگہ ”(ہلوع)“ (کم ظرف) معارج - ۱۹

ایک دوسری ”(ی و س کفور)“ (مایوس ناشکرا) (ہود - ۹)

ایک اور مقام پر ظاغی اور سرکش - (علق - ۶) کے ساتھ متعارف ہوا ہے۔

کیا واقعاً ضعف کمزوری کے یہ نقاط انسان کی طبیعت میں پوشیدہ ہیں، حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا نے آدم کو مکرم بنایا ہے اور سب مخلوق پر اسے برتری دی ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَا هُمْ فِي الْبَرِّ وَابْحَرُ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾ (اسراء - ۷۰)

اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان دو بعد و جہات وجودی رکھتا ہے، اور اسی بناء پر وہ اپنے ”قوس صعودی“ میں ”(اعلیٰ علیین)“ تک پہنچ جاتا ہے اور اپنے ”قوس نزولی“ میں اسفل سافلین میں گر جاتا ہے۔

اگر وہ مربیانِ الہی سے تربیت پائے، عقل کے پیام سے ہدایت حاصل کرے اور اپنی اصلاح کرے تو وہ ﴿فَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾ کا مصداق ہو جاتا ہے۔

اور اگر ایمان تقویٰ سے منہ موڑ لے، اور اولیاء خدا کی راہنمائی سے باہر نکل جائے، تو پھر وہ ”ظلم و“ ”کفار“ ”یوس“ و ”کفور“ اور ”ہلوع“ و ”کنود“ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس طرح ان آیات کے درمیان کسی قسم کا تضاد موجود نہیں ہے، البتہ ان میں سے ہر ایک کا انسان کے ایک بعد اور جہت کے ساتھ تعلق ہے۔

ہاں! انسان کی فطرت کے اندر تمام نیکیوں، اچھائیوں اور افتخارات و فضائل کی اصلی جڑ پوشیدہ ہے اور اسی طرح انسان ان فضائل کے نقطہ مقابل کے لیے بھی آمادگی رکھتا ہے۔ اسی لیے عالم آفرینش کی کسی بھی مخلوق کے قوس صعودی و نزولی کے درمیان اس قدر فاصلہ اور دوری نہیں ہے، (غور کیجئے)

۳۔ جہاد کی عظمت

قرآن مجید میں جہاد اور راہ خدا کے مجاہدین کی عظمت کے بارے میں بہت ہی زیادہ گفتگو ہوئی ہے۔ لیکن شاید یہ مسئلہ کسی جگہ بھی اس عظمت کے ساتھ بیان نہیں ہوا کہ ان کے گھوڑوں کے پھنکارنے، ان کے سموں سے نکلنے والی چنگاریوں اور ان کے تیز دوڑنے سے اٹھنے والا گرد و غبار تک بھی اس قدر با عظمت سمجھا جائے، کہ اس کی قسم کھائی جائے خصوصاً ان کے سرعت عمل پر، جو جنگوں میں کامیابی کا اہم ترین عامل ہے، تکیہ ہوا ہے، اور غفلت کی حالت میں جالینے پر بھی، جو جنگ میں موفق ہونے کا ایک اور عامل ہے، تکیہ ہوا ہے۔ اور یہ سب جہاد کے پروگرام کے سلسلہ میں ایک ترتیب اور تعلیم ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس سورہ کے شان نزول میں بھی آیا ہے کہ علی علیہ السلام نے یہ حکم دیا تھا کہ رات کی تاریکی میں اپنی سواریوں کو تیار کر لیں، انہیں ضروری خوراک دیں، ان پر زین کس لیں، اور مکمل طور پر المرٹ (تیاری کی صورت میں آجائیں، جب رات کی تاریکی کا پردہ ہٹا تو آپ نے فوراً اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز صبح ادا کی، اور بلا فاصلہ دشمن پر حملہ کر دیا، اور دشمن اس وقت بیدار ہوا جب مجاہدین اسلام کے گھوڑے ان کے سروں پر پہنچ گئے۔

غفلت کی حالت میں اس سریع حملہ سے تلف ہونے والوں کی تعداد بھی بہت کم رہی، اور جنگ کا خاتمہ بھی مختصر سے وقت میں ہو گیا، اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں اس سورہ کی آیات میں بہت ہی عمدہ طریقہ سے بیان ہوئی ہیں۔

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ نہ تو گھوڑوں میں کوئی خصوصیت ہے اور نہ ہی بیابان کے پتھروں پر سموں کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی چنگاریاں کوئی خصوصیت رکھتی ہیں، اور نہ ہی ان کے پاؤں سے اٹھنے والا گرد و غبار، جو چیز خصوصیت رکھتی ہے وہ مسئلہ جہاد ہے اور اس کے بعد اس کے آلات ہیں، جو مودہ زمانہ کے تمام جنگی وسائل کو شامل ہیں، جیسا کہ سورہ انفال کی آیت ۹ میں ”رَبَاطُ الْخَيْلِ“ (قومی اور طاقتور گھوڑوں) کے بیان میں ”قوة“ اور ”طاقت“ کے بارے میں کلی طور پر گفتگو ہوئی ہے۔

خدا وندا! ہمیں اپنی رضا اور خوشنودی کی راہ میں جہاد کرنے اور قربانی دینے کی توفیق مرحمت فرما۔
پروردگار! نفس سرکش ناشکری اور کفران کی طرف مائل رہتا ہے، ہمیں اس کے خطرات سے محفوظ فرما۔
بار الہا! تو ہر شخص کے اندرونی اسرار سے آگاہ ہے اور ہمارے اعمال سے باخبر ہے۔ اپنے لطف و کرم اور عنایت و
بخشش سے ہمارے ساتھ سلوک کر۔

آمین یا رب العالمین

سورہ القارعة

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۱۱ آیات ہیں۔

سورہ قارعہ کے مطالب اور اس کی فضیلت

اس سورہ میں کلی طور پر معاد اور اس کے مقدمات کے بارے میں گفتگو ہے۔ اس میں چھٹنے والی تعبیریں، ہدائینے والے بیان ہیں، اور صریح و واضح انداز اور تنبیہ ہے۔ اور آخر میں انسانوں کی دو گروہوں میں تقسیم کا بیان ہے۔ ایک گمراہ تو وہ ہے جن کے اعمال عدل الہی کے میزان میں وزنی ہوں گے، اور ان کی جزاء حق تعالیٰ کے جوار رحمت میں سراسر رضایت بخش زندگی ہے۔ اور دوسرا گمراہ وہ ہے جن کے اعمال ہلکے اور کم وزن ہوں گے، ان کی سر نوشت جہنم کی جلادینے والی آگ ہے۔

اس سورہ کا نام یعنی ”قارعہ“ اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت

اس کی فضیلت کے سلسلہ میں بس اتنا ہی کافی ہے کہ ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

”من قرأ القارعة أَمَنَهُ اللهُ مِنَ الدَّجَالِ انْ يَوْ مِنْ بَهْ ، و مِنْ قِيَحِ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ انْ شَاءَ اللهُ :

”جو شخص سورہ ”قارعہ“ کو پڑھے گا تو خداوند تعالیٰ اسے دجال کے فتنہ اور اس پر ایمان لانے سے محفوظ رکھے گا، اور

اسے قیامت کے دن انشاء اللہ پیپ سے دور رکھے گا۔ ۱

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

- ۱۔ ﴿القَارِعَةُ﴾ - ۲۔ ﴿مَا الْقَارِعَةُ﴾ - ۳۔ ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ﴾ - ۴۔ ﴿يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ﴾ -
- ۵۔ ﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾ - ۶۔ ﴿فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ﴾ - ۷۔ ﴿فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ﴾ -
- ۸۔ ﴿وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ﴾ - ۹۔ ﴿فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ﴾ - ۱۰۔ ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَ﴾ - ۱۱۔ ﴿نَارُ حَامِيَةٍ﴾ -

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

- ۱۔ وہ چھینے والا حادثہ - ۲۔ اور وہ کیسا چھینے والا حادثہ ہے؟ - ۳۔ اور تو کیا جانے کہ وہ چھینے والا حادثہ کیسا ہے؟
- ۴۔ وہ دن جس میں لوگ پر اکندہ پر وانوں کی طرح ہر طرف دوڑتے رہے ہوں گے۔
- ۵۔ اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے - ۶۔ (اس دن) جس کے اعمال کا ترازو وزنی ہوگا۔
- ۷۔ وہ ایک پسندیدہ زندگی میں ہوگا - ۸۔ لیکن جس کا ترازوئے اعمال ہلکا ہوگا - ۹۔ اس کی پناہ ہاویہ (جہنم) ہوگی۔
- ۱۰۔ اور تو کیا جانے کہ ہاویہ کیا ہے؟ - ۱۱۔ ایک جلاڈالنے والی آگ ہے۔

چھینے والا حادثہ

ان آیات میں، جو قیامت کا تعارف کراتی ہیں، پہلے ارشاد ہوتا ہے: ”وہ چھینے والا حادثہ“ ﴿القَارِعَةُ﴾۔

اور وہ کیسا چھینے والا حادثہ ہے؟ - ﴿مَا الْقَارِعَةُ﴾۔

”اور تو کیا جانے کہ وہ چھینے والا حادثہ کیا ہے؟“ ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ﴾۔

”قارعة“ ”قرع“ (بروزن فرع) کے مادہ سے، کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر اس طرح رگڑنے کے معنی میں سے کہ اس سے سخت آواز پیدا ہو، تازیانہ اور ہتھوڑے کو بھی اسی مناسبت سے ”مقرعہ“ کہتے ہیں، بلکہ ہر اہم سخت حادثہ کو ”قارعة“ کہا جاتا ہے۔ (یہاں تاء تانیث کا تاء ممکن ہے تاکید کی طرف اشارہ ہو۔

ان تعبیروں سے جو دوسری اور تیسری آیات میں آئی ہیں، جن میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک سے یہ فرمایا ہے کہ تو کیا جانے یہ سخت اور سرکوبی کرنے والا حادثہ کیا ہے: واضح ہو جاتا ہے کہ یہ چبھنے والا حادثہ اس قدر عظیم ہے کہ اس کے ابعاد اور مختلف جہات ہر شخص کے ذہن میں نہیں آسکتے۔

بہر حال بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ ”قارعة“ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، لیکن انہوں نے ٹھیک طور سے یہ واضح نہیں کیا کہ کیا یہ تعبیر قیامت کے مقدمات کی طرف اشارہ ہے جس میں عالم دنیا درہم برہم ہو جائے گا، آفتاب و ماہتاب تاریک ہو جائیں گے، سمندروں میں آگ لگ جائے گی، اگر اس طرح ہو تو پھر اس حادثہ کے لیے ”قارعة“ کے نام کے انتخاب کی وجہ واضح ہے۔

دوم اس سے دوسرا مرحلہ مراد ہو، یعنی مردوں کے زندہ ہونے اور عالم ہستی میں ایک نئی طرح ڈالنے کا مرحلہ، اور ٹکرانے اور چبھنے کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ اس دن وحشت و خوف اور ڈردلوں سے ٹکرائیں گے ان کی سرکوبی کریں گے۔ وہ آیات جو اس کے بعد آئیں ہیں، ان میں سے بعض تو جہان کے خراب و برباد ہونے کے حادثہ سے مناسبت رکھتی ہیں اور بعض مردوں کے زندہ ہونے کے ساتھ، لیکن مجموعی طور سے یہ پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے، اگرچہ ان آیات میں دونوں حادثے یکے بعد دیگرے ذکر ہوئے ہیں (قرآن کی اور بہت سی دوسری آیات کے مانند جو قیامت کی خبر دیتی ہیں)۔

اس کے بعد اس عجیب و غریب دن کے تعارف میں کہتا ہے: ”وہی دن جس میں لوگ پراگندہ، حیران و پریشان، پروانوں کی طرح ہر طرف جائیں گے“۔ ﴿يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ﴾۔

”فراش“ ”فراشہ“ کی جمع ہے، بہت سے اسے ”پروانہ“ کے معنی میں سمجھتے ہیں، بعض نے اس کی ”ٹڈی دل“ کے معنی میں تفسیر کی ہے، اور ظاہراً یہ معنی سورہ قمر کی آیہ ۷ سے لیا ہے جو لوگوں کو اس دن پراگندہ ٹڈی دل سے تشبیہ دیتی ہے، ﴿كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ﴾ ورنہ اس کے لغوی معنی ”پروانہ“ ہی ہیں۔

بہر حال ”پروانہ“ کے ساتھ تشبیہ اس لیے ہے کہ پروانے اپنے آپ کو دیوانہ وار آگ پر پھینک دیتے ہیں۔ بدکار لوگ بھی اپنے آپ کو جہنم کی آگ میں ڈالیں گے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پروانہ کے ساتھ تشبیہ ایک خاص قسم کی حیرت و سرگردانی کی طرف اشارہ ہے، جو اس دن تمام انسانوں پر غالب ہوگی۔

اور اگر ”فراش“ ٹڈی دل کے معنی میں ہو تو پھر مذکورہ تشبیہ اس لیے ہے کہ کہتے ہیں بہت سے پرندے اڑتے وقت ایک معین راستہ میں اکٹھے پرواز کرتے ہیں، سوائے ٹڈی دل کے، جو گروہ کی صورت میں اڑتے ہوئے بھی کوئی مشخص راستہ نہیں رکھتے، بلکہ ان میں سے ہر ایک کسی دوسری ہی طرف اڑ رہا ہوتا ہے۔

پھر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حیرت و پرانگندگی و سرگردانی اور وحشت و اضطراب جہاں کے خاتمہ کے ہولناک حوادث کی وجہ سے ہوگا، یا قیامت اور حشر و نشر کے آغاز کی وجہ سے۔

اس سوال کا جواب ہمارے اسی بیان سے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے واضح ہو جاتا ہے۔
اس کے بعد اس دن کی ایک خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کے مانند ہو جائیں گے۔“ ﴿تَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾۔

”عھن“ (بروزن ذہن) رنگی ہوئی اون کے معنی میں ہے۔
اور ”منفوش“ ”نفس“ (بروزن نقش) کے مادہ سے اون کو پھیلانے کے معنی میں ہے جو عام طور پر دھنکنے کے مخصوص آلات کے ذریعے اون کو دھنکنے سے انجام پاتی ہے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کی مختلف آیات کے مطابق قربِ قیامت میں پہاڑ پہلے تو چلنے لگیں گے، پھر ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور انجام کار غبار کی صورت میں فضا میں اڑنے لگیں گے۔ زیر بحث آیت میں ان کو رنگین اور دھنکی ہوئی اون سے تشبیہ دی گئی ہے، ایسی اون جو تیز آندھی کے ساتھ چلے اور اس کا مصرف رنگ ہی رنگ نمایاں ہو، اور یہ پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے کا آخری مرحلہ ہوگا۔

ممکن ہے یہ تعبیر پہاڑوں کے مختلف رنگوں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ روئے زمین کے پہاڑوں میں سے ہر ایک خاص رنگ رکھتا ہے۔

بہر حال یہ جملہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اوپر والی آیات قیامت کے پہلے مرحلوں، یعنی اس جہان کی ویرانی اور اختتام مرحلہ کی ہی بات کرتی ہیں۔

اس کے بعد حشر و نشر، مردوں کے زندہ ہونے اور ان کی دوگرہوں میں تقسیم کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”پس جس شخص کا ترازوئے عمل وزنی ہوگا“ ﴿فَإِمَّا مِنْ ثَقَلْتِ مَوَازِينَهُ﴾۔

”وہ ایک عمدہ اور پسندیدہ زندگی میں ہوگا۔“ ﴿فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ﴾۔

”لیکن جس شخص کا ترازو نے اعمال ہلکا ہوگ ﴿و امامم خفت موازینہ﴾۔

”تو اس کی پناہ گاہ جہنم ہے“۔ ﴿فامہ ہاویۃ﴾۔

اور تو کیا جانے ہاویہ (دوزخ) کیا ہے؟ ﴿وما ادراک ماہیہ﴾۔^(۱)

”ایک جلانے والی آگ ہے“ ﴿نار ہامیۃ﴾۔

”موازن“ میزان کی جمع ہے جو تولنے کے ایک آلہ کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ پہلے تو مادی وزنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے، اس کے بعد معنوی موازن اور مقایس کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔

بعض کا نظریہ ہے کہ اس دن انسان کے اعمال جسمانی اور قابل وزن موجودات کی صورت اختیار کر لیں گے اور واقعی طور پر انہیں اعمال کے تولنے والے ترازوؤں کے ساتھ تولیں گے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ خود نامہ اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ اگر اس میں کچھ اعمال صالح لکھے ہوئے ہیں تو وہ سنگین اور بھاری ہوگا ورنہ ہلکا بے وزن ہوگا۔

لیکن ظاہراً ان توجیہات کی ضرورت نہیں ہے۔ میزان یقینی طور پر ترازوؤں کے معنی میں نہیں ہے، جس میں مخصوص قسم کے پلڑے ہوتے ہیں، بلکہ اس کا ہر قسم کے تولنے کے وسیلہ اور ذریعہ پر اطلاق ہوتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔

”ان امیر المومنین و الأئمہ من ذریتہ ﴿ع﴾ ہم الموازین“۔

”امیر المومنین اور وہ ائمہ جو آپ کی ذریت میں ہیں، وہی تولنے کے ترازو ہیں“۔^(۲)

اس طرح اولیاء خدا یا قوانینِ عدل الہی ہی وہ ترازو ہیں جن کے سامنے انسانوں اور ان کے اعمال کو پیش کیا جاتا ہے اور جس قدر وہ اس کے ساتھ مشابہت اور مطابقت رکھتے ہیں وہی ان کا وزن ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ میزان کے ”ہلکا“ اور ”بھاری“ ہونے سے مراد خود تولنے کے ترازوؤں کی سنگینی و سبکی نہیں ہے، بلکہ ان چیزوں کا وزن ہے جن کو ان سے تولتے ہیں۔

ضمنی طور پر ”موازن“ کی تعبیر جمع کی صورت میں اس بناء پر آئی ہے کہ اولیائے حق اور قوانینِ الہی میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ تولنے کی ایک میزان ہے۔ اس سے قطع نظر انسان کی صفات اور اعمال کا تنوع اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہر ایک کو ایک ترازو سے تولا جائے، اور تولنے کے نمونے اور ترازو مختلف ہوں۔

”راغب“ ”مفردات“ میں کہتا ہے: ”قرآن مجید میں میزان کبھی تو مفرد کی صورت میں آیا ہے اور کبھی جمع کی صورت میں، پہلی صورت میں اس کے لیے آیا ہے جو حساب کرتا ہے یعنی خدائے یکتا، اور دوسری صورت میں ان کے لیے ہے جن کا حساب ہوگا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ موازین ”موزون“ کی جمع ہے، یعنی وہ عمل جس کا وزن کرتے ہیں۔ اس بناء پر موازین کا ہلکا یا بھاری ہونا خود اعمال کے ہلکا اور بھاری ہونے کے معنی میں ہے، نہ کہ ترازوؤں کے ہلکا اور بھاری ہونے کے معنی میں۔ (۳)

”عیشۃ راضیۃ“ (خوش و خرم زندگی) کی تعبیر بہت ہی عمدہ اور بلیغ تعبیر ہے، جو قیامت، میں اہل بہشت کی پر نعمت اور سراسر سکون و آرام کی زندگی کے لئے بیان ہوئی ہے یہ زندگی اتنی پسندیدہ اور رضایت بخش ہے گویا کہ وہ خود ہی راضی ہیں، یعنی بجائے اس کے کہ ”مرضیۃ“ کہا جائے، زیادہ تاکید کے لیے ”اسم مفعول“ کی بجائے ”اسم فاعل“ استعمال ہوا ہے۔ (۳)

اور یہ عظیم امتیاز آخرت کی زندگی کے ساتھ ہی مخصوص ہے، کیونکہ دنیا کی زندگی چاہے جتنی بھی مرفہ، پر نعمت، امن و امان اور رضایت و خوشنودی کے ساتھ ہو، پھر بھی ناخوشی اور ناپسندیدگی کے عوامل سے خالی نہیں ہوتی۔ یہ صرف آخرت ہی کی زندگی ہے جو سراسر رضایت و خوشنودی، آرام اور انیت و دل جمعی کا سبب ہے۔

”قامہ حاویہ“ کے جملہ میں ”ام“ کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ ”ام“ ماں کے معنی میں ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ ماں اولاد کے لیے ایک ایسی پناہ گاہ ہے جس کی طرف مشکلات میں پناہ لیتے ہیں اور اس کے پاس رہتے ہیں، اور یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ہلکے وزن والے، گنہگار، دوزخ کے علاوہ اور کوئی جگہ پناہ لینے کے لیے نہ پائیں گے، اس شخص کے حال پر وائے ہے جس کی پناہ گاہ دوزخ ہوگی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ”ام“ کا معنی ”مغز“ (دماغ) ہے کیونکہ عرب سر کے مغز کو ”ام الرأس“ کہتے ہیں، تو اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ انہیں سر کے بل جہنم میں پھینکیں گے، لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے کیونکہ اس صورت میں بعد والی آیت ”وما ادراک ماہیہ“ (تو کیا جانے کہ وہ کیا چیز ہے) کا مفہوم درست نہیں رہے گا۔

”حاویہ“ ”ہوی“ کے مادہ سے گرنے اور سقوط کرنے کے معنی میں ہے، اور وہ ”دوزخ“ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، کیونکہ گنہگار اس میں گریں گے اور یہ جہنم کی آگ کے عمق اور گہرائی کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اور اگر ہم ”ام“ کو یہاں ”مغز“ کے معنی میں لیں، تو ”ہاویہ“ کا معنی گرنے والی ہوگا، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح اور مناسب نظر آتی ہے۔

”حامیہ“ ”حمی“ (بروزن نفی) کے مادہ سے شدتِ حرارت کے معنی میں ہے، اور ”حامیہ“ یہاں جہنم کی آگ کی حد سے زیادہ حرارت اور جلانے کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال یہ جملہ جو یہ کہتا ہے تو کیا جانے کہ ”ہاویہ“ کیا ہے ”ہاویہ“ جلانے والی آگ ہے۔ اس معنی پر ایک تاکید ہے کہ قیامت کا عذاب اور جہنم کی آگ تمام انسانوں کے تصور سے بالاتر ہے۔

۱۔ ماہیہ اصل میں ”ماہی“ تھا ”ہاء سکت“ کا اس سے الحاق ہوا۔

۲۔ ”ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ جب لوگوں نے آپ سے میزان کے معنی کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا: المیزان العدل“ ”تولنے کی ترازو وہی عدل ہے“۔

۳۔ اس معنی کو ”زمنخشی“ نے ”کشاف“ میں اور ”فخر رازی“ نے تفسیر کبیر“ میں اور ”ابو الفتوح رازی“ نے اپنی تفسیر میں ”موازن“ کے معنی میں دو احتمالات میں سے ایک احتمال کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔

البتہ دونوں کا نتیجہ ایک ہے، لیکن دو مختلف راستوں سے۔

اس سلسلہ میں ہم نے سورہ اعراف کی آیہ ۸-۹ کے ذیل میں (جلد ۴ ص ۴۲) پر، اور اسی طرح سورہ کہف کی آیہ ۱۰۵ کے ذیل میں (جلد ۷ ص ۷۲۷) پر اور سورہ مومنون کی آیہ ۱۰۲ کے ذیل میں (جلد ۸) پر زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے ۳ بعض نے ”راضیہ“ کو ”ذات رضا“ کے معنی میں بھی سمجھا ہے، یا تقدیر میں کچھ فرض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے مراد اس زندگی والوں کی رضایت ہے، لیکن تین تفاسیر میں سے وہی تفسیر اوپر بیان ہوئی ہے جو سب سے زیادہ مناسب ہے۔

میزان اعمال کی سنگینی کے اسباب

اس میں شک نہیں کہ تمام نیک اور صالح اعمال کی قدر و قیمت یکساں نہیں ہے اور یہ آپس میں بہت زیادہ فرق رکھتے ہیں، اور اسی وجہ سے مختلف اسلامی روایات میں کچھ اعمال خیر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور ان کو ہی قیامت میں میزان عمل کے بھاری ہونے کے اسباب شمار کیا گیا ہے۔

منجملہ ایک حدیث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپ نے لا الہ الا اللہ کی تفسیر میں فرمایا:

”﴿بِعَنَىٰ بَوَاحِدَانِيَّتِهِ لَا يَقْبَلُ الْأَعْمَالُ إِلَّا بِهَا، وَهِيَ كَلِمَةُ التَّقْوَىٰ يَثْقُلُ اللَّهُ بِهَا الْمَوَازِينَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾“

”لا الہ الا اللہ“ خدا کی وحدانیت کی طرف اشارہ ہے اور کوئی عمل اس کے بغیر قبول نہیں ہوگا یہ کلمہ تقویٰ ہے جو عمل تولنے والے ترازوں کو قیامت میں سنگین اور وزنی بنائے گا۔“ (۱)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے خدا کی وحدانیت اور پیغمبر اکرم کی نبوت کی شہادت کے بارے میں آیا ہے:

”خف میزان تر فعان منه و ثقل میزان تواضعان فيه“

”تولنے کا وہ ترازو جس سے شہادتیں کو اٹھایا جائے وہ ہلکا ہو جائے گا، اور وہ ترازو جس میں شہادتیں کو رکھ دیا جائے وہ سنگین اور وزنی ہو جائے گا۔“ (۲)

اور ایک اور دوسری حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

”ما فی المیزان شیء اثقل من الصلوٰۃ علی محمد و آل محمد“

”میزان عمل میں کوئی چیز محمد و آل محمد پر درود بھیجنے سے زیادہ سنگین نہیں ہے۔“

اور روایت کے ذیل میں آیا ہے کہ قیامت میں کچھ لوگ میزان عمل کے نیچے کھڑے ہوں گے جن کے اعمال کا پلٹرا ہلکا ہوگا، پھر محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود

کو اس میں رکھ دیں گے تو وہ سنگین اور وزنی ہو جائے گا۔^(۳)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

”﴿مَنْ كَانَ ظَاهِرُهُ أَرْجَعُ مِنْ بَاطِنِهِ خَفَ مِيزَانُهُ﴾“

جس شخص کا ظاہر اس کے باطن سے بہتر ہوگا قیامت میں اس کا میزان عمل ہلکا رہے گا۔^(۴)

ہم اس بحث کو سلمان فارسی (رض) کی ایک گفتگو پر ختم کرتے ہیں جو حقیقت میں وحی اور سنت کا خلاصہ ہے۔

اس حدیث میں آیا ہے ”کسی شخص نے تحقیر کے طور پر سلمان فاسی (رض) سے کہا:

تو کون ہے اور تیری کچھ بھی قدر و قیمت نہیں ہے سلمان (رض) نے جواب میں کہا ہے:

”﴿إِمَامٌ أُولَىٰ وَ أَوْلَىٰكَ فَنُطْفَةُ قَذَرَةٍ وَ أَمَّا أُخْرَىٰ وَ أُخْرَىٰكَ فَجَفِيْفَةٌ مُنْتَيْنَةٌ فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ، وَ نَصَبْتَ الْمَوَازِينَ فَمَنْ

ثَقُلْتَ مَوَازِينَهُ فَهُوَ الْكَرِيمُ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ اللَّئِيمُ﴾“:

”لیکن! میرے اور تیرے وجود کا آغاز تو ایک گندے نطفہ سے ہوا ہے اور میرے اور تیرے وجود کا اختتام ایک بدبو

دار مردار ہے، اور جب قیامت کا دن ہوگا اور اعمال کے تولنے کے لیے ترازو نصب کیے جائیں گے تو جس شخص کے

عمل کا ترازو سنگین اور بھاری ہوگا وہ شریف و بزرگوار ہے، اور جس کے عمل کا ترازو سبک اور ہلکا ہوگا وہ پست و ذلیل

اور کمینہ ہوگا۔^(۵)

خدا وندا! ہمارے ترازو کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے ذریعے سنگین اور وزنی کر دے۔

پروردگار! ”عیشة راضیة“ کا حصول تیرے لطف و کرم کے بغیر آسان نہیں ہے۔ پس تو خود ہی اس راہ میں ہماری

مدد فرما!

بار الہا تیری دوزخ کی آگ بہت ہی سخت جلاتے والی ہے اور ہم میں اس کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

اسے اپنے رحم و کرم کے پانی سے ہمارے لیے خاموش کر دے۔

آمین یا رب العالمین

١- ”نور الثقلین“ جلد ٥ ص ٦٥٩ حدیث ٨، ١٢-

٢- ”نور الثقلین“ جلد ٥ ص ٦٥٩ حدیث ٨، ١٢-

٣- ”نور الثقلین“ جلد ٥ ص ٦٥٩ حدیث ٧-

٤- ”نور الثقلین“ ج ٥ ص ٦٦٠ حدیث ١٣-

٥- ”نور الثقلین“ جلد ٥ ص ٦٦٠ حدیث ١٤-

سورہ التکاثر

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۸ آیات ہیں۔

سورہ تکاثر کے مطالب اور اس کی فضیلت

بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا ہے۔ اس بناء پر اس میں تفاخر کے بارے میں جو گفتگو آئی ہے وہ اصولی طور پر قبائل قریش کے ساتھ مربوط ہے جو موہوم امور کی بناء پر ایک دوسرے پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے۔

لیکن جیسا کہ مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں لکھا ہے۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ مدینہ میں نازل ہوا ہے اور اس میں تفاخر کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہودیوں یا انصار کے دو قبیلوں کے بارے میں ہے، لیکن اس سورہ کا ملکی سورتوں سے زیادہ مشابہت رکھنے کی وجہ سے ملکی ہونا زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

اس سورہ کے مطالب میں مجموعی طور سے پہلے تو ایسے لوگوں کی، جو موہوم مطالب کی بنیاد پر ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرتے تھے، سرزنش اور ملامت ہے۔ اس کے بعد قیامت و معاد اور جہنم کی آگ کے مسئلہ پر تنبیہ ہے اور آخر میں نعمتوں کے بارے میں سوال اور باز پرس کے مسئلہ میں تنبیہ کی گئی ہے۔

اس سورہ کا نام اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت

اس کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

”﴿وَمَنْ قَرَأَهَا لَمْ يَحَاسِبْهُ اللَّهُ بِالْنَّعِيمِ الَّذِي أَنْعَمَ عَلَيْهِ فِي دَارِ الدُّنْيَا وَاعْطَىٰ مِنَ الْأَجْرِ كَأَنَّمَا قَرَأَ الْفَافَ﴾“:

”جو شخص اس کو پڑھے گا تو خدا اس سے ان نعمتوں کا حسان نہیں لے گا جو اس نے اسے دار دنیا میں دی ہیں، اور

اسے اس قدر اجر و ثواب عطا کرے گا گویا کہ اس نے قرآن کی ہزار آیتوں کی تلاوت کی ہے۔“^(۱)

اور ایک حدیث سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ ”اس سورہ کا واجب اور مستحب نماز میں پڑھنا شہداء

کی شہادت کا ثواب رکھتا ہے۔“^(۲)

واضح ہو کہ یہ سب ثواب ان لوگوں کے لیے ہیں جو اسے پڑھیں اور اسے اپنی زندگی کا پروگرام بنائیں اور دل جان سے آپ کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

- ۱۔ ﴿الْهَلْكُمْ التَّكَاثُرُ﴾ - ۲۔ ﴿حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ - ۳۔ ﴿كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾ - ۴۔ ﴿ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾ -
- ۵۔ ﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ﴾ - ۶۔ ﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ﴾ - ۷۔ ﴿ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ﴾ - ۸۔ ﴿ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ﴾ -

ترجمہ شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

- ۱۔ تفاخر و تکاثر نے تمہیں اپنے حال میں مشغول رکھا۔ (اور اس نے تمہیں خدا سے غافل کر دیا)۔
- ۲۔ یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کے لیے گئے۔ (اور تم نے اپنے مردوں کی قبریں شمار کیں)۔
- ۳۔ ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم نے خیال کیا ہے، تم جلدی ہی (اصل حقیقت کو) جان لو گے۔
- ۴۔ ہرگز ایسا نہیں ہے جیسا کہ تمہارا خیال ہے، یہ جلدی ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔
- ۵۔ اس طرح نہیں ہے جس طرح تم خیال کرتے ہو، اگر تم آخرت کا علم الیقین رکھتے ہو تے (تو ان موہومات اور فخر و مباہات کے پیچھے نہ لگتے)۔
- ۶۔ تم یقیناً جہنم کو دیکھو گے۔
- ۷۔ پھر (اس میں وارد ہو کر) اس کو عین الیقین کے ساتھ مشاہدہ کرو گے۔
- ۸۔ پھر اس دن تم سب سے ان نعمتوں کے بارے میں جو تمہیں دی گئیں تھیں، سوال کیا جائے گا۔

شان نزول

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سورہ ان قبائل کے بارے میں نازل ہوا ہے جو ایک دوسرے پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے اور اپنی جمیعت، افراد کی کثرت یا مال و دولت کی زیادتی کے باعث ایک دوسرے پر

فخر کرتے تھے، یہاں تک کہ اپنے قبیلہ کے افراد کی تعداد کو بڑھانے کے لیے قبرستان میں جاتے تھے اور ہر قبیلہ کی قبریں شمار کرتے تھے۔

البتہ بعض مفسرین تو اس کو مکہ میں قریش کے دو قبیلوں کے بارے میں سمجھتے ہیں، اور بعض مدینہ میں انصارِ پیغمبر کے بارے میں اور بعض یہودیوں کے دوسرے لوگوں پر فخر کرنے کے بارے میں۔ اگرچہ اس کا مکمل ہونا صحیح نظر آتا ہے

لیکن یہ امر یقینی ہے کہ شان نزول چاہے جو کچھ ہو آیت کے مفہوم کو ہرگز محدود نہیں کرتی۔

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۳۲۔

۲۔ ”وہی مدرك“ (تلخیص کے ساتھ)۔

تکاثر و تفاخر کی مصیبت

ان آیات میں پہلے ملامت بھرے لہجے میں فرماتا ہے: ”تفاخر اور ایک دوسرے پر کثرت رکھنے کے خیال نے تمہیں خدا اور قیامت سے غافل کر کے اپنی طرف مشغول کر دیا ہے“۔ ﴿الهاکم التکاثر﴾۔

”یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت اور دیدار کے لیے بھی گئے اور تم نے اپنے مردوں کی قبروں کو شمار کیا“ ﴿حتی زرتم المقابر﴾۔

آیت کی تفسیر میں یہ بھی احتمال دیا گیا ہے کہ ”تکاثر“ اور تفاخر نے انہیں اس طرح سے اپنی طرف مشغول کر لیا ہے کہ وہ قبروں میں وارد ہونے کے لمحہ تک جاری و ساری ہے۔

لیکن پہلا معنی ”زرتم المقابر“ کی تعبیر، اور اسی طرح شانِ فزول اور نہج البلاغہ کے خطبہ کے ساتھ، جس کی طرف انشاء اللہ بعد میں اشارہ ہوگا، زیادہ سازگار ہے۔

﴿الهاکم﴾ ”لھو“ کے مادہ سے، چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول ہو جانا، اور کاموں سے غافل رہنے کے معنی میں ہے۔ ”راغب“ ”مفردات“ میں کہتا ہے ”لھو“ اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اپنی طرف مشغول رکھتے ہوئے اس کے اہداف و مقاصد سے باز رکھتی ہے۔

”تکاثر“ کثرت کے مادہ سے، تفاخر اور مباہات اور ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتلانے کے معنی میں ہے۔^(۱) ”زرتم“ ”زیارة“ اور ”زور“ (بروزن قول) کے مادہ سے اصل میں سینہ کے اوپر والے حصہ کے معنی میں ہے اس کے بعد ملاقات کرنے اور روبرو ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اور ”زور“ (بروزن قر) سینہ کے اوپر والے حصہ کے ٹیڑھا ہو جانے کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ جھوٹ ایک قسم کا حق سے انحراف ہے، اس لیے اس پر ”زور“ (بروزن نور) کا اطلاق ہوتا ہے۔

”مقابر“ ”مقبرة“ کی جمع ہے جو میت کی قبر کی جگہ کے معنی میں ہے اور یہاں قبروں کی زیارت کرنا یا تو (بعض تفاسیر کے مطابق) موت سے کنایہ ہے یا شمار کرنے اور فخر و مباہات کرنے کے لیے قبروں کے پاس جانے کے معنی میں ہے (جو اس کی مشہور تفسیر کے مطابق ہے)۔

اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے دوسرا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے اور اس کے شواہد میں سے ایک امیر المومنین علی علیہ السلام کا وہ کلام ہے جو اس سلسلہ میں نہج البلاغہ میں آیا ہے، جو آپ نے ”﴿الهاکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر﴾“ کے بعد فرمایا ہے:

”یا له مراماً ما بعده؟ وزراً ما اغفله؟ و خطراً ما افطعه؟ لقد استخلوا، منهم ای مدّ و تنا و شوهم من مکان بعید افبمصارع ابائهم یفخرون؟“

تکاثر و تفاخر کی مصیبت

ان آیات میں پہلے ملامت بھرے لہجے میں فرماتا ہے: ”تفاخر اور ایک دوسرے پر کثرت رکھنے کے خیال نے تمہیں خدا اور قیامت سے غافل کر کے اپنی طرف مشغول کر دیا ہے“۔ ﴿الهاکم التکاثر﴾۔

”یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت اور دیدار کے لیے بھی گئے اور تم نے اپنے مردوں کی قبروں کو شمار کیا“ ﴿حتىٰ زرتم المقابر﴾۔

آیت کی تفسیر میں یہ بھی احتمال دیا گیا ہے کہ ”تکاثر“ اور تفاخر نے انہیں اس طرح سے اپنی طرف مشغول کر لیا ہے کہ وہ قبروں میں وارد ہونے کے لمحہ تک جاری و ساری ہے۔

لیکن پہلا معنی ”زرتم المقابر“ کی تعبیر، اور اسی طرح شانِ فزول اور نہج البلاغہ کے خطبہ کے ساتھ، جس کی طرف انشاء اللہ بعد میں اشارہ ہوگا، زیادہ سازگار ہے۔

”الهاکم“ ”لھو“ کے مادہ سے، چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول ہو جانا، اور کاموں سے غافل رہنے کے معنی میں ہے۔ ”راغب“ ”مفردات“ میں کہتا ہے ”لھو“ اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اپنی طرف مشغول رکھتے ہوئے اس کے اہداف و مقاصد سے باز رکھتی ہے۔

”تکاثر“ کثرت کے مادہ سے، تفاخر اور مباہات اور ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتلانے کے معنی میں ہے۔^(۲)

”زرتم“ ”زیارة“ اور ”زور“ (بروزن قول) کے مادہ سے اصل میں سینہ کے اوپر والے حصہ کے معنی میں ہے اس کے بعد ملاقات کرنے اور روبرو ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اور ”زور“ (بروزن قمر) سینہ کے اوپر والے حصہ کے ٹیڑھا ہو جانے کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ جھوٹ ایک قسم کا حق سے انحراف ہے، اس لیے اس پر ”زور“ (بروزن نور) کا اطلاق ہوتا ہے۔

”مقابر“ ”مقبرۃ“ کی جمع ہے جو میت کی قبر کی جگہ کے معنی میں ہے اور یہاں قبروں کی زیارت کرنا یا تو (بعض تفاسیر کے مطابق) موت سے کنایہ ہے یا شمار کرنے اور فخر و مباہات کرنے کے لیے قبروں کے پاس جانے کے معنی میں ہے (جو اس کی مشہور تفسیر کے مطابق ہے)۔

اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے دوسرا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے اور اس کے شواہد میں سے ایک امیر المومنین علی علیہ السلام کا وہ کلام ہے جو اس سلسلہ میں نہج البلاغہ میں آیا ہے، جو آپ نے ”الہاکم التکاثر حتی زرتم المقابر“ کے بعد فرمایا ہے:

”یا له مراماً ما بعده؟ وزراً ما اغفله؟ و خطراً ما افطعه؟ لقد استخلوا، منهم ای مدّ و تنّا و شوهم من مکان بعيد اقمصارع اباہم یفخرون؟ ام بعد ید اهلکی یتکاثرن؟ یر تجمعون منهم اجساداً خوت، و حرکات سکنت، ولا یكونو عبراً احق من ان یكونوا مفتخرًا!“:

”عجب ہے وہ مقصد سے کتنے زیادہ دور ہیں اور کیسے غافل زیارت کرنے والے ہیں؟ اور کیسا موہوم اور رسوا کرنے والا افتخار ہے؟ ایسے افراد کی بوسیدہ ہڈیوں کی یاد میں بڑے ہوئے ہیں کو سا لہا سال سے مٹی ہو چکے ہیں اور وہ یاد بھی کیسی؟ اتنے دور دراز کے فاصلہ پر ایسے لوگوں کی یاد میں پڑے ہیں جو ان کی حالت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ کیا وہ اپنے آبا و اجداد کی نابودی کی جگہ پر فخر کرتے ہیں یا اپنے مردوں اور معدودین کی تعداد کو شمار کر کے خود کو بہت زیادہ سمجھتے ہیں وہ ایسے جسموں کی بازگشت کے خواہاں ہیں جن کا تار و پود بکھر چکا ہے اور جن کی حرکتیں ختم ہو چکی ہیں، یہ بوسیدہ جسم اگر عبرت کا باعث ہوں تو وہ اس سے زیادہ سزاوار ہیں کہ جب موجب افتخار ہوں“ (۳)

یہ خطبہ جس کے صرف ایک حصہ کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اس قدر ہلادینے والا گویا و صریح ہے کہ ”ابن ابی الحدید معتزلی“ کہتا ہے کہ: میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کی تمام امتیں قسم کھاتی ہیں کہ میں نے پچھلے پچاس سال سے لے کر آج تک اس خطبہ کو ایک ہزار بار پڑھا ہے، اور ہر بار میرے دل میں ایک نیا لرزہ و خوف اور ایک نئی پند و نصیحت پیدا ہوتی ہے، اور اس نے میری روح کے اندر ایک شدید اثر چھوڑا ہے اور میرے اعضاء و جوارح لرزنے لگے اور کبھی ایسا نہیں ہوا، کہ میں اس میں غور و فکر کروں اور اس حال میں اپنے خاندان، عزیزوں اور دوستوں کی موت کو یاد نہ کروں، اور ٹھیک میرے سامنے یہ بات مجسم ہو جاتی تھی کہ میں وحی ہوں جس کی امام نے وضاحت کی ہے۔

اس سلسلے میں کتنے ہی واعظوں، خطباء، سخن وروں اور فصیح افراد نے گفتگو کی ہے، اور میں نے انہیں کان لگا کر سنا ہے اور ان کی باتوں میں غور و فکر کیا ہے، کسی ایک میں بھی میں نے کلامِ امام والی تاثیر نہیں پائی۔

یہ تاثیر جو ان کا کلام میرے دل میں چھوڑتا ہے، یا تو اس کا سرچشمہ اس کا وہ ایمان ہے جو اس کا کہنے والا رکھتا ہے، یا اس کے یقین و اخلاص والی نیت اس بات کا سبب بن گئی ہے کہ وہ اس طرح ارواح میں نفوذ کرے اور دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔^(۴)

”ابن ابی الحدید“ اپنی گفتگو کے ایک اور حصہ میں کہتا ہے:

ينبغي لو اجتماع فصحاء العرب قاطبة في مجلس و تلى عليهم يسجدوا له !“:

”یہ خطبہ اس لائق ہے کہ، اگر فصحاء عرب سب کے سب کسی مجلس میں جمع ہوں اور یہ خطبہ ان کے سامنے پڑھا جائے، تو وہ اس کے سامنے سجدہ کریں۔“

اور اسی مقام پر امیر المومنین علی علیہ السلام کی فصاحت کے بارے میں معاویہ کی گفتگو کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ کہتا ہے:

”و الله ما سنّ الفصاحة لقريش غيره“

”خدا کی قسم قریش کے لیے علی کے سوا کسی نے فصاحت و بلاغت کی بنیاد نہیں رکھی۔“

بعد والی آیت میں ان لوگوں کو اس بات کے ساتھ سختی سے تہدید کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم گمان کرتے ہو، اور تم اس کے ذیعے ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرتے ہو۔ تم عنقریب اس موہوم تفاخر کا نتیجہ دیکھ لو گے۔“ ﴿كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾۔

پھر دوبارہ مزید تاکید کے لیے کہتا ہے: ”پھر بھی اس طرح نہیں ہے جس طرح تم خیال کرتے ہو۔ عنقریب تم جان لو گے۔“ ﴿ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾۔

مفسرین کی ایک جماعت نے ان دونوں آیتوں کو ایک ہی مطلب کی تکرار اور تاکید سمجھا ہے اور یہ دونوں ہی سر بستہ طور پر ان عذابوں کی خبر دیتی ہیں جو ان متفاخر مستکبرین کے انتظار میں ہے۔

جب کہ بعض دوسروں نے پہلی آیت کو عذاب قبر اور عذاب برزخ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جس سے انسان کی موت کے بعد روبرو ہوگا اور دوسری کو عذاب قیامت کی طرف۔

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”مازلنا نشک فی عذاب القبر حتی نزلت الہاکم التکاثر، الیٰ قولہ کلا سوف تعلمون، یرید فی القبر، ثم کلا

سوف تعلمون بعد البعث“

”ہم میں سے ایک گروہ ہمیشہ عذاب قبر کے بارے میں شک کیا کرتا تھا یہاں تک کہ سورہ ”الہاکم التکاثر“ نازل ہوئی، یہاں تک کہ فرماتا ہے: ”کلا سوف تعلمون“ اس سے مراد عذاب قبر ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے: ”ثم کلا سوف تعلمون“ اس سے مراد قیامت کا عذاب ہے۔“^(۵)

تفسیر کبیر فخر رازی میں یہ مطلب علی علیہ السلام کے ایک صحابی ”زربن جیشن“ سے نقل ہوا ہے، جو کہتا ہے: ”ہم عذاب قبر کے بارے میں شک کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم نے علی علیہ السلام سے سنا کہ آپ فرماتے ہیں: ”یہ آیت عذاب قبر پر دلیل ہے۔“^(۶)

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم ایک دوسرے پر فخر کرنے والے خیال کرتے ہو۔ اگر تمہارا آخرت پر ایمان ہوتا اور علم الیقین کے ساتھ جان لیتے، تو ہر گز ایسا کام نہ کرتے اور ان باطل مسائل پر فخر و مباہات کرنے سے باز آتے۔“ **﴿کلا لو تعلمون علم الیقین﴾**^(۷)

پھر دوبارہ تاکید اور مزید ڈرانے کے لیے اضافہ کرتا ہے: تم یقینی طور پر جہنم کو دیکھو گے۔ **﴿لترون الجحیم﴾**۔

”پھر اس میں داخل ہو کر عین الیقین کے ساتھ اس کا مشاہدہ کرو گے۔“ **﴿ثم لترونہا عین الیقین﴾**۔

”پھر اس دن تم سے ان نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔“ **﴿ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم﴾**۔

اس دن تمہیں اس بات کی وضاحت کرنی پڑے گی کہ تم نے ان خداداد نعمتوں کو کس طریقہ سے صرف کیا ہے؟ اور ان سے تم نے خدا کی اطاعت کے لیے مدد لی ہے یا اس کے معصیت کے لیے، یا ان نعمتوں کو ضائع کر کے ہر گز ان کا حق ادا نہیں کیا ہے؟

۱۔ فارسی کے روزمرہ کے استعمالات میں ”تکاثر“ دولت جمع کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، حالانکہ یہ معنی لغت کی اصل کے اعتبار سے نہیں ہے، لیکن بعض روایات میں جن کی طرف اشارہ کریں گے، اس قسم کا استعمال ہوا ہے۔

۲۔ ”نبج البلاغہ“، خطبہ ۲۲۱۔

۳۔ ”نبج البلاغہ خطبہ ۲۲۱۔

۴۔ ”شرح نہج البلاغہ“ ابن ابی الحدید“ جلد ۱۱ ص ۱۵۳۔

۵۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۳۴۔

۶۔ ”تفسیر فخر رازی“ جلد ۲۲ ص ۷۲۔

۷۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر لفظ ”کلا“ تاکید کے لیے ہوتا ہے اور ”حقاً“ کے معنی میں ہوتا ہے، یہ بات طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ”العرب تو کذبکلا وحقاً“ عرب لفظ کلا اور حق سے تاکید کرتے ہیں۔

۱۔ تفاخر کا سرچشمہ

اوپر والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تفاخر اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرنے کے عوامل اصل میں ایک، وہی خدائی جزاء و سزا کے بارے میں جہالت و نادانی اور معاد کے بارے میں ایمان کا نہ ہونا ہے اس کے علاوہ انسان کا اپنی پیدائش کے آغاز سے لے کر انجام تک ہی کمزوریوں اور مصیبتوں سے بے خبر رہنا بھی کبر و غرور اور تفاخر کے عوامل میں سے ایک عامل ہے۔ اسی بناء پر قرآن مجید اس تفاخر و تکاثر کو توڑنے کے لیے گزشتہ اقوال کی سرگزشت کو مختلف آیات میں بیان کرتا ہے کہ یہ قومیں اتنے امکانات اور فراوان قدرت رکھنے کے باوجود اتنے سادہ عام قسم کے وسائل کے ذیعے کس طرح سے نابود ہو گئیں۔

ہواؤں کے چلنے سے آسمانی بجلی (صاعقہ) کے کوندنے سے، زمین کے ایک زلزلہ سے، حد سے زیادہ بارش کے برسنے سے، خلاصہ یہ ہے کہ پانی، ہوا اور مٹی سے اور بعض اوقات ”سجیل“ (کنکریوں) اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے نابود ہو گئے۔

ان حالات میں یہ سب تفاخر و غرور کس لیے ہے؟

اس بات کے لیے دوسرا عامل وہی ضعف و حقارت کا احساس ہے جو ناکامیوں اور شکستوں سے پیدا ہوتا ہے کہ کچھ افراد اپنی شکستوں کی پردہ پوشی کے لیے تفاخر و مباہات کی پناہ لیتے ہیں۔ اسی لیے ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

”مارجل تکبر او تجبر الا لذتہ وجدھا فی نفسہ“

”کوئی شخص تکبر اور فخر و مباہات نہیں کرتا مگر اس ذلت کی وجہ سے جسے وہ اپنے نفس کے اندر پاتا ہے۔“^(۱)

لہذا جب وہ یہ احساس کرتا ہے کہ وہ حد کمال کو پہنچ گیا ہے، تو پھر وہ تفاخر کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

”ثلاثة من عمل الجاهلیة، الفخر بالانساب، و الطعن فی الاحساب و الاستسقاء بالانواء“

”تین چیزیں ایسی ہیں جو زمانہ جاہلیت کے عمل میں سے ہیں، نسب پر فخر کرنا، لوگوں کی شخصیت اور خاندانی

شرافت میں طعن کرنا ستاروں کے ذریعے بارش طلب کرنا“^(۲)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے آیا ہے:

”اهلك الناس اثنان: خوف الفقر، و طلب الفخر“ دو چیزوں نے لوگوں کو ہلاک کیا: فقر و فاقہ کا خوف (جو انسان کو ہر طریقہ اور ہر ذریعہ سے مال جمع کرنے پر ابھارتا ہے) اور ایک دوسرے پر فخر کرنا۔^(۳)

اور حقیقتاً حرص بخل، دنیا پرستی اور تباہ کرنے والی رقابتوں اور بہت سے اجتماعی مفاسد کے اہم ترین عوامل میں سے ایک یہی فقر و فاقہ کا بلا وجہ خوف اور افراد و قبائل اور امتوں کے درمیان ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرنا اور برتری کا اظہار کرنا ہے اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”ما اخشى عليكم الفقر، ولكن اخشى عليكم التكاثر“ ”میں تم پر فقر و فاقہ سے نہیں ڈرتا، لیکن میں تمہارے تکاثر و تفاخر سے ڈرتا ہوں“^(۴)

”تکاثر“ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی تذکرہ کیا ہے اصل میں تفاخر کے معنی میں ہے، لیکن بعض اوقات یہ زیادہ طلب اور مال جمع کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

”التكاثر، (فی) الاموال جمعها من غير حقها، و منها من حقها، و شدھا فی الاوعية“

”تکاثر، غیر شرعی طریقہ سے مال جمع کرنا، اور اس کا حق ادا نہ کرنا اور اسے صندوقوں اور خزانوں میں جمع کرنا۔^(۵) ہم اس وسیع بحث کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک پر معنی حدیث پر ختم کرتے ہیں، جو آپ نے ”الھاکم التکاثر“ کی تفسیر میں بیان فرمائی ہے:

”يقول ابن آدم مالی مالی، و مالک من مالک الاما کلت فافنیت او لبست فابلیت او تصدقت فامضیت۔“

”انسان کہتا ہے: میرا مال، میرا مال، حالانکہ تیرا مال تو صرف وہ غذا ہے جو تو کھاتا ہے، وہ لباس جو تو پہنتا ہے اور وہ صدقات ہیں جو تو راہ خدا میں دیتا ہے۔“^(۶)

اور یہ ایک بہت ہی عمدہ نکتہ ہے کہ اس فراوان مال میں سے ہر شخص کا حصہ، جسے وہ جمع کرتا ہے، اور اس کے حلال و حرام ہونے کے بارے میں کبھی تھوڑی سی دیر کے لیے بھی غور و فکر نہیں کرتا، اس تھوڑے سے کھانے پینے اور راہ خدا میں خرچ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے وہ بہت ہی کم، حقیر اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور کیا ہی اچھا ہو کہ وہ راہ خدا میں خرچ کرنے میں اپنا حصہ زیادہ کرے۔

۲- ”بحار الانوار“ جلد ۷۳ ص ۲۹۱-

۳- ”بحار الانوار“ جلد ۷۳ ص ۲۹۰ حدیث ۱۲-

۴- ”الدر المنثور“ جلد ۶ ص ۳۸۷-

۵- ”نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۶۶۲ حدیث ۸

۶- ”صحیح مسلم“ (مطابق نقل مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۵۳۴)

۲۔ یقین اور اس کے مراحل

”یقین“ ”شک“ کا نقطہ مقابل ہے، جیسا کہ علم، جہالت کا نقطہ مقابل ہے، اور کسی چیز کے واضح اور ثابت ہونے کے معنی میں آیا ہے، اور اختیار و روایات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کے مطابق ایمان کے اعلیٰ مرحلہ کو یقین کہا جاتا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: ”ایمان اسلام سے ایک درجہ بالاتر ہے، اور تقویٰ ایمان سے ایک درجہ بالاتر ہے، اور یقین تقویٰ سے ایک درجہ بالاتر ہے۔“

اس کے بعد آپ نے فرمایا: ”ولم یقسم بین الناس شیء اقل من الیقین“ ”یقین کی حقیقت اللہ پر توکل کرنا، اللہ کی پاک ذات کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، قضائے الہی پر راضی رہنا اور اپنے تمام کاموں کا خدا کے سپرد کر دینا ہے۔“^(۱)

مقام تقویٰ و ایمان و اسلام سے مقام یقین کی برتری ایک ایسی چیز ہے جس پر دوسری روایات میں بھی تاکید ہوئی ہے۔^(۲)

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

”من صحة یقین المرأ المسلم ان لا یرضی الناس بسخط اللہ ، ولا یلومهم علی ما لم یو ته اللہ ان اللہ بعد له و قسطه جعل الراحة فی الیقین و الرضا و جعل الهم و الحزن فی الشک و السخط:

”مرد مسلمان کے یقین کے صحیح ہونے کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ خدا کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی نہ کرے اور جو کچھ خدا نے اسے نہیں دیا اس پر لوگوں کو ملامت نہ کرے (انہیں اپنی محرومیوں کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے) خدا نے اپنے عدل و انصاف کی بناء پر راحت و آرام، یقین و رضا میں رکھا ہے، اور غم و اندور کو شک اور راضی میں قرار دیا ہے۔“

ان تعبیرات اور دوسری تعبیروں سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جب انسان یقین کے مقام تک پہنچ جاتا ہے تو ایک خاص قسم کا سکون و آرام اس کے سارے دل و جان میں سرایت کر جاتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود یقین کے لیے کئی مراتب ہیں جن میں سرایت کر جاتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود یقین کے لیے کئی مراتب ہیں جن کی طرف اوپر والی آیات اور سورہ واقعہ کی آیہ (انْ هَذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ) میں اشارہ ہوا ہے، اور وہ تین مرحلہ ہیں۔^(۳)

۱۔ علم الیقین: یہ ہے کہ انسان مختلف دلائل سے کسی چیز پر ایمان لائے، اس شخص کے مانند جو دھوئیں کو دیکھ کر آگ کے ہونے پر ایمان لے آتا ہے۔

۲۔ عین الیقین: اس مقام پر حاصل ہوتا ہے جب انسان مشاہدہ کے مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے، اور اپنی آنکھ سے مثلاً کسی آگ کو دیکھ لے۔

۳۔ حق الیقین: اور وہ اس شخص کے مانند ہے جو آگ میں داخل ہو جائے، اور اس کے سوزش اور حرارت کو لمس کرے، اور یہ یقین کا بالاترین مرحلہ ہے۔

محقق طوسی اپنی ایک گفتگو میں کہتے ہیں: ”یقین“ وہی پختہ، اور ثابت اعتقاد ہے، جس کا زوال ممکن نہیں ہے اور حقیقت میں وہ دو علموں سے مرکب ہے۔ ایک معلوم کے متعلق علم، اور دوسرا یہ علم کہ اس علم کے خلاف محال ہے، اور اس کے کئی مراتب ہیں۔ ”علم الیقین“ و ”عین الیقین“ و ”حق الیقین“^(۴)

حقیقت میں پہلا مرحلہ عمومی پہلو رکھتا ہے اور دوسرا مرحلہ پرہیزگاروں کے لیے ہے اور تیسرا مرحلہ خواص اور مقربین کے ساتھ مخصوص ہے۔

اسی سے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں صحابہ نے عرض کیا: ہم نے سنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعض اصحاب پانی پر چلتے تھے؟ آپ نے فرمایا: ”لو كان يقينه اشد من ذالك لمشي على الهواء“

”اگر اس کا یقین اس سے زیادہ پختہ اس سے زیادہ اور محکم ہوتا تو وہ ہوا پر چلتا!“

مرحوم ”علامہ طباطبائی“ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد مزید کہتے ہیں: تمام چیزیں خداوند سبحان پر یقین اور عالم تکوین کے اسباب کی تاثیر کے استقلال کو محو کرنے کے محور کے گرد گھومتی ہیں، اس بناء پر انسان کا قدرت مطلقہ الہیہ پر اعتقاد و ایمان جتنا زیادہ ہوگا، اشیاء عالم اسی نسبت سے اس کے سامنے مطیع و منقاد ہو جائیں گی۔^(۵)

اور عالم آفرینش میں یقین اور خارق العادت تصرف کے رابطہ کی یہی رمز ہے۔

۲۔ ”بحار الانوار“ جلد ۷۰ ص ۱۳۵-۱۳۷۔

۳۔ ”بحار الانوار“ جلد ۷۰ ص ۱۴۳۔

۴۔ ”مطابق نقل بحار الانوار“ جلد ۷۰ ص ۱۴۳۔

۵۔ ”المیزان“ جلد ۶ ص ۲۰۰ (سورہ مائدہ کی آیہ ۱۰۵ کے ذیل میں)

۳۔ سب لوگ دوزخ کا مشاہدہ کریں گے

”لترون الجحیم“ کے جملہ کی دو تفسیریں ہیں پہلی یہ کہ اس سے مراد آخرت میں دوزخ کا مشاہدہ کرنا ہے جو کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یا یہ تمام جن و انس کے لیے عام ہے، کیونکہ قرآن کی بعض آیات کے مطابق سب کو ہی جہنم کے پاس سے گزرنا پڑے گا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد اسی عالم دنیا میں شہود قلبی ہے، اور اس صورت میں یہ جملہ قضیہ شرطیہ کا جواب ہے، فرماتا ہے: ”اگر تم“ ”علم الیقین“ رکھتے ہو تو ”جہنم“ کو اسی عالم میں دل کی آنکھ سے مشاہدہ کر لیتے ”کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بہشت و دوزخ اب بھی خلق شدہ موجود ہیں، اور وجود خارجی رکھتی ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ پہلی تفسیر بعد والی آیات کے ساتھ، جو روز قیامت کی بات کر رہی ہیں، زیادہ زیادہ مناسب ہے، اس بناء پر یہ ایک قطعی اور غیر مشروط قضیہ ہے۔

۴۔ قیامت میں کونسی نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا؟

اس سورہ کی آخری آیت میں آیا ہے کہ یقینی طور پر تم سب سے قیامت کے دن نعمتوں کے بارے میں باز پرس ہوگی، بعض نے تو یہ کہا ہے اس نعمت سے مراد ”سلامتی“ اور ”فراغتِ خاطر“ ہے، اور بعض اسے ”تندرستی“ اور امن و امان سمجھتے ہیں، اور بعض نے تمام ہی نعمتوں کو اس آیت کا مشمول سمجھا ہے۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے: ”النعیم الرطب، و الماء البارد“

”نعیم سے مراد تازہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی“۔

جب کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ”ابو حنیفہ“ نے ”امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا تو امام علیہ السلام نے اس کے سوال کو اسی کی طرف پلٹا کر فرمایا: تیرے نظریہ کے مطابق نعیم سے مراد کیا ہے؟“

اس نے عرض کیا: غذا ہے اور کھانا اور ٹھنڈا پانی ہے۔“ آپ نے فرمایا: اگر خدا قیامت کے دن تجھے اپنی بارگاہ میں اس لیے کھڑا کرے کہ وہ ہر اس لقمہ کا جو تو نے کھایا ہے، اور اور ہر اس گھونٹ کا جو تو نے پیا ہے، تجھ سے سوال کرے، پھر تو تجھے وہاں بہت زیادہ دیر تک ٹھہرنا پڑے گا!“ اس نے عرض کیا: نعیم کیا ہے؟“

آپ نے فرمایا: ”وہ ہم اہل بیت ہیں کہ خدا نے ہمارے ہی ذریعے اپنے بندوں کو نعمت عطا کی ہے اور ان کے درمیان اختلاف کے بعد الفت بخشی ہے، ان کے دلوں کو ہماری وجہ سے آپس میں جوڑ دیا ہے اور انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنایا جبکہ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اور ہمارے ہی ذریعے انہیں اسلام کی طرف ہدایت کی ہے۔۔۔۔۔“

ہاں! نعیم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت ہی ہیں۔“ (۱)

ان روایات کی تفسیر، جو ظاہراً مختلف ہیں، جو تمام مواہب الہی کو، چاہے وہ معنوی ہوں جیسے دین، ایمان، اسلام و قرآن اور ولایت یا انواع و اقسام کی انفرادی و اجتماعی نعمتیں ہوں، ان سب کو شامل ہے۔

البتہ جو نعمتیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، مثلاً نعمت ”ایمان و ولایت“ تو ان کے بارے میں زیادہ سوال ہوگا کہ ان کا حق ادا ہوا ہے یا نہیں؟ اور ظاہراً وہ روایات جو اس آیت کے مادی نعمتوں کے شمول کی نفی کرتی ہیں وہ اس معنی میں ہیں کہ تمہیں اہم تر مصادیق کو چھوڑ کر بہت چھوٹے مصادیق کی طرف نہیں جانا چاہیئے۔ اور حقیقت میں یہ لوگوں کو خدئیٰ ا نعمتوں اور مواہب کے مراتب کے سلسلے میں ایک تنبیہ ہے کہ ان کے لیے ان سے بہت سخت قسم کی باز پرس ہوگی۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ان نعمتوں کے بارے میں سوال نہ ہو حالانکہ یہ بہت ہی بڑے سرمائے ہیں جو نوع بشر کے اختیار میں دیے گئے ہیں۔ اور انہیں ان میں سے ہر ایک کی بڑی باریکی کے ساتھ قدر دانی کرنا چاہیئے اور ان کا شکر بجالانا چاہیئے۔ اور انہیں ان کے صحیح موارد میں صرف کرنا چاہیئے۔

خداوند! اپنی بے انتہا نعمتوں کو، خصوصاً ایمان و ولایت کی نعمت کو ہمیشہ ہمیشہ ہم پر جاری رکھ۔
 پروردگار! ہمیں ان نعمتوں کے حق کی ادائیگی کی توفیق مرحمت فرما۔

بارِ لہا! ہم پر ان عظیم نعمتوں میں اضافہ کرتا رہ، اور انہیں ہرگز ہم سے سلب نہ کرنا۔
آمین یا رب العالمین

سورہ والعصر

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۳ آیات ہیں۔

سورہ والعصر کے مطالب

مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا ہے اگر بعض نے مدنی ہونے کا احتمال بھی ظاہر کیا ہے لیکن سورہ کی آیات کے چھوٹے چھوٹے مقاطع اور اس کا لب و لہجہ اس کے مکی ہونے کا شاہد ہے۔

بہر حال اس سورہ کی جامعیت اس حد تک ہے کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق قرآن کے تمام علوم و مقاصد کا خلاصہ اس سورہ میں موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سورہ نے مختصر ہونے کے باوجود انسا کی سعادت و خوش بختی کا ایک مکمل اور جامع پروگرام پیش کیا ہے۔

سب سے پہلے عصر کی معنی خیز قسم سے شروع ہوتا ہے، جس کی تفسیر عنقریب پیش کی جائے گی، اس کے بعد تمام انسانوں کے زیاں کار اور خسارے میں ہونے کی گفتگو ہے جو تدریجی زندگی کی فطرت میں پوشیدہ ہے۔ اسکے بعد صرف ایک گروہ کو اس اصل کلی سے جدا کرتا ہے، جو ذیل کی چار خصوصیات والے پروگرام کے حامل ہیں:

- ۱۔ ایمان - ۲۔ عمل صالح - ۳۔ ایک دوسرے کے حق کی وصیت کے نالے۔
- ۴۔ ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرنے والے، اور حقیقتاً چار اصول اسلام کی اعتقادی و عملی، اور انفرادی و اجتماعی پروگراموں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔

اس سورہ کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں آیا ہے:

”من قرأ“ و العصر “ فی نوافله بعثہ اللہ یوم القیامۃ مشروفاً وجہہ ضاحکاً سنۃ قریرۃ عینہ حتی یدخل الجنة“

”جو شخص سورہ ”و العصر“ کو نافلہ نمازوں میں پڑھے گا، خدا اسے قیامت کے دن اس حالت میں اٹھائے گا کہ اس کا چہرہ نورانی، لبخنداں، اور اس کی آنکھ خدا کی نعمتوں سے روشن اور ٹھنڈی ہوگی یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ۱ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یہ سب اعزاز و افتخار اور سرور و شادمانی اس شخص کے لیے ہے، جو اپنی زندگی میں ان چار اصولوں پر عمل کرے گا، نہ کہ صرف پڑھنے پر ہی قناعت کرے۔

آیات ۱، ۲، ۳،

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿وَالْعَصْرِ﴾ ۲۔ ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خَسْرٍ﴾ ۳۔ ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾
تواصوا بالصبر۔

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن الرحیم

۱۔ قسم ہے عصر کی۔ ۲۔ کہ سب انسان خسارے میں ہیں۔ ۳۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیئے ہیں، ایک دوسرے کو حق کی وصیت و نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر و استقامت کی وصیت کی۔

نجات کی صرف ایک راہ

اس سورہ کی ابتداء میں ہم ایک نئی قسم سے روبرو ہو رہے ہیں، فرماتا ہے: ”عصر کی قسم“ ﴿وَالْعَصْرِ﴾۔
”عصر“ کا لفظ اصل میں نچوڑنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد اس کا وقت عصر پر اطلاق ہونے لگا کیونکہ اس میں زلزلہ کے پروگراموں کو لپیٹ کر مختصر کر دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد یہ لفظ مطلق ”زمانہ“ اور تاریخ بشر کے دور یا زمانے کے ایک حصہ، جیسے ظہور اسلام اور پیغمبر اکرم کے قیام کے زمانے، اور اسی قسم کے دوسرے زمانوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی لیے اس قسم کی تفسیر میں مفسرین نے بہت زیادہ احتمال دیے ہیں۔

۱۔ بعض اس اسے اسی وقت ”عصر“ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، اس قرینہ سے کہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں دن کے آغاز کی قسم کھائی گئی ہے مثلاً: ﴿وَالضُّحَى﴾ (ضحیٰ آیہ ۱) یا ﴿وَالصُّبْحُ إِذَا اسْفَر﴾ (مدثر۔ ۳۴)

یہ قسم اس اہمیت کی بناء پر ہے جو دن کے اس موقع کو حاصل ہے کیونکہ یہ وقت انسانوں کی حیات اور نظام زندگی کے خاتمے کا وقت ہوتا ہے، دن کے کام اپنے انجام کو پہنچتے ہیں، پرند و چرند اپنے اپنے آشیانوں اور ٹھکانوں کو لوٹتے ہیں، سورج افق مغرب میں اپنا سر چھپا لیتا ہے اور فضا بتدریج تاریک ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہ اختتام اور تغیر انسان کو خدا کی لایزال قدرت کی طرف جو اس نظام پر حاکم ہے متوجہ کرتا ہے اور حقیقت میں یہ توحید کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور پروردگار کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے جو قسم کے لائق ہے۔

۲۔ بعض دوسروں نے اسے تمام زمانے اور تاریخ بشریت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جو در سہائے عبرت، ہلادینے والے حوادث اور بیدار کرنے والے واقعات سے پر ہے، اور اسی بناء پر ایسی عظمت رکھتا ہے کہ خدا کی قسم کے لائق ہے۔

۳۔ اور بعض نے زمانہ کے ایک خاص حصہ کو، جیسے پیغمبر اکرم کے قیام کا زمانہ یا مہدی علیہ السلام کے قیام کا زمانہ، جو تاریخ بشر میں خصوصیت اور مخصوص عظمت کا حامل ہے، مراد لیا ہے اور قسم کو اسی کے بارے میں سمجھتے ہیں۔ ۱

۴۔ اور بعض اس لفظ کے لغوی ریشہ اور جڑ بنیاد کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے اور اس قسم کو ان مشکلات اور دشواریوں کے بارے میں سمجھتے ہیں جو انسانوں کی طویل زندگی میں رونما ہوتے ہیں، انہیں خواب غفلت سے بیدار کرتے ہیں، انہیں خدائے عظیم کی یاد دلاتے ہیں اور روح استقامت کی پرورش کرتے ہیں۔

۵۔ بعض اسے کامل انسانوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو عالم ہستی اور جہان خلقت کا نچوڑ ہیں۔

۶۔ اور آخر میں بعض اسے ”نماز عصر“ کے بارے میں سمجھتے ہیں، اسی خصوصی اہمیت کی بناء پر جو اسے باقی نمازوں میں حاصل ہے کیونکہ وہ ”صلوة وسطیٰ“ جس کے لیے قرآن میں خاص قسم کی تاکید کی گئی ہے نماز عصر کو سمجھتے ہیں۔

اگرچہ اوپر والی تفاسیر آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تضاد نہیں رکھتیں، اور ممکن ہے کہ وہ سب ہی آیت کے معنی میں جمع ہوں، اور ان تمام اہم امور کی قسم کھائی ہو، لیکن ان سب میں، سب سے زیادہ مناسب، عصر کو زمانہ اور تاریخ بشر کے معنی لینا ہی نظر آتا ہے۔

کیونکہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن کی قسمیں ہمیشہ اس مطلب کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے اور مسلمہ طور سے انسانوں کی زندگی میں زیان و خسارہ ان کی عمر کے زمانے کے گزرنے کا نتیجہ ہے، یا پیغمبر خاتم کے قیام کا زمانہ، کیونکہ اس سورہ میں بیان کیے گئے چار اصولوں کا پروگرام اسی زمانہ میں نازل ہوا ہے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے آیات قرآنی کی عظمت اور اس کے مفاہیم کی وسعت اچھی طرح سے واضح ہو گئی ہے کہ ان میں سے ایک ہی لفظ کس حد تک پر معنی اور عمیق و گوناگوں تفاسیر کے لائق ہے۔

بعد والی آیت میں اس چیز کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے یہ اہم قسم کھائی گئی ہے، فرماتا ہے: ”یقینی طور پر تمام انسان خسارے میں ہیں“ ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خَسْرٍ﴾۔

وہ اپنے وجودی سرمائے کو، خواہ چاہیں یا نہ چاہیں، کھو بیٹھے ہیں، عمر کی گھڑیاں، دن، مہینے اور سال تیزی کے ساتھ گزرتے چلے جاتے ہیں، معنوی اور مادی قوتیں تحلیل ہو جاتی ہیں اور طاقت و قدرت گھٹتی چلی جاتی ہیں۔

ہاں! انسان اس شخص کے مانند ہے جس کے پاس عظیم سرمایہ ہو اور اس کی مرضی اور خواہش کے بغیر اس سرمایہ کا ایک حصہ ہر روز اس سے لے لیتے ہوں۔ یہ دنیا کی زندگی معین کا مزاج ہے، ہمیشہ کم ہوتے چلے جانے والا مزاج، ایک دل میں حرکت کرنے کی ایک میں استعداد ہوتی ہے اور جب وہ استعداد اور طاقت ختم ہو جاتی ہے تو دل خود بخود رک جاتا ہے، حالانکہ اس میں کوئی عجیب، بیماری یا علت نہیں ہوتی، اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ وہ کسی بیماری کی وجہ سے پہلے ہی فیل نہ ہو جائے۔ انسانی وجود کے باقی کارخانوں، اور اس کی مختلف استعدادوں کے سرمایوں کا بھی یہی حال ہے۔

”خسر“ (بروزن عسر) اور خسران“ جیسا کہ ”راغب“ مفردات“ میں کہتا ہے: سرمایہ کے کم ہونے کے معنی میں ہے۔

کبھی تو اس کی انسان کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کو نقصان ہو گیا، اور بعض اوقات خود عمل کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ اس کی تجارت میں نقصان ہو گیا۔ یہ لفظ عام طور پر خارجی سرمایوں مثلاً مال و مقام کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور بعض اوقات اندرونی سرمایوں، مثلاً صحت و سلامتی، عقل و ایمان اور ثواب کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہ وہی چیز ہے جسے خداوند عالم نے ”خسران مبین“ (واضح خسارہ) کے عنوان سے ذکر کیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: ان الخاسرين الذين خسروا انفسهم و اھلھم يوم القيامة الا ذالك هو الخسران المبين “واقعی زیاں کار لوگ تو وہ ہیں جو قیامت میں اپنے وجود اور اپنے گھروالوں کے وجود کا سرمایہ ہاتھ سے دے بیٹھیں گے۔ جان لو کہ خسران مبین (واضح خسارہ) یہی ہے۔ (زمر- ۱۵)۔“ (۲)

فخر رازی اس آیات کی تفسیر میں ایک بات نقل کرتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ بزرگوں میں سے ایک کہتے ہیں کہ اس سورہ کا معنی میں نے ایک برف پوش شخص سے سیکھا ہے جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا: ارحموا من یدوب رأس مالہ ارحموا من یدوب رأس مالہ! اس شخص پر رحم کرو جس کا سرمایہ پگھلا جا رہا ہے، اس شخص پر رحم کرو جس کی پونجی پگھل رہی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے یہ کہا ہے معنی ان الانسان لنفی خسرکا: اس پر زمانہ گزرتا چلا جاتا ہے اور اسی عمر ختم ہو جاتی ہے، اور وہ کوئی ثواب حاصل نہیں کرتا، اور وہ اس حال میں خسارے میں ہے۔ (۳)

بہر حال اسلام کی جہان بینی کے لحاظ سے دنیا ایک بازار، تجارت ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں امام ہادی علی بن محمد التقی علیہ السلام سے آیا ہے:

”الدنيا سوق ربح فيها قوم و خسرا خرون“

”دنیا ایک بازار ہے جس میں ایک گروہ نے نفع کمایا اور دوسری جماعت خسارے میں رہی۔“ (۴)

زیر بحث آیت کہتی ہے کہ اس عظیم بازار میں سبھی لوگ خسارے میں رہتے ہیں، سوائے ایک گروہ کے جس کا پروگرام بعد والی آیت میں بیان ہوا ہے۔

ہاں اس عظیم خسارے اور قہری اور جبری نقصان سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، صرف ایک ہی راہ ہے جس کی طرف اس سورہ کی آخری آیت میں اشارہ ہوا ہے، فرماتا ہے: ”سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیے ہیں، اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت اور صبر و استقامت کی نصیحت کرتے ہیں“ ﴿الذین آمنوا و عملوا الصالحات و تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر﴾۔

دوسرے لفظوں میں جو چیز اس عظیم نقصان کو روک سکتی ہے اور اسے عظیم نفع میں تبدیل کر سکتی ہے، یہ ہے کہ اس سرمائے کو ہاتھ سے روک دینے کے مقابلہ میں زیادہ گراں بہا اور قیمتی سرمایہ حاصل کرے، جس سے نہ صرف اس سرمایہ کی خالی جگہ پر ہوگی بلکہ اس سے سینکڑوں اور ہزاروں گنا زیادہ اور بہتر ہو جائے گی۔

ہر سانس جو انسان لیتا ہے اس سے موت کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے، جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام اپنی اس نورانی عبارت میں فرماتے ہیں: ”نفس المرء خطاه الی اجلہ“ ”انسان کا سانس موت کی طرف اس کا ایک قدم ہے“ ۵

اس بناء پر انسان کے دل کی ہر حرکت اسے اختتام عمر سے ایک قدم اور زیادہ نزدیک کر دیتی ہے۔ اس طرح سے اس قطعی نقصان کے مقابلہ میں کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جس سے خالی جگہ پر ہو جائے۔

ایک گروہ عمر اور زندگی کا نفیس سرمایہ ہاتھ سے دے دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں تھوڑا یا زیادہ مال، معمولی گھریا خوبصورت محل فراہم کر لیتا ہے۔

ایک گروہ اس تمام سرمائے کو، مقام و منصب تک پہنچنے کے لیے ضائع کر دیتا ہے۔
اور کچھ لوگ اسے عیش و نوش اور جلدی گزر جانے والی لذتوں میں صرف کر دیتے ہیں۔
مسئلہ طور سے ان میں سے کوئی سی چیز بھی اس عظیم سرمایہ کی قیمت نہیں ہو سکتی، اس کی قیمت صرف اور صرف خدا کی رضا اور اس مقام کا قرب ہے۔

یا جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے:

”انه ليس لانفسكم ثمن الا الجنة فلا تبيعوها الا بها“

”تمہارے وجود کی قیمت جنت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس کو اس سے کمتر کسی چیز کے بدلے میں بیچ دو“^۶

یا جیسا کہ ماہ رجب کی دعائیں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

”خاب الوافدون علی غیرک و خسر المتعرضون الالک“

جو تیرے غیر کے پاس جائیں گے وہ مایوس ہو جائیں گے اور تیرے سوا دوسروں کی طرف رجوع کرنے والے خسارے میں رہیں گے۔

اور قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ”یوم التغابن“ بلا وجہ نہیں ہے جیسا کہ سورہ تغابن کی آیہ ۹ میں آیا ہے: ”ذالک یوم التغابن“ اس دن پتہ چل جائے کہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں۔“

حسن مطلب اور لطف مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف تو انسانی وجود کے سرمایوں کا خریدار خداوندِ عظیم ہے: ”**ان الله**

اشتری من المومنین“ (توبہ - ۱۱۱)

دوسری طرف وہ تھوڑے سے سرمایوں کو بھی خرید لیتا ہے: ”**فمن يعمل مثقال ذرة خیراً یره**“ (زلزال - ۷)
اور تیسری طرف اس کے مقابلہ میں وہ بہت زیادہ قیمت لگاتا ہے۔ کبھی دس گناہ کبھی سات سو گنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ۔ ”فی کل سنبلۃ ماہ جتہ و السہ یضاعف لمن یشاء“ (بقرہ - ۲۶۱)

اور جیسا کہ دعائیں وارد ہوا ہے، یا من یقبل الیسیر ویعفو عن الکثیر: ”اے وہ خدا جو تھوڑے سے حسنات اور نیکیوں کو بھی قبول کر لیتا ہے اور بہت زیادہ گناہوں کو بخش دیتا ہے۔“

اور چوتھی طرف سے، باوجود اس کے کہ یہ تمام سرمائے خود اسی انسان کو دیے جاتے ہیں، وہ اس قدر بزرگوار ہے کہ پلٹ کر انہیں کو زیادہ گراں قیمت پر خرید لیتا ہے۔

۱۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ والعصران الانسان لفی خسر کی تفسیر میں فرمایا: العصر عصر خروج القائم عصر سے مراد حضرت مہدی (سلام اللہ علیہ) کے قیام کا زمانہ ہے۔ (نور الثقلین جلد ۵۔ ۶۶۶ حدیث ۵)

۲۔ ”مفرداتِ راغب“ مادہ ”خسر“

۳۔ ”تفسیر فخر رازی“ جلد ۳۲ ص ۸۵۔

۴۔ ’تحف العقول‘ ص ۳۶۱ (کلمات امام ہادی علیہ السلام)

۵۔ ”نبج البلاغہ“ کلمات قصار جملہ ۷۴۔

۶۔ ”نبج البلاغہ“ کلمات قصار جملہ ۴۵۶۔

خوش بختی کا چار نکاتی پروگرام

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے اس عظیم خسارت کے لیے ایک جامع پروگرام پیش کیا ہے، جس میں چار اصولوں پر تکیہ ہوا ہے۔

پہلی اصل: اس پروگرام میں مسئلہ ”ایمان“ ہے جو انسان کی تمام کارکردگیوں کی بنیاد ہے، کیونکہ انسان کی عملی جدوجہد اس کی فکری و اعتقادی بنیادوں سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے۔ وہ حیوانات کے افعال کی طرح نہیں ہوتیں جن کی حرکات فطری و طبعی اسباب کی بناء پر ہوتی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں انسان کے اعمال اس کے عقائد و افکار کی ایک مجسم صورت ہوتے ہیں، اور اسی بناء پر خدا کے تمام انبیاء ہر چیز سے پہلے امتوں کی اعتقادی بنیادوں کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ اور وہ خصوصیت کے ساتھ شرک سے جو انواع و اقسام کے رذائل، بد بختیوں اور پرانندگیوں کا سرچشمہ ہے مبارزہ کرتے تھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”ایمان“ یہاں مطلق طور پر ذکر ہوا ہے تاکہ ایمان کے تمام کے تمام پہلوؤں کو شامل کیا جائے یعنی خدا اور اس کی صفات پر ایمان سے لے کر قیامت و حساب و کتاب، جزا و سزا، کتب آسمانی، خدا کے انبیاء اور ان کے اوصیاء کے ایمان تک۔

دوسری اصل: میں ایمان کے بار آور اور پرثمر درخت کے پھل اور نتیجہ کو پیش کرتے ہوئے ”اعمال صالح“ کی بات کرتا ہے۔ کیسی وسیع اور مطالب سے پر تعبیر ہے، ہاں! ”صالحات“ وہی سارے کے سارے شائستہ اعمال، نہ صرف عبادات، نہ صرف انفاق فی سبیل اللہ، نہ صرف راہِ خدا میں جہاد، نہ صرف علم و دانش کا حصول، بلکہ ہر وہ شائستہ کام جو تمام میدانوں میں نفوس کے تکامل و ارتقاء، اخلاق کی پرورش، قرب الی اللہ اور انسانی معاشرے کی پیش رفت کا وسیلہ ہو۔

یہ تعبیر چھوٹے سے چھوٹے کاموں سے لے کر۔ جیسے لوگوں کے راستہ سے ایک رکاوٹ ڈالنے والے پتھر کو ہٹانا۔ کروڑوں انسانوں کو گمراہی و ضلالت سے نجات دلانے اور دین حق و عدالت کی سارے جہان میں نشر و اشاعت کرنے تک کو شامل ہے۔

اور اگر ایک حدیث میں ”اعمال صالح“ کی امام جعفر صادق علیہ السلام، ”مواسات اور دینی بھائیوں سے مساوات کرنے“ سے تفسیر ہوئی ہے، تو وہ واضح و روشن مصداق کے قبیل سے ہے۔

ممکن ہے بعض اوقات اعمال صالح بعض غیر مومن انسانوں سے بھی سرزد ہوں، لیکن مسلمہ طور پر وہ مضبوط و پائیدار اور وسعت رکھنے والے نہیں ہوتے، کیونکہ وہ خدائی عمیق اور گہرے اسباب سے سرچشمہ حاصل نہیں کرتے۔ لہذا ان میں جامعیت نہیں ہوتی۔

قرآن نے یہاں ”صالحات“ کو خصوصیت کے ساتھ جمع کی صورت میں بیان کیا ہے، ایسی جمع ہو جو ”الف و لام“ کے ساتھ ہے، اور عموم کے معنی رکھتی ہے۔ اور یہ اس حقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ ایمان کے بعد اس طبعی و قہری خسارے سے روکنے والا راستہ تمام اعمال صالح کو انجام دیتا ہے نہ صرف ایک یا چند اعمال صالح پر قناعت کرنا، اور واقعاً اگر ایمان عمیق اور گہرے طور پر انسان کے دل میں جاگزیں ہو جائے تو وہ ایسے ہی آثار ظاہر کیا کرتا ہے۔ ایمان کوئی فکر اور اعتقاد نہیں ہوتا، جو روح کے گوشوں میں تو موجود ہو لیکن اس میں کسی قسم کی تاثیر موجود نہ ہو۔ ایمان تو انسان کے سارے وجود کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

ایمان اس پر نور چراغ کے مانند ہے جو کسی کمرے کے اندر روشن ہے، جو نہ صرف اس کمرے کی فضا کو روشن کرتا ہے بلکہ اس کی روشنی اس کمرے کے تمام دریچوں سے باہر نکلتی ہے اور جو شخص اس کے باہر سے گزرے وہ اچھی طرح سے سمجھ لیتا ہے کہ اس میں ایک پر نور چراغ روشن ہے۔

اسی طرح سے جب ایمان کا چراغ انسان کے دل کی سرائے میں روشن ہوتا ہے تو اس کا نور انسان کی زبان، آنکھ، کان اور ہاتھ پاؤں سے منعکس ہوتا ہے، ان میں سے ہر ایک کی حرکت بتاتی ہے کہ دل میں ایک نور موجود ہے جس کی شعاعیں باہر نکل رہی ہیں۔

اسی بناء پر قرآن کی آیات میں عام طور پر ”عمل صالح“ ”ایمان“ کے ساتھ ”لازم و ملزوم“ کے عنوان سے آیا ہے

سورہ نخل کی آیہ ۹۷ میں آیا ہے: ﴿مَنْ عَمِلْ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ جو بھی عمل صالح انجام دے، مرد ہو یا عورت، لیکن ہو صاحب ایمان، تو ہم اسے پاکیزہ حیات کے ساتھ زندہ کریں گے۔

اور سورہ مومنون کی آیہ ۹۹-۱۰۰ میں آیا ہے، اس عالم سے جدائی کے بعد بدکاروں کو اس بات پر افسوس ہو گا کہ انہوں نے اعمالِ صالح کیوں انجام نہیں دیے۔ لہذا بہت ہی زیادہ امداد کے ساتھ عملِ صالح کو انجام دینے کے لئے باز گشت کا تقاضا کریں گے: ﴿رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي اَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ﴾ اور سورہ مومنون کی آیہ ۵۱ میں آیا ہے کہ خدا اپنے رسولوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ ”پاک و پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور عملِ صالح بجالاؤ“ ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾

اور چونکہ ایمان و عملِ صالح سوائے اس صورت کے ہر گز جاری نہیں رہتے کہ ایک طرف تو معاشرے میں حق کی طرف دعوت اور اس کی معرفت کے لیے کام کیا جائے اور دوسری طرف سے اس دعوت کی انجام دہی کی راہ میں صبر و استقامت کی دعوت ہو، اس لیے ان دونوں اصولوں کے بعد دوسرے اصولوں کی طرف اشارہ فرماتا ہے، جو حقیقت میں دو بنیادی اصولوں ”ایمان“ اور ”عملِ صالح“ کے اجراء کے ضامن ہیں۔

تیسری فصل: میں ”تواصی بہ حق“ کے مسئلہ یعنی حق کی طرف سب کو عمومی دعوت دینے کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ سب لوگ حق کو باطل سے اچھی طرح پہچان لیں اور ہر گز اسے فراموش نہ کریں اور زندگی کی راہ میں اس سے منحرف نہ ہوں۔

”تواصوا“ ”تواصی“ کے مادہ سے، جیسا کہ ”راغب“ نے ”مفردات“ میں بیان کیا ہے، اس معنی میں ہے کہ بعض افراد دوسرے بعض افراد کو نصیحت کریں۔

اور ”حق“ ”واقعیت“ یا واقعیت سے مطابقت کے معنی میں ہے۔ کتاب ”وجہ قرآن“ میں قرآن مجید میں اس لفظ کے بارہ معانی اور موارد استعمال ذکر ہوئے ہیں، مثلاً خدا، قرآن، اسلام، توحید، عدل، آشکار ہونا، اور واجب ہونا وغیرہ، لیکن وہ سب ہی اسی ریشہ اور جڑ کی طرف لوٹتے ہیں جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔

بہر حال ”﴿تواصوا بالحق﴾“ کا جملہ بہت ہی وسیع معنی رکھتا ہے، جو امر بہ معروف اور نہی از منکر کو بھی شامل ہے، اور جاہل کو تعلیم دینے اور اس کو ہدایت کرنے، غافل کو تنبیہ کرنے، شوق دلانے اور ایمان و عملِ صالح کی تبلیغ کرنے کو بھی۔

یہ بات ظاہر و واضح ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں انہیں خود بھی حق کا طرفدار اور اس کا عامل ہونا چاہیے۔

چوتھی اصل: میں ”صبر“ و استقامت اور اس کی نصیحت و وصیت کرنے کا مسئلہ پیش ہوا ہے، کیونکہ معرفت اور گاہی کے بعد ہر شخص عمل کی راہ میں ہر قدم پر موانع سے روبرو ہوتا ہے۔ اگر استقامت اور صبر نہ ہو تو وہ ہر گز احقاقِ حق نہیں کر سکتا اور کوئی عمل صالح انجام نہیں دے سکتا، یا اپنے ایمان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔

ہاں! احقاقِ حق، اور اجراءِ حق اور معاشرے میں حق کی ادائیگی، ایک عمومی فعالیت اور پختہ و عظیم استقامت یعنی موانع کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کے سوا ممکن نہیں ہے۔

”صبر“ بھی یہاں ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو اطاعت پر صبر کرنے کو بھی شامل ہے، گناہ پر ابھارنے والی چیزوں پر صبر کرنے، اور مصائب اور ناگوار حوادث پر صبر کرنے اور توانائیوں، سرمایوں اور ثمرات کو کھو بیٹھنے کے مقابلہ میں صبر کرنے کو بھی۔ ۱

ان چار اصولوں کے بارے میں جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اور جو حقیقت میں انسانوں کی زندگی اور سعادت کا جامع ترین پروگرام ہے اس کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ روایات میں یہ کیوں آیا ہے کہ ”جنب اصحابِ پیغمبر ایک دوسرے کے پاس جاتے تھے، تو ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے سورہ ”والعصر“ کی تلاوت کیا کرتے تھے، اور اس چھوٹی سی سورت کے عظیم مطالب کو بیان کیا کرتے تھے اور پھر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔ ۲

اور حقیقتاً اگر مسلمان آج بھی اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ان چار اصولوں پر عمل پیرا ہو جائیں، اور دنیا جہاں کے شیروں کے شران سے منقطع ہو جائیں۔

خدا وندا! ہمیں صبر و استقامت اور حق و صبر کی ایک دوسرے کو وصیت کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔
 پروردگارا! ہم سب خسارے میں ہیں اور اس خسارے کی تلافی تیرے لطف و کرم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔
 بار الہا! ہم چاروں احکام پر، جو تو نے اس سورہ میں دیے ہیں، عمل کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اس کی توفیق عطا فرما۔
 آمین یا رب العالمین

۱۔ ہم نے ”صبر کی حقیقت اور اس کے مراحل اور شعبوں کے بارے میں جلد اول میں سورہ بقرہ کی آیہ ۱۵۳ کے ذیل میں مفصل بحث کی ہے۔

سورہ ہمزہ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۹ آیات ہیں۔

سورہ ہمزہ کے مطالب اور فضیلت

یہ سورہ جو مکہ سورتوں میں سے ہے ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جو مال جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور ان کے نزدیک انسانی وجود کی تمام اقدار کا خلاصہ یہی ہے پھر وہ ان لوگوں کو جن کے ہاتھ اس سے خالی ہوتے ہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔

یہ مغرور دولت جمع کرنے والے اور خود پسند جیلہ گر، بادہ کبر و نخوت سے ایسے مست ہو جاتے ہیں کہ دوسروں کی تحقیر، عیب جوئی، استہزاء اور غیبت کرنے سے لذت اٹھاتے ہیں اور اس سے تفریح کرتے ہیں۔

اور سورہ کے آخر میں ان کی دردناک سرنوشت کی بات کرتا ہے کہ وہ کیسی حقارت آمیز صورت میں دوزخ میں پھینکے جائیں گے، اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہر چیز سے پہلے ان کے دل پر مسلط ہو جائے گی، اور ان کی روح و جان کو، جو اس سارے کبر و نخوت اور ان سب شرارتوں کا مرکز تھا، آگ میں ڈال دی جائے گا، بھڑکتی ہوئی دوامی اور طولانی آگ

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

”من قرأ سورة الهمزة اعطى من الاجر عشر حسنات بعدد من استهزأ بمحمد (ص) و اصحابه“:

”جو شخص اس سورہ کی تلاوت کرے گا اسے ان لوگوں کی تعداد سے، جنہوں نے محمد اور ان کے اصحاب کا مذاق اڑا

یا تھا، دس گناہ حسنات دیے جائیں گے“۔^(۱)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے: ”جو شخص اس کو واجب نمازیں پڑھے گا، تو اس سے

فقر و فاقہ دور ہو جائے گا، اور روزی اس کا رخ کرے گی اور قبیح اور بری موت اس سے دور ہو جائے گی“۔^(۲)

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

- ۱۔ ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ - ۲۔ ﴿الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ﴾ - ۳۔ ﴿يَحْسِبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ﴾ -
- ۴۔ ﴿كَأَلَّا لِيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ﴾ - ۵۔ ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ﴾ - ۶۔ ﴿نَارُ اللَّهِ الْمَوْقُودَةُ﴾ -
- ۷۔ ﴿الَّتِي تَطَّعَ عَلَى الْإِفْئَةِ﴾ - ۸۔ ﴿أَتَاهَا عَلَيْهِمْ مَوْ صِدَّةٌ﴾ - ۹۔ ﴿فِي عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ﴾ -

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ہر عیب جو اور تمسخر کرنے والے کے لیے وائے ہے - ۲۔ وہی جو مال کو جمع کر کے گنتا رہا، (جائز و ناجائز کا حساب کیے بغیر)

۳۔ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس کے اموال اس کے دوام کا سبب بن جائیں گے۔

۴۔ جیسا کہ وہ خیال کرتا ہے ایسا نہیں ہے، عنقریب اسے حطمہ (ریزہ ریزہ کرنے والی آگ) میں پھینک دیا جائے گا۔

۵۔ اور تو کیا جانے کہ حطمہ کیا ہے؟ ۶۔ خدا کی بھڑکتی ہوئی آگ - ۷۔ ایسی آگ جو دلوں سے نکلتی ہے۔

۸۔ یہ آگ ان کے اوپر در بستہ صورت میں ہے - ۹۔ کشیدہ اور طولانی ستونوں میں۔

شان نزول

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اس سورہ کی آیات ”ولید بن مغیرہ“ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پس پشت تو آپ کی غیبت کیا کرتا تھا اور آپ کے سامنے طعن و تشنیع اور استہزاء کیا کرتا تھا۔

اور بعض دوسرے مفسرین نے اسے روسائے شرک اور اسلام کے جانے پہچانے دوسرے کینہ ور لوگوں مثلاً: ”اخنس بن شریق“ و ”امیہ بن خلف“ و ”عاص بن وائل“ کے بارے میں سمجھا ہے۔
لیکن ہم ان شان ہائے نزول کو قبول بھی کر لیں تو بھی آیات کے مفہوم کی عمومیت ختم نہیں ہوتی، بلکہ وہ ان تمام کو شامل ہے جو ان صفات کے حامل ہیں۔
عیب جوئی اور غیبت کرنے والوں کے لیے وائے ہے۔

یہ سورہ ایک چھبنے والی تہدید کے ساتھ شروع ہوتا ہے، فرماتا ہے: ”ہر عیب جو اور تمسخر اڑانے والے کے لئے وائے ہے“ ﴿وَلِكُلِّ هَمْزَةٍ لَمْزَةٌ﴾۔

وہ لوگ جو زبان کے ڈنگ، ہاتھ اور پاؤں کی حرکات اور چشم و ابرو کے اشاروں سے، پیٹھ پیچھے اور روبرو دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں، یا ان کی عیب جوئی اور غیبت کرتے ہیں، یا انہیں طعن و تشنیع اور تہمت کے تیروں کا ہدف بناتے ہیں۔ ”ہمزہ“ و ”لمزہ“ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں^(۱)۔

پہلا ”ہمز“ کے مادہ سے اصل میں ”توڑنے“ کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ عیب جو اور غیبت کرنے والے دوسروں کی شخصیت کو توڑتے ہیں اس لیے ان پر ”ہمزہ“ کا اطلاق ہوتا ہے۔

اور ”لمزہ“ ”لمز“ (بروزن رمز) کے مادہ سے اصل میں غیبت کرنے اور عیب جوئی کرنے کے معنی میں ہے۔ اس بارے میں کہ کیا یہ دونوں لفظ ایک ہی معنی میں ہیں اور غیبت کرنے والوں اور عیب جوئی کرنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یا ان دونوں کے درمیان کوئی فرق ہے؟ مفسرین نے بہت سے احتمال دیے ہیں، بعض نے انہیں ایک ہی معنی میں لیا ہے اور اس بناء پر ان دونوں کا اکٹھا ذکر تاکید کے لیے ہے۔

لیکن بعض نے یہ کہا ہے کہ ”ہمزہ“ غیبت کرنے والے کے معنی میں ہے اور ”لمزہ“ عیب جوئی کرنے کے معنی میں ہے۔

بعض دوسروں نے ”ہمزہ“ ان اشخاص کے معنی میں سمجھا ہے جو ہاتھ اور سر کے اشارہ سے عیب جوئی کرتے ہیں اور ”لمزہ“ ان اشخاص کے معنی میں جو زبان سے یہ کام انجام دیتے ہیں۔

اور بعض نے ”پہلے“ کو روبرو عیب جوئی کرنے اور ”دوسرے“ کو پیٹھ پیچھے عیب جوئی کرنے کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

اور بعض نے پہلے کو آشکارا عیب جوئی اور دوسرے کو پنہاں اور آنکھ اور آبرو کے اشارہ سے عیب جوئی کے معنی میں سمجھا ہے۔

اور بعض اوقات یہ کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ہی اس شخص کے معنی میں ہیں جو لوگوں کو برے اور چبھنے والے القاب سے یاد کرتا ہے۔

اور آخر میں ”ابن عباس (رض)“ کی ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ ان دونوں کی تفسیر میں اس طرح کہا کرتے تھے:

”هم المشاؤون بالنميمة، المفرقون بين الاحبة، الناعتون للناس بالعيب“۔

”یہ وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کمرتے ہیں اور دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں اور لوگوں میں عیب نکالتے ہیں“۔^(۲)

گویا ابن عباس (رض) نے اس بات کا اس حدیث سے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے استفادہ کیا ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

”الا نبئکم بشرار کم؟ قالوا: بلی یا رسول اللہ (ص) قال: المشاؤون بالنميمة، المفرقون بين الاحبة، الباغون للبراء المعایب“

”کیا میں تمہیں شریر ترین افراد کی خبر نہ دوں؟ انہوں نے کہا: ہاں اے رسول خدا (ﷺ) فرمایا: وہ لوگ جو بہت زیادہ چغل خوری کرتے ہیں، دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں اور پاکیزہ و بے گناہ افراد کے عیوب کی جستجو میں رہتے ہیں۔“^(۳)

لیکن ارباب لغت کے کلمات کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ ایک ہی معنی میں ہیں اور ایک وسیع معنی رکھتے ہیں، جو ہر قسم کی عیب جوئی، غیبت، طعن و تشنیع اور علائم و اثبات اور زبان کے ذیعے ٹھٹھ کرنے اور مذاق اڑانے اور چغل خوری اور بدگوئی شامل ہے۔

بہر حال اس گروہ کے بارے میں ”ویل“ کی تعبیر ایک تہدید شدید ہے۔ اور اصولی طور پر آیات قرآنی نے اس قسم کے افراد کے لیے سخت تنقید اور اعتراض کیا ہے اور ان کے لیے ایسی تعبیریں استعمال کی ہیں کہ ان جیسی کسی بھی گناہ کے لیے نظر نہیں آتیں۔ مثلاً جب کور دل منافقین کو مومنین کا مذاق اڑانے کی بناء پر عذاب الیم کی تہدید کرتا ہے تو فرماتا ہے:

استغفرلہم اولاً تستغفرلہم ان تستغفرلہم سبعین مرة فلن يغفر الله لہم: تو ان کے لیے استغفار کمر اور چاہے نہ کمر، اگر ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کرے گا تو بھی خدا انہیں نہیں بخشے گا۔“ (توبہ - ۸۰)

اسی معنی کے مشابہ، ان منافقین کے بارے میں، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استہزاء کرتے اور مذاق اڑاتے تھے، سورہ منافقین کی آیہ ۵ میں آیا ہے۔

اصولی طور پر اسلام کی نظر میں اشخاص کی عزت اور حیثیت بہت ہی محترم ہے۔ اور ہر وہ کام جو لوگوں کی تحقیر و تذلیل کا سبب ہو بہت بڑا گناہ ہے۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے: ”اذل الناس من اهان الناس“: ”لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل شخص وہ ہے جو لوگوں کی توہین و تذلیل کرے“۔^(۴)

ہم نے اس سلسلہ میں سورہ حجرات کی آیہ ۱۱، ۱۲ کے ذیل میں (جلد ۱۲ ص ۴۵۸ پر) زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اس کے بعد اس قبیح عمل (عیب جوئی و استہزاء) کے سرچشمہ کو (جو عام طور پر مال و دولت سے پیدا ہونے کبر و غرور کے سبب سے ہوتا ہے) پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”وہی شخص جو مال کو جمع کر کے گنتا رہا، (حلال و حرام کا خیال رکھے بغیر) ﴿الذی جمع مالا وعدہ﴾۔“

اسے مال و دولت کے ساتھ اتنی محبت ہے، کہ وہ ہمیشہ انہیں گنتا رہتا ہے اور درہم و دینار کی چمک اور دوسری قسم کے سکوں سے لذت حاصل کرتا ہے، اور خوش ہوتا ہے ہر درہم و دینار اس کے لیے ایک بت ہے، وہ نہ صرف اپنی شخصیت بلکہ تمام شخصیتوں کو انہیں میں منحصر سمجھتا ہے اور یہ ایک طبعی و فطری امر ہے کہ اس قسم کا گمراہ اور دیوانہ و احمق فقیر و نادار اور مومنین کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتا ہے۔

”عدہ“ اصل میں ”عد“ کے مادہ سے اسے شمار کرنے اور گننے کے معنی میں ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ ”عدہ“ (بروزن عدہ) کے مادہ سے ہے جو ان اموال کو آمادہ کرنے اور مشکلات اور برے دن کے لیے ذخیرہ کرنے کے معنی میں ہے۔

اور بعض نے اس کی تفسیر روک رکھنے اور بچانے کے ساتھ بھی کی ہے۔

لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بہر حال یہ آیت ان مال جمع کرنے والوں کے بارے میں ہے جو مال کو ایک وسیلہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک ہدف اور مقصد کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس کے جمع کرنے میں کسی قسم کی قید و شرط نہیں ہیں۔ وہ اسے حلال و حرام اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کر کے، شریفانہ طریقہ سے، یا پست و رذیلہ طریقہ سے، جمع کرتے ہیں۔ اور صرف اسی کو عظمت و شخصیت کی نشانی سمجھتے ہیں۔

وہ مال و دولت کو زندگی کی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے نہیں چاہتے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مال و دولت میں جتنا اضافہ ہوتا جاتا ہے ان کی حرص اور طمع بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ورنہ معقول حدود میں اور جائز طریقہ سے حاصل شدہ مال و دولت نہ صرف مذموم نہیں ہے بلکہ بعض اوقات قرآن مجید نے اسے ”فضل اللہ“ کے عنوان سے تعبیر کیا ہے، جہاں فرماتا ہے: ﴿وَاتَّبِعُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ (جمعہ ۱۰) اور دوسری جگہ اسے خیر سے تعبیر کرتا ہے ﴿کَتَبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدُکُمُ الْمَوْتَ اَنْ تَرَکَ خَیْرًا لِّوَصِیَّتِهِ﴾: تم پر واجب ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے تو اگر اس نے کچھ خیر چھوڑی ہے تو اس کے لیے وصیت کرے۔

ایسا مال یقینی طور پر نہ تو طغیان و سرکشی کا باعث ہوتا ہے، نہ ہی تفاخر کا سبب بنتا ہے اور نہ ہی وہ دوسروں کے استہزاء کا موجب ہوتا ہے، لیکن وہ مال جو معبود بنا کیا گیا ہے اور وہی اصلی ہدف و مقصد بن چکا ہے، اور وہ اپنے مالکون کو ”قارون“ کی طرح طغیان و سرکشی دعوت دیتا ہے، وہ ننگ و عار ہے، ذلت ہے اور مصیبت و نکبت ہے اور خدا سے دوری اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں رہنے کا باعث ہے۔

عام طور پر اس مال کو زیادہ مقدار میں جمع کرنا بہت زیادہ آلودگیوں کے سوا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے آیا ہے، آپ نے فرمایا:

”لا یجتمع المال الا بخمس خصال“: بخل شدید، وامل طویل، وحرص غالب، واطیث الدنیا علی الآخرة:

”پانچ خصلتوں کے بغیر مال کسی کے پاس جمع نہیں ہو سکتا۔ (۱) بخل شدید (۲) طویل آرزوئیں (۳) حرص غالب (۴) قطع رحمی (۵) اور دنیا کو آخرت پر مقدم رکھنا۔ ۵

جو لوگ سخی ہوتے ہیں اور لمبی لمبی آرزوئیں میں گرفتار نہیں ہوتے، حلال و حرام کا خیال رکھتے ہیں، اپنے اقرباء کی مدد کرتے ہیں، عام طور پر ایسوں کے پاس مال جمع نہیں ہوتا ان کی آمدنی زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”دولت جمع کرنے والا مال پرست انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اس کے اموال اس کی ہمیشگی کا سبب ہے ﴿یَحْسَبُ اَنْ مَالَهُ اَخْلَدَهُ﴾۔ (۶)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”اخلدہ“ یہاں ”فعل ماضی“ کی صورت میں آیا ہے، یعنی وہ یہ گمان کرتا ہے، کہ اس کے اموال نے اسے ایک جاودانی اور دائمی موجود بنا دیا ہے، نہ تو موت اس کے پاس پھٹک سکتی ہے، اور نہ ہی بیماریاں اور

دنیا کے حوادث اس کے لیے کوئی مشکل پیدا کر سکتے ہیں، کیونکہ اس کی نظر میں مشکل کشا صرف مال و دولت ہے، اور یہ مشکل کشا اس کے پاس حاضر ہے۔ یہ تصور کتنا غلط اور خام خیالی ہے؟ اس قدر مال و دولت جو قارون کے قبضہ و اختیار میں تھا، کہ اس کے خزانوں کی چابیاں کئی طاقتور مرد بڑی مشکل سے اٹھا سکتے تھے، لیکن عذاب الہی کے حملہ کے وقت وہ اس کی موت کو ایک گھڑی کے لیے متوجہ نہ کر سکے اور خدا نے اسے اور اس کے خزانوں کو ایک ہی لمحہ میں مختصر سے زلزلہ کے ساتھ زمین میں دھنسا دیا: ﴿فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ﴾ (قصص - ۸۱)

وہ اموال جن کا کامل نمونہ فراعنہ مصر کے پاس تھا، لیکن مصداق ”کم تر کوا من جنات و عیون و زروع و مقام کریم و نعمة کانوا فیہا فاکھین“: ”وہ کتنے زیادہ باغات اور چشمے کھیتیاں اور عمدہ و قیمتی محلات، اور دوسری فراواں نعمتیں جن میں وہ ناز و نعمت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔“ (دخان - ۲۵ تا ۲۷) لیکن یہ سب کے سب آسانی کے ساتھ ایک ہی ساعت میں دوسروں کے ہاتھ میں پہنچ گئے: ”کذا لک و اورثنا قوماً آخرین، (دخان - ۲۸) اور اسی لیے کیونکہ قیامت میں پردے ہٹ جائیں گے، اور انہیں اپنی عظیم غلطی کا علم ہو جائے گا، تو وہ پکار اٹھیں گے: ﴿مَا اغْنَىٰ عَنِّي مَا لِيهِ هَلْكَ عَنِّي سُلْطَانِيهِ﴾: ”میرے مال و دولت نے مجھے ہرگز بے نیاز نہیں کیا، اور میری قدرت و طاقت و اقتدار بھی میرے پاس نہ رہے۔ (حاقہ - ۲۸-۲۹)

اصولی طور پر انسان فنا و نیستی سے متنفر ہے۔ اور وہ ہمیشگی اور دام کا طرف دار ہے، اور یہی اندرونی لگاؤ ہماری معاد کے مباحث میں مدد کرتا ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ انسان ہمیشگی اور دام کے لیے پیدا ہوا ہے، ورنہ جاوداں ہونے کے ساتھ لگاؤ کی فطری خواہش اس میں نہ ہوتی۔

لیکن یہ مغرور خود غرض اور دنیا پرست انسان اپنی ہمیشگی کو ایسے امور میں سمجھنے لگتا ہے جو ٹھیک اس کی فنا و نیستی کا سبب ہیں، مثلاً وہ مال و مقام کو، جو عام طور پر اس کی بقاء کے دشمن ہیں دوام کا ذریعہ شمار کرنے لگتا ہے۔ اس بیان سے واضح ہو گیا کہ مال کے ذریعے دوام اور ہمیشگی کا تصور، مال کے جمع کرنے کی ایک دلیل ہے اور ان دل کے اندھوں کی نظر میں مال کا جمع ہو جانا بھی دوسروں پر استہزاء اور تمسخر کرنے کا ایک عامل شمار ہوتا ہے۔ قرآن اس گروہ کے جواب میں فرماتا ہے: ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ گمان کرتا ہے: (کلا)۔

بلکہ وہ عنقریب انتہائی ذلت و خواری کے ساتھ پاش پاش کرنے والی آگ میں پھینک دیے جائیں گے۔ ﴿لَيَبْذَنَّٰهُنَّ الْحَطْمَةُ﴾۔ اس کے بعد حطمہ کی اس طرح تفسیر کرتا ہے: ”اور تو کیا جانے کہ حطمہ کیا ہے“ ﴿وَمَا ادْرَاكَ مَا الْحَطْمَةُ﴾۔

”وہ خدا کی بھڑکی ہوئی آگ ہے۔“ ﴿نار اللہ الموقدة﴾۔ ”وہ آگ جو دلوں سے نکلے گی اور اس کے ابتدائی شعلے دلوں میں ظاہر ہوں گے۔“ ﴿التی تطلع علی الافئدة﴾۔

﴿لینبذن﴾ ”نبذ“ (بروزن سبز) کے مادہ سے ”مفردات“ میں ”راغب“ کے قول کے مطابق، اصل میں کسی چیز کو اس کی حقارت اور بے قدری کی وجہ سے دور پھینکنے کے معنی میں ہے۔
یعنی خدا ان مغرور، خود خواہ، اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والوں کو اس دن ذلیل اور بے قدر و قیمت موجودات کی صورت میں جہنم کی آگ میں پھینکے گا، تاکہ وہ اپنے کبر و غرور کا نتیجہ دیکھ لیں۔

”حطمہ“ ”حطم“ کے مادہ سے مبالغہ کا صیغہ ہے جو کسی چیز کو درہم برہم کرنے کے معنی میں ہے، اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ بڑی سختی کے ساتھ ان کے اعضاء و جوارح کو توڑ کر رکھ دے گی، لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ”حطمہ“ ساری جہنم کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے حد سے زیادہ گرم اور بھڑکتے ہوئے حصہ کا نام ہے۔^(۷)

اس معنی کو سمجھنا کہ آگ جلانے کے بجائے اعضاء کو توڑ دے گی، شاید گزشتہ زمانوں میں تو مشکل ہو، لیکن موجودہ زما نہ میں بم کے پھٹنے کی لہروں کی تاثیر کی شدت کا مسئلہ ہم سب پر واضح ہو چکا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک خوفناک بم کے پھٹنے سے پیدا ہونے والی لہریں، نہ صرف انسانوں کو بلکہ لوہے کے محکم گارڈروں اور عمارتوں کے بڑے بڑے ستونوں کو بھی توڑ دیتی ہیں، یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

”نار اللہ“ (خدا کی آگ) کی تعبیر اس کی عظمت کی دلیل ہے اور ”موقدة“ کی تعبیر اس کے ہمیشہ کے لیے روشن ہونے کی دلیل ہے۔

تعب کی بات یہ ہے کہ یہ آگ دنیا کی آگ کے برخلاف، جو پہلے چمڑے کو جلاتی ہے، اور اس کے بعد بدن کے اندر نفوذ کرتی ہے، سب سے پہلے دلوں میں شعلہ ور ہوگی اور اندر کو جلائے گی۔ پہلے دل کو جلائے گی پھر دماغ اور ہڈیوں کو اور اس کے بعد باہر کی طرف سرایت کرے گی۔

یہ کس قسم کی آگ ہے جس کا پہلا شعلہ انسان کے دل میں ظاہر ہوگا؟ یہ کیسی آگ ہے جو باطن کو ظاہر سے پہلے جلائے گی؟ قیامت کی ہر چیز عجیب و غریب ہے اور اس کا اس جہان کی باتوں کے ساتھ بہت زیادہ فرق ہے، یہاں تک کہ اس کی جلانے والی آگ کی گرفت میں بھی ایک الگ خاصیت ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو؟ جب کہ ان کے دل ہی تو کفر اور کبر و نخوت کا مرکز تھے، اور وہ حبِ دنیا اور مال و دولت کی محبت کا محور بنے ہوئے تھے

خدا کے قہر و غضب کی آگ ہر چیز سے پہلے ان کے دلوں پر کیوں مسلط نہ ہو، جب کہ انہوں نے اس دنیا میں مومنین کے دل کو تمسخر، عیب جوئی، غیبت اور تحقیر و تذلیل کے ساتھ جلایا تھا۔ لہذا عدالتِ الہی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے اعمال جیسا ہی کیفرِ کردار دیکھیں۔

اس سورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے: ”یہ جلانے والی آگ ان پر دروازہ بند صورت میں ہوگی“۔ ﴿انھا علیہم مو

صدۃ﴾۔

”موصدة“ ”ایصاد“ کے مادہ سے، دروازہ بند کرنے اور اس کو محکم کرنے کے معنی میں ہے، اسی لئے ان کمروں کو جو پہاڑوں کے اندر مال جمع کرنے کے لیے بناتے ہیں ”وصید“ کہتے تھے۔

حقیقت میں جیسا کہ وہ اپنے اموال کو مضبوط صندوقوں اور در بست خزانوں میں محفوظ کر کے رکھا کرتے تھے، خدا بھی انہیں دوزخ کے در بست عذاب، میں جس سے خلاصی اور نجات پانے کی کوئی راہ نہ ہوگی، قید کرے گا۔ اور آخر میں فرماتا ہے:

”انہیں کھینچے ہوئے اور طولانی ستونوں میں رکھا جائے گا“ ﴿فی عمد ممددة﴾۔

”عمد“ ”عمود“ جیسا کہ لکڑی اور لوہے کی قطعات (شہتیر) ہوتے ہیں ”ممددة“ کھینچے ہوئے اور طولانی کے معنی میں ہے

مفسرین کی ایک جماعت نے اس تعبیر کو لوہے کی بڑی بڑی میخوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جن کے ساتھ جہنم کے دروازے محکم طور پر جڑے ہوئے ہوں گے، اس طرح کہ ان سے نکلنے کی بالکل کوئی راہ نہ ہوگی۔ اس بناء پر یہ گزشتہ آیت پر ایک تاکید ہے جو یہ کہتی ہے کہ جہنم کے دروازوں کو ان پر بند کر دیں گے، اور وہ ہر طرف سے محصور ہو کر رہ جائیں گے۔

بعض نے اسے عذاب و مجازات کے وسائل کی ایک قسم کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اس چیز کے مانند جو ہمارے ہاں ”ہتھکڑی اور بیڑی“ کے ساتھ معروف ہے، اور لکڑی یا لوہے کا ایک وزنی ٹکڑا ہوتا ہے جس میں پاؤں کے ناپ کے برابر دو سوراخ ہوتے ہیں، اس میں پاؤں کو رکھ دیتے ہیں اور اس کے اوپر سوراخ سے پکڑ کر اس میں تالہ لگا دیتے ہیں۔

اس طرح اس آدمی میں چلنے کی طاقت نہیں رہتی تھی، اور یہ ان شکنجوں کی سزا ہو گی جو وہ بے گناہ لوگوں کو دیا کرتے تھے۔

بعض نے ایک تیسری تفسیر بھی آخری انکشافات کی مدد سے اس کے لیے بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جہنم کے جلانے والے شعلے کشیدہ اور طولانی ستونوں کی طرح ان پر مسلط ہو جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ آخری انکشافات میں ثابت ہوا ہے کہ ریکس (رونٹگن) کی مخصوص شعاعیں، دوسری شعاعوں کے برخلاف جو مخروطی صورت میں پھیلتی ہیں، وہ استوانی صورت میں ٹھیک ستون کی طرح منتشر ہوتی ہیں، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ شعاعیں انسان کے سارے وجود میں نفوذ کر جاتی ہیں، یہاں تک کہ اس کے دل پر بھی مسلط ہو جاتی ہیں، اور اسی بناء پر داخلی اعضاء کا ایکسرے لینے کے لیے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ سے ایسی شعاعیں اٹھیں گی جو اوپر والی شعاعوں سے ملتی جلتی ہوں گے۔^۸

لیکن ان تفاسیر میں سب سے زیادہ مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔ (البتہ ان تفاسیر میں بعض کی بناء پر ”فی عمد مددہ“) کا جملہ دوزخ کی حالت کو بیان کرتا ہے اور دوسری بعض کی بناء پر دوزخیوں کی حالت کو)

۱۔ مبالغہ کا صیغہ مشہور چھ اوزان کے علاوہ دوسرے اوزان پر بھی آتا ہے، منجملہ ان کے ایک یہی وزن ہے، جس کی عربی زبان میں نظائر بھی موجود ہیں، مثلاً: ”ضحک“ جو بہت زیادہ ہنسنے والے کے معنی میں ہے۔

۲۔ ”تفسیر فخر رازی“ جلد ۳۲ ص ۹۲۔

۳۔ ”اصول کافی جلد ۲ باب النبیۃ حدیث ۱

۴۔ ”بحار الانوار“ جلد ۷۵ ص ۱۴۲۔

۵۔ ”تور الثقلین“ جلد ۵ ص ۶۶۸ حدیث ۷

۶۔ ”مال“ ممکن ہے کہ ”مال“ ضمیر غائب کی طرف مضاف ہو، یا ”ما“ موصولہ اور اس کے صلہ سے مرکب ہو، ”اخلدہ“ کا جملہ جو کہ فعل ماضی ہے مضارع کے معنی میں ہے۔ یا خلود کے موجبات و اسباب کے معنی میں ہے۔

۷۔ ”تور الثقلین“ جلد ۳ ص ۱۷، ۱۹ حدیث ۶۰، ۶۴

۸۔ ”طفاوی“ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۱۔ کبر و غرور بڑے برے گناہوں کا سرچشمہ ہے

”اپنے آپ کو بڑا خیال کرنا ایسی عظیم بلا ہے جو بہت سے گناہوں کی اصل اور بنیاد قرار پاتی ہے۔ خدا سے غفلت، نعمتوں کا کفران، عیاشی اور ہوس بازی میں غرق ہونا، دوسروں کی تحقیر و تذلیل، مومنین کا مذاق اڑانا، اسی صفتِ رذیلہ کے منحوس اور برے اثرات ہیں۔

کم ظرف لوگ جب کسی مقام و منصب یا کسی اچھی منزل پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ ایسے کبر و غرور میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ کسی دوسرے کے لیے کسی قدر و قیمت کے قائل ہی نہیں ہوتے۔ اور یہی چیز ان کے معاشرے سے جدا ہونے اور معاشرے کے ان سے الگ ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔

وہ اپنے ہی تصورات و خیالات کی دنیا میں ڈوبے رہتے ہیں اور خود کو باقیوں سے علیحدہ کوئی اور مخلوق خیال کرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقربانِ خدا میں بھی شمار کرنے لگتے ہیں، اور اسی وجہ سے دوسروں کی عزت و آبرو بلکہ ان کی جان تک بھی ان کے نظر میں بے قدر و قیمت ہو جاتی ہے، اور وہ ”ہمز“ و ”لمز“ یا دوسروں کی عیب جوئی اور مذمت میں مشغول ہو جاتے ہیں اور یوں اپنے خیال میں وہ اپنی عظمت میں اضافہ کرتے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں اس قسم کے افراد کو عقرب (بچھو) سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اگرچہ بچھو کا ڈنگ مارنا کسی کینہ کی وجہ سے نہیں ہوتا، لیکن ان کا ڈنگ مارنا کینہ پروری کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم نے فرمایا: ”میں نے شبِ معراج دوزخیوں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ ان کے پہلو و س کے گوشت الگ کر کے انہیں کھلاتے تھے۔ میں نے جبریل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا:

”ہؤلاء الھمازون من امتک، المازون!“:

”یہ آپ کی امت میں سے عیب جوئی کرنے والے اور استہزاء کرنے والے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ہم نے سورہ حجرات کی آیات کے ذیل میں اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کی ہے۔

۲۔ مال جمع کرنے کی حرص

مال و دولت کے بارے میں افراط و تفریط کے لحاظ سے مختلف نظریے پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو اس کو اتنی جلدی اہمیت دیتے ہیں کہ اسے تمام مشکلات کا حل سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس نظریے کے طرف داروں نے اپنے اشعار میں اس سلسلہ میں خوب دادِ سخن دی ہے، منجملہ ایک شاعر عرب کہتا ہے:

”فصاحة سحبان و خط ابن مقله و حكمة لقمان و زهد بن ادهم

اذا اجتمعت في المرء و المرء مفلس فليس له قدر بمقدار درهم“

”(عرب کے معروف فصیح) ”سحبان کی فصاحت“ اور معروف خطاط) ”ابن مقلہ کا خط اور ”لقمان“ کی حکمت اور ”ابراہیم بن ادہم“ کا زہد اگر کسی انسان میں جمع ہو جائے اور مفلس و نادار ہو، تو اس کی قدر و قیمت ایک درہم کے برابر بھی نہیں ہوگی!“

لہذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے اگر یہ گروہ ہمیشہ مال جمع کرنے میں مشغول رہے اور ایک آن کے لیے بھی راحت و آرام سے نہ بیٹھے اور اس کے لیے کسی بھی قید و شرط کا قائل نہ ہو اور حلال و حرام ان کی نظر میں یکساں ہو جائے۔

اس گروہ کے نقطہ مقابل میں وہ گروہ ہے جو مال و دولت کے لیے کم سے کم قدر و قیمت کا بھی قائل نہیں ہے۔ وہ فقر و فاقہ کی تعریف کرتا ہے اور اس کی عظمت و بلندی کا قائل ہے، یہاں تک کہ وہ مال کو تقویٰ اور قربِ خدا میں مزاحم سمجھتے ہیں۔ لیکن دونوں نظریات کے مقابلہ میں (جو افراط و تفریط رکھتے ہیں) قرآن مجید اور اسلامی روایات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مال اچھی چیز ہے، لیکن چند شرائط کے ساتھ:

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ذریعہ اور وسیلہ ہو نہ کہ ہدف اور مقصد۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنا ”اسیر“ نہ بنائے بلکہ انسان اس کا ”امیر“ ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اسے مشروع اور حلال طریقہ سے حاصل کیا جائے اور وہ رضائے خدا کے لیے صرف ہو۔

اس قسم کے مال سے محبت نہ صرف یہ کہ وہ دنیا پرستی نہیں ہے، بلکہ آخرت سے محبت کی ایک دلیل ہے۔ اسی لیے

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

”جس وقت آپ نے ذہب و فضہ (سونا چاندی) پر لعنت کی، تو آپ کے ایک صحابی نے تعجب کیا، اور اس بارے میں

سوال کیا تو امام علیہ السلام نے فرمایا: ”لیس حیث تذهب الیہ انما الذہب الذی ذہب بالذین و الفضة الّتی افاضت

الكفر“:”(ذہب) سونے سے مراد وہ چیز ہے جو دین کو ختم کر دے اور فضہ (چاندی) سے مراد وہ چیز ہے جو کفر و بے ایمانی کا سرچشمہ بنے۔^(۱)

ایک اور حدیث میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے آیا ہے:
”السکر اربع سكرات سكر الشراب و سكر المال، و سكر النوم، و سكر الملك۔“
”نشہ اور مستی چار قسم کی ہوتی ہے: ۱۔ شراب کی مستی ۲۔ مال کی مستی ۳۔ نیند کی مستی ۴۔ اقتدار کی مستی۔“^(۲)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا، میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھے کچھ وعظ و نصیحت فرمائیے، تو آپ نے فرمایا:
”ان كان الحسنات حقاً فالجمع لماذا وان كان الخلف من الله عز و جل حقاً فالبلخل لماذا؟!“
”اگر حسنات حق ہیں اور ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر مال کا جمع کرنا کس لیے؟ (کیوں اسے راہ خدا میں خرچ نہ کریں) اور اگر بدلہ دینا اور تلافی کرنا اللہ کی طرف سے حق ہے، تو بلخل کس لیے؟۔“^(۳)
بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آخر عمر تک مال جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور انجام کار دوسروں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کا حساب تو انہیں دینا پڑے گا اور اس سے فائدہ دوسرے لوگ اٹھائیں گے۔ اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں نے امیر المومنین علی علیہ السلام سے سوال کیا، من اعظم الناس حسرة؟: لوگوں میں سب سے زیادہ حسرت و ندامت کس کو ہوگی؟
آپ نے فرمایا:

”من رأى ماله فى الميزان غيره و ادخله الله به النار و ادخل وارثه به الجنة“
وہ شخص جو اپنے اموال کو دوسروں کے اعمال میں تولنے کی ترازوں میں دیکھے، خدا اسے تو اس کے اموال کی وجہ سے دوزخ میں داخل کرے، اور اس کے وارث کو اس کی وجہ سے جنت میں داخل کرے۔“^(۴)
ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے آیہ ”کذا لک یرہم اللہ اعمالہم حسرات علیہم“: (اسی طرح سے خدا ان کے اعمال کو ان کے لیے حسرت بنا دے گا) کی تفسیر میں فرمایا:

”هو الرجل يدع المال لا ينفقه فى طاعة الله بخلا ثم يموت فیدعه لمن يعمل به فى طاعة الله او فى معصیه“

”یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو مال چھوڑ جاتا ہے اور بخل کی وجہ سے اسے راہ خدا میں خرچ کرتا۔ پھر مرجاتا ہے، اور اسے ایسے شخص کے لیے چھوڑ جاتا ہے جو اسے اللہ کی طاعت یا اس کی معصیت میں خرچ کرتا ہے۔“
اس کے بعد امام نے مزید فرمایا:

”اگر وہ خدا کی اطاعت میں خرچ کرے گا تو وہ اسے دوسرے کی میزان عمل میں دیکھ کر حسرت کرے گا کیونکہ وہ مال تو اس کی ملکیت تھا، اور اگر وہ خدا کی معصیت و نافرمانی میں صرف کرے گا، تو وہ گناہ کرنے میں اس کی تقویت کا سبب بنا (اس پر بھی اسے عقوبت اور حسرت ہوگی)۔“^(۵)

ہاں! انسان مال کو مختلف انداز میں استعمال کرتے ہیں، کبھی تو اس سے ایک خطرناک بت بنا لیتے ہیں، اور کبھی عظیم سعادت کا وسیلہ۔

اس گفتگو کو ہم ”ابن عباس (رض) سے منقول ایک پر معنی حدیث پر ختم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

”ان اول درہم و دینار ضربا فی الارض نظر الیہما ابلیس فلما عاینہما اخذہما فوضعہما علی عینیہ، ثم ضمہما علی صدرہ، ثم صرخ صرخۃ، ثم ضمہما الی صدرہ، ثم قال: انتما قرۃ عینی! و ثمرۃ فواد ما ابالی من بنی آدم اذا احبوکما“ ان لا یعبدوا و ثنا! حسبی من بنی آدم آدم ان یحبوا کما: (۶)

”جب دنیا میں درہم و دینار کا سب سے پہلا سکہ بنایا گیا تو ابلیس نے ان پر نگاہ کی، جب انہیں دیکھا تو اس نے ان دونوں کو اٹھا لیا اور دونوں کو اپنی آنکھوں پر رکھا، پھر انہیں سینہ سے لگا لیا۔ پھر وہ والہانہ طور پر چیخا اور دوبارہ انہیں سینہ سے لگا لیا اور کہنے لگا: تم (اے درہم و دینار) میری آنکھوں کی روشنی ہو، تم میرے دل کا میوہ ہو۔ اگر انسان تمہیں دوست بنالیں تو میرے لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ بت پرستی نہ کریں۔ بس میرے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ تم سے محبت کرنے لگیں، (کیونکہ تم سب بتوں سے بڑھ کر بت ہو)۔“^(۷)

خدا وندا! ہمیں مال و غضب، دنیا و شہوت کی ہستی سے محفوظ فرما۔

پروردگار! ہمیں شیطان کے تسلط اور درہم و دینار کی بندگی سے رہائی عطا فرما۔

بارالہا! جہنم کی آگ سخت توڑنے والی ہے اور تیرے لطف و کرم کے بغیر اس سے نجات ممکن نہیں ہے۔ ہمیں

اپنے لطف کا مشمول قرار دے۔

آمین یا رب العالمین

١- ”بحار الانوار“ جلد ٧٣ ص ١٤١ حديث ١٧-

٢- ”بحار الانوار“ جلد ٧٣ ص ١٤٢-

٣- ”توحيد صدوق“ مطابق نقل ”نور الثقلين“ جلد ٥ ص ٦٦٨ حديث ٨-

٤- ”بحار الانوار“ جلد ٧٣ ص ١٤٢-

٥- ”بحار الانوار“ جلد ٧٣ ص ١٤٢-

٦- ”بحار الانوار“ جلد ٧٣ ص ١٤٢-

٧- ”بحار الانوار“ جلد ٧٣ ص ١٣٧ حديث ٣

سورہ فیل

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں پانچ آیات ہیں۔

سورہ فیل کے مطالب

یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے ایک مشہور تاریخی داستان کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے سال واقع ہوئی تھی اور خدا نے خانہ ”کعبہ“ کو کفار کے اس عظیم لشکر کے شر سے محفوظ رکھا تھا جو سرزمین یمن سے ہاتھیوں پر سوار ہو کر آیا تھا۔

یہ سورہ اس عجیب داستان کی یاد دلاتا ہے جو مکہ کے بہت سے لوگوں کو یاد تھی، کیونکہ وہ ماضی قریب میں واقع ہوئی تھی۔

اس داستان کی یاد آوری مغرور اور ہٹ دھرم کفار کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ یہ جان لیں کہ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے۔ وہ خدا جس نے ہاتھیوں کے اس عظیم لشکر کو ان چھوٹے چھوٹے پرندوں، اور ان نیم بند کنکریوں (حجارة من سجيل) سے ریزہ ریزہ کر دیا۔ وہ ان ہٹ دھرم متکبرین کو سزا دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ نہ تو ان کی قدرت ہی ”ابرہہ“ کی قدرت سے زیادہ تھی اور نہ ہی ان کے لشکر کو اور افراد کی تعداد کبھی اس حد تک پہنچی تھی۔ یعنی تم لوگ جنہوں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے، غرور و تکبر کی وادی سے نیچے کیوں نہیں اترے؟!

اور اس کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

جو شخص سورہ فیل کو نماز واجب میں پڑھے گا قیامت میں ہر پہاڑ اور ہموار زمین اور ہر ڈھیلہ اس کی گواہی دے گا وہ نماز گزاروں میں سے ہے اور ایک منادی ندا دے گا کہ تم نے میرے پرندے کے بارے میں کہا ہے۔ میں تمہاری گواہی کو اس کے نفع یا نقصان میں قبول کرتا ہوں میرے بندے کو حساب کے بغیر جنت میں داخل کر دو، کیونکہ وہ ایسا شخص ہے جسے میں دوست رکھتا ہوں اور اس کے عمل کو بھی دوست رکھتا ہوں۔^(۱)

یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ یہ سب فضیلت و ثواب اور عظیم جزا اس شخص کے لیے ہے جو ان آیات کو پڑھ کے غرور و تکبر کی سواری سے نیچے اتر آئے اور رضائے الہی کی راہ میں قدم رکھ دے۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿الْمَ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ﴾ - ۲۔ ﴿الْمَ يَجْعَلُ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ﴾ -

۳۔ ﴿وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ﴾ - ۴۔ ﴿تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِنْ سِجِّيلٍ﴾ -

۵۔ ﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَأْكُولٍ﴾ -

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

۱۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے اصحابِ فیل (ابرہہ کے لشکر کو جو کعبہ کو نابود کرنے کے ارادے سے آیا تھا) کے ساتھ کیا کیا۔

۲۔ کیا ان کے منصوبہ کو خاک میں نہیں ملا دیا؟ ۳۔ اور ان کے اوپر گروہ در گروہ پرندے بھیجے۔

۴۔ جو ان کے اوپر چھوٹی چھوٹی کنکریاں برسا رہے تھے۔ ۵۔ اور اس طرح انہیں کھاتے ہوئے بھوسہ کی مانند بنا دیا۔

شان نزول

ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے آیا ہے کہ :

”ابو طالب ہمیشہ اپنی تلوار کے ذریعے پیغمبر اسلام کا دفاع کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے فرماتے ہیں: (ایک دن) ابو طالب نے کہا: اے بھتیجے! کیا آپ سب لوگوں کے لیے مبعوث ہوئے ہیں یا صرف اپنی قوم کے لیے بھیجے گئے ہیں (پیغمبر نے فرمایا: ”نہیں! میں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں، وہ گورا ہو یا کالا، عربی ہو، یا عجمی۔ اسی ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں تمام انسانوں کو چاہے وہ گورے ہوں یا کالے اس دین کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اور ان تمام لوگوں کو جو پہاڑ کی چوٹی پر بستے ہیں یا دریاؤں میں رہتے ہیں اس دین کی طرف بلاتا ہوں، اور میں فارس و روم کی تمام زبانوں کو دعوت دیتا ہوں۔“

جب یہ گفتگو قریش کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے تعجب کیا اور کہا، کیا آپ اپنے بھتیجے کی باتوں کو نہیں سنتے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ خدا کی قسم اگر فارس و روم کے لوگ یہ بات سن لیں گے تو ہمیں ہماری سرزمین سے باہر نکال کھڑا کریں گے اور خانہ کعبہ کے پتھروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے الگ الگ کر دیں گے۔ اس موقع پر خدا نے آیہ شریفہ ﴿وَقَالُوا إِنَّا نَتَّبِعُ الْهُدَىٰ مَعَكَ نَتَّخِطُفَ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَمْ نَمُكِّنْ لَهُمْ حَرَمًا مِّنَّا يُجِبِي إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾: ”انہوں نے کہا: اگر ہم تیرے ساتھ مل کر ہدایت کو قبول کر لیں تو ہمیں ہماری سرزمین سے باہر نکال دیں گے، کیا ہم نے انہیں امن کے اس حرم میں، جس کی طرف ہر طرح کے پھل لاتے ہیں، جگہ نہیں دی“ (قصص - ۵۷) نازل ہوئی۔

اور ان کے اس قول کے بارے میں کہ وہ خانہ کعبہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے سورہ فیل نازل کی۔ (اور انہیں گوش گزار کیا کہ کوئی شخص بھی اس قسم کے کام کی قدرت نہیں رکھتا)۔^(۲)

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۳۹۔

۲۔ روضۃ الواعظین“ (مطابق نقل ”نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۶۶۹ حدیث ۸)

اصحاب فیل کی داستان

مفسرین اور مورخین نے اس داستان کو مختلف صورتوں میں نقل کیا ہے، اور اس کے وقوع کے سال میں بھی اختلاف ہے لیکن اصل داستان ایسی مشہور ہے کہ یہ اخبار متواتر میں شمار ہوتی ہے، اور ہم اسے مشہور روایات کے مطابق ”سیرۃ ابن ہشام“ و ”بلوغ الارب“ و ”بحار الانوار“ و ”مجمع البیان“ سے خلاصہ کر کے نقل کرتے ہیں۔

یمن کے بادشاہ ”ذونواس“ نے نجران کے عیسائیوں کو جو اس سرزمین کے نزدیک بستے تھے، اس لیے بہت تنگ کر رکھا تھا کہ وہ اپنا دین مسیحیت چھوڑ دیں۔ قرآن اس واقعہ کو سورہ ”بروج“ میں اصحاب الاخدود کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ اور ہم نے اسے اسی سورہ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس عظیم جرم کے بعد ”دوس“ نامی ایک شخص ان میں سے اپنی جان بچا کر نکل گیا اور وہ قیصر روم کے پاس، جو دین مسیحیت پر تھا، جا پہنچا، اور اس کے سامنے یہ سارا ماجرا بیان کیا۔

چونکہ ”روم“ اور ”یمن“ کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا لہذا اس نے حبشہ کے بادشاہ ”نجاشی“ کو خط لکھا کہ وہ ”ذونواس“ سے نصارائے نجران کا انتقام لے، اور اس خط کو اسی شخص کے ہاتھ ”نجاشی“ کے پاس روانہ کیا۔ ”نجاشی“ نے ایک بہت بڑا لشکر جو ستر ہزار افراد سے زیادہ پر مشتمل تھا ”اریاط“ نامی شخص کی کمان میں یمن کی طرف روانہ کیا۔ ”ابرہہ“ بھی اس لشکر کے افسروں میں سے ایک تھا۔ ”ذونواس“ کو شکست ہوئی، اور ”اریاط“ یمن کا حکمران ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد ”ابرہہ“ نے اریاط کے خلاف بغاوت کردی اور اس کا خاتمہ کرنے کے بعد اس کی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اس واقعہ کی نجاشی کو خبر پہنچی تو اس نے ”ابرہہ“ کی سرکوبی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ابرہہ نے اپنی نجات کے لیے اپنے سر کے بال مندو اکریمن کی کچھ مٹی کے ساتھ مکمل تسلیم کے طور پر نجاشی کے پاس بھیج دیے، اور وفاداری کا اعلان کیا۔ نجاشی نے جب یہ دیکھا تو ابرہہ کو معاف کر دیا، اور اسے اس کے منصب پر برقرار رکھا۔

اس موقع پر ”ابرہہ“ نے اپنے حسن خدمت کو ثابت کرنے کے لیے ایک اہم اور بہت ہی خوبصورت گرجا گھر تعمیر کرایا، جس کی اس زمانہ میں کمرہ زمین پر کوئی مثل و نظیر نہ تھی۔ اور اس کے بعد جزیرہ عرب کے لوگوں کو خانہ کعبہ کی

بجائے اس گرجے کی طرف دعوت دینے کا مصمم ارادہ کر لیا، اور یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ اس جگہ کو عرب کے حج کامرکز بنانے کے لئے مکہ کی اہم مرکزیت کو وہاں منتقل کر دے۔

اس مقصد کے لیے اس نے ہر طرف عرب کے قبائل اور سرزمین حجاز میں بہت سے مبلغ بھیجے۔ عربوں نے، جو مکہ اور کعبہ کے ساتھ شدید لگاؤ رکھتے تھے اور اسے ابراہیم خلیل کے آثار میں سے جانتے تھے، اس سے خطرہ محسوس کیا۔ بعض روایات کے مطابق ایک گروہ نے وہاں جا کر مخفی طور پر اس گرجے کو آپ لگادی، اور روایت کے مطابق بعض نے اسے مخفی طور پر گندہ اور ملوث کر دیا۔ اور اس طرح سے انہوں نے اس عظیم دعوت کے مقابلہ میں شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا، اور ”ابرہہ“ کے عبادت خانے کو بے اعتبار اور حقیر بنادیا۔

ظاہر ہے اس پر ”ابرہہ“ کو بہت غصہ آیا اور اس نے خانہ کعبہ کو کلی طور ویران کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس کا خیال تھا اس طرح وہ انتقام بھی لے لے گا اور عربوں کو نئے معبد کی طرف متوجہ بھی کر دے گا۔ چنانچہ وہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ، جن میں سے کچھ لوگ ہاتھیوں پر سوار تھے، مکہ کی طرف روانہ ہوا۔

جب وہ مکہ کے قریب پہنچا تو اس نے کچھ لوگوں کو مکہ والوں کو اونٹ اور دوسرے اموال لوٹنے کے لیے بھیجا۔ ان میں سے دو سو اونٹ ”عبدالمطلب“ کے بھی لوٹ لیے گئے۔

”ابرہہ“ نے کسی آدمی کو مکہ کے اندر بھیجا اور اس سے کہا کہ رئیس مکہ کو تلاش کر کے اس سے کہنا کہ ”ابرہہ“ یمن کا بادشاہ کہتا ہے کہ: میں جنگ کرنے کے لیے نہیں آیا، میں تو صرف اس لیے آیا ہوں کہ اس خانہ کعبہ کو ویران کر دوں اگر تم جنگ نہ کرو تو مجھے تمہارا خون بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔

”ابرہہ“ کا قاصد مکہ میں داخل ہوا اور رئیس و شریف مکہ کے بارے میں دریافت کیا۔ سب نے ”عبدالمطلب“ کی طرف راہنمائی کی۔ اس نے ”عبدالمطلب“ کے سامنے ماجرا بیان کیا۔ ”عبدالمطلب“ نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم میں تم سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے، رہا خانہ کعبہ تو خدا خود اس کی حفاظت کرے گا۔

”ابرہہ“ کے قاصد نے عبدالمطلب سے کہا کہ تمہیں میرے ساتھ اس کے پاس چلنا پڑے گا۔ جب عبدالمطلب اس کے دربار میں داخل ہوئے تو وہ آپ کے بلند قد حسین چہرے اور حد سے زیادہ رعب اور دبدبہ کو دیکھ کر سخت متاثر ہوا، یہاں تک کہ ”ابرہہ“ ان کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور زمین پر بیٹھ گیا اور ”عبدالمطلب“ کو اپنے پہلو میں

بٹھالیا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھائے۔ اس کے بعد اس نے اپنے مترجم سے کہا کہ ان سے پوچھ کہ ان کی کیا حاجت ہے؟

آپ نے مترجم سے کہا: میری حاجت یہ ہے کہ میرے دو سو اونٹ تیرے لشکری لوٹ کر لے گئے ہیں، تو انہیں حکم دیں کہ وہ میرا مال واپس کر دیں۔

”ابرہہ“ کو ان کے اس مطالبہ پر سخت تعجب ہوا اور اس نے اپنے متجم سے کہا: ان سے کہو: جب میں نے تمہیں دیکھا، تو میرے دل میں تمہاری بہت زیادہ عظمت پیدا ہوئی تھی، لیکن تم نے یہ کہی تو میری نظر میں تمہاری توقیر گھٹ گئی۔

تم اپنے دو سو اونٹوں کے بارے میں تو بات کرتے ہو لیکن ”کعبہ“ کے بارے میں جو تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا دین ہے، اور میں اسے ویران کرنے کے لیے آیا ہوں، بالکل کوئی بات نہیں کرتے۔

”عبد المطلب“ نے کہا: ”انا رب الابل، و ان للبيت ربا سيمنعہ!“ ”میں اونٹوں کا مالک ہوں، اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے، وہ اس کی حفاظت خود کرے گا۔“

(اس بات نے ابرہہ کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ سوچ میں پڑ گیا)۔

”عبد المطلب“ مکہ کی طرف آئے، اور لوگوں کو اطلاع دی کہ وہ پہاڑیوں میں پناہ گزین ہو جائیں اور آپ خود ایک گروہ کے ساتھ خانہ کعبہ کے پاس آئے تاکہ دعا کریں اور مدد طلب کریں۔ آپ نے خانہ کعبہ کے دروازے کی زنجیر میں ہاتھ ڈال

کر اپنے یہ مشہور اشعار پڑھے: لاہم ان المرء يمنح رحله فامنع رحالک لا يغلبن صليہم و محالہم ابدًا محالک
جروا جميع بلادہم و الفیل کی یسبوا عیالک لاہم ان المرء يمنح رحله فامنع عیالک

والنصر علی آل الصلیب و عابد یہ الیوم الک۔^(۱)

”خدا یا ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے گھر کی حفاظت فرما۔“

”ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی کی تمام توانائیاں اور ہاتھی ساتھ لے کر آئے ہیں تاکہ تیرے حرم کے ساکنوں قیدی بنالیں۔“

”خدا یا ہر شخص اپنے گھر والوں کا دفاع کرتا ہے تو بھی اپنے حرم امن کے رہنے والوں کا دفاع کر۔“

”اور آج اس حرم کے رہنے والوں کی آلِ صلیب اور اس کی عبادت کرنے والوں کے برخلاف مدد فرما۔“

اس کے بعد عبد المطلب اطراف مکہ کے ایک درّہ کی طرف آئے، قریش کی ایک جماعت کے ساتھ وہاں پناہ لی اور اپنے ایک بیٹے کو حکم دیا کہ وہ کوہ ابو قیس کے اوپر جا کر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔

آپ کا بیٹا بڑی تیزی کے ساتھ آپ کے پاس آیا اور کہا: بابا جان! سمندر (دریائے احمر) کی طرف سے ایک سیاہ بادل آتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ عبد المطلب خوش ہو گئے اور پکار کر کہا:

”یامعشر قریش! ادخلوا منازلکم فقد اتاکم اللہ بالنصر من عندہ“

”اے جمیعت قریش اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاؤ کیونکہ خدا کی نصرت تمہاری مدد کے لیے آرہی ہے۔ یہ تو اس طرف کی بات تھی۔“

دوسری طرف سے ابرہہ اپنے مشہور ہاتھی پر سوار جس کا نام ”محمود“ تھا اپنے کثیر لشکر کے ساتھ کعبہ کو تباہ کرنے کے لیے اطراف کے پہاڑوں سے مکہ کی طرف اترا، لیکن وہ اپنے ہاتھی پر جتنا دباؤ ڈالتا تھا وہ آگے نہ بڑھتا تھا، لیکن جب وہ اس کا رخ یمن کی طرف کرتا تھا تو وہ فوراً چل پڑھتا تھا۔ ابرہہ اس واقعہ سے سخت متعجب ہوا اور حیرت میں ڈوب گیا۔ اسی اثناء میں سمندر کی طرف سے غول کے غول اور جھنڈ کے جھنڈ پرندوں کے، آن پہنچے، جن میں سے ہر ایک کے پاس تین تین کنکریاں تھیں، ایک ایک چونچ میں اور دو دو پنچوں میں، جو تقریباً چنے کے دانے کے برابر تھیں، انہوں نے یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر برسانی شروع کر دیں۔ یہ کنکریاں جس کسی کو لگتیں وہ ہلاک ہو جاتا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ کنکریاں ان کے بدن پر جہاں بھی لگتیں سوراخ کر دیتی تھیں، اور دوسری طرف نکل جاتی تھیں۔

اس وقت ابرہہ کے لشکر پر ایک عجیب و غریب وحشت طاری ہو گئی۔ جو زندہ بچے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، اور واپسی کے لیے یمن کی راہ پوچھتے تھے، لیکن مسلسل خزاں کے پتوں کی طرح سڑک کے نیچوں بیچ گر جاتے تھے۔

ایک پتھر خود ”ابرہہ“ کے آکر لگا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اس کو صعنا (یمن کے پائے تخت) کی طرف واپس لے گئے اور وہاں جا کر ہلاک ہو گیا۔

بعض نے کہا ہے کہ چچک کی بیماری پہلی مرتبہ عرب میں اسی سال پھیلی تھی۔

ہاتھیوں کی تعداد جو ابرہہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، بعض نے وہی ”محمود“ ہاتھی، بعض نے آٹھ، بعض نے دس اور بعض نے بارہ لکھی ہے

مشہور قول کے مطابق پیغمبر اکرم نے ولادت اسی سال ہوئی اور عالم آپ کے نور کے وجود سے منور ہو گیا۔ لہذا بہت سے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان دونوں واقعات کے درمیان ایک رابطہ موجود تھا۔

بہر حال اس عظیم حادثہ کی اس قدر اہمیت تھی کہ اس سال کا نام عال الفیل (ہاتھی کا سال) رکھا گیا اور یہ عربوں کا تاریخ کا مبداء قرار پایا۔^(۲)

۱۔ مورخین و مفسرین نے اوپر والے اشعار کو مختلف طور پر نقل کیا ہے جو کچھ نقل کیا گیا ہے وہ مختلف نقلوں کا مرکب خلاصہ ہے۔

۲۔ ”سیرۃ ابن ہشام“ جلد ۱ ص ۶۲ تا ۶۳ ”بلوغ الارب“۔ جلد ۱ ص ۲۵۰ تا ۲۶۳ ”بحار الانوار“ جلد ۱۵ ص ۱۳۰ سے آگے ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۴۲۔

تفسیر

ابرہ سے کہہ دو کہ وہ آنے میں جلدی نہ کرے

اس سورہ کی پہلی آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا سلوک کیا؟“ ﴿الم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل﴾۔

وہ اپنی پوری قدرت و طاقت اور لشکر کے ساتھ آئے تاکہ خانہ خدا کو ویران و تباہ کر دیں اور خدا نے ایک ایسے لشکر کے ساتھ، جو بظاہر بہت ہی چھوٹا اور بے حیثیت تھا، انہیں درہم برہم کر دیا۔ ہاتھیوں کو چھوٹے سے پرندوں کے ساتھ، اور اس زمانہ کے ترقی یافتہ اسلحہ کو ”سجیل“ پتھریلی کنکریوں کے ساتھ بیکار کر دیا تاکہ اس مغرور سرکش انسان کی کمزوری و ناتوانائی کو قدرتِ الہی کے مقابلہ میں ظاہر و آشکار کرے۔

الم قر (کیا تو نے نہیں دیکھا؟) کی تعبیر، حالانکہ یہ حادثہ ایسے زمانہ میں رونما ہوا تھا کہ پیغمبر نے ابھی دنیا میں آنکھ نہیں کھولی تھی، یا یہ آپ کی پیدائش سے قریب تر تھا، اسی وجہ سے مذکورہ حادثہ پیغمبر اکرم کے زمانہ کے بہت ہی نزدیک تھا، اس کے علاوہ یہ اتنا مشہور اور متواتر تھا کہ گویا پیغمبر اپنے چشم مبارک سے اس کا مشاہدہ کیا ہوا تھا، اور پیغمبر کے معاصرین میں سے ایک گروہ نے یقینی طور پر اسے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔

”اصحاب الفیل“ کی تعبیر انہیں چند ہاتھیوں کی وجہ سے ہے جنہیں وہ اپنے ساتھ یمن سے لائے تھے تاکہ مخالفین کو مرعوب کریں، اور اونٹ اور گھوڑے انہیں دیکھ کر بدک جائیں اور میدانِ جنگ میں نہ ٹھہر سکیں۔^(۱)

اس کے بعد مزید یہ کہتا ہے: کیا خدا نے ان کے منصوبہ کو خاک میں نہیں ملا دیا؟ ﴿الم یجعل کیدہم فی تضلیل﴾۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ خانہ کعبہ کو تباہ کر ڈالیں تاکہ یمن کے گرجے کو مرکزیت حاصل ہو اور قبائل عرب اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ لیکن وہ نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو بلکہ اس ماجرے نے جس کی شہرت تمام جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی تھی۔ مکہ اور خانہ کعبہ کی عظمت کو اور چارچاند لگا دئے اور اس کے مشتاق دلوں کو پہلے سے بھی زیادہ اس کی طرف متوجہ کر دیا اور شہر کو اور بھی زیادہ پر امن بنا دیا۔

”تضلیل“ سے مراد، جو وہی گمراہ کرنا ہے، کہ وہ ہرگز اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔

اس کے بعد اس ماجرے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”خدا نے گروہ درگروہ ہر طرف ہاتھیوں کے لشکر کی طرف آئے تھے۔“

یہ لفظ جمع کے معنی دیتا ہے، جس کا مفرد بعض نے ”ابابہ“ یعنی پرندوں یا گھوڑوں یا اونٹوں کا گروہ سمجھا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی جمع ہے جس کی جنس کا مفرد نہیں ہے۔

بہر حال ”طیر“ یہاں جمع کا معنی دیتا ہے، اور یہ دونوں الفاظ ”طیر“ و ”ابابیل“ مجموعی طور پر گروہ درگروہ پرندوں کے معنی میں ہے (ایسا نہیں ہے کہ ابابیل ان پرندوں کا نام ہو)۔

اس بارے میں کہ یہ پرندہ کون سا پرندہ تھا جیسا کہ ہم نے داستانوں کی تفصیل میں بیان کیا ہے مشہور یہ ہے کہ وہ پرندے کوئے یا چیل کی طرح کے پرندے تھے جو بحر احمر کی راہ سے اٹھے تھے اور ہاتھیوں کے لشکر کی طرف آئے تھے۔

بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے: ”ان پرندوں نے اس لشکر کو سجیل (پتھریلی مٹی) کے چھوٹے چھوٹے کنکروں سے نشانہ بنایا تھا“۔ ﴿ترمیم بحجارة من سجيل﴾۔ (۲)

اور جیسا کہ اس ماجرے کی تفصیل میں ہم نے تواریخ، تفاسیر اور روایات سے نقل کیا ہے، ان چھوٹے چھوٹے پرندوں میں سے ہر ایک نے چنے کے دانے کے برابری اس سے بھی چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھائی تھیں، ایک ایک کنکری چونچ میں اور دو دو اپنے پنجوں میں۔ اور یہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں جس پر بھی پڑتی تھیں، اسی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھیں۔

جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے: ”انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی مانند بنا دیا“ ﴿فجعلهم كعصف مأكول﴾۔ ”عصف“ (بروزن حذف) ان پتوں کو کہتے ہیں جو زراعت کی شاخ پر ہوتے ہیں اور پھر خشک ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ”گھاس“ کے معنی میں ہے۔

اور بعض نے اس کی گندم کے اس چھلکے کے معنی میں تفسیر کی ہے، جب کہ وہ خوشہ میں ہوتا ہے۔ ”مأكول“ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گھاس جانوروں کے دانتوں کے نیچے آکر دوبارہ پس جاتا ہے اور مکمل طور پر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، پھر جانور کے معدے نے بھی اسے تیسری مرتبہ ریزہ ریزہ کیا ہے اور یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ سنگریزے جس کسی کو بھی جا کر لگتے تھے، اس کو مکمل طور پر ریزہ ریزہ کر دیتے تھے۔

یہ تعبیر ان کے شدت کے ساتھ پارہ پارہ ہونے کی دلیل قرار پانے کے علاوہ اس کے سرکش و مغرور اور ظاہراً طاقت ور گروہ اور جمیعت کے بے قدر و قیمت ہونے اور اس کے ضعف و ناتوانی کی طرف اشارہ ہے۔

۱۔ ”فیل“ اگرچہ یہاں مفرد ہے، لیکن جنس و جمع کا معنی رکھتا ہے

۲۔ ”سجیل“ فارسی کا لفظ ہے جو ”سنگ“ (پتھر) اور ”گل“ (مٹی) سے لیا گیا ہے، اسی بناء پر وہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو نہ پتھر کی طرح سخت ہو اور نہ مٹی کی طرح نرم۔

۱۔ ایک بے نظیر معجزہ (اس گھر کا ایک مالک ہے)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس مفصل و طولانی داستان کو چند مختصر اور چبھنے والے انتہائی فصیح و بلیغ جملوں میں بیان کر دیا ہے۔ اور حقیقتاً ایسے نکات بیان کیے ہیں جو قرآنی اہداف، یعنی مغرور سرکشوں کو بیدار کرنے اور خدا کی عظیم قدرت کے مقابلہ میں انسان کی کمزوری دکھانے میں مدد دیتے ہیں۔

یہ ماجرا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ معجزات و خوارق عادات، بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف، لازمی نہیں ہے کہ پیغمبر یا امام ہی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں۔ بلکہ جن حالات میں خدا چاہے اور ضروری سمجھے انجام پا جاتے ہیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ خدا کی عظمت اور اس کے دین کی حقانیت سے آشنا ہو جائیں۔

یہ عجیب و غریب اعجاز آمیز عذاب دوسری سرکش اقوام کے عذاب کے ساتھ ایک واضح فرق رکھتا ہے کیونکہ طوفان نوح کا عذاب، اور قوم لوط کا زلزلہ اور سنگ باری، قوم عاد کی تیز آندھی اور قوم ثمود کا صاعقہ طبعی حوادث کا ایک سلسلہ تھے، کہ جن کا صرف ان خاص حالات میں وقوع معجزہ تھا۔

ان چھوٹے چھوٹے پرندوں کا اٹھنا، اسی خاص لشکر کی طرف آنا، اپنے ساتھ کنکریوں کا لانا، خاص طور سے انہیں کو نشانہ بنانا اور ان چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے ایک عظیم لشکر کے افراد کے اجسام کا ریزہ ریزہ ہو جانا، یہ سب کے سب خارق عادی امور ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی قدرت کے سامنے بہت ہی معمولی چیز ہے۔ وہی خدا جس نے انہیں سنگ ریزوں کے اندر اسٹیم کی قدرت پیدا کی ہے، کہ اگر وہ آزاد ہو جائے تو ایک عظیم تباہی پھیلا دے۔

اس کے لیے یہ بات آسان ہے کہ ان کے اندر ایسی خاصیت پیدا کر دے کہ ابرہہ کے لشکر کے جسموں کو ”عصف ماکول“ (کھائے ہوئے بھوسے کی مانند) بنا دے۔

ہمیں بعض مصری مفسرین کی طرف اس حادثہ کی توجیہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان کنکریوں میں وبایا چچک کے جراثیم تھے۔^(۱)

اور اگر بعض روایات میں یہ ہے کہ صدمہ زدہ لوگوں کے بدنوں سے چچک میں مبتلا افراد کی طرح خون اور پیسپ آتی تھی، تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حتمی طور پر چچک میں مبتلا تھے۔

اسی طرح سے ہمیں اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ سنگ ریزے پسے ہوئے اٹم تھے جن کے درمیان کی فضا ختم ہو گئی تھی۔ اور وہ حد سے زیادہ سخت تھے، اس طرح سے کہ وہ جہاں بھی گرتے تھے سوراخ کر دیتے تھے۔

یہ سب کی سب ایسی توجیہات ہیں جو اس حادثہ کو طبعی بنانے کے لیے ذکر ہوئی ہیں اور ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان سنگ ریزوں میں ایسی عجیب و غریب خاصیت تھی جو جسموں کو ریزہ ریزہ کر دیتی تھی۔ اس سے زیادہ اور کوئی اطلاع ہمارے پاس نہیں ہے۔ بہر حال خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا۔^(۲)

۱۔ ”تفسیر عبده“ جزء ۱ ص ۱۵۸ ملاحظہ ہو۔

۲۔ اگر بعض تواریخ میں یہ آیا ہے کہ عرب کے شہروں میں چچک کا مرض پہلی مرتبہ اسی سال دیکھنے میں آیا ہے تو یہ بات اسی معنی پر دلیل نہیں بنتی۔

۲۔ معمولی وسیلہ سے سخت ترین سزا

قابل توجہ بات یہ ہے کہ خدا نے اس ماجرے میں مستکبرین اور سرکشوں کے مقابلہ میں اپنی قدرت اعلیٰ ترین صورت میں دکھادی ہے۔ شاید دنیا میں ابرہہ کے لشکر کے عذاب سے بڑھ کر زیادہ سخت اور کوئی عذاب نہ ہو اور ان مغرور لوگوں کو اسی طرح سے تباہ و برباد کر دیا جائے کہ ریزہ ریزہ اور کھائے ہوئے بھوسے (عصف ماکول) کی طرح ہو جائیں۔ اتنی جڑی قدرت و شوکت رکھنے والی جمیعت کی نابودی کے لیے خرم قسم کے سنگ ریزوں اور کمزور اور چھوٹے چھوٹے پرندوں سے کام لیا جائے۔ وہی بات کہ یہ دنیا جہان کے تمام مستکبرین اور سرکشوں کے لیے ایک تنبیہ ہے، تاکہ وہ جان لیں کہ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کس قدر ناتواں ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خدا اس قسم کے عظیم کام بہت ہی چھوٹے سے موجودات کے سپرد کر دیتا ہے۔ مثلاً ایسے جراثیم کو، جو ہرگز آنکھ سے دیکھے نہیں جاسکتے، مامور کر دیتا ہے کہ وہ ایک مختصر سی مدت میں سرعت کے ساتھ اپنی پیدائش بڑھا کر طاقت ور قوموں کو ایک خطرناک سرایت کرنے والی بیماری، مثلاً: ”وباء“ و ”طاعون“ میں مبتلا کر دے۔ اور ایک مختصر سی مدت میں خزاں کے پتوں کی طرح زمین پر ڈھیر کر دے۔

یمن کا عظیم بند (سد مارب) جیسا کہ ہم نے سورہ سبا کی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ زیادہ آبادی اور ایک عظیم طاقت ور تمدن کی پیدائش کا ذریعہ بنی۔ اور اس کے بعد اس قوم کی سرکشی برہ گئی، لیکن اس قوم کی نابودی کا فرمان جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے، ایک یا چند صحرائی چوہوں کے سپرد ہوا تاکہ وہ اس عظیم بند کے اندر گھس جائیں اور اس میں ایک سوراخ کر دیں۔ اس سوراخ میں پانی ہونے کی وجہ سے یہ سوراخ بڑے سے بڑا ہوتا چلا گیا اور آخر کار وہ عظیم بند توٹ گیا اور پانی جو اس بند کے تھپڑے مار رہا تھا، اس نے ان سب آبادیوں، گھروں اور محلوں کو ویران اور تباہ کر دیا۔ اور بڑی جمیعت یا تو نابود ہو گئی یا دوسرے علاقوں میں پراکندہ اور منتشر ہو گئی۔ یہ ہے خداوند بزرگ و برتر کی قدرت نمائی۔

۳۔ داستانِ فیل کے اہداف

آگے آنے والی سورت (سورہ الیلاف) سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ سورہ فیل کا ایک ہدف قریش پر خدا کی عظیم نعمتوں کی یاد آوری ہے تاکہ انہیں یہ بتا دے کہ اگر پروردگار کا لطف نہ ہوتا تو نہ اس مقدس مرکز یعنی مکہ و کعبہ کے آثار

ہوتے اور نہ ہی قریش ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اسی طرح کبر و غرور کی سواری سے نیچے اتر آئیں اور پیغمبر اکرم کی دعوت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

دوسری طرف یہ ماجرہ، جو پیغمبر اکرم کے میلاد کے قریب قریب ساتھ واقع ہوا تھا، حقیقت میں اس عظیم ظہور کا پیش خیمہ تھا اور اس قیام کی عظمت کا پیام لانے والا تھا۔ اور یہ وہی چیز ہے جسے مفسرین نے ”ارہاص“ سے تعبیر کیا ہے۔^(۱)

اس واقعہ کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ یہ ساری دنیا جہان کے سرکشوں کے لیے ایک تنبیہ ہے، چاہے وہ قریش ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہوں، کہ وہ جان لیں کہ وہ ہرگز پروردگار کی قدرت کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ وہ خیالِ خا، کو اپنے سے نکال دیں، اس کا حکم مانیں اور حق و عدالت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

چوتھا مقصد اس عظیم گھر کی اہمیت کو ظاہر کرنا ہے کہ جب ”کعبہ“ کے دشمنوں نے اس کو نابود کرنے کا منصوبہ بنایا، اور وہ اس ابراہیمی سرزمین کی مرکزیت کو دوسری جگہ منتقل کرنا چاہتے تھے، تو خدا نے ان کی اس طرح سے گوشمالی کی کہ ساری دنیا کے لیے باعثِ عبرت بن گئی اور اس مقدس مرکز کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا۔

اور پانچواں مقصد یہ ہے کہ، وہ خدا جس نے اس سرزمین مقدس کی انیت کی بارے میں ابراہیم خلیل کی دعا کو قبول کیا تھا، اور اس کی ضمانت دی تھی، اس نے اس ماجرے میں اس بات کی نشان دہی کر دی ہے کہ اس کی مشیت یہی ہے کہ یہ توحید و عبادت کا مرکز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مرکز امن رہے۔

۱۔ ”ارہاص“ ان معجزات کے معنی جو پیغمبر کے قیام سے قبل واقع ہوں اور اس کی دعوت کے لیے زمین ہموار کرنے والے ہوں۔ یہ لفظ اصل میں بنیاد گزاری اور پہلا سنگ بنیاد رکھنے کے معنی میں ہے جسے دیوار کے نیچے رکھتے ہیں، اور آمادہ ہونے اور (کھڑے ہونے) کے معنی میں بھی آیا ہے۔

۴۔ ایک مسلم تاریخی رویت

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”اصحاب فیل“ کا ماجرا عربوں کے درمیان ایسا مسلم تھا کہ یہ ان کے لیے تاریخ کا آغاز قرار پایا اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ، قرآن مجید نے ایک نہایت ہی عمدہ تعبیر ”الم تر“ (کیا تو نے نہیں دیکھا) کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، وہ بھی پیغمبر اکرم کو خطاب کرتے ہوئے جو نہ تو اس زمانہ میں موجود تھے اور نہ ہی اسے دیکھا تھا، جو اس ماجرے کے مسلم ہونے کی ایک اور نشانی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر جب پیغمبر اکرام نے مشرکین مکہ کے سامنے ان آیات کی تلاوت کی تو کسی نے اس کا انکار نہ کیا۔ اگر یہ مطلب مشکوک ہوتا تو کم از کم کوئی تو اعتراض کرتا اور ان کا اعتراض ان کے باقی اعتراضوں کی طرح ہی تاریخ میں ثبت ہو جاتا خصوصاً جب کہ قرآن نے جملہ ”الم تر“ کے ساتھ اس مطلب کو ادا کیا تھا۔ خداوند! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم اس توحید کے عظیم مرکز کی پاسداری کریں۔

پروردگارا! ان لوگوں کے ہاتھ، جو اس مقدس مرکز کی ظاہری حفاظت پر قناعت کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت کے پیام کو نظر انداز کرتے ہیں، اس مرکز سے کاٹ دے۔ بار الہا! تمام اشتیاق رکھنے والوں کو مکمل آگاہی و عرفان کے ساتھ اس کی زیارت نصیب فرما۔

آمین یا رب العالمین

سورہ قریش

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۴ آیات ہیں

سورہ قریش کے مطالب

ہ سورہ حقیقت میں سورہ فیل کی تکمیل کرنے والی سمجھی جاتی ہے اور اس کی آیات اس مطلب پر واضح دلیل ہیں۔ اس سورہ کا مضمون قریش پر خدا کی نعمت اور ان کے بارے میں اس کے الطاف اور محبتوں کا بیان ہے، تاکہ ان میں شکرگزاری کا احساس پیدا ہو اور اس عظیم گھر کے پروردگار کی عبادت کے لیے جس سے ان کا سارا شرف اور افتخار ہے تیار ہو جائیں۔

جیسا کہ ہم نے سورہ ”والضحیٰ“ کے آغاز میں بیان کیا تھا کہ یہ سورہ اور سورہ الم نشرح حقیقت میں ایک شمار ہوتی ہے، اسی طرح سورہ ”فیل“ اور سورہ ”قریش“ بھی ایک ہی شمار ہوتی ہیں کیونکہ اگر ہم ٹھیک طرح سے ان دونوں کے مطالب پر غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ ان دونوں کے مطالب ایک دوسرے کے ساتھ اتنے ملتے جلتے ہیں کہ وہ دونوں کے ایک ہونے کی دلیل بن سکتے ہیں۔

اسی بناء پر نماز کی ہر رکعت میں ایک مکمل سورت پڑھنے کے لیے اگر کوئی شخص اوپر والی سورتوں کا انتخاب کرے تو ضروری ہے کہ وہ دونوں کو اکٹھا پڑھے۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے فقہی کتابوں (کتاب صلوٰۃ بحث قرت) کی طرف رجوع کیا جائے۔^(۱)

۱۔ مرحوم شیخ ”حرم علی“ نے کتاب ”وسائل“ میں اس مطلب سے مربوط روایات جلد ۴ ص ۷۴۳ (باب ۱۰ از ابواب قرت نماز) میں نقل کی ہیں۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں یہی بات کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا

:

”من قرأھا اعطی من الاجر عشر حسنات، بعدد من طاف بالكعبة، واعتكف بها:“

”جو شخص اس کو پڑھے تو اسے ان لوگوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں دی جائے گی، جنہوں نے خانہ کعبہ کا طواف کیا

ہے، یا وہاں اعتکاف کیا ہے“^(۱)

مسلمہ طور پر اس قسم کی فضیلت اس شخص کے لیے ہے جو اس خدا کی بارگاہ میں، جو کعبہ کا پروردگار ہے، سر تعظیم جھکائے، اس کی عبادت کرے، اس گھر کے احترام کو مد نظر رکھے، اس کا پیام دل کے کان سے سنے اور اس کی پابندی کرے۔

۱ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۴۳۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿لَا يَلْفُ قَرِيشٌ﴾ - ۲۔ ﴿إِيْلَافُهُمْ رَحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ﴾ - ۳۔ ﴿فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ﴾ - ۴۔ ﴿لَذِي اطْعَمَهُمْ
مِنْ جُوعٍ﴾ - ﴿وَأَمَّنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ﴾ -

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ (اصحاب فیل کا عذاب) اس بناء پر تھا کہ قریش (اس سرزمین مقدس سے) الفت رکھیں۔ (اور پیغمبر کے ظہور کے مقدمات فراہم ہوں)۔
۲۔ انہیں سردیوں اور گرمیوں کے سفر سے الفت ہے۔ ۳۔ پس (اس عظیم نعمت کے شکرانے کے طور پر) اس گھر کے پروردگار کی عبادت کریں۔
۴۔ وہی جس نے انہیں بھوک سے نجات دی اور بد امنی سے نجات بخشی۔

اس گھر کے پروردگار کی عبادت کرنی چاہیئے۔

چونکہ گزشتہ سورہ (سورہ فیل) میں اصحاب فیل اور ابرہہ کے لشکر کی نابودی کی تفصیل بیان ہوئی تھی، جو خانہ کعبہ کو نابود کرنے اور اس خدائی مرکز مقدس کو ویران کرنے کے ارادہ سے آیا تھا، لہذا اس سورہ کی پہلی آیت میں، جو حقیقت میں سورہ فیل کا ایک (تکلیل بیان) ہے، فرماتا ہے: ”ہم نے ہاتھیوں کے لشکر کو نابود کر کے انہیں کھائے ہوئے بھوسہ کے مانند ریزہ ریزہ کر دیا، تاکہ قریش اس مقدس سرزمین سے الفت پیدا کریں“ اور پیغمبر اکرم کے ظہور کے مقدمات فراہم ہوں۔ ﴿لَا يَلْفُ قَرِيشٌ﴾ - (۱)

”ایلاف“ مصدر ہے، اور الفت بخشنے کے معنی میں ہے اور ”الفت“ انس و محبت اور گھل مل جانے کے ساتھ اجتماع کے معنی میں ہے، اور یہ بعض نے ”ایلاف“ کی متوالفت اور ”عہد و پیمان“ کے ساتھ تفسیر کی ہے، تو وہ نہ تو اس لفظ کے ساتھ مناسب ہے جو باب افعال کا مصدر ہے، اور نہ ہی اس سورہ کی آیات کے مضمون سے۔

بہر حال اس سے مراد قریش اور سرزمین مکہ اور خانہ کعبہ کے درمیان الفت پیدا کرنا ہے کیونکہ قریش اور تمام اہل مکہ اس سرزمین کی مرکزیت اور اہمیت کی بناء پر ہی وہاں رہائش پذیر تھے۔ حجاز کے بہت سے لوگ ہر سال وہاں آتے تھے اور مراسم حج بجالاتے تھے، اقتصادی اور ادبی مبادلات رکھتے تھے اور اس سرزمین کی مختلف برکات سے استفادہ کرتے تھے۔

یہ سب کچھ اس کی مخصوص سلامتی کی وجہ سے تھا۔ اگر ابرہہ یا کسی اور لشکر کشی سے اس کی سلامتی اور اہمیت مخدوش ہو جاتی، یا خانہ کعبہ ویران ہو جاتا، تو پھر کسی کو اس سرزمین سے الفت و محبت نہ رہتی۔

”قریش“ کا لفظ جیسا کہ بہت سے مفسرین اور ارباب لغت نے کہا ہے اصل میں سمندر کے عظیم جانوروں کی ایک نوع کے معنی میں ہے، جو ہر جانور کو آسانی کے ساتھ کھا لیتی ہے۔ یہ عبارت ”ابن عباس“ سے مشہور ہے کہ جب ان سے سوال ہوا کہ قریش کو ”قریش“ کیوں کہتے ہیں؟ تو انہوں نے یہ جواب دیا: ”لدابة تكون في البحر من اعظم دوابه يقال لها القریش، لا تمر بشيء من الغث والسمين الا اكلته،!“

”یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سمندر کے ایک بہت بڑے جانور کا نام ہے، وہ جس دبلے یا موٹے جانور کے پاس سے گزرتا ہے اسے کھا جاتا ہے۔“

اس کے بعد وہ اپنی بات کے ثبوت میں اشعار عرب سے شہادت پیش کرتے ہیں۔
اس بناء پر اس قبیلہ کے لیے اس نام کا انتخاب، اس قبیلہ کی قدرت و قوت اور اس قدرت سے غلط فائدہ اٹھانے کی وجہ سے ہوا۔

لیکن بعض نے اسے ”قریش“ (بر وزن فرش) کے مادہ سے اکتساب کے معنی میں لیا ہے، کیونکہ عام طور پر یہ قبیلہ تجارت اور کسب میں مشغول رہتا تھا۔ بعض اس مادہ کو خبر گیری اور دیکھ بھال کرنے کے معنی میں جانتے ہیں اور چونکہ قریش حاجیوں کے حالات کی خبر گیری کرتے تھے، اور بعض اوقات ان کی مدد کرتے تھے، اس لیے یہ لفظ ان کے لیے منتخب ہوا۔

”قریش“ لغت میں اجتماع کے معنی میں آیا ہے کیونکہ یہ قبیلہ ایک خاص قسم کی تنظیم اور اجتماع رکھتا تھا، اس لیے یہ نام ان کے لیے انتخاب ہوا۔

لیکن بہر حال موجودہ زمانہ میں قریش کسی اچھے مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا، اور باوجود اس کے کہ وہ پیغمبر اکرم کا قبیلہ تھا، اسلام کا سخت ترین دشمن شمار ہوتا تھا جو کسی قسم کی عہد شکنی، عداوت اور دشمنی سے نہیں چوکتا تھا۔ یہاں تک کہ جب ان کی قدرت و طاقت اسلام کی کامیابی کی وجہ سے دم توڑ گئی تو پھر بھی انہوں نے مخفی سازشوں کو جاری رکھا اور پیغمبر اکرم کی رحلت کے بعد بھی انہوں نے ایسے دردناک حوادث پیدا کیے جنہیں تاریخ اسلام کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ ”بنی امیہ“ اور ”بنی عباس“ جو طاغوتی حکومت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے، قریش میں سے ہی اٹھے تھے۔

قرآن بھی اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ وہ عربوں کے زمانہ جاہلیت میں بھی لوگوں کے استعمار و استعمار کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور اسی وجہ سے جب آزادی بخش اسلام نے طلوع کیا اور ان کے ناجائز منافع خطرے میں پڑ گئے تو وہ پوری طاقت کے ساتھ مبارزہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ لیکن اسلام کی عظیم قدرت نے انہیں درہم و برہم کر دیا۔

بعد الی آیت میں مزید کہتا ہے: ”ہدف اور مقصد یہ تھا کہ خدا قریش کو سردیوں اور گرمیوں کے سفروں سے الفت بخشے۔“ ﴿ایلافہم رحلة الشتاء والصیف﴾ (۲)، (۳)۔

ممکن ہے کہ اس سرزمین مقدس سے قریش کو الفت بخشنا مراد ہو، تاکہ وہ گرمیوں اور سردیوں کے طویل سفروں میں اس مقدس مرکز سے اپنا تعلق اور لگاؤ دل سے نہ بھلائیں اور اس کی سلامتی کی وجہ سے اس کی طرف لوٹ آئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سرزمین یمن اور شام کی زندگی کی آسائشوں سے متاثر ہو کر مکہ کو خالی چھوڑ دیں۔ یا اس سے ان دو عظیم سفروں میں قریش اور دوسرے لوگوں کے درمیان الفت پیدا کرنا مراد ہے، کیونکہ ابرہہ کی داستان کے بعد لوگ انہیں دوسری نظر سے دیکھتے تھے اور قریش کے قافلہ کے احترام و اہمیت کے قائل تھے۔

قریش کو اس طویل سفر میں بھی امن کی ضرورت تھی اور سرزمین مکہ کے لیے بھی، اور خدا نے ابرہہ کے لشکر کی شکست کے نتیجے میں یہ دونوں سلالتیاں انہیں بخش دی تھیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ ”مکہ“ کی زمین میں نہ تو کوئی باغ تھا اور نہ ہی کوئی کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ جانوروں کی دیکھ بھال بھی ان کی محدود تھی، ان کی درآمد زیادہ تر انہیں تجارتی قافلوں کے ذریعے پوری ہوتی تھی۔ وہ سردی کے موسم میں جنوب یعنی سرزمین یمن کی طرف۔ جس کا موسم نسبتاً گرم ہوتا ہے۔ رخ کرتے تھے اور گرمی کے موسم میں شمال اور سرزمین کی

طرف۔ جس کی ہوا اور موسم خوشگوار ہوتا تھا۔ اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ سرزمین یمن بھی اور سرزمین شام بھی، اس زمانہ میں اہم تجارتی مراکز تھے۔ اور مکہ اور مدینہ ان دونوں کے درمیان حلقہ اتصالی شمار ہوتے تھے۔

البتہ قریش ان غلط کاریوں کی وجہ سے، جو وہ انجام دیتے تھے، خدا کے ان الطاف و محبت کے مستحق تو نہ تھے۔ لیکن چونکہ یہ مقدر ہو چکا تھا کہ اس قبیلہ اور اس سرزمین مقدس سے اسلام اور پیغمبر اسلام کا طلوع ہو، لہذا خدا نے ان پر یہ لطف فرمایا۔

بعد والی آیت میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قریش کو ان سب خدائی نعمتوں کی وجہ سے جو انہیں کعبہ کی برکت سے حاصل ہوئی تھیں ”اس گھر کے پروردگار کی عبادت کرنا چاہیئے نہ کہ بتوں کی۔“ (فلیعبدوا رب هذا البيت)۔

”وہی خدا جس نے انہیں بھوک سے نجات بخشی اور کھانا دیا، اور بے امنی سے رہائی بخشی اور امن دیا۔“ ﴿الذی اطعمهم من جوع و امنهم من خوف﴾۔ (۴)

ایک طرف تو انہیں تجارت میں فروغ عطا کیا اور انہیں فائدہ پہنچایا اور دوسری طرف بے امنی کو ان سے دور کر دیا اور دفع ضرر کیا۔ اور یہ سب کچھ ابرہہ کے لشکر کی شکست سے فراہم ہوا اور حقیقت میں یہ کعبہ کے بانی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت تھی۔ لیکن انہوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی۔ اس مقدس گھر کو ایک بت خانہ میں تبدیل کر دیا، بتوں کی عبادت کو اس گھر کے خدا کی عبادت پر ترجیح دی اور انجام کار ان تمام ناشکریوں کا انجام بد دیکھا۔

خداوند! ہمیں عبادت و بندگی اور نعمتوں کا شکر ادا کرنے اور اس عظیم گھر کی حفاظت، پاسداری اور احترام کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔ پروردگار! اس عظیم اسلامی مرکز کو روز بروز زیادہ پر شکوہ، اور دنیا جہان کے مسلمانوں کے لیے حلقہ اتصال قرار دے۔

بار الہا! سارے خونخوار دشمنوں اور ان لوگوں کے جو اس عظیم مرکز سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ہاتھ کاٹ دے۔ آمین یا رب العالمین

۱۔ ”الایلاف“ میں ”لام“ علت کے معنی میں ہے اور ”جارد مجرور“ ”جعل“ سے متعلق ہے، جو گزشتہ سورہ کی آیہ ”فجعلهم كعصف مأكول“ میں، یا کسی اور دوسرے فعل کے جو اس سورہ میں تھا۔ بعض نے اس جارد مجرور کو فلیعبدوا کے جملہ سے متعلق سمجھا ہے، جو بعد والی آیات میں آیا ہے۔ لیکن یہ احتمال آیات کے مفہوم کے ساتھ چنداں سازگار نہیں ہے اور پہلا معنی بہتر ہے۔

۲۔ ”ایلا فھم“ اس ”ایلاف“ کا بدل ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے، اور ”ھم“ کی ضمیر پہلا مفعول ہے۔ اور ”رحلۃ الشتاء“ دوسرا مفعول ہے اور بعض کے نظریے کے مطابق ظرفیت کے معنی میں ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہ ”منصوب بنزع خافض“ ہو، اور تقدیر میں اس طرح ہو ”ایلا فھم من رحلۃ الشتاء والصیف“ (دوسرا اور تیسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔)

۳۔ ”رحلۃ“ دراصل ”رحل“ (بروزن شہر) سے، اس پردہ کے معنی میں ہے جو سوار ہونے کے لیے ڈالتے ہیں۔ اسی مناسبت سے، خود اونٹ پر یا ان مسافرتوں پر جو اونٹ یا دوسرے ذرائع سے ہوتی ہیں، پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

۴۔ بعض مفسرین نے اس آیت کو دو آیات سمجھا ہے، اور اس سورہ کی آیات کو پانچ آیات شمار کیا ہے، لیکن مشہور و معروف یہ ہے کہ یہ ایک آیت ہے، اور اس سورہ کی چار ہی آیات ہیں۔

سورۃ الماعون

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۷ آیات ہیں۔

سورہ ماعون کے مطالب

یہ سورہ بہت سے مفسرین کے نظریہ کے مطابق مکی سورتوں میں سے ہے۔ اس کی آیات کالب و لہجہ، جو مختصر اور چبھنے والے مقاطع میں قیامت اور اس کے منکرین کے اعمال کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، اس مطلب کی ناطق گواہ ہیں۔ مجموعی طور پر اس سورہ میں منکرین قیامت کی صفات و اعمال کو پانچ مرحلوں میں بیان کیا گیا ہے، کہ وہ اس عظیم دن کی تکذیب کی وجہ سے راہ خدا میں ”اتفاق“ کرنے اور ”یتیموں“ اور ”مسکینوں کی مدد کرنے سے کس طرح روگردانی کرتے ہیں اور وہ ”نماز“ کے بارے میں کیسے غافل اور ریاکار ہیں، اور ”حاجت مندوں“ کی مدد کرنے سے کس طرح روگردانی کرتے ہیں؟

اس سورہ کی شان نزول کے بارے میں بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ ابو سفیان کے بارے میں نازل ہوا ہے جو روزانہ دو بڑے بڑے اونٹ نحر کیا کرتا تھا اور وہ خود اس کے یار دوست انہیں کھاتے تھے۔ لیکن ایک دن ایک یتیم آیا اور اس نے ان سے کچھ مانگا تو اس نے اپنے عصا سے اسے مارا، اور اسے دور کر دیا۔

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا کہ یہ ”ولید بن مغیرہ“ یا ”عاص بن وائل“ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

اس سورہ کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

”من قرأ آیت الذی یکذب بالذین فرایضہ ونوافلہ قبل اللہ صلاتہ وصیامہ، ولم یحاسبہ بما کان منہ فی الحیۃ الدنیا“:

”جو شخص اس سورہ کو اپنی فریضہ نمازوں میں پڑھے گا تو اس کے نماز و روزہ کو قبول کرے گا اور ان کاموں کے مقابلہ میں جو اس سے دنیا میں سرزد ہوئے ہیں اس کا کوئی حساب نہیں لے گا۔“^(۱)

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

- ۱۔ ﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يَكْذِبُ بِالْدِينِ﴾ - ۲۔ ﴿فَإِذَا لَكَ يَدْعُ الْيَتِيمَ﴾ - ۳۔ ﴿وَلَا يَحْضُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمَسْكِينِ﴾ -
۴۔ ﴿فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ﴾ - ۵۔ ﴿الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ﴾ - ۶۔ ﴿الَّذِينَ هُمْ يَرَاءُ و ن﴾ - ۷۔ ﴿وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ﴾

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

۱۔ کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے، جو ہمیشہ ہی روز جزا کا انکار کرتا رہتا ہے؟ ۲۔ وہی تو ہے، جو یتیم کو سختی کے ساتھ دھکے دیتا ہے۔

۳۔ اور دوسروں کو مسکین کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتا ہے۔ ۴۔ پس ان نماز گزاروں پر وائے ہے، جو۔
۵۔ اپنی نمازوں کو بھول جاتے ہیں۔ ۶۔ وہی جو ریاکاری کرتے ہیں۔ ۷۔ اور دوسروں کو ضروریاتِ زندگی سے باز رکھتے ہیں۔

معاد کے انکار کے اثراتِ بد

اس سورے میں پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخاطب کرتے ہوئے منکرین کے اعمال میں روز جزا کے انکار کے اثراتِ بد کو بیان کرتا ہے:-

”کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو ہمیشہ روز جزا کا انکار کرتا ہے“ ﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يَكْذِبُ بِالْدِينِ﴾۔
اس کے بعد اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر مزید فرماتا ہے: ”وہی تو ہے جو یتیم کو سختی کے ساتھ دھکے دیتا ہے۔“
﴿فَإِذَا لَكَ يَدْعُ الْيَتِيمَ﴾۔

”دین“ سے مراد یہاں ”جزا“ یا ”روز جزا“ ہے۔ اور اس کی عظیم دادگاہ کے انکار سے انسان کے عمل میں ایک وسیع ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ جس کے پانچ حصوں کی طرف اس سورہ میں اشارہ ہوا ہے، منجملہ: یتیموں کو سختی کے ساتھ

دھتکارنا اور دوسرے لوگوں کو مسکینوں کو کھانا کھلانے کا شوق دلانا۔ یعنی نہ تو خود ہی انفاق کرنا اور نہ ہی دوسروں کو اس کام کی دعوت دینا۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں ”دین“ سے مراد قرآن یا تمام آئین و دین اسلام ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے، اور اس کی نظیر سورہ انفطار کی آیہ ۹ ”کَلَّا بَلْ تُكْذِبُونَ بِالْدِّينِ“ اور سورہ ”تین“ آیہ ۷ ”فَمَا يَكْذِبُكَ بَعْدَ الدِّينِ“ میں بھی آئی ہے، جہاں ان سورتوں کی دوسری آیات کے قرینہ سے دین سے مراد روز جزا ہے۔

”یدع“ ”دع“ (بروزن حد) کے مادہ سے، سختی کے ساتھ دور کرنے اور غصہ کے ساتھ دھتکارنے کے معنی میں ہے اور ”یحض“ ”حض“ کے مادہ سے کسی چیز کے لیے دوسروں کو تحریص و ترغیب دینے کے معنی میں ہے، ”راغب“ ”مفردات“ میں کہتا ہے، ”حض“ چلنے اور سیر کرنے کے لیے شوق دلانا ہے، لیکن ”حض“ اس طرح نہیں۔^(۱) چونکہ ”یحض“ اور ”یدع“ فعل مضارع کی صورت میں آئے ہیں، لہذا اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یتیموں اور مسکینوں کے بارے میں ان کا یہ کام دائمی طور پر تھا۔

یہ نکتہ بھی یہاں پر قابل توجہ ہے کہ یتیموں کے بارے میں انسانی حقیقت اور مہربانی کرنے کا مسئلہ کھانا کھلانے اور سیر کرنے کی نسبت زیادہ عمدہ ہے۔ کیونکہ یتیم سب سے زیادہ رنج اور دکھ شفقت و مہربانی کے مرکز اور غذائے روحی کے ہاتھ سے چلے جانے کی وجہ سے ہوتا ہے، اور جسمانی غذا کا مرحلہ بعد میں آتا ہے۔

پھر ان آیات میں ہمارے سامنے مسکینوں کو کھانا کھلانے کا مسئلہ آتا ہے، جو اہم ترین کارہائے خیر میں سے ہے۔ یہاں تک کہ فرماتا ہے کہ اگر کوئی شخص خود کسی مسکین کو کھانا کھلانے کی قدرت نہیں رکھتا، تو دوسروں کو اس بات کی ترغیب دے اور شوق دلائے۔

”فَذَالِك“ کی تعبیر (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہاں ”فا“ سببیت کا معنی دیتا ہے) اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ معاد پر ایمان کا نہ ہونا ان غلط کاریوں کا سبب بنتا ہے، اور واقعاً ایسا ہی ہے وہ شخص جو دل کی گہرائیوں کے ساتھ اس عظیم دن اور اس دادگاہ عدل، اور اس حساب و کتاب اور جزا و سزا پر یقین رکھتا ہو، اس کے تمام اعمال میں اس کے مثبت آثار ظاہر ہوں گے، لیکن جو اس پر ایمان نہیں رکھتے تو گناہ کرنے اور انواع و اقسام کے جرائم کرنے پر ان کی جرأت کرنے میں اس کے اثرات کامل طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔

اس گروہ کی تیسری صفت کے بارے میں فرماتا ہے: پس ان نماز گزاروں پر وائے ہے۔ ﴿فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ﴾۔

”وہی نمازی جو اپنی نماز کو بھول جاتے ہیں“۔ ﴿الذین ہم عن صلاتہم ساهون﴾۔

وہ اس کے لیے نہ تو کسی قدر و قیمت کے قائل ہیں اور نہ ہی اس کے اوقات کو کوئی اہمیت دیتے ہیں، اور نہ ہی اس کے ارکان و شرائط اور آداب کی رعایت کرتے ہیں۔

”ساهون“ ”سہو“ کے مادہ سے اصل میں اس خطا کے معنی میں ہے جو غفلت کی بناء پر سرزد ہو چاہے اس کے مقدمات کے فراہم کرنے میں مقصر ہو یا نہ ہو۔ البتہ پہلی صورت میں معذور نہیں ہے، اور دوسری صورت میں معذور ہے لیکن یہاں وہ سہو مراد ہے جو تقصیر کے ساتھ توأم ہو۔

اس بات کی توجہ رکھنی چاہیے کہ یہ نہیں فرماتا کہ: ”وہ اپنی نماز میں سہو کرتے ہیں“۔ چونکہ نماز میں سہو تو بہر حال ہر شخص سے ہو جاتا ہے، ”وہ اصل نماز سے ہی سہو کرتے ہیں، اور کل کی کل نماز کو ہی بھول جاتے ہیں“۔

اس بات واضح ہے کہ اگر اس مطلب کا ایک یا چند مرتبہ اتفاق ہو تو ممکن ہے کہ کوتاہی کی وجہ سے ہو۔ لیکن جو شخص نماز کو ہمیشہ کے لیے ہی بھولے ہوئے ہو، اور اسے بالکل ہی بھلا چکا ہو، تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے کسی اہمیت کا قائل نہیں ہے، یا اصلاً اس پر ایمان نہیں رکھتا، اور اگر وہ کبھی کبھار نماز پڑھ لیتا ہے تو لوگوں کی زبان یا اسی طرح کی باتوں سے ڈر کر پڑھتا ہے

اس بارے میں کہ یہاں ”ساهون“ سے مراد کیا ہے؟ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس کے علاوہ دوسری تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ اس سے مراد وقت فضیلت سے تاخیر کرنا ہے۔ یا اس سے مراد منافقین کی طرف اشارہ کرنا ہے جو نہ نماز کے ثواب کا اعتقاد رکھتے ہیں، اور نہ ہی اس کے ترک کے عذاب کا۔

یا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نماز میں ریاکاری کرتے ہیں۔ (جب کہ یہ معنی بعد والی آیت میں آ رہا ہے)۔ البتہ ان معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ بہر حال جب نماز کو بھول جانے والے ویل اور ہلاکت کے مستحق ہیں، تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو کلی طور پر نماز کو چھوڑے ہوئے ہیں اور تارک الصلاۃ ہیں۔

چوتھے مرحلہ میں ان کے ایک اور بدترین عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ ایسے لوگ ہیں جو ہمیشہ ریاکاری کرتے ہیں“۔ ﴿الذین ہم یراءون﴾۔

مسلمہ طور پر اس مظاہر اور ریاکاری کے سرچشمے روز قیامت پر ایمان کا نہ ہونا، اور خدائی جزاؤں کی طرف توجہ کرنا ہے ، ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان خدائی جزاؤں کو تو چھوڑ دے، اور مخلوق کو خوش کرنے کی طرف توجہ رکھے۔

”ماعون“ ”معن“ (بروزن شأن) کے مادہ سے، کم اور تھوڑی سی چیز کے معنی میں ہے اور بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں اس سے مراد جزئی اور معمولی قسم کی چیزیں ہیں، جو لوگ، خصوصاً ہمسائے، ایک دوسرے سے رعایتاً لے لیتے ہیں، مثلاً کچھ نمک، پانی، آگ (ماچس) برتن وغیرہ۔

واضح رہے کہ جو شخص اس قسم کی چیزیں بھی دوسروں کو دیتا، وہ انتہائی پست اور بے ایمان آدمی ہوتا ہے، ایسے افراد اس قدر بخیل ہوتے ہیں کہ اس قسم کی معمولی چیزوں کے دینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی معمولی معمولی چیزیں بعض اوقات بڑی بڑی احتیاجات کو پورا کرتی ہیں اور ان کے روک لینے سے لوگوں کی زندگی میں بڑی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔

ایک گروہ نے یہ بھی کہا ہے کہ ”ماعون“ سے مراد زکوٰۃ ہے۔ کیونکہ اصل مال سے عام طور پر بہت ہی کم ہوتی ہے۔ کبھی سو میں سے دس، کبھی سو میں سے پانچ اور کبھی سو میں سے اڑھائی۔

یقیناً ”زکوٰۃ کا نہ دینا“ بھی بدترین کاموں میں سے ایک ہے، کیونکہ زکوٰۃ معاشرے کی بہت سی اقتصادی مشکلات کو حل کرتی ہے۔ ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے ماعون کی تفسیر میں فرمایا:

”﴿هو القرض یقرضه، و المتاع یعیره، و المعروف یصنعه﴾:

”ماعون وہ قرض ہے جو انسان دوسرے کو دیتا ہے۔ اور وہ وسائل زندگی ہیں جو وہ ادھار کے طور پر دوسروں کو دیتا ہے۔ اور وہ امدادیں اور کارہائے خیر ہیں جنہیں انسان انجام دیتا ہے۔“ (۲)

ایک اور روایت میں انہیں حضرت سے یہی معنی نقل ہوا ہے، اور اس کے ذیل میں آیا ہے کہ راوی نے کہا: ہمارے ہمسائے ایسے ہیں کہ جب ہم کچھ وسائل زندگی ان کو دیتے ہیں تو وہ انہیں توڑ دیتے ہیں اور خراب کر دیتے ہیں، تو کیا انہیں نہ دینا بھی گناہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا اس صورت میں کوئی مانع نہیں ہے۔

”ماعون“ کے معنی کے بارے میں دوسرے احتمالات بھی دئے گئے، یہاں تک کہ تفسیر قرطبی میں بارہ سے زیادہ قول اس سلسلے میں نقل ہوئے ہیں جن میں سے بہت سوں کو ایک دوسرے میں ملایا جاسکتا ہے، البتہ زیادہ اہم وہی جو ہم نے اوپر نقل کیے ہیں۔

ان دونوں کاموں کو ایک دوسرے کے بعد ذکر کرنا (ریا کاری و منع ماعون) گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو بات خدا کے لیے ہے اسے وہ مخلوق کی نیت سے بجالاتے ہیں، اور جو مخلوق کے لیے ہے وہ ان کے لیے نہیں کرتے اور اس طرح سے وہ کوئی بھی حق اس کے حق دار تک نہیں پہنچاتے۔

ہم اس گفتگو کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

”من منع الموعون جاره منع اللہ خیرہ یوم القیامۃ، وکلہ الی نفسہ، ومن وکلہ الی نفسہ فما اسوء حالہ؟!:

جو شخص ضروری اور معمولی چیزوں کو اپنے ہمسایہ سے روکتا ہے، خدا اسے قیامت کے دن اپنی خیر سے روک دے

گا، اور جسے خدا اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دے اس کا بہت ہی برا حال ہوگا۔^(۳)

۱۔ ”مفردات“ مادہ ”حض“

۲۔ ”کافی“ مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۶۷۹۔

۳۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۶۷۹ حدیث ۲۰۔

۱۔ سورہ ماعون کے مباحث کی جمع بندی

اس مختصر سورہ میں صفاتِ رذیلہ کا ایک ایسا مجموعہ آیا ہے کہ وہ جس شخص میں بھی ہو اس کی بے ایمانی، پستی اور حقارت کی ایک نشانی ہے۔ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان سب کو تکذیبِ دین یعنی جزاء یا روزِ جزا کی فرع قرار دیا ہے۔

یتیموں کو حقیر جاننا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، نماز سے غفت برتنا، ریاکاری کرنا اور لوگوں سے موافقت نہ کرنا، یہاں تک کہ زندگی کے معمولی وسائل دینے میں یہ ہے کہ ان (صفاتِ رذیلہ) کا مجموعہ۔ اور اس طرح سے ان بخیل، خودخواہ اور ریاکار افراد کو ظاہر کرتا ہے، جن کا نہ تو ”مخلوقِ خدا“ ہی کے ساتھ کوئی تعلق ہے اور نہ ہی ”خالق“ کے ساتھ کوئی رابطہ۔ ایسے افراد جن کے وجود میں نورِ ایمان اور احساسِ مسئولیت نہیں ہوتا، نہ تو وہ خدائی اجر و ثواب میں غور و فکر کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

۲۔ تظاہر و ریا ایک بہت بڑی اجتماعی مصیبت ہے۔

ہر عمل کی قدر و قیمت اس کے سبب کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسلام کی نگاہ میں ہر عمل کی بنیاد اس کی ”نیت“ پر ہوتی ہے، وہ بھی ”خالص نیت“ اسلام ہر چیز سے پہلے نیت کے بارے میں تحقیق کرتا ہے، لہذا ایک مشہور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے

”انما الاعمال بالنیات و لكل امرء ما نوى“

”ہر عمل نیت کے ساتھ وابستہ ہے اور ہر شخص کا عمل میں حصہ، اس کی اس نیت کے مطابق ہوگا، جو وہ عمل میں رکھتا تھا۔“

اور اسی حدیث کے ذیل میں آیا ہے:

”جو شخص خدا کے لیے جہاد کرے اس کا اجر خدائے بزرگ و برتر ہے۔ اور جو شخص مالِ دنیا کے لیے جنگ کرے، یہاں تک کہ ایک عقال وہ چھوٹی سی رسی جس سے اونٹ کے پاؤں کو باندھتے ہیں (لینے کے لیے کمرے اس کا حصہ بس وہی ہے۔^(۱))

یہ سب اس بناء پر ہے کہ ”نیت سے ہی عمل وجود میں آتا ہے۔ وہ شخص جو خدا کے لیے کوئی کام انجام دیتا ہے، تو وہ اس کی بنیاد کو محکم کرتا ہے، اور اس کی تمام کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ لیکن جو شخص تظاہر اور ریاکاری کے لیے کسی عمل کو انجام دیتا ہے وہ صرف اس کے ظاہر اور زرق و برق پر نظر رکھتا ہے، اور وہ اس کی گہرائی و بنیاد اور حاجت مندوں کے استفادے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

وہ معاشرہ جو ریاکاری کا عادی ہو جاتا ہے وہ نہ صرف خدا، اخلاقِ حسنہ اور ملکاتِ فاضلہ سے دور کر دیا جاتا ہے، بلکہ اس کے تمام اجتماعی پروگرام مفہوم و مطلب سے خالی ہو جاتے ہیں، اور وہ مٹھی بھرے معنی ظواہر کا خالص رہ جاتے ہیں، اور ایسے انسان اور اس قسم کے معاشرے کی سرنوشت کتنی دردناک ہے؟!۔

”ریا“ کی مذمت میں بہت زیادہ روایات آئی ہیں، یہاں تک کہ اس کو شرک کی ایک نوع کہا گیا ہے، اور ہم یہاں تین ہلا دینے والی روایات پر قناعت کرتے ہیں۔

۱۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

”سِیْئاً تِیْ عَلٰی النَّاسِ زَمَانٌ تَحْبِثُ فِیْهِ سِرَائِرُہُمْ وَنَحْنُ فِیْہِ عَلَانِیَّتُہُمْ، طَمَعاً فِی الدُّنْیَا لَا یَدُوْنَ بِہِ مَا عِنْدَ رَبِّہُمْ،

یَكُوْنُ دِیْنُہُمْ رِیْاءٌ لَا یُخَالِطُہُمْ خَوْفٌ، یَعْمَعُہُمْ اللّٰہُ بِعِقَابٍ فِیْدُ عَوْنُہُ دَعَا الْغَرِیْقِ فَلَا یَسْتَحِبُّ لَہُمْ!:

”لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب ان کے باطنِ قبیح، گندے اور آلودہ ہو جائیں، اور ان کے ظاہر زیبا اور خوبصورت ہوں گے۔ دنیا میں طمع کی خاطر وہ اس سے اپنے پروردگار کی جزاؤں کے طلب گار نہیں ہوں گے۔ ان کا دین ریا ہو جائے گا، خوفِ خدا ان کے دل میں باقی نہ رہے گا، خدا ان سب کو ایک سخت عذاب میں گرفتار کرے گا، اور وہ جتنا بھی ایک ڈوبنے والے کی طرح خدا کو پکاریں گے، ہرگز ان کی دعا قبول نہ ہوگی۔“^(۲)

۲۔ ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک صحابی ”زرارہ“ سے فرمایا:

”مَنْ عَمِلَ لِلنَّاسِ كَانَتْ ثَوَابُہُ عَلٰی النَّاسِ یَا زَرَارَہُ ! كُلُّ رِیْاءٍ شُرْكٌ!“۔

”جو شخص لوگوں کے لیے عمل کرے گا اس کا اجر و ثواب لوگوں پر ہی ہوگا۔ اے زرارہ! ہر ریا شرک ہے۔“^(۳)

۳۔ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم سے آیا ہے: ”ان المرأی یدعی یوم القیامۃ باربعۃ اسماء: یا کافر! یا فاجر! غادر! یا خاسر! حبط عملک، و بطل اجرک، فلا خلاص لک الیوم، فالتمس اجرک من کنت تعمل له!:

”ریا کار شخص کو قیامت کے دن چار ناموں سے پکارا جائے گا:

اے کافر! اے فاجر! اے حیلہ گر! اے خاسر و زیاں کار! تیرا عمل نابود ہو گیا ہے، تیرا اجر و ثواب باطل ہو چکا ہے۔ آج تیرے لیے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے، لہذا تو اپنا اجر و ثواب اس سے طلب کر جس کے لیے تو عمل کرتا تھا۔ ۲ خداوند! خلوص نیت سخت مشکل کام ہے، تو خود اس راہ میں ہماری مدد فرما۔ پروردگار! ہمیں ایسا ایمان مرحمت فرما کہ ہم تیرے ثواب و عقاب کے علاوہ اور کچھ نہ سوچیں، اور مخلوق کی رضا و خشنودی اور غصہ و غضب تیری راہ میں ہمارے لیے یکساں ہو۔ بار لہنا! اس راہ میں جو خطا اور غلطی اب تک ہم نے کی ہے وہ ہمیں بخش دے۔

آمین یا رب العالمین۔

۱۔ وسائل الشیعہ ”جلد اول ص ۳۵ (ابواب مقدمہ العبادات باب ۵ حدیث ۱۰)۔

۲۔ ”اصول کافی“ جلد ۲ باب الریاء حدیث ۱۴۔

۳۔ ”وسائل الشیعہ“ جلد اول ص ۴۹ (حدیث ۱۱ کے ذیل میں)۔

۴۔ ”وسائل الشیعہ“ جلد اول ص ۵۱ (حدیث ۱۶ کے ذیل میں)۔

سورہ الکواثر

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۳ آیات ہیں۔

سورہ کوثر کے مطالب اور اس کی فضیلت

مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ ”مکہ“ میں نازل ہوا ہے۔ لیکن بعض نے اس کے مدنی ہونے کا احتمال بھی دیا ہے۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ سورہ دوبار نازل ہوا۔ ایک دفعہ مکہ میں اور دوسری دفعہ مدینہ میں، لیکن جو روایات اس کے شان نزول میں وارد ہوئی ہیں وہ اس کے لگی ہونے کے مشہور قول کی تائید کرتی ہیں۔

اس سورہ کے شان نزول میں آیا ہے کہ: ”عاص بن وائل“ نے جو مشرکین کے سرداروں میں سے تھا، پیغمبر اکرم سے مسجد الحرام سے نکلتے وقت ملاقات کی اور کچھ دیر تک آپ سے باتیں کرتا رہا۔ قریش کے سرداروں کا ایک گروہ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے دور سے اس منظر کا مشاہدہ کیا۔ جس وقت ”عاص بن وائل“ مسجد میں داخل ہوا تو انہوں نے اس سے کہا کہ تو کس سے باتیں کر رہا تھا؟ اس نے کہا: اس ”ابتر“ شخص سے۔ اس نے اس تعبیر کا اس لیے انتخاب کیا کہ پیغمبر اکرم کے فرزند ”عبد اللہ“ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اور عرب ایسے آدمی کو جس کے کوئی بیٹا نہ ہو ”ابتر“ کہا کرتے تھے یعنی (بلا عقب۔ مقطوع النسل) لہذا قریش نے پیغمبر اکرم کے فرزند کی وفات کے بعد اس لقب کو آنحضرت کے لیے انتخاب کر رکھا تھا، جس پر یہ سورت نازل ہوئی، اور پیغمبر اکرم کو بہت سی نعمتوں اور کوثر کی بشارت دی اور ان کے دشمنوں کو ابتر کہا

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ پیغمبر اکرم کے بانو نے اسلام جناب خدیجہ سے دو پسر تھے، ایک قاسم اور دوسرے طاہر جنہیں عبد اللہ بھی کہتے تھے۔ دونوں ہی مکہ میں دنیا سے چل بسے اور پیغمبر اکرم کے کوئی بیٹا نہ رہا۔ اس بات نے قریش کے بد خواہوں کی زبان کھول دی، وہ آنحضرت کو ”ابتر“ کہنے لگے

وہ اپنی روایت کے مطابق بیٹے کو حد سے زیادہ اہمیت دیتے تھے، اسے باپ کے پروگراموں کو جاری رکھنے والا شمار کرتے تھے اس سانچے کے باعث ان کا خیال یہ تھا کہ پیغمبر اکرم کی رحلت کے بعد بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے پروگرام معطل ہو کر رہ جائیں گے چنانچہ وہ اس بات پر بہت خوش تھے۔

قرآن مجید نازل ہوا اور اس سورہ میں اعجاز آمیز طریقہ سے انہیں جواب دیا اور خبر دی کہ آنحضرت کے دشمن ہی ابتر رہیں گے اور اسلام و قرآن کا پروگرام کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اس سورہ میں جو بشارت دی گئی ہے وہ ایک طرف تو دشمنان اسلام کی امیدوں پر ایک ضرب تھی اور دوسری طرف رسول اللہ کے لئے تسلی خاطر تھی جن کا قلب نازک دل اس قبیح لقب اور دشمنوں کی سازش کو سن رہا تھا۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے:

”من قرائھا سقاہ اللہ من انھار الجنة، واعطی من الاجر بعد کل قربان قربہ العباد فی یوم عید و یقربون من اهل الكتاب والمشرکین“

جو شخص اس کی تلاوت کرے خدا اسے جنت کی نہروں سے سیراب کرے گا اور ہر قربانی کی تعداد میں جو خدا کے بندے عید (قربان) کے دن کرتے ہیں، اور اسی طرح سے وہ قربانیاں کو اہل کتاب اور مشرکین دیتے ہیں ان سب کی تعداد کے برابر اس کو اجر دے گا۔

اس سورہ کا نام (کوثر) اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔

آیات ۱، ۲، ۳

﴿بسم الله الرحمن الرحيم﴾

۱۔ ﴿انا اعطینک الکوثر﴾۔ ۲۔ ﴿فصل لربک وانحر﴾۔ ۳۔ ﴿انا شائنک هو الا بتر﴾۔

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحیم ہے

۱۔ ہم نے تجھے کوثر (بہت زیادہ خیر و برکت) عطا کی۔ ۲۔ اب جب کہ یہ بات ہے تو اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھ اور قربانی دے۔

۳۔ یقیناً تیرا دشمن ہی ابتر (اور بلا عقب و مقطوع النسل) ہے۔

ہم نے تجھے فراواں خیر و برکت دی

اس تمام سورے میں روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف ہے (جیسا کہ سورہ الضحیٰ اور سورہ الم نشرح میں ہے) اور تینوں سوروں کے اہداف و مقاصد میں سے ایک آنحضرت کے دل کو دردناک انبوہ حوادث میں تسلی دینا اور دشمنوں کے بار بار لگائے ہوئے زبان کے زخموں کے مقابلہ میں تشفی بخشنا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ”ہم نے تجھے کوثر عطا کیا“ ﴿إِنَّا عَطَيْنَاكَ الْكُوثِرَ﴾ ”کوثر“ وصف ہے جو کثرت سے لیا گیا ہے، اور فراواں خیر و برکت کے معنی میں ہے اور ”سخی“ افراد کو بھی ”کوثر“ کہا جاتا ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں کوثر سے کیا مراد ہے، ایک روایت میں آیا ہے کہ جس وقت یہ سورہ نازل ہوا، پیغمبر اکرم نبی پر تشریف لے گئے اور اس سورہ کی تلاوت فرمائی۔ اصحاب نے عرض کیا یہ کیا چیز ہے جو خدا نے آپ کو عطا فرمائی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ جنت میں ایک نہر ہے، جو دودھ سے زیادہ سفید اور قدح (بلور) سے زیادہ صاف ہے، اس کے اطراف میں دریا قوت کے قے ہیں

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”کوثر جنت میں ایک نہر ہے جو خدا نے اپنے پیغمبر کو ان کے فرزند (عبداللہ جو آپ کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے) کے بدلے میں عطا کی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد وہی ”حوضِ کوثر“ ہے جو پیغمبر سے تعلق رکھتا ہے، اور جس سے مومنین جنت میں داخل ہونے کے وقت سیراب ہو گے۔

بعض نے اس کی نبوت سے تفسیر کی ہے، بعض دوسروں نے قرآن سے، بعض نے اصحاب و انصار کی کثرت سے اور بعض نے کثرتِ اولاد اور دُریت سے، جو سب آپ کی دختر نیک اختر فاطمہ زہرا علیہا السلام سے وجود میں آئی اور اس قدر بڑھ گئی ہے کہ حساب و شمار سے باہر ہو گئی ہے اور دامنِ قیامت تک پیغمبر اسلام کے وجود کی یادگار ہے۔ بعض نے اس کی ”شفاعت“ سے بھی تفسیر کی ہے اور اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث بھی نقل کی ہے یہاں تک کہ فخر رازی نے ”کوثر“ کی تفسیر میں ”پندرہ قول“ نقل کیے ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر اس وسیع معنی کے واضح مصادیق کا بیان ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے ”کوثر“ ”خیر کثیر اور افرادِ نعمت“ کے معنی میں ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے پیغمبر اکرم کو بہت ہی زیادہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور جو کچھ اوپر بیان کیا گیا

ان میں سے ہر ایک اس کے مصداق میں سے ایک واضح مصداق ہے اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مصداق ہیں، جنہیں آیت کی مصداقی تفسیر کے عنوان سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال تمام میدانوں میں پیغمبر اکرم کی ذات پر تمام نعمتیں۔ یہاں تک کہ دشمنوں کے ساتھ جنگوں میں آپ کی کامیابیوں میں، یہاں تک کہ آپ کی اُمت کے علماء جو ہر عصر اور ہر زمانہ میں قرآن و اسلام کی مشعلِ فروزاں کی پاسداری کرتے ہیں، اور اسے دنیا کے ہر گوشہ میں لے جاتے ہیں۔ سب اس خیر کثیر میں شامل ہیں۔

اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ خدا اپنے پیغمبر سے یہ بات اس وقت کہہ رہا ہے کہ ابھی تک اس خیر کثیر کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ یہ ایک ایسی خبر اور پیش گوئی تھی جو مستقبل بعید کے لئے کی جارہی تھی۔ یہ ایک اعجاز آمیز اور رسو لِ اکرم کی دعوت کی حقانیت کو بیان کرنے والی خبر ہے۔

اس عظیم نعمت اور خیرِ فراہاں کے لئے بہت ہی زیادہ شکر ادا کرنے کی ضرورت ہے، اگرچہ مخلوق کا شکر ادا کرنا خالق کی نعمت کے حق کو ہرگز ادا نہیں کرتا، بلکہ شکر گزاری کی توفیق اس کی طرف سے خود ایک اور نعمت ہے، لہذا فرماتا ہے: ”اب جب کہ ایسا ہے تو صرف اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھ اور قربانی دے“ ﴿فصل لربک وانحر﴾

ہاں! نعمت کا بخشنے والا وہی ہے اسی بناء پر نماز، عبادت اور قربانی جو ایک قسم کی عبادت ہے، اس کے علاوہ کسی اور کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی خصوصاً ”رب“ کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو نعمتوں کے دوام اور پروردگار کی تدبیر و ربوبیت کو بیان کرتا ہے خلاصہ یہ کہ ”عبادت“ خواہ نماز کی صورت میں، ہو یا قربانی کرنے کی صورت میں وہ رب اور ولی نعمت کے ساتھ ہی مخصوص ہے اور وہ خدا کی ذاتِ پاک سے وابستہ ہے

یہ بات مشرکین کے اعمال کے مقابلہ میں جو اپنی نعمتوں کو تو خدا ہی کی طرف سے سمجھتے تھے لیکن سجدہ اور قربانی بتوں کے لئے کرتے تھے بہر حال ’لربک‘ کی تعبیر عبادات میں قصدِ قربت کے لازم ہونے کے مسئلہ پر ایک واضح دلیل ہے بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ نماز سے مراد عیدِ قربان کے دن کی نماز ہے اور قربانی کرنا بھی اسی دن ہے لیکن ظاہراً آیت کا مفہوم عام اور وسیع اگرچہ عید کے دن کی نماز اور قربانی بھی اس کا ایک واضح مصداق ہے۔ ”وانحر“

نحر“ کے مادہ سے، اُونٹ کو حلال کرنے کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ بات شاید اس بناء پر ہے کہ قربانیوں میں سے اُونٹ کی قربانی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ اور پہلے پہل مسلمان اس سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے اور اُونٹ کی قربانی دینا ایثار و قربانی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

اوپر والی آیت کے لیے یہاں دو اور تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ ”وا نحر“ کے جملہ سے مراد نماز کے وقت رُوبقلیہ کھڑا ہونا ہے، چونکہ ”نحر“ کا مادہ گلے والی جگہ کے معنی میں ہے اس کے بعد عربوں نے اسے ہر چیز کے آمنے سامنے ہونے کے معنی میں استعمال کیا ہے، لہذا وہ کہتے ہیں: ”منا زلنا تنناحر“ یعنی ہمارے گھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔

۲۔ اس سے مراد تکبیر کے وقت ہاتھوں کو بلند کرنا اور گلے اور چہرے کے سامنے لانا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے: ”جس وقت یہ سورہ نازل ہوا، تو پیغمبر اکرم نے جبریل سے سوال کیا: یہ ”نُحیرہ“ جس کے لئے میرے پروردگار نے مجھے مامور کیا ہے، کیا ہے؟“ جبریل نے عرض کیا:

”یہ نُحیرہ نہیں ہے، بلکہ خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ جس وقت نماز میں داخل ہو تو تکبیر کہتے وقت اپنے ہاتھوں کو بلند کریں، اور اسی طرح جب رکوع کریں، یا رکوع سے سر اٹھائیں، یا سجدہ کریں، اس وقت بھی، کیونکہ ہماری اور سات آسمانوں کے فرشتوں کی نماز اسی طرح کی ہے۔ اور ہر چیز کی ایک زینت ہوتی ہے، اور نماز کی زینت ہر تکبیر کے وقت ہاتھوں کو بلند کرنا ہے۔“

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں اپنے دستِ مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اس سے مراد یہ ہے کہ نماز کے آغاز میں ہاتھوں کو اس طرح بلند کرو کہ ان کی ہتھیلیاں رُوبقبلہ ہو۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے، کیونکہ اس سے مراد بُت پرستوں کے اعمال کی نفی ہے جو غیر خدا کے لئے عبادت و قربانی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان تمام روایات اور مطالب کے درمیان جمع کرنا، جو اس سلسلہ میں ہم تک پہنچی ہیں کوئی مانع نہیں ہے۔ خاص طور سے تکبیرات کے وقت ہاتھ بلند کرنے کے سلسلہ میں تو شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں۔ اس طرح سے ایک آیت جامع مفہوم رکھتی ہے جو ان کو بھی شامل ہے۔

اور اس سورہ کی آخری آیت میں، اس نسبت کی طرف توجہ دیتے ہوئے، جو شرک کے سرغنہ آنحضرت کی طرف دیتے تھے، فرماتا ہے: ”أَبْرًاوَرَبْلًا عَقْبًاوَمَقْطُوعَ النَّسْلِ“۔ بلکہ تیرا دشمن اَبْر، بلا عقب اور مقطوع النسل

رہے گا۔ ﴿إِنَّا شَانِئُكَ هُوَ الْاَبْرُ﴾

”شانی“ ”شننان“ (بروزن ضربان) کے مادّہ سے عداوت و دشمنی، کینہ ورزی اور بد خلقی کرنے کے معنی میں ہے اور ”شانی“ اس شخص کو کہتے ہیں جو اس صفت کا حامل ہو۔

قابل توجہ بات یہ کہ ”ابتر“ اصل میں ”دُم کُٹے جانور“ کے معنی میں ہے، اور دشمنانِ اسلام کی طرف سے اس تعبیر کا انتخاب آنحضرت کی ہتک حرمت اور توہین کرنے کے لئے تھا۔ اور ”شانی“ کی تعبیر اسی واقعیت کو بیان کرتی ہے کہ وہ اپنی دشمنی میں کم سے کم آداب کی رعایت تک بھی نہیں کرتے تھے۔ یعنی ان کی عداوت و دشمنی قساوت و رذالت سے آمیختہ تھی۔ حقیقت میں قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ لقب خود تمہارا ہے نہ کہ پیغمبر اکرم کا۔ دوسری طرف۔ جیسا کہ سورہ کی شانِ نزول میں بیان کیا گیا ہے۔ قریش پیغمبر اکرم، اور اسلام کی بساط کے اُلٹ جانے کے انتظار میں تھے، کیونکہ وہ یہ کہتے تھے کہ آپ کے پیچھے کوئی اولاد نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تو بلا عقب اور بے اولاد نہیں ہے بلکہ تیرے دشمن ہی بلا عقب اور بے اولاد ہیں۔

۱۔ حضرت فاطمہ اور ”کوثر“

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ”کوثر“ ایک عظیم جامع اور وسیع معنی رکھتا ہے۔ اور وہ ”خیر کثیر و افراداں ہے“ اور اس کے بہت زیادہ مصداق ہیں۔ لیکن بہت سے بزرگ شیعہ علماء نے واضح ترین مصداق میں سے ایک مصداق ”فاطمہ زہرا“ (سلام اللہ علیہا) کے وجود مبارک کو سمجھا ہے۔ چونکہ آیت کی شانِ فزول سے ظاہر ہے کہ دشمن پیغمبر اکرم کو ابتر اور بلا عقب ہونے سے متہم کرتے تھے۔ قرآن ان کی بات کی نفی کے ضمن میں کہتا ہے: ”ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ہے“ اس تعبیر کا مطلب یہی بنتا ہے کہ یہ ”خیر کثیر“ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہی ہیں کیونکہ پیغمبر کی نسل اور ذریت اسی دخترِ گرامی کے ذریعے سارے عالم میں منتشر ہوئی، جو نہ صرف پیغمبر کی جسمانی اولاد تھی بلکہ انہوں نے آپ کے دین اور اسلام کی تمام اقدار کی حفاظت کی اور اسے آنے والوں تک پہنچایا۔ نہ صرف اہل بیت کے آئمہ معصومین، جن کی اپنی ایک مخصوص حیثیت تھی، بلکہ ہزارہا فرزندانِ فاطمہ عالم میں پھیل گئے، جن میں بڑے بڑے جزرگ علماء متوفین، فقہا، محدثین، مفسرین والا مقام، اور عظیم حکمران ہو گزرے ہیں جنہوں نے ایثار و قربانی اور فداکاری کے ساتھ دینِ اسلام کی حفاظت کی کوشش کی۔ یہاں پر ”فخر رازی“ کی ایک عمدہ بحث ہمارے سامنے آئی ہے جو اُس نے کوثر کی مختلف تفسیروں کے ضمن میں بیان کی ہے: تیسرا قول یہ ہے کہ یہ سورہ ان لوگوں کے ردّ کے عنوان سے نازل ہوا ہے جو پیغمبر اکرم کی اولاد کے نہ ہونے پر طعن و طنز، اور تنقید و اعتراض کرتے تھے۔ اس بناء پر سورہ کا معنی یہ ہوگا کہ خدا آپ کو ایسی نسل دے

گا جو زمانہ دراز تک باقی رہے گی غور تو کرو کہ لوگوں نے اہل بیت کے کتنے افراد کو شہید کیا لیکن اس کے باوجود دنیا اُن سے بھری پڑی ہے جب کہ بنی اُمیہ میں سے (جو اسلام کے دشمن تھے) کوئی قابل ذکر شخص دنیا میں باقی نہیں رہا پھر آنکھ کھول کر دیکھ اور غور کر کہ فاطمہ کی اولاد کے درمیان باقر و صادق و رضا و نفیس ذکیہ / جیسے کتنے عظیم اور بزرگ علماء ہوئے ہیں

۲۔ اس سورہ کا اعجاز

در حقیقت اس سورہ میں تین پیشین گوئیاں، بیان کی گئی ہے ایک طرف پیغمبر کو خیر کثیر عطا کرنے کی خوش خبری دیتی ہے (اگرچہ ”اعطینا“ فعل ماضی کی صورت میں ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ مضارع مسلم کی قسم سے ہو، جو ماضی کی صورت میں بیان ہوا ہے) اور یہ خیر کثیر ان تمام فتوحات، کامیابیوں اور توفیقات کو شامل ہے جو پیغمبر اکرم کو بعد میں نصیب ہوئی ہے اگرچہ وہ مکہ میں اس سورہ کے نزول کے وقت پیش بینی کے قابل نہیں تھیں دوسری طرف یہ سورہ اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ پیغمبر اکرم بے اولاد، بلا عقب اور مقطوع النسل نہیں ہو گئے۔ بلکہ آپ کی نسل اور اولاد بڑی کثرت سے عالم میں موجود رہے گی۔

تیسری جانب یہ سورہ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ آپ کے دشمن ابتر، بلا عقب اور مقطوع النسل ہو جائیں گے یہ پیش گوئی بھی پوری ہو گئی ہے اور آپ کے دشمن اس طرح تتر بتر اور تباہ و برباد ہوئے کہ آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے حالانکہ ”بنی اُمیہ“ اور ”بنی عباس“ جیسے قبائل جو پیغمبر اور ان کی اولاد کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے ایک وقت اتنی جمعیت اور کثرت رکھتے تھے کہ ان کی اولاد شمار میں نہ آئی تھی، لیکن آج اگر اُن میں سے کوئی باقی رہ بھی گیا ہو تو وہ بالکل پہچانا نہیں جات

۳۔ خدا کے لیے جمع کی ضمیر کس لیے ہے؟

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں بھی اور قرآن مجید کی اور بہت سی دوسری آیات میں بھی صیغہ ”متکلم مع الغیر“ (جمع متکلم) کے ساتھ اپنا ذکر کرتا ہے فرماتا ہے: ”ہم“ نے تجھے کوثر عطا کیا یہ تعبیر اور اس قسم کی تعبیریں عظمت و قدرت کو بیان کرنے کے لیے ہوتی ہیں کیونکہ بزرگ اور بڑی ہستیاں جب اپنے بارے میں بات کرتی ہیں، تو وہ صرف اپنے بارے

میں ہی نہیں، بلکہ اپنے ماموریں کارندوں کے بارے میں بھی خبر دیتی ہیں، اور یہ قدرت و عظمت اور ان کے اوامر کے مقابلہ میں فرمانبرداری کرنے والوں سے کتنا یہ ہے

زیر بحث آیت میں لفظ ”ان“ بھی اس معنی پر ایک دوسری تاکید ہے۔ ”ایتناک“ کے بجائے ”اعطیناک“ کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ خدا نے پیغمبر کو کوثر بخش دے ا ہے اور عطا کر دیا ہے۔ اور یہ پیغمبر اکرم کے لئے ایک بہت بڑی بشارت ہے کہ کو دشمنوں کی یہودہ باتوں سے آپ کا قلب مبارک آزرہ نہ ہو۔ اور آپ کے آہنی عزم میں سستی اور کمزوری پیدا نہ ہونے پائے۔ اور دشمن یہ جالیں کہ آپ کی تکیہ گاہ وہ خدا ہے، جو تمام خیرات کا منبع ہے اور اس نے خیر کثیر آپ کو بخش دی ہے۔

خدا ندا! ہمیں اس خیر کثیر کی برکات سے جو تو نے اپنے پیغمبر کو مرحمت فرمائی ہے، بے نصیب نہ کرنا۔ پروردگار! تو جانتا کہ ہم آنحضرت اور آپ کی ذریت طاہرہ کو خلوص دل کو ساتھ دوست رکھتے ہیں، لہذا ہمیں انہیں کے ساتھ محشور کرنا۔

بار الہا آنحضرت اور آپ کے دین و انیس کی بہت بڑی عظمت ہے، اس عظمت و عزت و شوکت میں روز بروز اضافہ فرما۔

سورہ کافرون

یہ مکہ میں نازل ہوا اس میں ۶ آیات ہیں

سورہ کافرون کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس کا لب و لہجہ اور اس کے مطالب اس بات کے واضح گواہ ہیں۔ اسی طرح وہ شانِ نزول جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا، اس مدعا پر دوسری دلیل ہے۔ یہ جو بعض نے اس کے مدنی ہونے کا احتمال دیا ہے، بہت بعید نظر آتا ہے۔

سورہ کالِب و لہجہ بتاتا ہے کہ یہ سورہ ایسے زمانہ میں نازل ہوا جب مسلمان اقلیت میں تھے اور کفار اکثریت میں پیغمبر پر ان کی طرف سے سخت دباؤ تھا اور انہیں اصرار تھا کہ کسی طرح سازش کر کے آپ کو شرک کی طرف کھینچ لیں۔ پیغمبر نے ان کی اس پیش کش کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور انہیں کلی طور پر مایوس کر دیا اور ان کے ساتھ لہجہ بھی نہیں۔

یہ بات تمام مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ ہے کہ وہ اسلام اور دین کی اساس کے بارے میں دشمن کے ساتھ کسی حالت میں بھی مصالحت نہ کریں اور جب بھی ان کی طرف سے اس قسم کی خواہش کی جائے تو انہیں کامل طور سے مایوس کر دیں۔ اس سورہ میں اس معنی پر خصوصیت کے ساتھ دو مرتبہ تاکید ہوئی ہے کہ ”میں تمہارے معبودوں کی پرستش نہیں کروں گا“ اور یہ تاکید انہیں مایوس کرنے کے لئے ہے۔ اسی طر اس بات کی بھی دو مرتبہ تاکید ہوئی ہے کہ ”تم بھی ہر گز میرے معبود، خدائے یگانہ کی عبادت نہیں کرو گے۔“ یہ ان کی ہٹ دھرمی کی ایک دلیل ہے اور اس کا انجام یہ ہے کہ ”میں ہوں اور میرا دین توحید، اور تم ہو اور تمہارا شرک آلود دین۔“

اس سورہ کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں، جو اس کے مطالب کی حد سے زیادہ اہمیت کی ترجمان ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

”من قرأ قل یا ایہا الکافرون فکأنما قرأ ربع القرآن و تباعدت عنه مردۃ الشیاطین ، و برأ من الشرک و لیعافی من الفزع الاکبر“

”جو شخص ”قل یا ایہا الکافرون“ کو پڑھے گا تو ایسا ہے جیسے اس نے چوتھائی قرآن پڑھا ہو، سرکش شیاطین اس سے دور رہیں گے، وہ شرک سے پاک ہو جائے گا اور ”روز قیامت“ کی گھبراہٹ سے امان میں ہوگا۔

”ربع القرآن“ (چوتھائی قرآن) کی تعبیر شاید اس بناء پر ہے کہ قرآن کا تقریباً چوتھا حصہ شرک و بت پرستی سے مبارزہ میں ہے اور اس کا نچوڑ اور خلاصہ اس سورہ میں آیا ہے۔ اور سرکش شیاطین کا دور ہونا اس بناء پر ہے کہ اس سورہ میں مشرکین کی پیش کش کو ٹھکرا دیا گیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ شرک شیطان کا اہم ترین آلہ ہے۔

قیامت میں نجات پہلے درجہ میں توحید اور نفی شرک کی مرہونِ منت ہے، وہی مطلب کے محور پر یہ سورہ گردش کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے عرض کیا: اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے کسی ایسی چیز کی تعلیم دیجئے جسے میں سوتے وقت پڑھا کروں، آپ نے فرمایا:

”اذا اخذت مضجعک فاقرأ قل یا ایہا الکافرون ثم نم علی خاتمها فانھا براءۃ من الشریک“

”جب تو اپنے بستر پر جائے تو سورہ قل یا ایہا الکافرون کو پڑھ۔ اسکے بعد سو جا کیونکہ یہ شرک سے بیزاری ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے ”جیر بن مطعم“ سے فرمایا: ”کیا تو اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ جب تو سفر پر جائے تو زادراہ اور توشہ کے لحاظ سے اپنے ساتھیوں میں سب سے بہتر ہو؟“ اس نے عرض کی ہاں! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان پانچ سورتوں کو پڑھا کرو: ”قل یا ایہا الکافرون“ و ”اذا جاء نصر اللہ و الفتح“ و ”قل هو اللہ احد“ و ”قل اعوذ برب الفلق“ و ”قل اعوذ برب الناس“ اور اپنی قرأت کی ابتداء بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کیا کرو۔

اور ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”میرے والد کہا کرتے تھے کہ ”قل یا ایہا الکافرون“ ربع قرآن ہے اور جب آپ اس کی قرأت سے فارغ ہوتے تھے فرماتے: ”اعبد اللہ وحدہ“ میں صرف خدائے واحد کی عبادت کرتا ہوں، میں صرف خدائے واحد کی عبادت کرتا ہوں۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶

﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم﴾

۱۔ ﴿قل یا ایہا الکافرون﴾ - ۲۔ ﴿لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ﴾ - ۳۔ ﴿وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا اَعْبُدُ﴾ - ۴۔ ﴿وَلَا اَنَا عَابِدُ مَا

عَبَدْتُمْ﴾ -

۵۔ ﴿وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا اَعْبُدُ﴾ - ۶۔ ﴿لَكُمْ دِیْنُکُمْ وَلِی دِیْنُ﴾ -

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

۱۔ کہہ دو اے کافرو! ۲۔ جن کی تم پرستش کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا۔

۳۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرو گے، جس کی میں پرستش کرتا ہوں۔ ۴۔ اور نہ ہی میں ان کی پرستش کروں گا جن کی تم پرستش کرتے ہو۔

۵۔ اور نہ تم اس کی پرستش کرو گے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

۶۔ (اب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو) تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے۔

شان نزول

روایات میں آیا ہے کہ یہ سورہ مشرکین کے سرغنوں کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ مثلاً ”ولید بن مغیرہ“ ”عاص بن وائل“ ”حارث بن قیس“ اور ”امیہ بن خلف“ وغیرہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ اے محمد! آؤ تم ہمارے دین کی پیروی کرلو، ہم بھی تمہارے دین کی پیروی کر لیتے ہیں، اور ہم تمہیں اپنے تمام امتیازات میں شریک کر لیں گے، ایک سال تو تم ہمارے خداؤں کی عبادت کیا کرو اور دوسرے سال ہم تمہارے خدا کی عبادت کیا کریں گے۔ اگر تمہارا دین بہتر ہے تو ہم اس میں شریک ہو گئے ہیں اور اپنا حصہ اس میں سے لے لیا۔ اور اگر تمہارا دین ہو تو تم ہمارے دین میں شریک ہو گئے اور تم نے اس میں سے اپنا حصہ لے لیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ کسی چیز کو اس کا شریک قرار دوں۔“

انہوں نے کہا: کم از کم ہمارے خداؤں کو چھو ہی لو اور ان سے تبرک حاصل کر لو تو ہم تمہاری بات مان لیں گے اور تمہارے خدا کی پرستش کرنے لگیں گے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”میں تو اپنے پروردگار کے حکم کا منتظر ہوں۔ تو اس موقع پر سورہ ”قل یا ایہا الکافرون“ نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد الحرام میں آئے اور جب قریش کے سرداروں کی ایک جماعت وہاں جمع تھی۔ تو آپ نے ان کے سروں کے اوپر کھڑے یہ سورہ آخر تک ان کے سامنے پڑھا۔ جب انہوں نے اس سورہ کے پیام کو سنا تو مکمل طور پر مایوس ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو آزار پہنچانے لگے۔“

بت پرست کے ساتھ ہرگز مصالحت نہیں ہو سکتی

اس سورہ کی آیات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہیں: ”کہہ دو اے کافرو! ﴿قل یا

ایہا الکافرون﴾

”تم جن کی پرستش کرتے ہو میں ان کی پرستش نہیں کرتا“۔ ﴿لَا اَعْبُدُ لَا تَعْبُدُونَ﴾

”اور نہ ہی تم اس کی پرستش کرو گے جس کی میں پرستش کرتا ہوں“۔ ﴿وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا اَعْبُدُ﴾

اس طرح اپنی مکمل علیحدگی کو مشخص کرتا ہے اور صراحت کے ساتھ کہتا ہے، ”میں ہرگز کبھی بت پرستی نہیں کروں

گا“

اور تم بھی اپنی اس ہٹ دھرمی اور اپنے بڑوں کی اندھی تقلید کے باعث، جس پر تمہیں اصرار ہے، اور بت پرستوں کی طرف سے جو بکثرت ناجائز منافع تمہیں حاصل ہوتے ہیں اس وجہ سے ہرگز شرک سے خالص خدا پرستی کی طرف نہیں آسکتے

بت پرستوں کو توحید و بت پرستی میں کس قسم کی مصالحت سے مکمل طور پر مایوس کرنے کے لئے دوبارہ مزید فرماتا ہے:
اور نہ ہی میں ہرگز انکی پرستش کروں گا جن کی تم پرستش کرتے ہو“ ﴿وَلَا اَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ﴾ ”نہ ہی تم اس کی پرستش کرو گے جس کی میں عبادت کرتا ہوں“ ﴿وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا اَعْبُدُ﴾ اس بناء ہر بت پرستی کے مسئلہ پر بے جا مصالحت کے لئے اصرار نہ کرو، کیونکہ کہ یہ بات غیر ممکن ہے ”اب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے“ ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينٌ﴾

”بہت سے مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ یہاں ”کافرون“ سے مراد مکہ کے بت پرستوں کے سرغنوں کا ایک خاص گروہ ہے، اس بنا پر ”الکافرون“ پر ”الف و لام“ اصطلاح کے مطابق ”عہد کا ہے“ جمع ”کا نہیں ہے ممکن ہے کہ اس مطلب پر ان کی دلیل۔ اس چیز کے علاوہ جو شان فزول میں کی جا چکی ہے۔ یہ ہو کہ مکہ کے بت پرستوں میں سے بہت سے آخر کار ایمان لے آئے تھے۔ اس بناء پر اگر وہ یہ کہتا ہے کہ، ”نہ تم میرے معبود کی عبادت کرو گے نہ ہی میں تمہارے معبودوں کی، تو یقینی طور پر یہ شرک و کفر کے سرغنوں کے اس گروہ کے بارے میں ہے جو آخری عمر تک ہرگز ایمان نہیں لایا، ورنہ فتح مکہ کے موقع پر بہت سے مشرکین فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے تھے یہاں چند سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے

۱۔ یہ سورہ ”قل“ (کہہ دے) کے ساتھ شروع کیوں ہوا؟

کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ ”قل“ اس کے آغاز میں لائے بغیر ”یا ایہا الکافرون“ کہا جاتا؟

دوسرے لفظوں میں پیغمبر کو خدا کے حکم کا اجراء کرنا چاہیے تھا اور انہیں ”﴿يَا ايها الكافرون﴾“ کہنا چاہیے تھا، نہ کہ جملہ ”قل“ کا بھی تکرار کریں

اس سوال کا جواب سورہ کے مضمون کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کیونکہ مشرکین عرب نے پیغمبر کو بتوں کے سلسلے میں مصالحت کرنے کی دعوت دی تھی، لہذا آپ کے لئے اپنی طرف سے اس مطلب کی نفی کرنا ضروری تھا اور یہ کہنا چاہیے تھا کہ میں ہرگز تمہاری بات نہیں مانوں گا اور اپنی عبادت کو شرک سے آلودہ نہیں کروں گا۔ اگر اس سورہ کے آغاز میں لفظ ”قل“ نہ ہوتا تو یہ بات خدا کی بات ہو جاتی اور اس صورت میں ”﴿لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ﴾“ (تم جن کی عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کروں گا) کا جملہ اور اسی قسم کے دوسرے جملوں کا کوئی مفہوم نہ ہوتا اس کے علاوہ چونکہ جبریل کے پیام میں لفظ ”قل“ خدا کی طرف سے تھا، لہذا پیغمبر کی ذمہ داری یہ کہ قرآن کی اصلیت کی حفاظت کے لیے اسے بعینہ بیان کریں اور خود بھی چیز اس بات کی نشانی وہی کرتی ہے کہ ”جبریل“ اور اس رسول اکرم نے وحی الہی کے نقل کرنے میں معمولی سی بھی تبدیلی نہیں کی اور انہوں نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایسے مامور ہیں جو فقط فرمان الہی پر ہی کان دھرتے ہیں جیسا کہ سورہ یونس کی آیت ۱۵ میں آیا ہے: قل ما يكون لى ان ابد له من تلقائى نفسى ان اتبع الا ما يو حى الى: کہ دیجئے مجھے اس بات کا کوئی حق نہیں ہے کہ قرآن کو اپنی طرف سے بدل دوں، میں تو صرف اس بات کی پیروی کرتا ہوں جس کی مجھ پر وحی ہوتی ہے

۲۔ کیا بت پرست خدا کے منکر تھے؟

ہم جانتے ہیں کہ بت پرستوں کو ہرگز خدا کا انکار نہیں تھا۔ اور قرآن کی صریح آیات کے مطابق جب ان سے آسمان و زمین کے خالق کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو وہ یہ جواب دیتے تھے کہ وہ خدا ہے: وَلئن ساء لتهم من خلق السماوات والارض ليقولن الله (لقمان- ۲۵)

تو پھر وہ اس سورہ میں یہ کیسے کہتا ہے: ”نہ تو میں تیرے معبود کی پرستش کروں گا اور نہ ہی تم میرے معبود کی پرستش کرو گے؟“

اس سوال کا جواب بھی اس چیز کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ بحث مسئلہ خلقت کے بارے میں نہیں ہے بلکہ مسئلہ عبادت کے بارے میں ہے۔ بت پرست، خالق جہاں خدا ہی کو سمجھتے تھے۔ لیکن ان کا عقیدہ یہ تھا

کہ عبادت بتوں ہی کی کرنی چاہیے۔ تاکہ وہ بارگاہِ خدا میں واسطہ بنیں، یا یہ کہ ہم اصلاً اس لائق نہیں ہیں کہ خدا کی پرستش کریں، لہذا ہمیں جسمانی بتوں کی عبادت کرنی چاہیے۔ اس موقع پر قرآن ان کے اوہام اور خیالات پر سرخ لکیر کھینچتے ہوئے رد کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ عبادت تو صرف خدا ہی کی ہونا چاہیے، نہ کہ بتوں کی ہونا چاہیے اور نہ ہی دونوں کی

۳۔ یہ تکرار کس لیے ہے؟

اس بارے میں کہ پیغمبر کی طرف سے بتوں کی عبادت کی نفی کی تکرار اور مشرکین کی طرف سے خدا کی عبادت کی نفی کی تکرار کس بناء پر ہے، بہت زیادہ اختلاف ہے۔

ایک جماعت کا عقیدہ تو یہ ہے کہ تکرار تاکید اور مشرکین کو مکمل طور پر مایوس کرنے، ان کے راستے کو اسلام کے راستے سے جدا کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لیے ہے کہ توحید و شرک کے درمیان مصالحت کا امکان نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں، چونکہ وہ پیغمبر اکرم کو شرک کی طرف دعوت دینے میں اصرار کے ساتھ تکرار کرتے تھے، لہذا قرآن بھی ان کے رد کرنے میں تکرار کرتا ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ (امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے کے ایک زندیق) ”ابو شاکر دیصانی“ نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی ”ابو جعفر احوال“ (محمد بن علی نعمانی کوفی معروف بہ مومن طاق) سے ان آیات کے تکرار کی دلیل کے بارے میں سوال کیا اور یہ کہا کہ کیا کسی عقل مند آدمی سے یہ بات ممکن ہے کہ اس کے کلام میں اس قسم کی تکرار ہو؟ ابو جعفر احوال کے پاس چونکہ اس کا کوئی جواب نہیں تھا لہذا وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں مدینہ پہنچے اور اس سلسلہ میں سوال کیا، تو امام نے فرمایا: ”ان آیات کے نزول اور ان میں تکرار کا سبب یہ تھا کہ قریش نے پیغمبر اکرم کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک سال آپ ہمارے خداؤں کی پرستش کریں اور دوسرے سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں گے، اور اسی طرح بعد والے سال میں آپ ہمارے خداؤں کی عبادت کریں اور اس کے اگلے سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں گے، تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور تمام تجاویز کی نفی کی“ جب ابو جعفر ”احوال نے“ ”ابو شاکر“ کو یہ جواب دیا تو اس نے کہا: ”لہذا ما حملہ الا بل من الحجاز یہ وہ بار ہے جسے اونٹ حجاز سے اٹھا کر لائے ہیں“

(یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تیرا جواب نہیں ہے بلکہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول ہے):

بعض دوسروں نے یہ کہا ہے کہ تکرار اس بناء پر ہے کہ ایک جملہ تو حال کے بیان کے لیے ہے اور دوسرا مستقبل کے بیان کے لیے، یعنی میں ہر گز بھی نہ تو حال میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا اور نہ ہی کبھی آئندہ تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا

لیکن ظاہراً اس تفسیر پر کوئی شاہد موجود نہیں ہے

ایک تیسری تفسیر بھی اس تکرار کے لیے بیان کی گئی ہے کہ پہلا جملہ تو معبودوں کے اختلاف کو اور دوسرا عبادت کے اختلاف کو بیان کرتا ہے یعنی نہ تو میں ہر گز تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا اور نہ ہی میری عبادت تمہاری عبادت کی طرح ہے، کیونکہ میری عبادت مخلصانہ اور ہر قسم کے شرک سے خالی ہے علاوہ ازیں تمہارا بتوں کی عبادت کرنا بڑوں کی اندھی تقلید کی بناء پر ہے۔ لیکن میرا اللہ کی عبادت کرنا تحقیق و شکرانے کے طور پر

لیکن ظاہریہ ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لیے ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر وضاحت کی ہے وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے یہاں ایک چوتھی تفسیر بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ: ”دوسری آیت میں تو یہ فرماتا ہے کہ جن کی تم اب عبادت کر رہے ہو میں ان کی عبادت نہیں کروں گا اور چوتھی آیت میں فرماتا ہے کہ ”میں نے گزشتہ زمانہ میں بھی کبھی تمہارے معبود کی عبادت نہیں کی ہے چہ جائیکہ اب کرو

یہ فرق اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ دوسری آیت میں ”تعبدون“ فعل مضارع کی صورت میں ہے، اور چوتھی آیت میں ”عبدتم“ فعل ماضی کی صورت میں ہے، بعید نظر نہیں آتا

اگرچہ یہ تفسیر صرف دوسری اور چوتھی آیت کے تکرار کو تو حل کرتی ہیں، لیکن تیسری اور پانچویں آیت اسی طرح اپنی پوری قوت کے ساتھ باقی رہتی ہے

۴۔ کیا ”لکم دینکم“۔۔۔۔۔ کی آیت کا مفہوم بت پرستی کا جواز ہے؟

کبھی یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس سورہ کی آخری آیت جو یہ کہتی ہے کہ: ”تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے“ تو اس کا مفہوم وہی ”صلح کل“ یہ ہے اور یہ انہیں اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے دین پر برقرار رہیں کیونکہ یہ دین اسلام کو قبول کرنے پر اصرار نہیں کرتی لیکن یہ خیال انتہائی کمزور اور بے بنیاد ہے کیونکہ آیات کا لب و لہجہ اچھی

طرح سے اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ تعبیر ایک قسم کی تحقیر و تہدید ہے، یعنی تمہارا دین خود تمہیں ہی مبارک ہو اور تم جلدی ہی اس کے بُرے انجام کو دیکھ لو گے، جیسا کہ سورہ قصص کی آیہ ۵۵ میں آیا ہے: ﴿وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ﴾ ”مومنین جب کوئی لغو اور بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے روگردانی کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے اعمال تمہارے لیے تم پر سلام (وداع اور جدائی کا سلام) ہم جاہلوں کے طلب گار نہیں ہیں“

قرآن مجید کی سیکڑوں آیتیں اس مفہوم کی گواہ ہیں جو شرک کی ہر صورت میں سرکوبی کرتی ہیں، اسے ہر کام سے زیادہ قابلِ نفرت سمجھتی ہیں اور اسے نہ بخشا جانے والا گناہ خیال کرتی ہیں علماء نے اس سوال کے دوسرے جواب بھی دیے ہیں مثلاً یہ کہ آیت میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: ”لکم جزاء دینکم ولی جزاء دینی“ ”یعنی تمہارے دین کی جزا تمہارے لیے اور میرے دین کی جزا میرے لیے“ دوسرے یہ کہ یہاں ”دین“ جزاء کے معنی میں ہے اور آیت میں کوئی بھی چیز محذوف نہیں ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنی جزا لو گے اور میں اپنی جزا لوں گا

۵۔ آپ نے ایک لمحہ کے لیے بھی شرک سے مصالحت نہیں کی۔

اس سورہ میں جو کچھ آیا ہے وہ حقیقت میں اس واقعیت کو بیان کرتا ہے کہ توحید و شرک دو متضاد پروگرام اور مکمل طور پر دو الگ الگ راستے ہیں اور ان میں ایک دوسرے کے ساتھ کسی قسم کی مشابہت نہیں ہے توحید انسان کو خدا سے مربوط کرتی ہے، جب کہ شرک اس کو خدا سے بیگانہ کر دیتا ہے

توحید تمام مرحلوں اور میدانوں میں وحدت و یگانگی کی رمز ہے جب کہ شرک زندگی کے تمام شئون میں تفرقہ اور پراگندگی کا سبب ہے توحید انسان کو عالمِ مادہ اور جہان اور جہانِ طبیعت سے بلندی کی طرف لے جاتی ہے اور ماوراءِ طبیعت میں خدا کے لامتناہی وجود کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑ دیتی ہے، جبکہ شرک انسان کو طبیعت کے کنویں میں سرنگوں کر دیتا ہے اور اس کا رشتہ محدود، کمزور اور فانی موجودات کے ساتھ جوڑ دیتا ہے

اسی بنا پر پیغمبر اکرم اور تمام انبیاء عظام نے نہ صرف شرک کے ساتھ مصالحت نہیں کی، بلکہ ان کا پہلا اور اہم ترین پروگرام شرک کے ساتھ مبارزہ کرنا تھا۔ آج بھی راہِ حق کے تمام چلنے والوں اور اس دین کے علماء و مبلغین کو یہی

راستہ اور طریقہ اختیار کرنا چاہیئے اور ہر جگہ اور ہر مقام پر ہر قسم کے شرک اور مشرکین سے ساز باز اور مصالحت سے اپنی برائت اور بیزاری کا اعلان کرنا چاہیئے ہی اسلام کی اصل راہ ہے۔

خدا وندا! ہمیں شرک اور شرک آلودہ افکار و اعمال سے دور رکھ۔

پروردگار! ہمارے زمانہ کے مشرکین کے وسوسے بھی خطرناک ہے، ہمیں ان کے وام فریب میں گرفتار ہونے سے محفوظ رکھ۔

بارِ الہا! ہمیں ایسی شجاعت اور صراحت و قاطعیت مرحمت فرما کہ ہم بھی پیغمبر اکرم کی طرح ہر قسم کے کفر و شرک کی مصالحت کی پیش و کش کو رد کر دیں۔
آمین یا رب العالمین

سورہ نصر

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۳ آیات ہیں۔

سورہ نصر کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سورہ مدینہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے اور اس میں ایک بہت بڑی کامیابی اور فتح عظیم کی بشارت ہے کہ اس کے بعد لوگ گروہ در گروہ خدا کے دین میں داخل ہوں گے، لہذا اس عظیم نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے پیغمبر اکرم کو تسبیح حمد الہی اور استغفار کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اگرچہ اسلام میں بہت سی فتوحات ہوئی ہیں لیکن اوپر والی بات کے پورا ہونے کے طور پر ”فتح مکہ کے سوا اور کوئی فتح نہیں تھی۔“

خصوصاً جبکہ بعض روایات کے مطابق عربوں کا نظریہ یہ تھا کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کر لیا اور وہ اس پر مسلط ہو گئے، تو یہ ان کے حقانیت کی دلیل ہوگی، کیونکہ اگر وہ حق پر نہ ہوئے تو خدا انہیں اس قسم کی اجازت نہیں دے گا، جیسا کہ اس نے ”ابرہہ“ کے عظیم لشکر کو اس قسم کی اجازت نہیں دی تھی۔ اسی بناء پر مشرکین عرب فتح مکہ کے بعد گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ سورہ ”صلح حدیبیہ“ کے بعد فتح مکہ سے دو سال پہلے، ہجرت کے چھٹے سال نازل ہوا۔ لیکن یہ بات، جس کے بارے میں بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ فتح مکہ کے بعد ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع میں نازل ہوا، بہت ہی بعید ہے، کیونکہ اس سورہ کی تعبیریں اس معنی کے ساتھ سازگار نہیں ہیں، کیونکہ یہ مستقبل سے مراط ایک حادثہ کی خبر دیتا ہے نہ کہ گزشتہ کی

اس سورہ کا ایک نام سورہ ”تودیع“ ہے۔ (تودیع یعنی خدا حافظ) کیونکہ اس میں ضمنی طور پر پیغمبر کی رحلت کی خبر ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت یہ سورہ نازل ہوا اور پیغمبر اکرم نے اس کی اپنے اصحاب کے سامنے تلاوت کی تو سب کے سب بہت خوش اور مسرور ہوئے، لیکن پیغمبر کے چچا عباس (رض) اس کو سن کر رونے لگے پیغمبر نے فرمایا:

اے چچا! جان آپ کیوں رو رہے ہیں؟

عرض کیا: میرا گمان یہ ہے کہ اس سورہ میں آپ کی رحلت کی خبر دی گئی ہے تو رسول خدا نے فرمایا: یہی بات ہے جو آپ کہہ رہے ہیں^(۱)

اس بارے میں کہ یہ مطلب اس سورہ کے کس جملہ سے معلوم ہوتا ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کیونکہ آیات کے ظاہر میں توفیق اور کامیابی کی بشارت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ظاہراً اس مفہوم کا اس بات سے استفادہ کیا گیا ہے کہ یہ سورہ اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر کی رسالت آخرت کو پہنچ رہی ہے، آپ کا دین مکمل طور پر ثابت اور مستقر ہو چکا ہے اور یہ معلوم ہے کہ ایسی حالت میں سرائے فانی سے جہان باقی کی طرف رحلت کی توقع پورے طور پر قاطب پیش بینی ہے۔

۱۔ مجمع البیان“جلد ۱۰ ص ۵۵۴ یہ مضمون متعدد روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ ذکر ہوا ہے (المیزان جلد ۲۰ ص ۵۳۲)۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کئی بارے میں ’ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے: “من قرائھا فکانما شہد مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم فتح مکہ” جو شخص اس کی تلاوت کرے گا وہ اس شخص کے مانند ہے جو فتح مکہ میں پیغمبر کے ہمراہ تھے (۱)۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے: “جو شخص سورہ ﴿اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ کو نافلہ یا واجب نماز میں پڑھے گا خدا اس کو اس کے تمام دشمنوں پر فتح یاب کرے گا اور وہ قیامت میں اس حالت میں وارد محشر ہوگا کہ اس کے ہاتھ میں ایک عہد نامہ ہوگا، جو بات کرے گا، خدا نے اسے اس کی قبر کے اندر سے باہر بھیجا ہے، اور وہ جہنم کی آگ سے امان نامہ ہے،

آیات ۱، ۲، ۳

- ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

۱۔ ﴿اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ ۲۔ ﴿وَ رَاٰیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾

۳۔ ﴿نَسْبَحُ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرُکَ اِنَّہٗ كَانَ تَوَّابًا﴾۔

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ جب خدا کی مدد اور کامیابی آن پہنچے۔ ۲۔ اور تو دیکھے گا کہ لوگ گروہ در گروہ خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں

۳۔ پس تم اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجا لاؤ اور اس سے استغفار کرو کہ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

جب اصلی کامیابی آن پہنچے

اس سورہ کی پہلی آیت جس میں فرماتا ہے: “جس وقت خدا کی مدد اور کامیابی آن پہنچے”۔ (اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ) ”اور تو

دیکھے گا کہ لوگ گروہ در گروہ خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں“ (و رایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا)۔ تو اس

عظیم نعمت اور اس کامیابی اور نصرتِ الہی کے شکرانے کے طور پر اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجا لاء اور اس سے بخشش طلب کرو کہ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

﴿نَسْبِحُ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرُكَ إِنَّكَ تَوَّابٌ﴾

ان تین مختصر اور پر معنی آیات میں بہت سے ایسے نکات ہیں جن میں غور کرنے سے اس سورہ کے اصلی ہدف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے

۱۔ پہلی آیت میں ”نصرت“ کی اضافت ”خدا“ کی طرف ہوئی ہے (نصر اللہ) صرف یہی ایک جگہ نہیں ہے کہ جہاں یہ اضافت نظر آرہی ہے، بلکہ قرآن کی بہت سی آیات میں یہ معنی منعکس ہے منجملہ ان کے سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۴ میں آیا ہے ﴿إِنَّا أَنْصَرُوكَ قَرِيبٌ﴾ ”جان لو کہ خدا کی مدد قریب ہے“۔

اور سورہ آل عمران کی آیہ ۱۲۶ اور انفال کی آیہ ۱۰ میں آیا ہے۔ ﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ ”نصرت تو صرف خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے“۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نصرت و کامیابی ہر حال میں خدا کے ارادہ سے ہی ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے توانائیوں کو مجتمع کرنا اور قدرت و طاقت مہیا کرنا ضروری ہے، لیکن ایک مؤحد آدمی نصرت کو خدا ہی کی طرف سے سمجھتا ہے اور اسی بناء پر کامیابی کی صورت میں مغرور نہیں ہوتا بلکہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ ۲۔ اس سورہ میں پہلے نصرتِ الہی، پھر فتح و کامرانی اور اس کے بعد اسلام کے نفوذ و وسعت اور لوگوں کے خدا کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہونے کی بات کی گئی ہے۔ یہ تینوں ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔ جب تک خدا کی نصرت اور مدد نہ ہو، فتح و کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور جب تک فتح و کامیابی حاصل نہ ہو اور راستہ کی رکاوٹیں دور نہ ہوں، لوگ گروہ در گروہ مسلمان نہیں ہوتے۔ البتہ ان تین مرحلوں کے بعد، جن میں سے ہر ایک بہت بڑی نعمت ہے، چوتھا مرحلہ شکر اور حمد و ستائشِ الہی کا آتا ہے۔ اور دوسری طرف سے خدائی نصرت اور کامیابی اس لیے ہے کہ اصل ہدف یعنی لوگوں کا خدا کے دین میں داخل ہونا اور عمومی ہدایت صورت پذیر ہو۔

۳۔ ”فتح“ یہاں مطلق صورت میں بیان ہوا ہے اور ان قرائن کی بناء پر جن کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے، اس سے مراد فتح مکہ ہے، جس کا ایسا ہی ردِ عمل ہوا تھا اور واقعاً فتح مکہ نے تاریخ اسلام میں ایک نئی فصل کا اضافہ کیا، کیونکہ اس سے شرک کا اصلی مرکز تباہ و برباد ہو گیا، بت توڑ دیے گئے اور بت پرستوں کی امید مایوسی اور ناامیدی میں تبدیل ہو

گئی، اور لوگوں کے لیے اسلام پر ایمان کے راستے میں جو روکاؤں تھیں وہ ہٹ گئی اسی بناء پر فتح مکہ کو جزیرہ العرب میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں اسلام کے ثبات و استقرار کا مرحلہ سمجھنا چاہیئے۔

اور اسی لیے مشرکین کی جانب سے فتح مکہ کے بعد (سوائے ایک موقع کے جس کی جلدی ہی سرکوبی ہو گئی) کسی قسم کا مقابلہ نظر نہیں آیا اور لوگ تمام علاقوں سے اسلام قبول کرنے کے لیے پیغمبر کی خدمت میں آئے تھے

۴۔ تیسری آیت کے ذیل میں پیغمبر اکرم کو (اور طبعاً سب مومنین کو) تین اہم حکم دیتا ہے جو حقیقت میں اس عظیم کامیابی کا شکرانہ اور نصرت الہی کے مقابلہ میں ایک مناسب عکس العمل ہے اور وہ تسبیح، حمد اور استغفار کا حکم ہے ”تسبیح“ کا معنی خدا کو ہر قسم کے عیب و نقص سے منزہ سمجھنا ہے ”حمد“ صفاتِ کمالیہ کے ساتھ اس کی توصیف و تعریف کرنا ہے، اور ”استغفار“ بندوں کی کوتاہیوں اور تقصیروں کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ عظیم کامیابی اس بات کا سبب بنی ہے کہ شر کا آلودہ افکار میں کمی ہو، خدا کا کمال و جمال زیادہ سے زیادہ ظاہر ہو اور راستہ سے بھٹکے ہوئے لوگ حق کی طرف لوٹ آئیں۔

یہ فتح عظیم سبب بنی ہے کہ لوگ یہ گمان نہ کریں کہ خدا اپنے اولیاء اور دوستوں کو تنہا چھوڑ دیتا ہے (اس نقص سے پاکیزگی) اور وہ یہ بھی جان لیں کہ خدا اپنے وعدوں کے انجام دینے پر توانا ہے (اس کمال سے مو صوف ہونا) اور بندے بھی اس کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے نقص کا اعتراف کریں۔

اس کے علاوہ ممکن ہے کہ انسان میں کامیابی کے وقت غیر مطلوب ردِ عمل پیدا ہو جائے اور وہ ”غرور و تکبر اور خود کو برتر سمجھنے“ میں مبتلا ہو جائے یا دشمن سے ”انتقام لینے اور ذاتی حساب چکانے“ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ یہ تینوں احکام اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ وہ کامیابی کے حساس لمحات میں خدا کی صفاتِ جلال و جمال کی یاد میں رہیں، سب چیزوں کو اس کی طرف سے سمجھے اور استغفار میں مشغول ہو جائے تاکہ غرور و غفلت بھی اس سے زائل ہو اور وہ جذبہ انتقام سے بھی دور رہے

۵۔ مسئلہ طور پر پیغمبر اسلام تمام انبیاء کی طرح ”معصوم“ تھے، پس یہ استغفار کا حکم کس لیے ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ تو ساری امت کے لیے ایک نمونہ و اسوہ اور دستور العمل ہے کیونکہ:

نکۃ:

اولاً: اس طولانی مبارزہ کے طویل زمانہ میں، جو بہت زیادہ سالوں تک جاری رہا (تقریباً بیس سال) اور مسلمانوں نے بہت سخت اور دردناک دن گزارے، بعض اوقات تو حادثات ایسے پیچیدہ ہو جاتے تھے کہ جانیں لبوں تک پہنچ جاتی تھیں اور بعض لوگوں کے افکار میں خدائی وعدوں کے بارے میں بُرے گمان پیدا ہو جاتے تھے، جیسا کہ قرآن جنگ ”احزاب“ کے بارے میں فرماتا ہے: **وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللّٰهِ الظُّنُونُ**: ”اور دل گلے تک آگئے اور تم اللہ کے بارے میں (نا مناسب) گمان کرنے لگے۔ (احزاب ۱۰)

اب جب کہ کامیابی حاصل ہو گئی ہے تو وہ اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ وہ سب بدگمانیاں اور بے تابیاں غلط تھیں، لہذا انہیں استغفار کرنا چاہیئے

ثانیاً: انسان چاہے جتنی بھی خدا کی حمد و ثنا کرے، پھر بھی وہ اس کے شکر کا حق ادا نہیں کر سکتا، لہذا اُسے حمد و ثنا کے آخر میں اپنی تقصیر و کوتاہی کی بناء پر ”خدا کی بارگاہ میں“ استغفار کرنا چاہیئے

ثالثاً: عام طور پر کامیابیوں کے بعد شیطانی و سو سے شروع ہو جاتے ہیں اور ایک طرف ”غرور“ اور دوسری طرف ”تندورنی“ اور انتقام جوئی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے لہذا اس موقع پر خدا کو یاد رکھنا چاہیئے اور مسلسل استغفار کرتے رہنا چاہیئے، تاکہ ان میں سے کوئی سی حالت بھی پیدا نہ ہو یا اگر پیدا بھی ہو تو برطرف ہو جائے۔

رابعاً: جیسا کہ ہم نے سورہ کے آغاز میں بیان کیا ہے اس کامیابی کا اعلان تقریباً پیغمبر کی ماموریت کے اختتام اور آنحضرت کی عمر کے پورا ہونے اور لقائے محبوب کے لیے جانے کے اعلان کے معنی میں ہے اور یہ حالت ”تسبیح و حمد“ و ”استغفار“ سے مناسبت رکھتی ہے اسی لیے روایات میں آیا ہے کہ اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد پیغمبر اکرم اس جملہ کا بہت زیادہ تکرار فرماتے تھے:

”سبحانک اللہم وبحمدک، اللہم اغفر لی انک انت التواب الرحیم: ”خدا وندا! تو پاک و منزہ ہے، اور میں تیری حمد و ثنا کرتا ہوں۔ خدا وندا! مجھے بخش دے کہ تو بہت ہی توبہ کو قبول کرنے والا اور مہربان ہے

۶۔ ”انہ کان تواباً“ کا جملہ مسئلہ استغفار کی علت کا بیان ہے یعنی استغفار و توبہ کر کیونکہ خدا بہت ہی توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔ ضمنی طور پر شاید اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ جب خدا تمہاری توبہ کو قبول کر لیتا ہے تو تم بھی کامیابی کے بعد جہاں تک ہو سکے کوتاہی کرنے والوں کی توبہ کو قبول کر لو۔ اور جب تک ان سے مخالفت کا ارادہ یا سازش کے

آثار ظاہر نہ ہو انہیں اپنے سے دور نہ کرو لہذا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے۔ پیغمبر اکرم نے اس فتح مکہ کے ماجرے میں شکست خوردہ کینہ و دشمنوں کے مقابلہ میں اسلامی رافت و رحمت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا ہے۔

یہ صرف پیغمبر اکرم ہی کی سیرت نہیں ہے کہ آپ دشمن پر آخری اور اصلی فتح حاصل کرنے کے موقع پر تسبیح و حمد و استغفار میں مصروف ہو گئے، بلکہ سارے ہی انبیاء کی تاریخ میں یہ مطلب اچھی طرح نمایاں ہے۔

مثلاً حضرت ”یوسف“ علیہ السلام جب مصر کے تختِ حکومت پر بیٹھے اور ایک طویل جدائی کے بعد ان کے ماں باپ اور بھائی ان سے آکر ملے تو عرض کی: ﴿رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمَلِكِ وَعِلْمَتِي مِنْ تَاوِيلِ الْاِحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ

وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيٌّ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَالْحَقْنِي بِالْصَّالِحِينَ﴾:

پروردگار! تو نے حکومت کا ایک بڑا حصہ مجھے دیا ہے اور تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کیا ہے، تو ہی آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا ہے اور تو ہی دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے۔ مجھے مسلمان کی حیثیت سے موت دینا اور صالحین کے ساتھ ملحق کرنا“ (یوسف - ۱۰۱)

پیغمبر خدا حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب ملکہ سبا کے تخت کو اپنے سامنے حاضر دیکھا تو کہا: ”هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَلْبِسُنِي لِبَاسًا مُلْكًا“ ”یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ آیا میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں“ (نمل - ۴۰)

فتح مکہ میں اسلام کی عظیم ترین فتح:

فتح مکہ نے۔ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایک نئی فصل کا اضافہ کیا ہے اور تقریباً بیس سال کے بعد دشمن کی مقام و متوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ حقیقت میں فتح مکہ سے جزیرۃ العرب سے شرک و بت پرستی کی بساط لپیٹ دی گئی اور اسلام دنیا کے دوسرے ممالک کی طرف حرکت کے لیے آمادہ ہوا۔ اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیبیہ کے عہد و پیمان اور صلح کے بعد کفار نے عہد شکنی کی اور اس صلح نامہ کو نظر انداز کر دیا۔ اور پیغمبر کے بعض حلیفوں کے ساتھ زیادتی کی، آپ کے حلیفوں نے آنحضرت سے شکایت کی تو رسول اللہ نے اپنے حلیفوں کی مدد کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اور دوسری طرف مکہ میں بت پرستی، شرک اور نفاق کا جو مرکز قائم تھا اس کے ختم ہونے کے تمام حالات فراہم ہو گئے تھے اور یہ ایک ایسا کام تھا جسے ہر حالت میں انجام دینا ضروری تھا“ اس لیے پیغمبر خدا کے حکم سے مکہ کی طرف جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

فتح مکہ تین مراحل میں انجام پائی:-

پہلا مرحلہ مقدماتی تھا، یعنی ضروری قواء اور توانائیوں کو فراہم کرنا، زمانہ کے موافق حالات کا انتخاب اور دشمن کی جسمانی روحانی قوت و توانائی کی مقدار و کیفیت کی حیثیت کے بارے میں کافی اطلاعات حاصل کرنا تھا۔ دوسرا مرحلہ، فتح کے مرحلہ کو بہت ہی ماہرانہ اور ضائعات و تلفات یعنی نقصان کے بغیر انجام دینا تھا۔ اور آخری مرحلہ، جو اصلی مرحلہ تھا، وہ اس کے آثار و نتائج کا مرحلہ تھا۔

۱۔ یہ مرحلہ انتہائی دقت، باریک بینی اور لطافت کے ساتھ انجام پایا، خصوصاً رسول اللہ نے مکہ و مدینہ کی شاہراہ کو اس طرح سے قرق کر لیا تھا کہ اس عظیم آبادگی کی خبر کسی طرح سے بھی اہل مکہ کو نہ پہنچ سکی۔ اس لیے انہوں نے کسی قسم کی تیاری نہ کی، وہ مکمل طور پر غفلت میں پڑے رہے اور اسی وجہ سے اس مقدس سرزمین میں اس عظیم حملے اور بہت بڑی فتح میں تقریباً کوئی خون نہیں بہا۔

یہاں تک کہ وہ خط بھی، جو ایک ضعیف الایمان ”مسلمان حاطب بن ابی بلتعہ“ نے قریش کو لکھا تھا اور قبیلہ ”مزینہ“ کی ایک عورت ”کفود“ یا ”سارہ“ نامی کے ہاتھ مکہ کی طرف روانہ کیا تھا، اعجاز آمیز طریقہ سے پیغمبر اکرم کے لیے آشکار ہو گیا۔ علی علیہ السلام کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ تیزی سے اس کے پیچھے روانہ ہوئے، انہوں نے اس عورت کو مکہ و مدینہ کی ایک درمیانی منزل میں جا لیا اور اس سے وہ خط لے کر خود اسے بھی مدینہ واپس لے آئے، جس کی داستان سورہ ممتحنہ کی پہلی آیت کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے

بہر حال پیغمبر اکرم مدینہ میں اپنا ایک قائم مقام مقرر کر کے ہجرت کے آٹھویں سال ماہ رمضان کی دس تاریخ کو مکہ کی طرف چل پڑے، اور دس دن کے بعد مکہ پہنچ گئے۔

پیغمبر اکرم نے راستے کے وسط میں اپنے چچا عباس (رض) کو دیکھا کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے آپ کی طرف آرہے ہیں۔ حضرت نے ان سے فرمایا کہ اپنا سامان مدینہ بھیج دیجئے اور خود ہمارے ساتھ چلیں، اور آپ آخری مہاجر ہیں۔

۲۔ آخر کار مسلمان مکہ کے قریب پہنچ گئے اور شہر کے باہر، اطراف کے بیانوں میں اس مقام پر جسے ”مراظہران“ کہا جاتا تھا اور جو مکہ سے چند کلو میٹر سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا، پڑاؤ ڈال دیا۔ اور رات کے وقت کھانا پکانے کے لیے (یا شاید اپنی وسیع پیمانہ پر موجودگی کو ثابت کرنے کے لیے) وہاں آگ روشن کر دی۔ اہل مکہ کا ایک گروہ اس منظر کو دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئے۔

ابھی تک پیغمبر اکرم اور لشکرِ اسلام کے اس طرف آنے کی خبریں قریش سے پہنچاں تھیں۔ اس رات اہل مکہ کا سرغنہ ابو سفیان اور مشرکین کے بعض دوسرے سرغنے خبریں معلوم کرنے کے لیے مکہ سے باہر نکلے۔ اس موقع پر پیغمبر اکرم کے چچا عباس (رض) نے سوچا کہ اگر رسول اللہ قہر آلودہ طریقہ پر مکہ میں وارد ہوئے تو قریش میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ انہوں نے پیغمبر اکرم سے اجازت لی اور آپ کی سواری پر سوار ہو کر کہا کہ میں جاتا ہوں، شاید کوئی مل جائے تو اس سے کہوں کہ اہل مکہ کو اس ماجرے سے آگاہ کر دے تاکہ وہ اگر امان حاصل کر لیں۔

عباس وہاں روانہ ہو کر بہت قریب پہنچ گئے۔ اتفاقاً اس موقع پر انہوں نے ”ابو سفیان“ کی آواز سنی جو اپنے ایک دوست ”بدیل“ سے کہہ رہا تھا کہ ہم نے کبھی بھی اس سے زیادہ آگ نہیں دیکھی۔ ”بدیل نے“ کہا: میرا خیال ہے کہ یہ آگ قبیلہ ”خزاعہ“ نے جلائی ہوئی ہے ابو سفیان نے کہا: قبیلہ خزاعہ اس سے کہیں زیادہ ذلیل و خوار ہیں کہ وہ اتنی آگ روشن کریں۔

اس موقع پر ”عباس“ نے ”ابو سفیان“ کو پکارا۔ ابو سفیان نے بھی عباس کو پہچان لیا اور کہا سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟ عباس نے جواب دیا یہ رسول اللہ ہیں جو دس ہزار مجاہدین اسلام کے ساتھ تمہاری طرف آرہے ہیں۔ ابو سفیان سخت پریشان ہوا اور کہا: آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں۔

عباس نے کہا: میرے ساتھ آؤ اور رسول اللہ سے امان لے لو ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس طرح سے عباس نے ”ابو سفیان“ کو اپنے ہمراہ رسول اللہ کی سواری پر ہی سوار کر لیا اور تیزی کے ساتھ رسول اللہ کی خدمت میں پلٹ آئے۔ وہ جس گروہ اور جس آگ کے قریب سے گزرتے وہ یہی کہتے کہ یہ تو پیغمبر کے چچا ہیں جو آنحضرت کی سواری پر سوار ہیں کوئی غیر آدمی نہیں ہے۔ یہاں تک وہ اس مقام پر آئے جہاں عمر ابن خطاب (رض) تھے۔ جب عمر بن خطاب (رض) کی نگاہ ابو سفیان پر پڑی تو کہا: خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تجھ (ابو سفیان) پر مسلط کیا ہے، اب تیرے لیے کوئی امان نہیں ہے اور فوراً ہی پیغمبر کی خدمت میں آکر آپ سے (ابو سفیان) کی گردن اڑانے کی اجازت مانگی۔

لیکن اتنے میں عباس (رض) بھی پہنچ گئے اور کہا: کہ اے رسول خدا میں نے اسے پناہ دے دی ہے۔ پیغمبر اکرم نے فرمایا: میں بھی سر دست اسے امان دیتا ہوں۔ کل آپ اسے میرے پاس لے آئیں۔ اگلے دن جب عباس (رض) اسے پیغمبر کی خدمت میں لائے تو رسول اللہ نے اس سے فرمایا: ”اے ابو سفیان! وائے ہو تجھ پر، کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ تو خدائے یگانہ پر ایمان لے آئے۔ اس نے عرض کیا: ہاں! اے رسول خدا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدایگانہ ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اگر بتوں سے کچھ ہو سکتا تو میں یہ دن نہ دیکھتا۔

آپ نے فرمایا: ”کیا وہ موقع نہیں آیا کہ تو جان لے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔“ اس نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ابھی اس بارے میں میرے دل میں کچھ شک و شبہ موجود ہے۔ لیکن آخر کار ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں میں سے دو آدمی مسلمان ہو گئے۔

پیغمبر اکرم نے عباس (رض) کو فرمایا:

”ابو سفیان کو اس درہ میں جو مکہ کی گزرگاہ ہے، لے جاؤ تاکہ خدا کا لشکر وہاں سے گزرے اور یہ دیکھ لے۔“ عباس (رض) نے عرض کیا: ”ابو سفیان ایک جاہ طلب آدمی ہے، اس کو کوئی امتیازی حیثیت دے دیجئے۔ پیغمبر نے فرمایا: ”جو شخص ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے، جو شخص مسجد الحرام میں پناہ لے لے وہ امان میں ہے، جو شخص اپنے گھر کے اندر رہے اور دروازہ بند کر لے وہ بھی امان میں ہے۔“

بہر حال جب ابو سفیان نے اس لشکرِ عظیم کو دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ مقابلہ کرنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہی اور اس نے عباس کی طرف رخ کر کے کہا: آپ کے بھتیجے کی سلطنت بہت بڑی ہو گئی ہے۔ عباس نے کہا: وائے ہو تجھ پر یہ سلطنت نہیں نبوت ہے۔

اس کے بعد عباس نے اس سے کہا کہ اب تو تیزی کے ساتھ مکہ والوں کے پاس جا کر انہیں لشکر اسلام کا مقابلہ کرنے سے ڈرا۔

ابو سفیان نے مسجد الحرام میں جا کر پکار کر کہا:

”اے جمعیت قریش محمد ادا ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ تمہاری طرف آیا ہے، تم میں اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا: جو شخص میرے گھر میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے، جو شخص مسجد الحرام میں چلا جائے وہ بھی امان میں ہے اور جو شخص اپنے گھر میں رہتے ہوئے گھر کا دروازہ بند کرے وہ بھی امان میں ہے۔“

اس کے بعد اس نے چیخ کر کہا: اے جمعیت قریش اسلام قبول کر لو تاکہ سالم رہو اور بچ جاؤ، اس کی بیوی ”ہندہ“ نے اس کی داڑھی پکڑ لی اور چیخ کر کہا: اس بڈھے احمق کو قتل کر دو۔ ابو سفیان نے کہا: میری داڑھی چھوڑ دے۔ خدا کی قسم اگر تو اسلام نہ لائی تو تو بھی قتل ہو جائے گی، جا کر گھر میں بیٹھ جا۔ اس کے بعد پیغمبر اسلام لشکر اسلام کے ساتھ روانہ ہوئے اور ”ذوی طوی“ کے مقام تک پہنچ گئے، وہی بلند مقام جہاں سے مکہ کے مکانات صاف نظر آتے ہیں، پیغمبر کو وہ دن یاد آگیا جب آپ مجبور ہو کر مخفی طور پر مکہ سے باہر نکلے تھے، لیکن آج دیکھ رہے ہیں کہ اس عظمت کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں، تو آپ نے اپنی پیشانی مبارک اونٹ کے کجاوے کے اوپر رکھ دی اور سجدہ شکر بجالائے۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم ”حجون“ میں (مکہ کے بلند مقامات میں سے وہ جگہ جہاں خدیجہ کی قبر ہے) اترے، غسل کر کے اسلحہ اور لباس جنگ پہن کر اپنی سواری پر سوار ہوئے، سورہ فتح کی قرات کرتے ہوئے مسجد الحرام میں داخل ہوئے اور آواز تکبیر بلند کی۔ لشکر اسلام نے بھی نعرہ تکبیر بلند کیا تو اس سے سارے دشت و کوہ گونج اٹھے

اس کے بعد آپ اپنے اونٹ سے نیچے اترے اور بتوں کو توڑنے کے لیے خانہ کعبہ کے قریب آئے۔ آپ یکے بعد دیگرے بتوں کو سرنگوں کرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے: ”جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقاً“ حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل ہے ہی مٹنے والا۔

کچھ بڑے بڑے بت کعبہ کے اوپر نصب تھے، جن تک پیغمبر کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔ آپ نے امیر المومنین علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ آدوش مبارک پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ جائیں اور بتوں کو زمین پر گرا کر توڑ ڈالیں۔ علی نے آپ کے حکم کی اطاعت کی۔

اس کے بعد آپ نے خانہ کعبہ کی کلید لے کر دروازہ کھولا اور انبیاء کی ان تصویروں کو جو خانہ کعبہ کے اندر درو دیوار پر بنی ہوئی تھیں، محو کر دیا۔

۳۔ اس سریع اور شاندار کامیابی کے بعد پیغمبر نے خانہ کعبہ کے دروازے کے حلقہ میں ہاتھ ڈالا اور وہاں پر موجود اہل مکہ کی طرف رخ کر کے فرمایا:

”اب بتلاؤ تم کیا کہتے ہو؟ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے بارے میں کیا حکم دوں گا؟ انہوں نے عرض کیا: ہم آپ سے نیکی اور بھلائی کے سوا اور کوئی توقع نہیں رکھتے! آپ ہمارے بزرگوار بھائی اور آپ ہمارے بزرگوار بھائی کے فرزند ہیں۔ آج آپ برسرِ اقتدار آگئے ہیں، ہمیں بخش دیجئے۔ پیغمبر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور مکہ کے لوگ بھی بلند

آواز کے ساتھ رونے لگے۔ پیغمبر اکرم نے فرمایا: ”میں تمہارے بارے میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے کہی تھی کہ آج تمہارے اوپر کسی قسم کی کوئی سرزنش اور ملامت نہیں ہے، خدا تمہیں بخش دے گا، وہ ارحم الراحمین ہے۔“

اور اس طرح سے آپ نے ان سب کو معاف کر دیا اور فرمایا: ”تم سب آزاد ہو، جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ ضمنی طور پر پیغمبر نے یہ حکم دیا تھا کہ آپ کے لشکری کسی سے نہ الجھیں اور بالکل کوئی خون نہ بہایا جائے۔ ایک روایت کے مطابق صرف چھ افراد کو مستثنیٰ کیا گیا تھا جو بہت ہی بد زبان اور خطرناک لوگ تھے۔

یہاں تک کہ جب آپ نے یہ سنا کہ لشکر اسلام کے علمدار ”سعد بن عبادہ نے انتقام کا نعرہ بلند کیا ہے اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ: الیوم یوم الملاحمۃ“ آج انتقام کا دن ہے، تو پیغمبر نے علی علیہ السلام سے فرمایا۔۔۔۔۔ جلدی سے جا کر اس علم کو لے لو اور اس سے علم لے کر یہ نعرہ لگاؤ کہ: الیوم یوم المرحمة“ آج عفو و بخشش اور رحمت کا دن ہے۔“

اور اسی طرح مکہ بغیر کسی خونریزی کے فتح ہو گیا،، عفو و رحمت اسلامی کی اس کشش نے، جس کی انہیں بالکل توقع نہیں تھیں، دلوں پر ایسا اثر کیا کہ لوگ گروہ گروہ آکر مسلمان ہو گئے، اس عظیم فتح کی صدا تمام جزائر عربستان میں جا پہنچی۔

اسلام کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی اور مسلمانوں اور اسلام کی ہر جیت سے دھاک بیٹھ گئی۔

بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانہ کعبہ کے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”لا الہ الا اللہ وحدہ، وحده انجز وعده و نصر عبده، وهزم الاحزاب و هزم الاحزاب وحده، الا ان کل مال او مآثرہ او دم تدعی فہو تحت قدمی ہاتین!“

”خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا و یگانہ، اس نے آخر کار اپنے وعدے کو پورا کر دیا۔ اور اپنے بندے کی مدد کی، اور اس نے خود اکیلے ہی تمام گروہوں کو شکست دے دی۔ جان لو کہ ہر مال، ہر امتیاز، اور ہر وہ خون جس کا تعلق ماضی اور زمانہ جاہلیت سے ہے، سب کے سب میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہیں۔ (یعنی اب اس خون کے بارے میں، جو زمانہ جاہلیت میں بہایا گیا تھا، یا وہ اموال جو لوٹے گئے تھے، کوئی بات نہ کرنا) اور زمانہ جاہلیت کے تمام اعزازات اور امتیازات بھی باطل ہو گئے ہیں اور اس طرح تمام گزشتہ فائلیں بند ہو گئیں ہیں۔“

یہ ایک بہت اہم اور عجیب قسم کی پیش نہاد تھی جس میں عمومی معافی کے فرمان سے حجاز کے لوگوں کو ان کے تاریک اور پر ماجرا ماضی سے کاٹ کر رکھ دیا اور انہیں اسلام کے سائے میں ایک نئی زندگی بخشی جو ماضی سے مربوط کشمکشوں اور جنگالوں سے مکمل طور پر خالی تھی۔

اس کام نے اسلام کی پیش رفت کے سلسلہ میں حد سے زیادہ مدد کی اور یہ ہمارے آج اور آنے والے کل کے لئے ایک دستور العمل ہے۔

خدا وندا! تو اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ اس دیرینہ عظمت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے دوستوں کے زمرہ میں قرار دے۔

بار الہا! ہمیں ایسی توفیق مرحمت فرما کہ ہم دنیا میں عدل اسلامی حکومت کو اس طرح پھیلائیں کہ ساری دنیا کے لوگ فوج در فوج اسے دل و جان سے قبول کر لیں۔

سورہ اللہب (تبت)

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۵ آیات ہیں۔

سورہ لہب (تبت) کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سورہ جو مکہ میں اور تقریباً پیغمبر اسلام کی آشکارا دعوت کے آغاز میں نازل ہوا تھا، وہ واحد سورہ ہے جس میں پیغمبر اسلام اور اسلام کے دشمنوں میں سے اس زمانہ کے ایک دشمن (یعنی ابو لہب) پر نام لے کر سخت حملہ کیا گیا ہے اور اس کا مضمون اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اسے پیغمبر اسلام کے ساتھ خصوصی عداوت تھی اور وہ اور اس کی بیوی کام بگاڑنے اور بدزبانی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔

قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ دونوں جہنمی ہیں اور ان کے لیے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے۔ یہ معنی صحیح ثابت ہوا ہے اور وہ دونوں کے دونوں انجام کار دنیا سے بے ایمان ہو گئے۔ یہ قرآن کی ایک کھلی ہوئی پیش گوئی ہے۔

اور اس کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”من قرناھا رجوت ان لا یجمع الہ بینہ و بین ابی لہب فی دار واحدہ“ جو شخص اس کی تلاوت کرے گا مجھے امید ہے کہ خدا اسے اور ابو لہب کو ایک گھر میں اکٹھا نہیں کرے گا (یعنی وہ اہل بہشت سے ہوگا، جب کہ ابو لہب اہل دوزخ سے ہے۔^(۱))

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ یہ فضیلت اس شخص کے لیے ہے جو اس سورہ کو پڑھ کر اپنا راستہ ابو لہب کے راستے سے جدا کرے، نہ کہ وہ لوگ جو زبان سے تو پڑھیں لیکن ابو لہب جیسا عمل کریں۔

شان نزول

”ابن عباس“ سے نقل ہوا ہے کہ جس وقت آیہ ﴿وَ اَنْذِرْ عَشِیرَتَكَ الْاَقْرَبِینَ﴾ نازل ہوئی اور پیغمبر اپنے قریبی رشتہ داروں کو انذار کرنے اور اسلام کی دعوت دینے (اور اپنی دعوت کا اعلان کرنے) پر مامور ہوئے، تو پیغمبر کوہ صفا پر آئے اور پکار کر کہا ”یا صباہا“ (یہ جملہ عرب اس وقت کہتے تھے جب ان پر دشمن کی طرف سے غفلت کی حالت میں حملہ ہو جاتا تھا تاکہ سب کو باخبر کر دیں اور وہ مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جائیں، لہذا کوئی شخص ”یا صباہا“ کہہ کر آواز دیتا تھا!) ”صباح“ کے لفظ کا انتخاب اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ عام طور پر غفلت کی حالت میں حملے صبح کے وقت کیے جاتے

تھے)۔ مکہ کے لوگوں نے جب یہ صدا سنی تو انہوں نے کہا کہ یہ کون ہے جو فریاد کر رہا ہے۔ کہا گیا کہ یہ ”محمد ہیں۔ کچھ لوگ آپ کے پاس پہنچے تو آپ نے قبائل عرب کو ان کے نام کے ساتھ پکارا۔ آپ کی آواز پر سب کے سب جمع ہو گئے تو آپ نے ان سے فرمایا: ”مجھے بتلاؤ! اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ دشمن کے سوار اس پہاڑ کے پیچھے سے حملہ کرنے والے ہیں، تو کیا تم میری بات کی تصدیق کرو گے۔“ انہوں نے جواب دیا: ”ہم نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں سنا۔“ آپ نے فرمایا:

”انی نذیر لکم بدی عذاب شدید“

”میں تمہیں خدا کے شدید عذاب سے ڈراتا ہوں“

(میں تمہیں توحید کا اقرار کرنے اور بتوں کو ترک کرنے کی دعوت دیتا ہوں) جب ابو لہب نے یہ بات سنی تو اس نے کہا: ”تبا لک! امنا جمعتنا لا لهذا؟!“ (تو ہلاک ہو جائے! کیا تو نے ہمیں صرف اس بات کے لیے جمع کیا ہے؟“

اس موقع پر یہ سورہ نازل ہوا: **تَبَّتْ يَدَا ابِي لَهْبٍ وَتَبَّ** ”اے ابو لہب تو ہی ہلاک ہو اور تیرے ہاتھ ٹوٹیں، تو ہی زیاں کار اور ہلاک ہونے والا ہے۔ بعض نے اس موقع پر اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ ابو لہب کی بیوی ”ام جمیل“ نے یہ خبر سنی کہ یہ سورہ اس کے اور اس کے شوہر کے بارے میں نازل ہوا ہے تو وہ آپ کے پاس آئی، لیکن وہ آپ کو نہ دیکھ سکی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتھر تھا اور وہ کہہ رہی تھی کہ میں نے سنا ہے ”محمد نے میری ہجو کی ہے۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے مل گیا تو میں یہ پتھر اس کے منہ پر دے ماروں گی، میں خود بھی شاعر ہوں!“ اس کے بعد اصطلاح کے مطابق اس نے پیغمبر اسلام کی مذمت میں شعر کہے ہیں۔^(۲)

اسلام کے لیے ابو لہب اور اس کی بیوی کا خطرہ اور ان کی عداوت اسی تک منحصر نہیں تھی۔ اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے ان پر سخت شدید حملہ کیا ہے اور صراحت کے ساتھ ان کی مذمت کر رہا ہے تو اس کی بہت سی وجوہات ہیں، جن کی طرف انشاء اللہ بعد میں اشارہ ہوگا۔

۱۔ مجمع البیان ”جلد ۱۰ ص ۵۵۸۔

۲۔ تفسیر قرطبی ”جلد ۱۰ ص ۷۳۲۴ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ) اسی مضمون کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ ”طبرسی“ نے ”مجمع البیان“ میں، ”ابن اثیر“ نے ”الکامل جلد ۲ ص ۶۰“ میں اور ”در المنثور“ و ”ابو الفتوح رازی“ اور ”فخر رازی“ اور ”فی ظلال القرآن“ میں اس سورہ کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ﴾ ۲۔ ﴿مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ﴾

۳۔ ﴿سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾ ۴۔ ﴿وَأَمْرَاتِهِ حَمَالَةَ الْحَطَبِ﴾ ۵۔ ﴿فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ﴾

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ابو لہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں (اور وہ ہلاک ہو جائے)۔

۲۔ اس کے مال و دولت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے اسے ہرگز کوئی فائدہ نہ دیا۔

۳۔ وہ جلدی اس آگ میں داخل ہو جائے گا جس کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔

۴۔ اور اسی طرح سے اس کی وہ بیوی جو ایندھن اٹھانے والی ہے۔ ۵۔ اور اس کی گردن میں خرما کی چھال کی رسی

ہے۔

ابو لہب کا ہاتھ کٹ جائے

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے شان نزول میں بیان کیا ہے یہ سورہ حقیقت میں پیغمبر اکرم کے چچا، عبد المطلب کے بیٹے ”ابو لہب کی بری باتوں کا جواب ہے جو اسلام کے سخت دشمنوں میں سے تھا اور جس نے پیغمبر اکرم کی آشکار اور عمومی دعوت اور عذاب الہی کے بارے میں آپ کے انداز کو سن کر یہ کہا تھا کہ: ”تو ہلاک ہو جائے، کیا تو نے ہمیں انہی باتوں کے لیے پکارا تھا؟“

قرآن مجید اس بد زبان شخص کے جواب میں فرماتا ہے:

”ابو لہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں، یا وہ ہلاک ہو جائے اور خسارہ اٹھائے۔“

﴿تب یدا ابی لهب و تب﴾ ”تب“ و ”تباب“ (بروزن خراب) ”مفردات“ میں ”راغب“ کے قول کے مطابق دائمی خسارے کے معنی میں ہے لیکن ”طبرسی“ نے ”مجمع البیان“ میں یہ کہا ہے کہ یہ اس نقصان کے معنی ہے جو ہلاکت پر منتہی ہو۔

بعض ارباب لغت نے اس کی ”قطع کرنے“ کے معنی میں بھی تفسیر کی ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہلاکت پر منتہی ہونے والا دائمی نقصان طبعاً قطع ہونے اور کٹ جانے کا سبب بنتا ہے۔ ان معانی کے مجموعہ سے وہی بات معلوم ہوتی ہے جو ہم نے آیہ کے معنی میں بیان کی ہے۔

البتہ یہ ہلاکت اور نقصان ممکن ہے دنیوی پہلو رکھتا ہو یا معنوی و اخروی یا دونوں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید نے اپنی روش اور سیرت کے برخلاف ایک شخص کا نام کیسے لے لیا اور اس شدت کے ساتھ اس پر حملہ کیوں کیا ہے؟ لیکن ابو لہب کی حیثیت معلوم ہونے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ اس کا نام ”عبد العزیٰ“ (عزیٰ بت کا بندہ) اور اس کی کنیت ”ابو لہب“ تھی۔ اس کے لیے اس کنیت کا انتخاب شاید اس وجہ سے تھا کہ اس کا چہرہ سرخ اور بھڑکتا ہوا تھا، چونکہ لغت میں لہب آگ کے شعلہ کے معنی میں ہے۔

وہ اور اس کی بیوی ”ام جمیل“ جو ابو سفیان کی بہن تھی، پیغمبر اکرم کے نہایت بد زبان اور سخت ترین دشمنوں میں سے تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ”طارق محاربی“ نامی ایک شخص کہتا ہے: میں ”ذی المجاز“ کے بازار میں تھا۔ (ذی المجاز عرفات کے نزدیک مکہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر ہے) اچانک میں نے ایک جوان کو دیکھا جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا: اے لوگوں! لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لو تو نجات پا جاؤ گے۔ اور اس کے پیچھے پیچھے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو اس کے پاؤں کے پچھلے حصہ پر پتھر مارتا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں سے خون جاری تھا اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا ”اے لوگوں! یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ ماننا!“

میں نے پوچھا کہ یہ جوان کون ہے؟ تو لوگوں نے بتایا: ”یہ محمد“ ہے جس کا گمان یہ ہے کہ وہ پیغمبر ہے اور یہ بوڑھا اس کا چچا ابو لہب ہے جو اس کو جھوٹا سمجھتا ہے۔۔۔^(۱)

ایک اور دوسری روایت میں آیا ہے کہ ”ربیع بن عباد“ کہتا ہے: میں اپنے باپ کے ساتھ تھا، میں نے رسول اللہ کو دیکھا کہ وہ قبائل عرب کے پاس جاتے اور ہر ایک کو پکار کر کہتے: میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں: تم خدائے یگانہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ جب وہ اپنی بات سے فارغ ہو جاتا تو ایک خوبرو

بھینگا آدمی جو ان کے پیچھے پیچھے تھا، پکار کر کہتا: ”اے فلاں قبیلہ: یہ شخص یہ چاہتا ہے کہ تم لمات و عزی بت اور اپنے ہم پیمان جنوں کو چھوڑ دو اور اس کی بدعت و ضلالت کی پیروی کرنے لگ جاؤ۔ اس کی بات نہ سنا، اور اس کی پیروی نہ کرنا! میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ ”اس کاچا ابو لہب ہے“۔^(۲)

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جب مکہ سے باہر کے لوگوں کا کوئی گروہ اس شہر میں داخل ہوتا تھا تو وہ پیغمبر سے اس کی رشتہ داری اور سن و سال کے لحاظ سے بڑا ہونے کی بنا پر ابو لہب کے پاس جاتا تھا اور رسول اللہ کے بارے میں تحقیق کرتا تھا۔ وہ جواب دیتا: محمد ایک جادو گر ہے۔ وہ بھی پیغمبر سے ملاقات کیے بغیر ہی لوٹ جاتے۔ اسی اثناء میں ایک ایسا گروہ آیا جنہوں نے یہ کہا کہ ہم تو اسے دیکھے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ ابو لہب نے کہا: ”ہم مسلسل اس کے جنوں کا علاج کر رہے ہیں! وہ ہلاک ہو جائے!“^(۳)

ان روایات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اکثر مواقع پر سایہ کی طرح پیغمبر کے پیچھے لگا رہتا تھا اور کسی خرابی سے فرد گزاشت نہ کرتا تھا۔ خصوصاً اس کی زبان بہت ہی گندی اور آلودہ ہوتی تھی اور وہ رکیک اور چبھنے والی باتیں کیا کرتا تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے پیغمبر اسلام کے سب دشمنوں کا سر غنہ شمار ہوتا تھا۔ اسی بناء پر زیر بحث آیات اس پر اس کی بیوی ام جمیل پر ایسی صراحت اور سختی کے ساتھ تنقید کر رہی ہیں۔

وہی ایک اکیلا ایسا شخص تھا جس نے پیغمبر اکرم سے بنی ہاشم کی حمایت کے عہد و پیمان پر دستخط نہیں کیے تھے اور اس نے آپ کے دشمنوں کی صف میں رہتے ہوئے دشمنوں کے عہد و پیمان میں شرکت کی تھی۔ ان حقائق کی طرف توجہ کرنے سے اس سورہ کی استثنائی کیفیت کی دلیل واضح ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: اس کے مال و ثروت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے اس نے، اسے ہرگز کوئی فائدہ نہیں دیا اور وہ اسے عذاب الہی سے نہیں بچائے گا۔ ﴿مَا اغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ﴾^(۴)

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دولت مند مغرور شخص تھا جو اپنی اسلام دشمنی کو ششوں کے لیے اپنے مال و دولت پر بھروسہ کرتا تھا۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”وہ جلدی ہی اس آگ میں داخل ہوگا جس کے شعلے بھڑکنے والے ہیں۔“ ﴿سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾ اگر اس کا نام ”ابو لہب“ تھا تو اس کے عذاب کی آگ بھی ”ابو لہب“ ہے اور وہ بہت ہی عظیم شعلے رکھتی ہے۔ (اس بات پر توجہ رہے کہ ”لہب“ یہاں نمرہ کی صورت میں آیا ہے اور یہ اس شعلہ کی عظمت کی دلیل

(ہے)۔ نہ صرف ابو لہب کو بلکہ کسی بھی کافر اور بدکار کو اس کا مال و ثروت اور اس کی اجتماعی و معاشرتی حیثیت جہنم کی آگ اور خدا کے عذاب سے رہائی نہیں بخشیں گے، جیسا کہ سورہ شعراء کی آیہ ۸۸ و ۸۹ میں آیا ہے: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ إِلَّا مَنْ اتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾: قیامت ایک ایسا دن ہے جس میں انسان کو نہ تو اس کا مال ہی کوئی فائدہ دے گا اور نہ ہی اس کی کوئی اولاد، سوائے اس شخص کے جو قلب سلیم (یعنی ایمان و تقویٰ کی روح کے ساتھ) پروردگار کے دربار میں حاضر ہو۔ مسلمہ طور پر آیہ ”﴿سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾“ سے مراد جہنم کی آگ ہے، لیکن بعض نے احتمال دیا ہے کہ اس میں دنیا کی آگ بھی شامل ہے۔

روایات میں آیا ہے کہ جنگ ”بدر“ اور سخت شکست کے بعد، جو مشرکین قریش کو اٹھانی پڑی تھی، ابو لہب نے جو خود میدان جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا۔ ابو سفیان کے واپس آنے پر اس سے ماجرے کے بارے میں سوال کیا: ابو سفیان نے قریش کے لشکر کی شکست اور سرکوبی کی کیفیت اس سے بیان کی۔ اس کے بعد اس نے مزید کہا: خدا کی قسم ہم نے اس جنگ میں آسمان و زمین کے درمیان ایسے سوار دیکھے ہیں جو محمد کی مدد کے لیے آئے تھے۔ اس موقع پر ”عباس“ کے ایک غلام ”ابو رفع“ نے کہا: میں وہاں بیٹھا ہوا تھا، میں نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور کہا کہ وہ آسمانی فرشتے تھے۔ اس سے ابو لہب بھڑک اٹھا اور اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر دے مارا۔ مجھے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے مجھے پیٹے چلے جا رہا تھا۔ وہاں عباس کی بیوی ”ام الفضل“ بھی موجود تھی اس نے ایک چھڑی اٹھائی اور ابو لہب کے سر پر دے ماری اور کہا: ”کیا تو نے اس کمزور آدمی کو اکیلا سمجھا ہے؟“

ابو لہب کا سر پھٹ گیا اور اس سے خون بہنے لگا۔ سات دن کے بعد اس کے بدن میں بدبو پیدا ہو گئی، اس کی شکل میں طاعون کے دانے نکل آئے اور وہ اسی بیماری سے واصل جہنم ہو گیا۔ اس کے بدن سے اتنی بدبو آرہی تھی کہ لوگ اس کے نزدیک جانے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے مکہ سے باہر لے گئے اور دور سے اس پر پانی ڈالا اور اس کے بعد اس کے اوپر پتھر پھینکے۔ یہاں تک کہ اس کا بدن پتھروں اور مٹی کے نیچے چھپ گیا۔^(۵)

بعد والی آیت میں اس کی بیوی ”ام جمیل“ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اس کی بیوی بھی جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگی، جو اپنے دوش پر ایندھن اٹھاتی ہے۔“ ﴿وَامْرَأَتُهُ حَمَالَةَ الْحَطَبِ﴾^(۶) اور اس کی گردن میں خرما کی چھال کی رسی یا گردن بند ہے۔“ ﴿فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ﴾

کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ابو لہب کی بیوی۔ جو ”ابو سفیان“ کی بہن اور معاویہ کی پھوپھی تھی۔ اسلام کے بر خلاف اپنے شوہر کی عداوتوں اور خرابیوں میں برابر کی شریک تھی لیکن اس بارے میں کہ قرآن نے اس کی حملہ الحطب (دوش پر ایندھن اٹھانے والی عورت) کے ساتھ تو صیغہ کیوں کی ہے، مفسرین نے متعدد تفسیریں بیان کی ہیں: بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ اس بناء پر ہے کہ وہ کاٹیں دار جھاڑیاں کندھے پر اٹھا کر لاتی تھی اور پیغمبر کے راستہ میں ڈال دیا کرتی تھی تاکہ وہ آپ کے پاؤں میں چبھ جائیں۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ تعبیر اس کی سخن چینی اور چغل خوری کے بارے میں آئی ہے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے: میان دو کس جنگ چوں آتش است سخن چین بد بخت ہیزم کش است دو آدمیوں کے درمیان جنگ آگ کے مانند ہے اور بد بخت چغل خور ایندھن اٹھانے والا ہے۔

بعض اسے اس کے شدت سے بخل سے کنایہ سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ اتنی دولت مند ہونے کے باوجود کسی ضرورت مند کی مدد کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے اسے ”ہیزم کش“ ایندھن اٹھانے والے فقیر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ قیامت میں بہت سے گروہوں کے گناہوں کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے ہوگی۔ ان معانی میں سے پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب ہے، اگرچہ ان کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے۔

”جید“ (بر وزن دید) ”گردن“ کے معنی میں ہے اور اس کی جمع ”اجیاد“ ہے بعض ارباب لغت کا نظریہ یہ ہے کہ ”جید“ و ”عنق“ اور ”رقبہ“ تینوں کے ایک ہی معنی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ”جید“ سینہ سے اوپر والے حصہ کو کہا جاتا ہے، ”عنق“ گردن کی پشت یا ساری گردن کو اور ”رقبہ“ مطلقاً گردن کو کہا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ایک انسان کو بھی ”رقبہ“ کہتے ہیں، مثلاً: ”فک رقبہ“ یعنی انسان کو آزاد کرنا۔^(۷)

”مسد“ (بر وزن حسد) اس رسی کے معنی میں ہے جو کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ”مسد“ وہ رسی ہے جو جہنم میں اس کی گردن میں ڈالیں گے جس میں کھجور کے پتوں جیسی سختی ہوگی اور اس میں آگ کی حرارت اور لوہے کی سنگینی ہوگی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ بڑے لوگوں کی عورتیں اپنی شخصیت کو آلات و زیورات خصوصاً گردن کے قیمتی زیورات سے زینت دینے میں خاص بات سمجھتی ہیں، لہذا خدا قیامت میں اس مغرور و خود پسند عورت کی تحقیر کے لیے لیف خرما کا ایک گردن بند اس کی گردن میں ڈال دے گا۔ یا یہ اصلاً اس کی تحقیر سے کنایہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس تعبیر کے بیان کرنے کا سبب یہ ہے کہ ”اُمّ جمیل“ کے پاس جواہرات کا ایک بہت ہی قیمتی گردن بند تھا اور اس نے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ اسے پیغمبر اکرم کی دشمنی میں خرچ کرے گی، لہذا اس کے اس کام کے بدلے میں خدا نے بھی اس کے لیے ایسا عذاب مقرر کر دیا ہے۔

۱۔ مجمع البیان“جلد ۱۰ ص ۵۵۹

۲۔ فی ظلال القرآن“جلد ۸ ص ۶۹۷

۳۔ تفسیر القرآن“جلد ۳۰ ص ۵۰۳

۴۔ ماکسب“میں ”ما“ ممکن ہے ”موصولہ“ یا ”مصدریہ“ ہو، بعض اس کے لیے ایک وسیع معنی کے قائل ہیں جو نہ صرف اس کے اموال بلکہ اس کی اولاد کو بھی شامل ہے، اور ”ما اغنی عنہ“ میں ”ما“ مسئلہ طور پر ”مانافیہ“ ہے۔

۵۔۔ بحار الانوار“جلد ۱۹ ص ۲۲۷

۶۔ ”امراتہ“ ”سیصلی“ میں پوشیدہ ضمیر پر عطف ہے اور حمالة الحطب“ حال ہے اور منصوب ہے، اور بعض نے مثل ”زمنختری“ کے ”کشاف“ میں اسے ”ذم“ کے عنوان سے منصوب جانا ہے۔ اور تقدیر میں اس طرح ہے اذا حمالة الحطب۔ لیکن مسئلہ طور پر پہلا معنی بہتر ہے۔

۷۔ التحقیق فی کلمات القرآن الکریم“جلد ۲، ص ۱۵۸

۱۔ قرآن کے اعجاز کی ایک اور نشانی

ہم جانتے ہیں کہ یہ آیات مکہ میں نازل ہوئیں اور قرآن کریم نے دو ٹوک طریقہ سے یہ خبر دی تھی کہ ابو لہب اور اس کی بیوی جہنم کی آگ میں ہوں گے، یعنی وہ ہرگز بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ انجام کار ایسا ہی ہوا، بہت سے مشرکین مکہ تو واقعی طور پر ایمان لے آئے اور بعض ظاہری طور پر مسلمان ہو گئے، لیکن وہ افراد جو نہ تو واقع میں ایمان لائے اور نہ ہی ظاہر بظاہر، وہ یہ دونوں تھے۔ یہ قرآن مجید کے غیبی اخبار میں سے ایک ہے اور قرآن نے دوسری آیات میں بھی اس قسم کی خبریں دی ہیں جن میں قرآن کی غیبی خبروں کے عنوان کے تحت اعجاز قرآن کی ایک فصل کو مخصوص کیا گیا ہے اور ہم نے ان آیات میں سے ہر ایک کے ذیل میں مناسب بحث کی ہے

۲۔ ایک اور سوال کا جواب

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی ان پیشین گوئیوں کی موجودگی میں ممکن نہیں تھا کہ ابو لہب اور اس کی بیوی ایمان لے آتے، ورنہ یہ خبر جھوٹی اور دردغ ہو جاتی۔

یہ سوال اسی معروف سوال کے مانند ہے جو ”علم خدا“ کے مسئلہ کے بارے میں جبر کی بحث میں پیش ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ خدا جو ازل سے ہر چیز کا عالم تھا، وہ گنہگاروں کے گناہ اور اطاعت گزاروں کی اطاعت کو جانتا تھا۔ اس بناء پر اگر گنہگار گناہ نہ کرتے تو خدا کا علم جہالت میں بدل جائے۔

علماء اور فلاسفہ اسلام قدیم سے اس سوال کا جواب دے چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا جانتا ہے کہ ہر شخص اپنے اختیار و آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کون کون سے کام انجام دے گا، مثلاً زیر بحث آیات میں خدا ابتداء سے جانتا تھا کہ ابو لہب اور اس کی بیوی اپنی خواہش و رغبت اور ارادہ و اختیار سے ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، جبری اور لازمی طور نہیں۔

دوسرے الفاظ میں ارادہ و اختیار کی آزادی کا عنصر بھی خدا کو معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بندے صفت اختیار کے ساتھ اور اپنے ارادہ سے کون سے عمل انجام دیں گے۔

مسئلہ طور پر ایسا علم اور مستقبل کے بارے میں اس قسم کی خبر دینا، مسئلہ اختیار کی تاکید ہے، جبر اور مجبوری کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ (غور کیجئے)

۳۔ بے بصیرت رشتہ دار ہمیشہ دور ہوتے ہیں۔

یہ سورہ ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کی تاکید کر رہا ہے کہ ایسی رشتہ داری جس میں ایمان اور عقیدہ کا رشتہ نہ ہو اس کی کوئی حیثیت اور قدر و قیمت نہیں ہوتی، اور مردانِ خدا منحرف، جبار اور سرکش لوگوں کے مقابلہ میں کسی قسم کا میلان نہیں رکھتے تھے چاہے وہ ان کے کتنے ہی قریبی رشتہ دار ہوں۔

باوجود اس کے کہ ابو لہب پیغمبر اکرم کا چچا تھا اور آپ کے قریب ترین رشتہ داروں میں شمار ہوتا ہے، جب اس نے اپنا اعتقادی اور عملی راستہ آپ سے جدا کر لیا تو اس کی بھی دوسرے منحرف اور گمراہ لوگوں کی طرح سخت ملامت اور سرزنش کی گئی۔ اس کے برعکس ایسے دور دراز کے لوگ بھی تھے جو نہ صرف پیغمبر کے رشتہ داروں میں شمار نہ ہوتے تھے، بلکہ آپ کے خاندان اور اہل زبان سے بھی نہیں تھے، لیکن وہ فکری، اعتقادی اور عملی رشتہ کی بناء پر اس قدر نزدیک ہو گئے، کہ مشہور حدیث میں سلمان منا اہل البیت (سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں) کے مطابق گویا خاندانِ رسالت کا جزء ہو گئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس سورہ کی آیات صرف ابو لہب اور اس کی بیوی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ صرف ان کے صفات کی وجہ سے ان کی ایسی مذمت کی گئی ہے۔ اس بناء پر جو شخص یا جو گمراہ انہیں اوصاف کا حامل ہوگا اس کی سرنوشت بھی انہیں جیسی ہوگی۔

خداوند! ہمارے دل کو ہر قسم کی ہٹ دھرمی اور عناد سے پاک کر دے۔

چروردگارا! ہم سب اپنے انجام اور عاقبت کا رستے ڈرتے ہیں، ہمیں امن و سکون اور آرام بخش دے و اجعل عاقبة امرنا خیراً، (ہماری عاقبت بخیر کر)

بارِ الہا! ہم جانتے ہیں کہ اس عظیم عدالت میں نہ تو مال و دولت کام آتے ہیں اور نہ ہی کوئی رشتہ داری فائدہ دیتی ہے، صرف تیرا لطف و کرم ہی کام آتا ہے، لہذا ہم پر اپنا لطف و کرم کر۔

آمین یا رب العالمین

سورہ اخلاص

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۴ آیات ہیں

سورہ اخلاص کے مطالب

یہ سورہ۔ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے (سورہ اخلاص اور سورہ توحید) پروردگار کی توحید اور اس کی یگانگت اور یکتائی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور چار مختصر سی آیات میں خدا کی وحدانیت کی اس طرح سے توصیف و تعریف کی ہے جس میں اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس سورہ کی شان نزول کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوا ہے:

”یہودیوں نے رسول اللہ سے یہ تقاضا کیا کہ آپ ان کے لیے خدا کی توصیف بیان کریں۔ پیغمبر تین دن تک خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ سورہ نازل ہوا اور ان کو جواب دیا۔“

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ سوال کرنے والا ”عبد اللہ بن صوریہ“ تھا، جو یہودیوں کے مشہور سرداروں میں سے ایک تھا۔ اور دوسری روایت میں یہ آیا ہے کہ اس قسم کا سوال ”عبد اللہ بن سلام“ نے پیغمبر اکرم سے مکہ میں کیا تھا اور اس کے بعد وہ ایمان لے آیا تھا۔ لیکن اپنے ایمان کو اسی طرح سے چھپائے ہوئے تھا۔ دوسری روایات میں یہ آیا ہے کہ اس قسم کا سوال مشرکین مکہ نے کیا تھا۔^(۱)

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ سوال کرنے والا نجران کے عیسائیوں کا ایک گروہ تھا۔ ان روایات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ یہ سوال ان سب کی طرف سے ہوا ہو۔ اور یہی بات اس سورہ کی حد سے زیادہ عظمت و بزرگی کی ایک دلیل ہے جو مختلف افراد و اقوام کے سوالات کا جواب دیتا ہے

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں مشہور اسلامی منابع میں بہت سی روایات آئی ہیں، جو اس سورہ کی حد سے زیادہ عظمت کی ترجمان ہیں۔ منجملہ۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”ایعجز احدکم ان یقرأ ثلاث القرآن فی لیلة“

”کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات سے عاجز ہے کہ ایک ہی رات میں ایک تہائی قرآن پڑھ لے۔“
 حاضرین میں سے ایک نے عرض کیا، اے رسول خدا، ایسا کرنے کی کس میں طاقت ہے؟
 پیغمبر نے فرمایا: ”اقرء و اقل هو الله احد“ ”سورہ قل ہو اللہ پڑھا کرو“

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ جب رسول خدا نے ”سعد بن معاذ“ کے جنازے پر نماز پڑھی تو آپ نے فرمایا: ”ستر ہزار فرشتوں نے، جن میں جبریل بھی تھے، اس کے جنازے پر نماز پڑھی ہے۔ میں نے جبریل سے پوچھا ہے کہ وہ کس عمل کی بناء پر تمہارے نماز پڑھنے کا مستحق ہوا ہے؟“

جبریل نے کہا: ”(اٹھتے بیٹھتے، پیدل چلتے اور سوار ہوتے اور چلتے پھرتے ”قل هو الله احد“ پڑھنے کی وجہ سے“ (۲)
 ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جس شخص پر ایک رات اور دن گزر جائے، اور وہ پنجگانہ نمازیں پڑھے اور ان میں قل ہو اللہ احد کی قرأت نہ کرے تو اس سے کہا جائے گا: یا عبد اللہ! لست من المصلین“:

”اے بندہ خدا تو نماز گزاروں میں سے نہیں ہے۔“ (۳)

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جو شخص خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ ہر نماز کے بعد قل ہو اللہ احد کے پڑھنے کو ترک نہ کرے کیونکہ جو شخص اسے پڑھے گا خدا اس کے لیے خیر دنیا و آخرت جمع کر دے گا۔ اور خود اسے اور اس کے ماں باپ اور اس کی اولاد کو بخش دے گا“ (۴)

ایک اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں داخل ہوتے وقت اس سورہ کا پڑھنا، رزق کو بڑھاتا ہے اور فقر و فاقہ کو دور کر دیتا ہے۔ (۵)

اس سورہ کی فضیلت میں اتنی زیادہ روایات ہیں کہ وہ اس مختصر بیان میں نہیں سما سکتیں اور ہم نے جو کچھ نقل کیا ہے وہ صرف ان کا ایک حصہ ہے۔ اس بارے میں کہ سورہ ”قل ہو اللہ“ قرآن کی تہائی کے برابر کیسے ہو گیا؟ تو بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ اس بناء پر ہے کہ قرآن ”احکام“ و ”عقائد“ اور ”تاریخ“ پر مشتمل ہے اور یہ سورہ عقائد کے حصہ کو اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ قرآن کے تین حصے ہیں ”مبداء“ و ”معاد“ اور ”جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے“ اور یہ سورہ پہلے حصہ کی تشریح کرتا ہے۔

یہ بات قابل قبول ہے کہ قرآن کی تقریباً ایک تہائی توحید کے بارے میں بحث کرتی ہے، اور اس کا خلاصہ سورہ توحید میں آیا ہے

ہم اس گفتگو کو اس سورہ کی عظمت کے بارے میں ایک دوسری حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ امام علی بن الحسین علیہ السلام سے لوگوں نے سورہ توحید کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

”ان الله عز و جل علم انه يكون في آخر الزمان اقوام متعمقون، فأنزل الله تعالى قل هو الله احد، والآيات من سورة الحديد الى قوله: ”وهو عليم بذات الصدور“ فمن رام وراء ذلك فقد هلك“

”خداوند تعالیٰ جانتا تھا کہ آخری زمانہ میں ایسی قومیں آئیں گی جو مسائل میں تعمق اور غور و خوض کرنے والی ہوں گی، لہذا اس نے (مباحث توحید اور خدا شناسی کے سلسلہ میں) سورہ قل ہو اللہ احد اور سورہ حید کی آیات، علیم بذات الصدور تک نازل فرمائیں۔ جو شخص اس سے زیادہ کا طلب گار ہو گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔“ (۶)

جملہ کا ”ہو“ کی ضمیر کے ساتھ آغاز، جو واحد غائب کی ضمیر ہے اور ایک مبہم مفہوم کو بیان کرتی ہے، حقیقت میں اس واقعیت کی ایک رمز اور اشارہ ہے کہ اس کی ذات اقدس انتہائی خفاء میں ہے اور انسانوں کے محدود افکار کی دسترس سے باہر ہے اگرچہ اس کے آثار نے جہان کو اس طرح سے پر کمر رکھا ہے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ ظاہر اور زیادہ آشکار ہے۔ جیسا کہ سورہ حم سجدہ کی آیہ ۵۳ میں آیا ہے:

”سنر یہم آیاتنا فی الافاق و فی انفسہم حتی یتبین لہم انه الحق:“ ”ہم جلدی ہی اطراف جہان اور ان کے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے، تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے“ اس کے بعد اس ناشناختہ حقیقت سے پردہ اٹھائے ہوئے کہتا ہے، ”وہ یکتا و یگانہ خدا ہے“ ضمنی طور پر یہاں ”قل“ (کہہ دے) کا معنی یہ ہے کہ اس حقیقت کا اظہار کرو۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے اس بات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ کفار و بت پرست اسم اشارہ کے ساتھ اپنے بتوں کی طرف اشارہ کرتے تھے اور کہتے تھے:

”اے محمد! یہ ہمارے خدا ہیں، تو بھی اپنے خدا کی تعریف و توصیف کرتا کہ ہم اسے دیکھیں اور اس کا ادراک کریں۔ تو خدا نے یہ آیات نازل کیں: قل هو الله احد۔۔۔۔۔“ ”ہا“ ”ہو“ میں، مطلب کو ثابت کرنے اور توجہ دینے کے لیے

ہے اور ”واو“ ضمیر غائب ہے، جو اس ذات کی طرف اشارہ ہے جو آنکھوں کے دیکھنے سے غائب اور حواس کے لمس سے دور ہے،“ (۷)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:
”جنگِ بدر کی رات میں نے ”خضر“ علیہ السلام کو خواب میں دیکھا اور ان سے کہا کہ مجھے کوئی ایسی چیز بتائیں جس کی مدد سے میں دشمنوں پر کامیاب ہوں“ تو انہوں نے کہا: کہیئے: ”یا ہو ، یا من لا ہو الا ہو“

۱۔ المیزان جلد ۱۰ ص ۵۴۶

۲۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۶۱

۳۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۶۱ اور تفسیر و حدیث کی دوسری کتابیں۔

۴۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۶۱ اور تفسیر و حدیث کی دوسری کتابیں

۵۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۶۱ اور تفسیر و حدیث کی دوسری کتابیں

۶۔ ”اصول کافی“ جلد ۱ باب السیئہ حدیث ۳

۷۔ بعض نے ہو کو یہاں ”ضمیر شان“ لیا ہے، اس بناء پر معنی یہ ہوگا کہ شان و مطلب یہ ہے کہ خدا ایک اکیلا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ ”ہو“ اس خدا کی پاک ذات کی طرف اشارہ ہو جو سوال کرنے والوں کے لیے غیر معلوم اور مبہم تھی۔ اس بناء پر ”ہو“ بتداء ہے اور ”الہ“ اس کی خبر اور ”احد“ خبر کے بعد کی خبر ہے۔

آیات ۱، ۲، ۳

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ ۲۔ ﴿اللَّهُ الصَّمَدُ﴾ ۳۔ ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ کہہ دیجئے خدا یکتا و یگانہ ہے۔ ۲۔ خدا ہی ہے کہ جس کی طرف تمام حاجت مند رُخ کرتے ہیں۔
۳۔ نہ تو اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ ۴۔ اور ہرگز اس کا کوئی ہم پلہ اور مانند نہیں ہے۔
وہ یکتا اور بے مثال ہے

اس سورہ کی پہلی آیت بار بار کے ان سوالات کے جواب میں ہے جو مختلف اقوام یا افراد کی طرف سے پروردگار کے اوصاف کے سلسلہ میں ہوئے تھے، فرماتا ہے: ”کہہ دیجئے وہ یکتا و یگانہ ہے“ ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾^(۱)
جب صبح ہوئی تو میں نے رسول اللہ کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا ”یا علی! علمت الاسم الاعظم“
”اے علی آپ کو اسم اعظم کی تعلیم دی گئی ہے“

اس کے بعد جنگ بدر میں یہی جملہ میرا ورد زبان رہا۔۔۔^(۲)

”عماریا سر“ نے جب یہ سنا کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام صفین کے دن جنگ کے وقت یہی ذکر پڑھ رہے تھے
تو عرض کیا: یہ کیا کنایات ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: یہ خدا کا اسم اعظم اور توحید کا ستون ہے۔^(۳)

۱۔ ”بحار الانوار“ جلد ۳ ص ۲۲۲

۲۔ ”بحار الانوار جلد ۳، ص ۲۲۲

۳۔ ”بحار الانوار“ جلد ۳، ص ۲۲۲

اللہ “خدا کا اسم خاص ہے

اللہ “خدا کا اسم خاص ہے اور امام کی بات کا مفہوم یہ ہے کہ اسی ایک لفظ کے ذریعے اس کے تمام صفات جلال و جمال کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اسی بناء پر اس کو اسم اعظم الہی کا نام دیا گیا ہے۔ اس نام کا خدا کے سوا اور کسی پر اطلاق نہیں ہوتا جب کہ خدا کے دوسرے نام پر اس کی کسی صفت جمال و جلال کی طرف اشارہ ہوتے ہیں، مثلاً: عالم و خالق و رازق، اور عام طور پر اس کے غیر پر بھی اطلاق ہوتے ہیں۔ (مثلاً رحیم، کریم، عالم، قادر وغیرہ) اس حال میں اس کی اصل اور ریشہ و صفی معنی رکھتا ہے اور اصل میں یہ ”ولہ“ سے مشتق ہے، جو ”تخیر“ کے معنی میں ہے کیونکہ اس کی ذات پاک میں عقلیں حیران ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں امیر المومنین علی سے آیا ہے:

”اللہ معناه المعبود الذی یا له فیہ الخلق ویثولہ الیہ، واللہ هو المستور عن درک الابصار، المحجوب عن الاوهام والخطرات“

اللہ کا معنی ایک ایسا معبود ہے جس میں مخلوق حیران ہے اور اس سے عشق رکھتی ہے۔ اللہ وہی ذات ہے جو آنکھوں کے ادراک سے مستور اور مخلوق کے افکار و عقول سے محبوب ہے۔^(۱) بعض اوقات اسے ”اللاہۃ“ (بروزن و بمعنی عبادت) کی اصل اور ریشہ سے بھی سمجھا گیا ہے اور اصل میں ”الالہ“ ہے جو ”تنہا معبود حقیقی“ کے معنی میں ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس کا ریشہ اور اصل چاہے جو بھی ہو، بعد میں اس نے اسم خاص کی صورت اختیار کر لی ہے اور یہ اسی جامع جمیع صفات کمالیہ اور ہر قسم کے عیب و نقص سے خالی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے اس مقدس نام کا قرآن مجید میں تقریباً ایک ہزار مرتبہ تکرار ہوا ہے اور خدا کے اسماء مقدسہ میں سے کوئی سا نام بھی اتنی مرتبہ قرآن میں نہیں آیا۔ یہ ایک ایسا نام ہے جو دل کو روشن کرتا ہے اور انسان کو قوت اور توانائی اور سکون و آرام بخشتا ہے اور اسے نور و صفا کے ایک عالم میں غرق کر دیتا ہے۔

لفظ ”احد“

لیکن ”احد“ کا لفظ ”وحدت“ کے مادہ سے ہی ہے اور اسی لیے بعض نے ”احد“ اور ”واحد“ کی ایک ہی معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دونوں ہی اس ذات کی طرف اشارہ ہیں جو ہر لحاظ سے بے مثل و بے نظیر ہے۔ علم میں یگانہ ہے، قدرت میں بے مثل ہے، رحمانیت اور رحیمیت میں یکتا ہے اور خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے بے نظیر ہے۔

لیکن بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ”احد“ اور ”واحد“ میں فرق ہے۔ ”احد“ اس ذات کو کہا جاتا ہے جو کثرت کو قبول نہیں کرتا، نہ تو خارج میں اور نہ ہی ذہن میں۔ لہذا وہ شمار کرنے کے قابل نہیں ہے اور ہر گز عدد میں داخل نہیں ہوتا، ”واحد“ کے برخلاف کہ اس کے لیے دوسرے اور تیسرے کا تصور ہوتا ہے، چاہے وہ خارج میں ہو یا ذہن میں۔ اسی لیے بعض اوقات ہم یہ کہتے ہیں کہ: احدی ازاں جمعیت نیامد، یعنی ان میں سے کوئی شخص بھی نہیں آیا لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ: واحدی نیامد (ایک نہیں آیا) تو ممکن ہے کہ دو یا چند افراد آئے ہوں۔^(۱)

لیکن یہ فرق قرآن مجید اور احادیث کے موارد استعمال کے ساتھ چنداں سازگار نہیں ہے۔

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ ”احد“ (جنس و فصل اور ماہیت و وجود) کے اجزائے ترکیبیہ خارجیہ یا عقلیہ کے مقابلہ میں خدا کی بساطت ذات کی طرف اشارہ ہے کہ جب کہ واحد خارجی کثرتوں کے مقابلہ میں اس ذات کی یگانگت کی طرف اشارہ ہے۔ ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے آیا ہے کہ ”احد“ فرد یگانہ کو کہتے ہیں، اور ”واحد“ کا ایک ہی مفہوم ہے، اور وہ ایک ایسی منفرد ذات ہے جس کا کوئی مثل و نظیر نہیں ہے۔ اور ”توحید“ اس کی یگانگت، وحدت اور انفرادیت کا اقرار ہے۔

اسی حدیث کے ذیل میں آیا ہے۔

”واحد عدد نہیں ہے، بلکہ واحد اعداد کی بنیاد ہے۔ عدد دو سے شروع ہوتا ہے، اس بناء پر اللہ احد“ یعنی وہ معبود جس کی ذات کے ادراک سے انسان عاجز ہیں، اور جس کی کیفیت کا احاطہ کرنے سے ناتواں ہیں“ کا معنی یہ ہے کہ وہ الہیت میں فرد ہے اور مخلوقات کی صفات سے برتر ہے۔^(۲)

قرآن مجید میں ”واحد“ و ”احد“ دونوں کا خدا کی ذات پاک پر اطلاق ہوا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ توحید صدوق میں آیا ہے کہ جنگ جمل میں ایک اعرابی نے کھڑے ہو کر عرض کیا اے امیر المومنین! کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ خدا واحد ہے؟ تو واحد کا کیا معنی ہے؟

اچانک لوگوں نے ہر طرف سے اس پر حملہ کر دیا اور کہنے لگے: ”اے اعرابی یہ کیا سوال ہے؟ کیا تو دیکھ نہیں رہا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام مسئلہ جنگ کی فکر میں کتنے مشغول ہیں؟ ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامی وارد! ہر بات کا ایک موقع اور ہر نکتہ کا ایک مقام ہوتا ہے۔“

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: ”اسے اس کی حالت پر چھوڑ دو کیونکہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہی چیز ہم اس دشمن گروہ سے چاہتے ہیں۔ (وہ توحید کے بارے میں پوچھ رہا ہے، ہم بھی مخالفین کو کلمہ توحید ہی کی دعوت دے رہے ہیں)۔“

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

”اے اعرابی یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا ”واحد“ ہے تو اس کے چار معانی ہو سکتے ہیں جن میں سے دو معانی خدا کے لیے صحیح نہیں ہیں اور اس کے دو معانی صحیح ہیں۔“

”اب وہ دو جو صحیح نہیں ہیں، ان میں سے ایک وحدت عددی ہے۔ یہ خدا کے لیے جائز نہیں ہے (یعنی ہم یہ کہیں کہ وہ ایک ہے دو نہیں ہیں) کیونکہ اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے لیے دوسرے کا تصور ہو سکتا ہے لیکن وہ موجود نہیں ہے۔ حالانکہ مسئلہ طور پر حق تعالیٰ کی غیر متناہی ذات کے لیے دوسرے کا تصور نہیں ہو ہی سکتا۔ کیونکہ جس چیز کا کوئی ثانی ہی نہیں ہے وہ باب اعداد میں داخل نہیں ہوتی۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ خدا نے ان لوگوں کی، جنہوں نے یہ کہا تھا کہ: ”ان اللہ ثلاث ثلاثیہ۔“ (خدا تین میں کا تیسرا ہے، تکفیر کی ہے۔“

”واحد کا دوسرا معنی جو خدا کے لیے صحیح نہیں ہے یہ ہے کہ وہ واحد نوعی کے معنی میں ہو، مثلاً: ہم یہ کہیں کہ فلاں آدمی لوگوں میں سے ایک ہے، یہ بھی خدا کے لیے صحیح نہیں ہے۔ (کیونکہ خدا کی کوئی جنس اور نوع نہیں ہے) اس بات کا مفہوم تشبیہ ہے، اور ہر قسم کی تشبیہ اور نظیر سے برتر و بالاتر ہے۔“ اب رہے وہ دو مفہوم جو خدا کے بارے میں صحیح اور صادق ہیں، ان میں سے پہلا یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ خدا واحد ہے یعنی اشیاء عالم میں کوئی اس کی شبیہ نہیں ہے، ہاں! ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے۔“

”دوسرے یہ کہ یہ کہا جائے کہ ہمارا پروردگار احدی المعنی ہے، یعنی اس کی ذات ناقابل تقسیم ہے، نہ تو خارج میں، نہ تو عقل میں اور نہ ہی وہم میں، ہاں! خدائے بزرگ ایسا ہی ہے۔“ (۳)

”خلاصہ یہ ہے کہ خدا واحد و احد ہے اور یگانہ و یکتا ہے۔ واحد عددی یا نوعی و جنسی کے معنی میں نہیں بلکہ وحدت ذاتی کے معنی میں، زیادہ واضح عبارت میں اس کی وحدانیت کا معنی یہ ہے اس کا کوئی مثل و نظیر اور مانند و شبیہ نہیں ہے“ اس بات کی دلیل بھی واضح و روشن ہے: وہ ایک ایسی ذات ہے جو ہر جہت سے غیر متناہی ہے اور مسئلہ طور پر ہر جہت سے دو غیر متناہی ذاتیں ناقابل تصور ہیں، کیونکہ اگر دو ذاتیں ہوں گی تو وہ دونوں محدود ہو جائیں گی، اس میں اس کے کمالات نہ ہوں گے اور نہ اس میں اس کے کمالات (غور کیجئے)۔

بعد والی آیت میں اس یکتا ذات مقدس کے بارے میں فرماتا ہے: ”وہ ایسا خدا ہے کہ تمام حاجت مند اسی کی طرف رخ کرتے ہیں۔“ ﴿اللہ الصمد﴾۔

”صمد“ کے لیے روایات اور مفسرین و ارباب لغت کے کلمات میں بہت زیادہ معنی بیان ہوئے ہیں۔ ”راغب“ ”مفردات“ میں کہتا ہے: صمد اس آقا اور بزرگ کے معنی میں ہے جس کی طرف کاموں کی انجام دہی کے لیے جاتے ہیں۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ ”صمد“ اس چیز کے معنی میں ہے جو اندر سے خالی نہ ہو بلکہ پُر ہو۔ ”مقایس اللغت“ میں آیا ہے کہ دو اصلی جڑ بنیادیں ہیں: ایک قصد کے معنی میں ہے اور دوسرا صلابت و استحکام کے معنی میں، اور یہ جو خدا کو ”صمد“ کہا جاتا ہے تو یہ اس بناء پر ہے کہ بندے اس کی بارگاہ کا قصد و ارادہ کرتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ذیل کے متعدد معانی بھی لغت کی کتابوں میں ”صمد“ کے لیے ذکر ہوئے ہیں: ایسی بزرگ ہستی جو انتہائی عظمت ہو، اور ایسی ذات جس کی طرف لوگ اپنی حاجات لے کر جاتے ہیں، ایسی ذات جس سے برتر کوئی چیز نہیں ہے، ایسی ہستی جو مخلوق کے فنا و نابود ہونے کے بعد بھی دائم اور باقی رہنے والی ہے۔ اسی لیے امام حسین بن علی علیہما السلام نے ایک حدیث میں ”صمد“ کے لیے پانچ معانی بیان کیے ہیں۔

”صمد“ اس ہستی کو کہتے ہیں جو انتہائی سیادت و آقائی میں ہو۔

”صمد“ وہ ذات ہے جو دائم اور ازلی و ابدی ہو۔

”صمد“ وہ موجود ہے جو ف (اندر سے خلا) نہ رکھتا ہو۔

”صمد“ وہ ہستی جو نہ کھاتی ہو نہ پیتی ہو۔

”صمد“ وہ ہستی جو کبھی نہ سوتی ہو۔ (۴)

اور دوسری عبارتوں میں آیا ہے کہ: ”صمد اس ہستی کو کہتے ہیں جو قائم بہ نفس ہو اور غیر سے بے نیاز ہو۔“
”صمد“ اس ہستی کو کہتے ہیں جس میں تغیرات اور کون و فساد نہیں ہے۔ امام علی بن الحسین علیہ السلام سے نقل ہو
ا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”صمد“ اس ہستی کو کہتے ہیں جس کا کوئی شریک نہ ہو کسی چیز کی حفاظت کرنا اس کے لیے مشکل نہ ہو اور کوئی چیز اس
سے مخفی نہیں رہتی۔ (۵)

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ”صمد“ اس ذات کو کہتے ہیں کہ وہ جب بھی کسی چیز کا ارادہ کرے تو اسے کہتا ہے ہو جا، تو
وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ”اہل بصرہ“ نے امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا اور ”صمد“ کے معنی در
یافت کیے۔ امام علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم، اما بعد قرآن میں آکاہی کے بغیر بحث و گفتگو نہ کرو، کیونکہ میں نے اپنے نانا رسول اللہ سے
سنا ہے، آپ فرما رہے تھے: جو شخص علم کے بغیر بات کرے گا اسے آگ میں اس مقام پر رہنا پڑے گا جو اس کے لیے
معین ہے۔ خدا نے خود ”صمد“ کی تفسیر بیان فرمائی ہے ”لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ“

نہ اسے کسی نے جنا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور نہ ہی کوئی اس کی مانند اور مثل و نظیر ہے۔ ہاں! خداوند ”صمد“ وہ
ہے جو کسی چیز سے وجود میں نہیں آیا، اور نہ ہی وہ کسی چیز کے اندر موجود ہے نہ کسی چیز کے اوپر قرار پایا ہے، وہ تمام
چیزوں کا پیدا کرنے والا اور ان کا خالق ہے، تمام چیزوں کو وہی اپنی قدرت سے وجود میں لایا ہے۔ جن چیزوں کو اس
نے فنا کے لیے پیدا کیا ہے وہ اس کے ارادہ سے متلاشی ہو جائے گی، اور جسے بقاء کے لیے پیدا کیا ہے وہ اس کے علم
سے باقی رہے گی۔ یہ ہے خداوند صمد۔۔۔ (۶)

اور بالآخر ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ ”محمد بن حنفیہ“ نے امیر المومنین علی علیہ السلام سے ”صمد“ کے بارے میں
سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

”صمد“ کی تاویل یہ ہے کہ وہ نہ اسم ہے اور نہ جسم ہے، نہ اس کا کوئی مثل ہے نہ کوئی نظیر ہے، نہ صورت ہے، نہ
تمثال ہے، نہ حد ہے، نہ حدود ہے، نہ محل ہے، نہ مکان ہے، نہ حال ہے، نہ یہ ہے، نہ یہاں ہے، نہ وہاں ہے، نہ پر ہے، نہ

خالی ہے، نہ کھڑا ہے، نہ بیٹھا ہے، نہ ساکن ہے، نہ محرک ہے، نہ ظلماتی ہے، نہ نورانی ہے، نہ نفسانی ہے، اس کے باوجود کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے اور کسی مکان میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ نہ وہ رنگ رکھتا ہے، نہ انسان کے دل میں سماتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی بو ہے۔ یہ سب چیزیں اس کی ذات پاک سے منتقلی ہے۔^(۷)

یہ حدیث اچھی طرح سے نشان دہی کرتی ہے کہ ”صمد“ کا ایک بہت ہی جامع اور وسیع مفہوم ہے۔ جو اس کی ساخت قدس سے مخلوقات کی ہر قسم کی صفات کی نفی کرتا ہے، کیونکہ مشخص اور محدود اسماء اور اسی طرح جسم و رنگ و بو و مکان و سکون و حرکت و کیفیت و حدود اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، یہ سب ممکنات و مخلوقات کی صفات ہیں، بلکہ زیادہ تر عالم مادہ کے اوصاف ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ خدا ان سب سے برتر اور بالاتر ہے۔ آخری انکشافات سے معلوم ہوا ہے کہ جہان مادہ کی تمام چیزیں بہت ہی چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنی ہے جنہیں ”ایٹم“ کہا جاتا ہے۔ اور ”ایٹم“ خود بھی دو عمدہ حصوں کا مرکب ہے۔ مرکزی ذرہ اور وہ الیکٹرون جو اس کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس ذرہ اور الیکٹرونوں کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ (البتہ یہ زیادہ ایٹم کے حجم کے اندازہ سے ہے) اس طرح سے کہ اگر یہ فاصلہ اٹھا دیا جائے تو اجسام اس قدر چھوٹے ہو جائیں گے کہ وہ ہمارے لیے حیرت میں ڈالنے والے ہوں گے۔

مثلاً اگر ایک انسان کے وجود کے ایٹمی ذرات کے فاصلے ختم کر دیں اور اسے مکمل طور پر دبا دیں تو ممکن ہے کہ وہ ایک ذرہ کی صورت اختیار کر لے، جس کا آنکھ کے ساتھ دیکھنا مشکل ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک انسان کے بدن کے سارے وزن کے برابر ہوگا، (مثلاً یہی معمولی ذرہ ۶۰ کلوو زنی ہوگا)

بعض نے اس علمی انکشاف سے استفادہ کرتے ہوئے اور اس بات کی طرف توجہ دیتے ہوئے کہ ”صمد“ کا ایک معنی ایسا وجود ہے جو اندر سے خالی نہیں ہے، یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن اس تعبیر سے یہ چاہتا ہے کہ خدا سے ہر قسم کی جسمانیست کی نفی کر دے، کیونکہ تمام اجسام ایٹم سے بنے ہوئے ہیں اور ایٹم اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ اور اس طرح یہ آیت قرآن کے علمی معجزات میں سے ایک ہو سکتی ہے۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اہل لغت میں ”صمد“ ایک ایسی عظیم ہستی کے معنی میں ہے جس کی طرف تمام حاجت مند رخ کرتے ہیں اور وہ ہر لحاظ سے کامل ہو، اور ظاہراً باقی تمام معانی اور تفاسیر جو اس کے لیے بیان کی گئی ہیں اسی اصل کی طرف لوٹتی ہیں۔

اس کے بعد اگلی آیت میں نصاریٰ، یہود اور مشرکین عرب کے عقائد کی روپیش کرتے ہوئے۔ جو خدا کے لیے بیٹے یا باپ کے لیے قائل تھے۔ فرماتا ہے: ”اس نے نہ تو کسی کو جنا ہے اور نہ ہی وہ خود کسی سے پیدا ہوا ہے۔“ ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾۔ اس بیان کے مقابلہ میں ان لوگوں کا نظریہ ہے جو تثلیث (تین خداؤں) کا عقیدہ رکھتے تھے، باپ خدا، بیٹا خدا، اور روح القدس۔

نصاری ”مسیح“ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور یہود ”عزیر“ کو اس کا بیٹا سمجھتے تھے، و قالت الیہود عزیر ابن اللہ و قالت النصاری المسیح ابن اللہ ذالک قو لہم با فواہم یضاہئون قول الذین کفرو امن قبل قا تلہم اللہ انی یو فکون :

”یہود نے تو یہ کہا کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو وہ اپنی زبان سے کہتے ہیں اور ان کی یہ بات گزشتہ کافروں کے قول کے مانند ہے ان پر خدا کی لعنت ہو، وہ حق سے کیسے منحرف ہو جاتے ہیں، (توبہ۔ ۳۰)

مشرکین عرب کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں، و خر قوالہ بنین و بنات بغیر علم: ”انہوں نے جھوٹ اور جہالت کی بناء پر خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لی تھیں۔“ (انعام۔ ۱۰۰)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آیہ ”لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ“ میں تو لد ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس سے ہر قسم کی مادی و لطیف چیزوں کے خروج اس ذات مقدس کے دوسری مادی و لطیف چیزوں سے خروج کی نفی کرتا ہے۔ جیسا کہ اسی خط میں۔ جو امام حسین نے ”اہل بصرہ“ کے جواب میں صمد کی تفسیر میں لکھا تھا۔ ”﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾“ کے جملہ کی اس طرح تفسیر کی گئی تھی: (لَمْ يَلِدْ) یعنی کوئی چیز اس سے خارج نہیں ہوئی، نہ تو بیٹے جیسی کوئی مادی چیز اور نہ ہی وہ تمام چیزیں جو مخلوق سے خارج ہوئی ہیں (جیسے ماں کی چھاتیوں سے دودھ) اور نہ ہی نفس جیسی کوئی لطیف چیز، اور نہ ہی قسم قسم کے حالات، جیسے خواب و خیال حزن و اندوہ، خوشحال ہونا، ہنسنا اور رونا، خوف و رجاء، شوق و ملالت، بھوک اور سیری وغیرہ۔ خدا اس سے برتر و بالاتر ہے کہ کوئی چیز اس سے خارج ہو۔

اور وہ اس بات سے بھی برتر و بالاتر ہے کہ وہ کسی مادی چیز سے متولد ہو۔۔۔۔۔ جیسا کہ کسی زندہ موجود کا کسی دوسرے زندہ موجود سے خارج ہونا اور گھاس کا زمین سے، پانی کا چشمہ سے، پھل کا درختوں سے اور اشیائے لطیف کا اپنے منابع سے، جیسے نگاہ کا آنکھ سے، سماعت کا کان سے، سونگھنے کا ناک سے، چکھنے کا منہ سے، گفتگو کا زبان سے معرفت و شناخت کا دل سے اور آگ کی چنگاری کا پتھر سے نکلنا۔^(۸)

اس حدیث کے مطابق تولد ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کے خروج اور ایک چیز کے کسی دوسری چیز کا نتیجہ ہونے کو شامل ہے، اور یہ حقیقت میں آیت کا دوسرا معنی ہے اور اس کا پہلا اور ظاہری معنی وہی تھا جو ابتداء میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا معنی پہلے معنی کی تحلیل کرنے سے پورے طور پر قابل ادراک ہے کیونکہ اگر خدا کے بیٹا نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مادی عوارض سے پاک و منزہ ہے۔ یہی معنی تمام مادی عوارض میں بھی صادق آتا ہے۔ (غور کیجئے)

اور آخر میں اس سورہ کی آخری آیت میں خدا کے اوصاف کے بارے میں مطلب کو مرحلہ کمال تک پہنچاتے ہوئے فرماتا ہے: اور ہرگز اس کا کوئی شبیہ اور ہمسر نہیں ہے۔ ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾^(۹)۔

”کفواً“ اصل میں مقام و منزلت اور قدر میں پلہ کے معنی میں ہے اور اس کے بعد اس کا ہر قسم کے شبیہ اور مانند پر اطلاق ہوا ہے۔

اس آیت کے مطابق مخلوقات کے تمام عوارض اور موجودات کی صفات اور ہر قسم کا نقص و محدودیت اس کی ذاتِ پاک سے منتفی ہے۔ یہ وہی توحید ذاتی و صفاتی ہے جو اس توحید عددی و نوعی کے مقابلہ میں ہے جس کی طرف اس سورہ کے آغاز میں اشارہ ہوا ہے۔

اس بناء پر نہ تو ذات میں اس کا کوئی شبیہ ہے اور نہ صفات میں کوئی اس کے مانند ہے، اور نہ ہی افعال میں کوئی اس کا مثل و نظیر ہے، وہ ہر لحاظ سے بے مثل و نظیر ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے خطبہ میں فرماتے ہیں: ”لم یلد“ ”فیکون مولوداً“ ”ولم یولد“ فصیر محدوداً ولا ”کف“ ”لہ فیاکفئہ“ ولا نظیر لہ فیساویہ

”اس نے کسی کو نہیں جنا کہ وہ خود بھی مولود ہو۔ اور وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا اور نہ وہ محدود ہو جاتا اس کا کوئی مثل و نظیر نہیں ہے کہ وہ اس کا ہم پلہ ہو جائے، اور اس کے لئے کسی شبیہ کا تصور نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کے مساوی ہو جائے۔“^(۱۰)

اور یہ ایک ایسی عمدہ تفسیر ہے جو توحید کے عالیتین دقائق کو بیان کرتی ہے۔ (سلام اللہ علیک یا امیر المومنین)۔

۳۔ ”بحار الانوار“ جلد ۳، ص ۳۰۶، حدیث ۱

۴۔ ”بحار الانوار“ جلد ۳، ص ۲۲۳

۵۔ ”بحار الانوار“ جلد ۳، ص ۲۲۳

۶۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۵۶۵

۷۔ ”بحار الانوار“ جلد ۳، ص ۲۳۰، حدیث ۲۱

۸۔ ”بحار الانوار“ جلد ۳، ص ۲۲۴

۹۔ ”احد“ ”کان“ کا اسم ہے اور ”کفواً“ اس کی خبر ہے۔

۱۰۔ ”نبج البلاغہ“ خطبہ ۱۸۶۔

۱۔ توحید کے دلائل

توحید، یعنی ذاتی خدا کا یکتا و یگانہ ہونا اور اس کا کوئی شریک و شبیہ نہ ہونا، دلائل نقلی اور قرآن مجید کی آیات کے علاوہ بہت سے عقلی دلائل سے بھی ثابت ہے جن میں سے ایک حصہ کو ہم مختصر طور پر یہاں نقل کرتے ہیں۔

۱۔ برہان صرف الوجود۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا وجود مطلق ہے اور اس کے لیے کوئی قید و شرط اور حد نہیں ہے۔ اس قسم کا وجود یقینی طور پر غیر محدود ہوگا، کیونکہ اس میں محدودیت ہوگی تو وہ ضروری طور پر عدم سے آلودہ ہوگا، لیکن وہ ذات مقدس جس کی ہستی و وجود خود بخود موجود ہے وہ ہرگز عدم و نیستی کا مقتضی نہیں ہوگا، اور وہ خارج میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو عدم کو اس پر ڈال دے۔ اس بناء پر وہ کسی حد کے ساتھ محدود نہیں ہوگا۔

دوسری طرف سے عالم میں دو غیر محدود ہستیاں تصویریں ہی نہیں آسکتیں، کیونکہ اگر دو موجود پیدا ہو جائیں تو یقیناً ان میں سے ہر ایک دوسرے کے کمالات کا فاقد ہوگا۔ یعنی اس میں دوسرے کے کمالات نہیں ہوں گے۔ اس بناء پر وہ دونوں ہی محدود ہو جائیں گے، اور یہ خود ذات واجب والوجود کی یگانیت اور یکتائی پر ایک واضح دلیل ہے۔ (غور کیجئے)

۲۔ برہان علمی۔ جب ہم اس وسیع و عریض جہان پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ابتداء میں ہم عالم کو پراگندہ موجودات کی صورت میں دیکھتے ہیں، زمین و آسمان، سورج، چاند، ستارے، انواع و اقسام کی نباتات و حیوانات، لیکن ہم جتنا زیادہ غور کرتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ اس عالم کے اجزاء و ذرات اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور پیوستہ ہیں کہ مجموعی طور پر وہ ایک منظم چیز بناتے ہیں اور اس جہان پر معین قوانین کا ایک سلسلہ حکومت کرتا ہے۔

انسانی علم و دانش کی پیش رفت جس قدر زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس جہان کے اجزاء کا انسجام و وحدت زیادہ آشکار اور ظاہر ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ایک چھوٹے سے نمونہ (مثلاً ایک سیب کے درخت سے گرنے کی آزمائش اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ ایک بہت بڑا قانون جو سارے عالم ہستی پر حکم فرما ہے، منکشف ہو جاتا ہے۔) (جیسا کہ ”نیوٹن“ اور ”قانون جاذبہ“ کے بارے میں ہے)۔

نظام ہستی کی یہ وحدت، اس پر حاکم قوانین اور اس کے اجزاء کے درمیان انسجام و یکتائی، اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس کا خالق یکتا و یگانہ ہے۔

۳۔ برہانِ تمانع۔ (فلسفی علمی دلیل) دوسری دلیل جو علماء نے خدا کی ذات کی یکتائی اور وحدت کے لیے بیان کی ہے اور قرآن نے سورہ انبیاء کی آیہ ۲۲ میں جس کے بارے میں ہدایت کی ہے، وہ برہانِ تمانع ہے، فرماتا ہے: ”لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ“ اگر زمین و آسمان میں خدائے واحد و یکتا کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو آسمان و زمین میں فساد ہو جاتا، اور نظامِ جہاں درہم و برہم ہو جاتا پس وہ خدا جو عرش کا پروردگار ہے ان کی تو صیف سے پاک و منزہ ہے۔

ہم اس دلیل کی جلد ۱۳ ص ۲۸۶ میں ”برہانِ تمانع“ کے عنوان کے ماتحت تفصیل کے ساتھ وضاحت کر چکے ہیں۔
۴۔ خداوندیگانہ کی طرف انبیاء کی عمومی دعوت: اثباتِ توحید کے لیے یہ ایک اور دلیل ہے کیونکہ اگر عالم میں دو واجب الوجود ہوتے تو دونوں کو ہی منبعِ فیض ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ ایک بے نہایت کامل وجود کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی نور افشانی میں بخل کرے، کیونکہ وجود کامل کے لیے عدمِ فیض نقص ہے، اور اس کے حکیم ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سب کو اپنا فیض پہنچائے۔

اس فیض کی دو شاخیں ہیں۔ (عالمِ خلقت میں) فیضِ تکوینی، اور (عالمِ ہدایت میں) فیضِ تشریعی۔ اس بناء پر اگر متعدد خدا ہوتے تو ضروری تھا کہ ان کی طرف سے بھی پیغمبر اور رسول آتے، اور ان کے فیضِ تشریعی سب کو پہنچاتے۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزند گرامی امامِ مجتہبی علیہ السلام کے وصیت نامہ میں فرماتے ہیں: ”و اعلم یا بنی انہ لو کان لربک شریک لا تتک رسلہ و لرایت اثار ملکک و سلطانہ، و لعرفت افعالہ و صفاتہ، و لکنہ الہ واحد کما وصف نفسہ۔“ ”اے بیٹا! جان لو کہ اگر تیرے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھیجے ہوئے نمائندے تیرے پاس آتے، اور تو اس کے ملک و سلطنت کے آثار کا بھی مشاہدہ کرتا، اور تو اس کی صفات و افعال سے بھی آشنا ہوتا، لیکن وہ ایک اکیلا معبود ہے، جیسا کہ خود اس نے اپنی توصیف فرمائی ہے“ (۱)

یہ سب اس کی ذات کی یکتائی کے دلائل ہیں۔ باقی رہا اس کی ذاتِ پاک میں ہر قسم کی ترکیب و اجزاء کے نہ ہونے کی دلیل تو وہ روشن و واضح ہے کیونکہ اگر اس کے لیے اجزائے خارجہ ہوں تو طبعاً وہ ان کا محتاج ہوگا، اور واجب الوجود کے لیے محتاج ہونا معقول نہیں ہے۔ اور اگر ”اجزائے عقیلہ“ (ماہیت و وجود یا جنس و فصل کی ترکیب) مراد ہو، تو وہ بھی محال ہے، کیونکہ ماہیت و وجود سے ترکیب اس کے محدود ہونے کی فرع ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اس کا وجود

غیر محدود ہے، اور جنس و فصل کی ترکیب ماہیت رکھنے کی فرع ہے، لیکن وہ ذات جس کی کوئی ماہیت نہیں ہے، اس کی جنس و فصل بھی نہیں ہے۔

توحید کی اقسام

عام طور پر توحید کی چار اقسام بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ توحید ذات:

(جس کی اوپر تشریح کی گئی ہے)

۲۔ توحید صفات:

یعنی اس کی صفات اس کی ذات سے الگ نہیں ہے اور ایک دوسرے سے بھی جدا نہیں ہے، مثلاً ہمارا ”علم“ و ”قدرت“ دو الگ الگ صفات ہیں جو ہماری ذات پر عارض ہیں، ہماری ذات ایک الگ چیز ہے اور ہمارا علم و قدرت دوسری چیزیں ہیں جیسا کہ ”علم“ و ”قدرت“ بھی ہم میں ایک دوسرے سے جدا ہے۔ ہمارے علم کا مرکز ہماری روح ہے، جب کہ ہماری قدرت جسمانی کا مرکز ہمارے بازو اور عضلات ہیں لیکن خدا میں نہ اس کی صفات اس کی ذات پر زائد ہیں اور نہ ہی وہ ایک دوسرے سے جدا ہیں بلکہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو سارا کا سارا علم ہے، سارا کا سارا قدرت ہے اور سب کا سب ازلیت و ابدیت ہے۔

اگر اس کے علاوہ صورت ہو تو اس کا لازمہ ترکیب ہے اور اگر وہ مرکب ہوگا تو اجزاء کا محتاج ہوگا، اور محتاج چیز ہر گز واجب الوجود نہیں ہوتی۔

۳۔ توحید افعالی:

یعنی ہر وجود، ہر حرکت، اور ہر حرکت جو دنیا میں ہو رہی ہے اس کی بازگشت خدا کی پاک ذات کی طرف ہے، وہی مسبب الاسباب ہے اور اس کی پاک ذات ہی علت العلل ہے، یہاں تک کہ وہ افعال بھی جو ہم سے سرزد ہوتے ہیں ایک معنی میں اسی کے افعال ہیں، چونکہ اسی نے ہمیں قدرت و اختیار اور ارادہ کی آزادی فرمائی ہے۔ اس بناء پر ہم اپنے افعال کے فاعل اور ان کے مقابلہ میں مسئول و جواب دہ ہونے کے باوجود ایک لحاظ سے فاعل خدا ہی ہے، کیونکہ

ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب اسی کی طرف سے ہے۔ (لا موثر فی الوجود الا اللہ) (عالم وجود میں خدا کے سوا کوئی موثر نہیں ہے)۔

۴۔ توحید در عبادت :

یعنی صرف اس کی عبادت کرنا چاہیئے اور اس کا غیر لائق عبادت نہیں ہے، کیونکہ عبادت ایسی ذات کی ہونا چاہیئے جو کمال مطلق اور مطلق کمال ہے، جو سب سے بے نیاز اور تمام نعمتوں کا بخشنے والا، اور تمام موجودات کا پیدا کرنے والا ہے، اور یہ صفات اس کی پاک ذات کے سوا کسی میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ عبادت کا اصلی مقصد اس کمال مطلق اور بے پایاں ہستی کا قرب حاصل کرنا اور اس کی صفات جمال و کمال کو اپنی روح کے اندر منعکس کرنا ہے، جس کا نتیجہ ہو اوہوس سے دوری اور تہذیب نفس اور خود سازی کی طرف رخ کرنا ہے۔

یہ ہدف اور مقصد ”اللہ“ کی عبادت کے بغیر، جو وہی کمال مطلق ہے، امکان پذیر نہیں ہے۔

۱۔ ”نبج البلاغۃ“ وصیت امام مجتبیٰ (حصہ خطوط و خط ۳۱)۔

۳۔ توحید افعال کی اقسام

پھر توحید افعال کی بھی بہت سی اقسام ہیں جن میں سے ہم یہاں چھ اہم ترین اقسام کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ توحید خالقیت:

جیسا کہ قرآن کہتا ہے: قل اللہ خالق کل شیء: ”کہہ دیجئے خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے“ (رعد - ۱۶) اس کی دلیل بھی واضح ہے، جب گزشتہ دلائل سے ثابت ہو گیا کہ واجب الوجود ایک ہی ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز ممکن الوجود ہے تو اس بناء پر تمام موجودات کا خالق بھی ایک ہی ہوگا۔

۲۔ توحید ربوبیت:

یعنی عالم ہستی کا مدبر و مدیر، مربی اور اس کا نظام بخش صرف خدا ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ﴿قُلْ اَغِيْرَ اللّٰهِ اَبْغٰی رَبًّا ۚ وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۚ﴾ ”کہہ دیجئے کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا پروردگار مان لوں حالانکہ ہر چیز کا پروردگار وہی ہے“؟ (انعام - ۱۶۴)

اس کی دلیل بھی واجب الوجود کی وحدت اور عالم ہستی میں خالق کی توحید ہے۔

۳۔ توحید تشریع و قانون گزاری:

جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ﴾: ”جو شخص اس کے مطابق حکم نہیں کرتا، جو خدا نے نازل کیا ہے، وہ کافر ہے۔“ (مائدہ - ۴۴)

کیونکہ جب ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ مدبر و مدیر وی ہے، جو مسئلہ طور پر اس کے غیر میں قانون گزاری کی صلاحیت نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کے غیر کا تدبیر عالم میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ لہذا وہ نظام تکوین سے ہم آہنگ قوانین وضع نہیں کر سکتا۔

۴۔ توحید در مالکیت:

چاہے ”حقیقی مالکیت“ ہو، یعنی کسی چیز پر تکوینی تسلط، یا ”حقوقی مالکیت“ ہو، یعنی کسی چیز پر قانونی تسلط، یہ سب اسی کے لیے ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ﴿وَاللّٰهُ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ”آسمانوں اور زمین کی مالکیت حاکمیت خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ (آل عمران - ۱۸۹)

اور یہ بھی فرماتا ہے: ﴿وَانْفَقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ ”خدا نے جن اموال میں تمہیں اپنا نمائندہ قرار دیا ہے، ان میں سے (راہ خدا) میں خرچ کرو۔“ (حدید - ۷)

اس کی دلیل بھی وہی توحید در خالقیت ہے۔ جب تمام اشیاء کا خالق وہی ہے، تو طبعاً تمام چیزوں کی مالک بھی اسی کی ذات مقدس ہے، اس بناء پر ہر ملکیت کا سرچشمہ اسی کی مالکیت کو ہونا چاہیئے۔

۵۔ توحید حاکمیت

یقیناً انسانی معاشرہ حکومت کا محتاج ہے، کیونکہ اجتماعی زندگی حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ذمہ داریوں کی تقسیم، پروگراموں کی تنظیم، مدیریتوں کا اجراء اور تجاوزات کو روکنا، صرف حکومت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ایک طرف تو انسانوں کی اصل آزادی یہ کہتی ہے کہ کوئی شخص کسی شخص پر حق حکومت نہیں رکھتا مگر جسے اصل مالک اور حاکم حقیقی اجازت دے، اور یہی وجہ ہے کہ ہم ہر اس حکومت کو جو حکومت الہی پر منتهی نہیں ہوتی مردود سمجھتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہم حکومت کی مشروعیت کو صرف پیغمبر کے بعد ائمہ معصومین کے لیے اور ان کے بعد فقیہ جامع الشرائط کے لیے جانتے ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ لوگ کسی کو یہ اجازت دے دیں کہ وہ ان پر حکومت کرے، لیکن چونکہ پورے معاشرے کے تمام افراد کا اتفاق عادتاً ممکن نہیں ہے، لہذا عملی طور پر اس قسم کی حکومت ممکن نہیں ہے۔^(۱) البتہ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ توحید ربوبیت عالم تکوین کے ساتھ مربوط ہے اور توحید قانون گزاری و حکومت کا تعلق عالم تشریع کے ساتھ ہے۔

قرآن مجید کہتا ہے: ﴿اِنَّ الْحَكْمَ لِلّٰهِ﴾ ”حکم اور حکومت کرنا صرف خدا کے لیے ہے۔“ (انعام - ۵۷)

۶۔ توحید اطاعت

یعنی جہان میں واجب الاطاعت ہونے کا مقام صرف خدا کی ذات پاک کے لیے ہے اور ہر دوسرے مقام کی اطاعت کی مشروعیت کا سرچشمہ یہیں سے ہونا چاہیئے، یعنی اس کی اطاعت بھی خدا ہی کی اطاعت شمار ہوگی۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے۔ جب حاکمیت اسی کے ساتھ مخصوص ہے، تو مطاع ہونا بھی اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسی لیے ہم انبیاء کی اطاعت، ائمہ معصومین کی اطاعت اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کو بھی خدا ہی کی اطاعت کا پر تو شمار کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَ اطِيعُوا الرَّسُولَ وَ اطِيعُوا أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾:

”اے ایمان لانے والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور صاحبانِ امر (ائمہ معصومین) کی اطاعت کرو۔ (نساء ۵۹)

البتہ اوپر والے مباحث میں سے ہر ایک کے لیے بہت ہی زیادہ شرح و بسط کی ضرورت ہے اور ہم نے اس بناء پر کہ ہم بحث تفسیری سے خارج نہ ہو جائیں، انہیں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔
خدا وندا! ہمیں ساری عمر توحید کے راستہ پر ثابت قدم رکھ۔

پروردگار! شرک کی شاخیں بھی توحید کی شاخوں کی طرح بہت زیادہ ہیں، اور تیرے لطف کے بغیر شرک سے نجات ممکن نہیں ہے۔ تو ہمیں اپنے لطف کا مشمول قرار دے۔
بارالہا! ہمیں توحید کے ساتھ زندہ رکھنا اور توحید کے ساتھ ہی ہمیں موت دینا، اور حقیقت توحید کے ساتھ ہمیں محشور کرنا۔

آمین یا رب العالمین۔

۱۔ اس بناء پر اگر کوئی حکومت عوام اور اکثریت کی رائے سے معین ہو تو ضروری ہے کہ وہ فقیہ جامع الشرائط کے ذریعے نافذ ہو، تاکہ وہ مشروعیت الہیہ پیدا کر سکے۔

سورہ الفلق

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۵ آیات ہیں۔

سورہ ”فلق“ کے مطالب

ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اگرچہ مفسرین کی ایک دوسری جماعت اسے ”مدنی“ سمجھتی ہے۔ اس سورہ کے مطالب ایسی تعلیمات ہیں جو خدا نے پیغمبر کو بالخصوص، اور سب مسلمانوں کو بالعموم، تمام اشرار کے شر سے، اس کی ذات پاک سے پناہ مانگنے کے سلسلہ میں دی ہیں تاکہ خود کو اس کے سپرد کر دیں اور اس کی پناہ میں ہر صاحب شر موجود کے شر سے امان میں رہیں۔ اس سورہ کے شان نزول کے بارے میں اکثر کتب تفاسیر میں کچھ روایات نقل ہوئی ہیں جن کے مطابق بعض یہودیوں نے پیغمبر اکرم پر جادو کر دیا تھا، جس سے آپ بیمار ہو گئے تھے۔ جبرئیل نازل ہوئے اور جس کنویں میں جادو کے آلات چھپائے ہوئے تھے اس جگہ کی نشان دہی کی، اسے باہر نکالا گیا، پھر اس سورہ کی تلاوت کی تو پیغمبر کی حالت بہتر ہو گئی۔ لیکن مرحوم طبرسی اور بعض دوسرے محققین نے اس قسم کی روایات کو، جن کی سند صرف ”ابن عباس (رض)“ اور عائشہ (رض) تک منتهی ہوتی ہے، قابل اعتراض سمجھا ہے اور درست قرار نہیں دیا، کیونکہ:

اولاً۔ یہ سورہ مشہور قول کے مطابق مکی ہے اور اس کا لب و لہجہ بھی مکی سورتوں والا ہے، جب کہ پیغمبر کا یہودیوں سے واسطہ مدینہ میں پڑا اور خود یہی بات اس قسم کی روایات کی عدم اصالت کی ایک دلیل ہے۔ دوسری طرف اگر پیغمبر اکرم پر جادو گر اتنی آسانی کے ساتھ جادو کر لیا کریں کہ وہ بیمار پڑ جائیں اور بستر علالت پر دراز ہو جائیں تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آپ کو آپ کے عظیم ہدف اور مقصد سے آسانی روک دیں۔ مسلمہ طور پر وہ خدا جس نے آپ کو اس قسم کی ماموریت اور عظیم رسالت کے لیے بھیجا ہے، وہ آپ کو جادو گروں کے جادو کے نفوذ سے بھی محفوظ رکھے گا تاکہ نبوت کا بلند مقام ان کے ہاتھ میں بازیجہ اطفال نہ بنے۔

سوم۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ جادو پیغمبر کے جسم میں اثر انداز ہو سکتا ہے، تو پھر ممکن ہے کہ لوگوں کے ذہن میں یہ وہم پیدا ہو جائے کہ جادو آپ کی روح میں بھی اثر انداز ہو سکتا ہے، اور یہ ممکن ہے کہ آپ کے افکار جادو گروں کا شکار ہو جائے۔ یہ معنی پیغمبر اسلام پر اعتماد کی اصل کو عام لوگوں کے افکار میں متزلزل کر دیں گے۔

اس لیے قرآن مجید اس معنی کی نفی کرتا ہے کہ پیغمبر پر جادو کیا گیا ہو، فرماتا ہے: ﴿وَقَالَ الظَّالِمُونَ اِنْ تَتَّبِعُونَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا اَنْظِرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ اَمْثَالَ فَضْلُوْا فَلَا يَسْتَطِيعُوْنَ سَبِيْلًا﴾ ”اور ظالموں نے کہا تم ایک مسح زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو، دیکھو تو سہی! تیرے لیے انہوں نے کیسی کیسی مثالیں بیان کی ہیں اور ایسے گمراہ ہوئے ہیں کہ راستہ پا ہی نہیں سکتے۔“ (فرقان - ۸، ۹)

”مسحور“ چاہے یہاں اس شخص کے معنی میں ہو جس پر عقلی لحاظ سے جادو کیا گیا ہو یا اس کے جسم پر، دونوں صورتوں میں ہمارے مقصود پر دلالت کرتا ہے۔ بہر حال ایسی صورت مشکوک روایات کے ساتھ مقام نبوت کی قدرت پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی فہم آیات کے لیے ان پر تکیہ کیا جاسکتا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت میں پیغمبر اکرم سے نقل ہوا ہے، آپ نے فرمایا:

”انزلت علی آيات لم ينزل مثلهن: المعوذتان:“

”مجھ پر ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ ان کی مثل اور مانند اور نازل نہیں ہوئیں، اور وہ دو سورتیں ”فلق“ اور ”ناس“ ہیں۔“ (۱) ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

”جو شخص نماز ”وتر“ میں سورہ ”فلق“ و ”ناس“ اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کو پڑھے گا، تو اس کو یہ کہا جائے گا کہ اے بندہ خدا تجھے بشارت ہو، خدا نے تیری نماز وتر قبول کر لی ہے۔“ (۲) ایک اور روایت میں پیغمبر اکرم سے بھی آیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا: ”کیا تو چاہتا ہے کہ میں تجھے ایسی دو سورتوں کی تعلیم دوں جو قرآن کی سورتوں میں سب سے زیادہ افضل و برتر ہیں؟ اس نے عرض کیا: ہاں! اے رسول اللہ۔ تو حضرت نے اسے معوذتین (سورہ فلق و ناس) کی تعلیم دی۔ اس کے بعد ان دونوں کی نماز صبح میں قرات کی اور اس سے فرمایا، جب تو بیدار ہو یا سونے لگے تو ان کو پڑھا کر۔“ (۳) یہ بات واضح ہے کہ یہ سب کچھ ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی روح و جان اور عقیدہ و عمل کو اس کے مطالب کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔

۱۔ ”تور الثقلین“ جلد ۵ ص ۷۱۶ و ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۵۶۷۔ ”تور الثقلین“ جلد ۵ ص ۷۱۶ و ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۵۶۷۔

۳۔ ”تور الثقلین“ جلد ۵ ص ۷۱۶ و ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۵۶۷۔

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ ۲۔ ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾ ۳۔ ﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ﴾

۴۔ ﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفَّٰثِۃِ فِی الْعُقَدِ﴾ ۵۔ ﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ﴾

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ کہہ دیجئے میں سفیدہ صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

۲۔ ان تمام چیزوں کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہیں۔

۳۔ اور ہر مزامت کرنے والے موجود کے شر سے جب کہ وہ وارد ہو۔

۴۔ اور ان کے شر سے جو گرہوں میں دم کرتے ہیں۔ (اور ہر طرح کے ارادہ کو کمزور کر دیتے ہیں)۔

۵۔ اور ہر حسد کرنے والے کے حسد سے جب وہ حسد کرے۔

میں سفیدہ صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

قرآن اس سورہ کی پہلی آیت میں خود پیغمبر کو ایک نمونہ اور پیشوا کے عنوان سے اس طرح حکم دیتا ہے: کہہ دیجئے، میں

سفیدہ صبح کے پروردگار سے پناہ مانگتا ہوں جو رات کی سیاہی کو چیر دیتا ہے۔ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾۔ ان تمام چیزوں

کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہیں۔ ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾۔

تمام شریر موجودات کے شر سے، شریر انسانوں سے، جنوں، حیوانات، شر کے پیش آنے والے واقعات اور نفسِ امّارہ

کے شر سے۔ ”فلق“ (بروزن شفق) ”فلق“ (بروزن خلق) کے مادہ سے اصل میں کسی چیز میں شگاف کرنے اور ایک کو

دوسرے سے جدا کرنے کے معنی میں ہے، اور چونکہ سفیدہ صبح کے پھوٹنے کے وقت رات کا سیاہ پردہ چاک ہو جاتا ہے

۔ لہذا یہ لفظ طلوع صبح کے معنی میں استعمال ہوا۔ جیسا کہ ”فجر“ کا بھی اسی مناسبت سے طلوع صبح پر اطلاق ہوتا ہے

بعض اسے تمام موالید اور تمام زندہ موجودات کے معنی میں سمجھتے ہیں، چاہے وہ انسان ہو یا حیوان و نباتات کیونکہ ان موجودات کا پیدا ہونا، جو دانہ یا گٹھلی وغیرہ کے شگافتہ ہونے سے صورت پذیر ہوتا ہے، وجود کے عجیب ترین مراحل میں سے ہے اور حقیقت میں تولد کے وقت اس موجود میں ایک عظیم تحرک رونما ہوتا ہے اور وہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں قدم رکھتا ہے۔

سورۃ انعام کی آیہ ۹۵ میں آیا ہے: ”ان الله فالحب والنوى يخرج الحى من الميت و يخرج الميت من الحى“ ”خدا دانہ اور گٹھلی کا شگافتہ کرنے والا ہے، جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے خارج کرتا ہے۔“ بعض نے ”فلق“ کے مفہوم کو اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں لیا ہے اور اس کا ہر قسم کی آفرینش و خلقت پر اطلاق کیا ہے، کیونکہ ہر موجود کی آفرینش و خلقت سے عدم کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، اور وجود کا نور ظاہر و آشکار ہو جاتا ہے۔ ان تینوں معانی (طلوع صبح، زندہ موجودات کا تولد، اور ہر موجود کی خلقت و آفرینش) میں سے ہر ایک عجیب و غریب وجود میں آنے والی چیز ہے جو پروردگار اور اس کے خالق و مدبر کی عظمت کی دلیل ہے، اور اس وصف کے ساتھ خدا کی توصیف ایک عمیق مفہوم و مطلب رکھتی ہے۔

بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ: ”فلق“ دوزخ میں ایک کنواں یا زندان ہے، اور وہ جہنم کے وسط میں ایک شگاف کی مانند دکھائی دیتا ہے۔

یہ روایت ممکن ہے اس کے مصداق میں سے ایک مصداق کی طرف اشارہ ہو، لیکن یہ ”فلق“ کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کرتی۔ ”من شر ما خلق“ کی تعبیر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آفرینش و خلقت الہی ذات میں کوئی شر رکھتی ہے کیونکہ آفرینش خلقت تو ایک ایجاد ہی ہے، ورا ایجاد وجود خیر محض ہے، قرآن کہتا ہے: ﴿الذی احسن کل شیء خلقه﴾ ”وہی خدا جس نے چیز کو بھی پیدا کیا بہتر اور زیادہ سے زیادہ اچھا کر کے پیدا کیا“ (الم سجدہ - ۷)

بلکہ شر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مخلوقات قوانین آفرینش سے منحرف ہو جائیں اور معینہ راستے سے الگ ہو جائیں۔ مثلاً ڍٲک جانوروں کے کاٹنے والے دانت ایک دفاعی حربہ ہیں، جنہیں وہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں استعمال کرتے ہیں اب اگر یہ ہتھیار اپنے موقع و محل پر ہوں تو خیر ہی خیر ہیں، لیکن اگر یہ بے موقع اور دوست ہی کے مقابلہ میں استعمال ہونے لگیں تو پھر شر اور برائی ہیں۔

بہت سے ایسے امور ہیں، جنہیں ہم ظاہر میں شرمسجھتے ہیں، لیکن وہ باطن میں خیر ہیں، مثلاً بیدار کرنے والے اور ہوشیار و خبردار کرنے والے حوادث بلائیں اور مصائب، جو انسان کو خواب غفلت سے بیدار کر کے خدا کی طرف متوجہ کرتے ہیں، یہ مسلمہ طور پر شر نہیں ہیں۔

اس کے بعد اس مطلب کی توضیح و تفسیر میں مزید کہتا ہے: ”اور ہر مزاحمت کرنے والے موجود کے شر سے جب کہ وہ وارد ہوتا ہے۔“ ﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ﴾۔

”غاسق“ ”غسق“ (بروزن شفق) کے مادہ سے ”مفردات“ میں ”راغب“ کے قول کے مطابق، رات کی ظلمت کی اس شدت کے معنی میں ہے جو آدھی رات کے وقت ہوتی ہے، اسی لیے قرآن مجید نماز مغرب کے اختتام کے وقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: الی غسق اللیل، اور یہ جو لغت کی بعض کتابوں میں ”غسق“ کی آغاز شب کی تاریکی کے معنی میں تفسیر ہوئی ہے، بعید نظر آتا ہے، خصوصاً جب کہ اس کا اصلی ریشہ اور جڑ، امتلاء (پُر ہونے) اور بہنے کے معنی میں ہے، اور مسلمہ طور پر رات کی تاریکی اس وقت زیادہ یعنی پُر اور لبریز ہوتی ہے جب آدھی رات ہو جائے۔ اس کے مفہیم میں سے ایک، جو اس کا معنی کا لازمہ ہے، ہجوم کرنا اور حملہ آور ہونا ہے، اس لیے یہ معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

اس بناء پر زیر بحث آیت میں ”غاسق“ کا معنی یا تو حملہ کرنے والا شخص ہے، یا ہر وہ شریر موجود ہے جو حملہ کرنے کے لیے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتا ہے، کیونکہ نہ صرف درندے اور ڈنک مارنے والے جانور ہی رات کے وقت اپنے بلوں اور ٹھکانوں سے باہر نکل آتے ہیں، بلکہ شریر و ناپاک اور پلید افراد بھی اپنے برے مقاصد کے لیے عام طور پر رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

”وقب“ (بروزن شفق) ”وقب“ (بروزن نقب) کے مادہ سے گڑھے اور خندق کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس کا فعل گڑھے میں داخل ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ گویا شریر اور نقصان پہنچانے والے موجودات رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نقصان پہنچانے والے گڑھے کھود کر اپنے پلید اور گندے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اقدام کرتے ہیں۔ یا یہ ہے کہ یہ تعبیر ”نفوذ کرنے“ کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اور ان کے شر سے جو گرہوں میں دم کرتے ہیں۔“ ﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ﴾۔

”نفاثات“ ”نفث“ (بروزن جس) کے مادہ سے اصل میں تھوڑی سی مقدار میں تھوکنے کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ یہ کام پھونک مارنے کے ساتھ انجام پاتا ہے، لہذا ”نفث“ ”نفخ“ (پھونکنے اور دم کرنے) کے معنی میں آیا ہے۔ لیکن بہت سے مفسرین نے ”نفاثات“ کی ”جادوگر عورتوں“ کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ (نفاثات جمع مونث ہے اور اس کا مفرد ”نفاثہ“ ”نفث“ کے مادہ سے صیغہ مبالغہ ہے) وہ عورتیں کچھ اوارڈ پڑھتی تھیں اور گمراہوں پر دم کیا کرتی تھیں اور اس طرح سے وہ کرتی تھیں، لیکن کچھ لوگ اسے وسوسے پیدا کرنے والی عورتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ جو مسلسل مردوں کے، خصوصاً جو اپنے شوہروں کے کان بھرتی رہتی تھیں، تاکہ ثبوت کاموں کے انجام دینے میں ان کی آہنی عزم کو کمزور کر دیں اور اس قسم کی عورتوں کے وسوسوں نے طول تاریخ میں کیسے کیسے حوادث پیدا کیے، کیسی کیسی آگ بھڑکائی، اور کیسے کیسے استوار و مضبوط ارادوں کو کمزور کر کے رکھ دیا۔

”فخر رازی“ کہتا ہے: عورتیں مردوں کے دلوں میں اپنی محبت کے نفوذ کی بناء پر تصرف کر لیتی ہیں۔^(۱) یہ معنی ہمارے زمانہ میں ہر وقت سے زیادہ ظاہر ہے کیونکہ دنیا کے سیاست دانوں میں جاسوسوں کے نفوذ کرنے کا ایک اہم ترین ذریعہ جاسوسہ عورتوں سے فائدہ اٹھانا ہے، کیونکہ ان ”**نفاثات فی العقد**“ کے ذریعے پوشیدہ بھیدوں کے صندوقوں کے تالے کھل جاتے ہیں اور وہ انتہائی مرموز اور پوشیدہ مسائل سے باخبر ہو جاتی ہیں، اور انھیں دشمن کے حوالے کر دیتی ہیں۔

بعض نے نفاثات کی ”نفوس شریرہ“ یا ”وسوسے پیدا کرنے والی جماعتوں“ کے ساتھ بھی تفسیر کی ہے جو اپنے مسلسل پروپیگنڈوں کے ذریعے پختہ ارادوں کی گمراہوں کو کمزور کر دیتے ہیں۔

بعید نہیں ہے کہ یہ آیت ایک عام اور جامع مفہوم رکھتی ہو جو ان تمام معانی کو شامل ہو، یہاں تک کہ سخن چینی کرنے والوں اور چغل خوروں کی باتوں کو بھی، جو محبت کے مراکز کو سست، کمزور اور ویران کر دیتے ہیں۔

البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ سابقہ شان نزول سے قطع نظر، آیت میں کوئی ایسی نشانی موجود نہیں ہے کہ اس سے خصوصیت کے ساتھ جادو گروں کا جادو مراد ہو اور بالفرض اگر ہم آیت کی اس طرح تفسیر بھی کریں، تو بھی یہ اس شان نزول کی صحت پر دلیل نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ پیغمبر اکرم جادو گروں کے شر سے خدا کی پناہ مانگ رہے ہیں۔ اسی طرح سے جیسے صحیح و سالم افراد سرطان کی بیماری سے پناہ مانگتے ہیں، چاہے وہ ہرگز بھی اس میں مبتلا نہ ہوئے۔

ہوں۔

اس سورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے: اور ہر حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔ ﴿ومن شر حاسد

اذا حسد﴾۔

یہ آیت اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ حسد بدترین اور قبیح ترین صفاتِ رذیلہ میں سے ہے، کیونکہ قرآن نے اسے درندہ جانوروں، ڈسنے والے سانپوں اور وسوسے ڈالنے والے شیاطین کے کاموں کے ساتھ قرار دیا ہے

۱۔ ”تفسیر فخر رازی“ جلد ۳۲ ص ۱۹۶

۱۔۔ شر و فساد کے اہم ترین سرچشمے

اس سورہ کے آغاز میں پیغمبر اکرم کو حکم دیتا ہے کہ وہ تمام شریر مخلوقات کے شر سے خدا کی پناہ مانگیں، اس کے بعد اس کی وضاحت میں تین قسم کے شروں کی طرف اشارہ کرتا ہے:

۱۔ ان تاریک دل حملہ کرنے والوں کے شر سے جو تاریکیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حملہ آور ہوتے ہیں۔

۲۔ ان وسوسہ پیدا کرنے والوں کے شر سے جو اپنی باتوں اور برے پروپیگنڈوں سے، ارادوں، ایمانوں، عقیدوں، محبتوں اور رشتوں کو سست اور کمزور کر دیتے ہیں۔

۳۔ اور حسد کرنے والوں کے شر سے۔

اس اجمال و تفصیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شرور و آفات کا سرچشمہ یہی ہیں، اور شر و فساد کے اہم ترین منابع یہی تینوں ہیں۔ اور یہ بات بہت ہی پُر معنی اور قابل غور ہے۔

۲۔ آیات کا تناسب

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس سورہ کی پہلی آیت میں پیغمبر اکرم کو حکم دیتا ہے کہ شر والی تمام موجودات کے شر سے ”فلق“ کے پروردگار سے پناہ مانگ۔ ”رب فلک“ کا انتخاب شاید اس بناء پر ہے کہ شریر موجودات، سلامتی و ہدایت کے نور اور روشنی کو منقطع کر دیتے ہیں، لیکن فلک کا پروردگار ظلمتوں اور تاریکیوں کو شگافتہ کرنے والا ہے

۳۔ جادو کی تاثیر

ہم نے پہلی جلد میں، سورہ بقرہ کی آیہ ۱۰۲ و ۱۰۳ کے ذیل میں، گزشتہ اور موجود زمانہ میں جادو کی حقیقت کے بارے میں، اور اسلام کی نظر میں جادو کے حکم، اور اس کے اثر کرنے کی کیفیت کے سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے، اور ان مباحث میں ہم نے جادو کی تاثیر کو اجمالی طور پر قبول کیا ہے، لیکن اس صورت میں نہیں، جیسا کہ خیالی پلاؤ پکانے والے، اور ہیودہ لوگ اس کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ زیادہ وضاحت کے لیے اسی بحث کی طرف رجوع کریں۔

لیکن وہ نکتہ جس کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہے یہ ہے کہ اگر وہ زیر بحث آیات میں پیغمبر اکرم کو یہ حکم دے رہا ہے کہ جادو گروں کے جادو یا اس کے مانند چیزوں سے خدا کی پناہ مانگو تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ پیغمبر پر انہوں نے جادو کر دیا تھا۔ بلکہ اس کی ٹھیک مثال یہ ہے کہ پیغمبر کی غلطی اور خطا و گناہ سے بھی خدا کی پناہ مانگتے تھے۔ یعنی خدا کے لطف سے استفادہ کرتے ہوئے ان خطرات سے بچے رہیں۔ اور خدا کا لطف نہ ہوتا تو آپ پر جادو کے اثر کرنے کا امکان تھا یہ بات تو ایک طرف رہی۔

دوسری طرف ہم پہلے بھی یہ بیان کر چکے ہیں کہ اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ ﴿النفا ثات فی العقد﴾ سے مراد جادو گر ہوں۔

۴۔ حاسدوں کا شر

”حسد“ ایک بری شیطانی عادت ہے جو مختلف عوامل جیسے ایمان کی کمزوری، تنگ نظری اور بخل کی وجہ سے انسان میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا مطلب دوسرے شخص کی نعمت کے زوال کی درخواست اور آرزو کرنا ہے حسد بہت سے گناہان کبیرہ کا سرچشمہ ہے۔

حسد، جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے، انسان کے ایمان کو کھا جاتا ہے اور اسے ختم کر دیتا ہے، جیسا کہ آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

”ان الحسد لیأکل الایمان کما تأکل النار الحطب“^(۱)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

”أفة الدین الحسد والعجب والفجر“

”حسد“ ”خود کو بڑا سمجھنا“ اور ایک دوسرے پر ”فخر“ کرنا، دین کے لیے آفت ہے۔^(۲)

اس کی وجہ یہ ہے کہ حسد کرنے والا حقیقت میں خدا کی حکمت پر اعتراض کرتا ہے کہ اس نے کچھ افراد کو نعمت سے کیوں نوازا ہے؟ اور انہیں اپنی عنایت کا مشمول کیوں قرار دیا ہے؟ جیسا کہ سورہ نساء کی آیہ ۵۴ میں آیا ہے: ﴿إِمْ یحسدون

الناس علی ما أھم اللہ من فضلہ﴾۔

حسد کا معاملہ ممکن ہے کہ اس حد تک پہنچ جائے کہ محسود سے نعمت کے زوال کے لیے حاسد خود کو پانی اور آگ تک میں ڈال کر نابود کر لے، جیسا کہ اس کے نمونے داستانوں اور تواریخ میں مشہور ہیں۔

حسد کی مذمت میں بس یہی کافی ہے کہ دنیا میں جو سب سے پہلا قتل ہوا وہ ”قابیل“ کی طرف سے ”ہابیل“ پر ”حسد“ کرنے کی وجہ سے ہوا تھا۔

”حسد کرنے والے“ ہمیشہ ہی انبیاء و اولیاء کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے رہے ہیں، اسی لیے قرآن مجید پیغمبر کو یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ حاسدوں کے شر سے خدا اور رب فلق سے پناہ مانگیں۔

اگرچہ اس سورہ میں اور بعد والے سورہ میں خود پیغمبر کی ذات مخاطب ہے، لیکن مسئلہ طور پر اس سے نمونہ اور اسوہ مراد ہے، اور سب لوگوں کو حاسدوں کے شر سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

خدا وندا! ہم بھی حاسدوں کے شر سے تیری مقدس ذات سے پناہ مانگتے ہیں۔

پروردگارا! ہم تجھ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ تو ہمیں بھی دوسروں پر حسد کرنے سے محفوظ رکھ۔

بارالہا! ہمیں نفاثات فی العقد اور راہ حق میں وسوسے ڈالنے والوں کے شر سے بھی محفوظ رکھ۔

امین یا رب العالمین

۱۔ ”بحار الانوار“ جلد ۷۳، ص ۲۳۷

۲۔ ”بحار الانوار“ جلد ۷۳، ص ۲۴۸

سورہ الناس

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس میں ۶ آیات ہیں۔

سورہ الناس کے مطالب

انسان ہمیشہ انسانی و سوسوں کی زد میں ہے اور شیاطین جن و انس کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ اس کے قلب و روح میں نفوذ کریں۔ انسان کا مقام علم میں جتنا بالا ہوتا جاتا ہے اور اس کی حیثیت اجتماع اور معاشرے میں جتنی بڑھتی جاتی ہے، شیاطین کے و سوسے اتنے ہی زیادہ شدید ہوتے چلے جاتے ہیں، تاکہ اس کو راہ حق سے منحرف کر دیں اور ایک دانش ور عالم کے فساد و خرابی سے سارے جہان کو تباہ و برباد کر ڈالیں۔

یہ سورہ پیغمبر اکرم کو ایک نمونہ و اسوہ کے طور پر اور پیشوا اور رہبر کی حیثیت سے یہ حکم دے رہی ہے کہ تمام و سوسے ڈالنے والوں کے شر سے خدا کی پناہ طلب فرمائیں۔

اس سورہ کے مطالب ایک لحاظ سے سورہ ”فلق“ سے مشابہ ہیں، اور دونوں میں ہی شرور و آفات سے خداوند بزرگ کی پناہ مانگنے کو بیان کیا گیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ سورہ فلق میں شرور کے مختلف انواع و اقسام بیان کیے گئے ہیں، لیکن اس سورہ میں صرف نظر نہ آنے والے و سوسہ گروں (وسواس الخناس) پر تکیہ ہوا ہے۔

اس بارے میں بھی کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا ہے یا مدینہ میں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ اسے ”مکی“ سمجھتا ہے جب کہ دوسری جماعت اسے ”مدنی“ شمار کرتی ہے۔ لیکن اس کی آیات کا لب و لہجہ ”مکی“ سورتوں سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ روایات کے مطابق یہ سورہ اور سورہ فلق اکٹھے نازل ہوئے ہیں، اور سورہ فلق ایک کثیر جماعت کے نظریہ کے مطابق مکی ہے چنانچہ بہت ممکن ہے کہ یہ سورہ مکی ہی ہو۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم سخت بیمار پڑ گئے تو (خدا کے دو عظیم فرشتے) جبریل و میکائیل آپ کے پاس آئے۔ جبریل تو پیغمبر

کے سر کی طرف بیٹھ گئے اور میکائیل پاؤں کی طرف۔ جبرائیل نے سورہ ”فلق“ کی تلاوت اور پیغمبر اکرم کو اس کے ذریعے خدا کی پناہ میں دے دیا اور میکائیل نے سورہ ”﴿قل اعوذ برب الناس﴾“ کی تلاوت کی۔^(۱)

ایک روایت میں جو امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی اور ہم اس کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، یہ آیا ہے کہ :

”جو شخص نماز و قمر میں ”معوذتین“ (سورہ فلک و ناس) اور ”﴿قل هو الله احد﴾“ کی تلاوت کرے گا تو اس سے کہا جائے گا، اے بندہ خدا! تجھے بشارت ہو کہ خدا نے تیری نماز و ترک کو قبول کر لیا ہے“^(۲)

۱۔ ”توراة الثقلین“ جلد ۵، ص ۷۶۴۵ و ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۶۹

۲۔ ”توراة الثقلین“ جلد ۵، ص ۷۶۴۵ و ”مجمع البیان“ جلد ۱۰ ص ۵۶۹

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ ۲۔ ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ ۳۔ ﴿إِلَهِ النَّاسِ﴾ ۴۔ ﴿مَنْ شَرُّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾

۵۔ ﴿الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ﴾ ۶۔ ﴿مَنْ الْجِنَّةَ وَالنَّاسِ﴾

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ کہہ دیجئے میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔ ۲۔ لوگوں کے مالک و حاکم کی۔

۳۔ لوگوں کے خدا اور معبود کی۔ ۴۔ خناس کے وسوسوں کے شر سے ۵۔ جو انسانوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔

۶۔ چاہے وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

لوگوں کی پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں

اس سورہ میں، جو قرآن مجید کا آخری سورہ ہے، لوگوں کے لیے نمونہ اور پیشوا ہونے کے لحاظ سے خود پیغمبر کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”کہہ دیجئے، میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔“ ﴿قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾

”لوگوں کے مالک و حاکم کی۔“ ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾۔

”لوگوں کے خدا و معبود کی۔“ ﴿إِلَهِ النَّاسِ﴾۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں خدا کے عظیم اوصاف میں سے تین اوصاف (ربوبیت، ملکیت اور الوہیت) کا ذکر ہوا ہے جو سب کی سب براہ راست انسان کی تربیت اور وسوسے ڈالنے والوں کے چنگل سے نجات کے ساتھ ارتباط رکھتی ہیں۔

البتہ خدا سے پناہ مانگنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان صرف زبان سے یہ جملہ کہے، بلکہ فکر و نظر اور عقیدہ و عمل کے ساتھ بھی انسان خود کو پناہ میں قرار دے۔ شیطانی راستوں، شیطانی پروگراموں، شیطانی افکار و تبلیغات، شیطانی مجالس و

محافل سے خود کو دور رکھے، اور رحمانی افکار و تبلیغات کے راستے کو اختیار کرے۔ ورنہ وہ انسان جو عملی طور پر ان وسوسوں کے طوفان میں ٹہرا رہے گا وہ صرف اس سورہ کے پڑھنے اور ان الفاظ کے کہنے سے کہیں نہیں پہنچے گا۔
وہ ﴿رب الناس﴾ کہنے کے ساتھ پروردگار کی ربوبیت کا اعتراف کرتا ہے اور خود کو اس کی قرینیت میں قرار دیتا ہے

”﴿ملك الناس﴾ کہنے سے خود کو اس کی ملکیت سمجھتا ہے اور اس کے فرمان کا بندہ ہو جاتا ہے۔
اور ”﴿اله الناس﴾ کے کہنے سے اس کی عبودیت کے راستہ میں قدم رکھ دیتا ہے اور اس کے غیر کی عبادت سے پرہیز کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ جو شخص ان تینوں صفات پر ایمان رکھتا ہو اور خود کو ان تینوں کے ساتھ ہم آہنگ کر لے، وہ وسوسہ ڈالنے والوں کے شر سے امان میں رہے گا۔

در حقیقت یہ تینوں اوصاف تین اہم تربیتی درس، پیش رفت کے تین پروگرام اور وسوسے ڈالنے والوں کے شر سے نجات کے تین ذریعے ہیں اور یہ سورہ انسان کا ان کے مقابلہ میں بیمہ کر دیتا ہے۔

اسی لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”وسوسے ڈالنے والے خناس کے شر سے“ ﴿من شر لو سواس الخناس﴾۔

”وہی جو انسان کے سینوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔“ ﴿الذى يو سوس وصدور الناس﴾۔

”جنوں اور انسانوں میں سے وسوسے ڈالنے والے۔“ ﴿من الجنته والناس﴾۔

”وسواس“ کا لفظ ”مفردات“ میں ”راغب“ کے قول کے مطابق اصل میں ایسی آہستہ آواز ہے جو آلات زینت کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد ہر آہستہ آواز پر بولا جانے لگا اور اس کے بعد ایسے نامطلوب اور برے افکار و خیالات پر، جو انسان کے دل و جان میں پیدا ہوتے ہیں، اور ایسی آہستہ آواز کے مشابہ جو کان میں کہی جاتی ہے، اطلاق ہوا ہے۔

”وسواس“ مصدری معنی رکھتا ہے، بعض اوقات ”فاعل“ (وسوسہ ڈالنے والا) کے معنی میں بھی آتا ہے، اور زیر بحث آیت میں یہی معنی ہے۔

”خناس“ ”خنوس“ (بروزن خسوف) کے مادہ سے، صیغہ مبالغہ ہے، جو جمع ہونے اور پیچھے جانے کے معنی میں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خدا کا نام لیا جاتا ہے تو شیاطین پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور چونکہ یہ کام پنہاں ہونے کے ساتھ توام ہے، لہذا یہ لفظ ”اختفاء“ کے معنی میں بھی آیا ہے۔

اس بناء پر آیات کا مفہوم اس طرح ہوگا: ”کہہ دیجئے میں شیطان صفت و سوسہ ڈالنے والے کے شر سے، جو خدا کے نام سے بھاگتا ہے اور پنہاں ہو جاتا ہے، خدا کی پنہاں مانگتا ہوں۔“

اصولاً ”شیاطین“ اپنے پروگراموں کو چھپ کر کرتے ہیں اور بعض اوقات انسان کے دل کے کان میں اس طرح سے پھونک مارتے ہیں کہ انسان یہ یقین کر لیتا ہے کہ یہ فکر خود اسی کی فکر ہے اور خود اسی کے دل میں خود بخود پیدا ہوئی ہے، یہی بات اس کے بہکنے اور گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔ شیاطین کا کام نہنت دینا، باطل کو حق کے لعاب میں چھپانا، جھوٹ کو سچ کے چھلکے میں لپیٹ کر گناہ کو عبادت کے لباس میں اور گمراہی کو ہدایت کے سرپوش میں پیش کرنا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ بھی مخفی ہوتے ہیں اور ان کے پروگرام بھی پنہاں ہوتے ہیں، اور یہ راہ حق کے ان تمام رہ روؤں کے لیے ایک تنبیہ ہے جو یہ توقع نہیں رکھتے کہ شیاطین کو ان کے اصلی چہرے اور قیافہ میں دیکھیں، یا ان کے پروگراموں کو انحرافی شکل میں مشاہدہ کریں۔ سوچنے کی بات ہے، و سوسہ ڈالنے والے خناس ہوتے ہیں اور ان کا کام چھپانا، جھوٹ بولنا، دھوکا دینا، ریاکاری کرنا، ظاہر سازی اور حق کو پوشیدہ کرنا ہے۔

اگر وہ اصلی چہرے میں ظاہر ہو جائیں، اگر وہ باطل کو حق کے ساتھ نہ ملائیں، اگر وہ صریح اور صاف بات کریں تو علی علیہ السلام کے قول کے مطابق لم یخف علی المرتدین: خدا کی راہ پر چلنے والوں پر مطلب مخفی نہیں رہتا۔

وہ ہمیشہ کچھ حصہ تو ”اس“ سے لیتے ہیں، اور کچھ حصہ ”اس“ سے اور انہیں آپس میں ملا دیتے ہیں، تاکہ لوگوں پر مسلط ہو سکیں، جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں: فہنالک یستولی الشیطان علی لیائہ“ (۱)

”الذی یو سوس فی صدور الناس“ کی تعبیر، اور لفظ ”وسوسہ“ کا انتخاب، اور لفظ ”صدور“ (سینے) بھی اسی معنی

کی تاکید ہیں۔

یہ سب کچھ تو ایک طرف، دوسری طرف سے ”من الجنۃ والناس“ کا جملہ خبردار کرتا ہے کہ ”وسوسے“ ڈالنے والے خناس، صرف ایک ہی گروہ، ایک ہی جماعت، ایک ہی طبقہ، اور ایک ہی لباس میں نہیں ہوتے، بلکہ یہ جن و انس میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر لباس اور ہر جماعت میں پائے جاتے ہیں۔ لہذا ان سب پر نظر رکھنی چاہیئے اور ان سب کے شر سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

نا مناسب دوست، منحرف ہم نشین، گمراہ اور ظالم اور پیشوا، جبار اور طاغوتی کا رندے، فاسد مقررین اور لکھنے والے، ظاہر فریب الحادی والتقاطی مکاتب اور اجتماعی طور پر وسوسے ڈالنے والوں کے وسائل ارتباط سب کے سب ”وسوسہ خناس“ کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں کہ جن کے شر سے انسان کو خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

۱۔ ہم خدا کی پناہ کیوں مانگتے ہیں؟

انسان کے لیے ہر لمحہ انحراف کا امکان موجود ہے اور اصولی طور پر جب خدا اپنے پیغمبر کو یہ حکم دے رہا ہے کہ ”وسواس خناس“ کے شر سے خدا کی پناہ مانگیں، تو یہ خناسوں اور وسوسہ ڈالنے والوں کے دام فریب میں گرفتار ہونے کے امکان کی دلیل ہے۔

باوجود اس کے کہ پیغمبر اکرم لطف الہی، غیبی امدادوں اور اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے کی بناء پر ہر قسم کے انحراف سے محفوظ تھے، لیکن پھر بھی وہ آیات کو پڑھتے تھے اور ان کے ذریعے وسواس خناس کے شر سے پناہ مانگتے تھے۔ ان حالات میں دوسروں کا معاملہ واضح و روشن ہے۔

لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ان مخرب وسوسہ ڈالنے والوں کے مقابلہ میں مومن بندوں اور راہ حق کے رہروں کی مدد کے لیے آسمانی آتے ہیں۔ ہاں! مومن تنہا نہیں ہے، فرشتے ان پر نازل ہوتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں: ﴿ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملائكة﴾ (حم سجده - ۳۰)

لیکن بہر حال مغرور ہرگز نہیں ہونا چاہئے، اور خود کو موعظ و پند و نصائح اور خدائی امدادوں سے بے نیاز نہیں سمجھنا چاہئے۔ بلکہ ہمیشہ اس سے پناہ مانگنی چاہئے اور ہمیشہ بیدار اور ہوشیار رہنا چاہئے۔

۲۔ اس ارے میں کہ تین آیات میں ”ناس“ کا تکرار کیوں ہوا ہے؟ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ہر مقام پر الگ الگ معنی ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ خدا کی ان تین صفات کی عمومیت کی تاکید کے لیے ہے اور تینوں مقام پر ایک ہی معنی رکھتا ہے

۳۔ ایک روایت میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے:

”ما من مؤمن الا و لقلبه في صدره اذنان: اذن ينفث فيها الملك و اذن ينفث فيها الو سواس الخناس فيئو يد

الله المومن با الملك فهو قو له سبحانه: و ايدهم بروح منه:

”ہر مومن کے دل میں دو کان ہوتے ہیں، ایک کان میں فرشتہ پھونک مارتا ہے اور دوسرے کان میں وسواس خناس پھونک مارتا ہے۔ پس خدا مومن کی فرشتہ کے ذریعے تائید فرماتا ہے۔ اور آیہ ”و ايدهم بروح منه“ کا مطلب یہی ہے۔“ (۱)

ایک لرزہ خیز اور پر معنی حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ :

جب آیہ ﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا آفًا حَشَئًا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا الذُّنُوبَ بِهِمْ﴾: ”(وہ لوگ جو کبھی کوئی برا کام انجام دیتے ہیں، یا خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں کے لیے استغفار کرتے ہیں) نازل ہوئی، تو ابلیس مکہ میں ایک پہاڑ کے اوپر گیا اور اونچی آواز کے ساتھ فریاد کی اور اپنے لشکر کے سرداروں کو جمع کیا۔ انہوں نے کہا: اے آقا! کیا ماجرا ہے، آپ نے ہمیں کیوں بلایا ہے۔؟

اس نے کہا: یہ آیت نازل ہوئی ہے (اس آیت نے میری کمریں لرزہ پیدا کر دیا ہے اور یہ آیت نجات بشر کا باعث) تم میں سے کون ہے جو اس کا مقابلہ کرے؟

بزرگ شیطانوں میں سے ایک نے کہا: میں ایسا کر سکتا ہوں، میرا منصوبہ یہ ہے۔

ابلیس نے اس کے اس منصوبہ کو ناپسند کر دیا! تو دوسرا کھڑا ہوں اور اس نے اپنا منصوبہ پیش کیا، لیکن یہ بھی قبول نہ کیا گیا۔

اس موقع پر ”وسواس خناس کھڑا ہوا اور اس نے کہا: میں اس کام کو انجام دوں گا۔ ابلیس نے کہا: وہ کیسے؟

اس نے کہا: میں انہیں وعدوں اور آرزوؤں میں سرگرم کر دوں گا، یہاں تک کہ وہ گناہ میں آلودہ ہو جائیں گے، جب وہ گناہ کر لیں گے تو میں انہیں توبہ کرنا بھلا دوں گا۔

ابلیس نے کہا: تو اس کام سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ (تیرا منصوبہ بہت ماہرانہ اور عالی ہے) اور یہ کام قیامت تک اس کو سپرد کر دیا۔^(۲)

خداوند! ہمیں ان سب وسوسہ ڈالنے والوں کے شر سے اور خناس کے تمام وسوسوں سے محفوظ فرما۔ پروردگار! دام فریب سخت ہے، اور دشمن بیدار اور اس کے منصوبے مخفی اور پنہاں ہیں اور تیرے لطف کے بغیر نجات ممکن نہیں ہے۔

بار الہا! ہم نہیں جانتے کہ اس عظیم نعمت کا شکرتیری بارگاہ میں کس طرح پیش کریں کہ تو نے ہم پر احسان کیا ہے اور ہمیں یہ عظیم افتخار اور توفیق عطا فرمائی ہے کہ ہم نے اس وقت تقریباً پندرہ سال کے بعد اس تفسیر کو مکمل کر دیا ہے۔

خدایا! تو جانتا ہے کہ اس لمحہ ایک ایسی ناقابل تو صیف خوشی اور شکر کے ساتھ ملی ہوئی شادمانی ہمارے سارے وجود میں موجزن ہے، ایسا احساس جس کی کسی بیان کے ساتھ تشریح اور اس کے شکر کی ہم میں تو انائی نہیں ہے، ہم تیری بارگاہ میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں۔

آفرید گار! ممکن ہے ہم سے ان آیات کی تفسیر میں کچھ لغزشیں ہو گئی ہوں، تو وہ سب ہمیں بخش دے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ تیرے بندے بھی ہمیں بخش دیں گے، اور آخری جملہ میں ہم یہ عرض کرتے ہیں: اے خدائے رحیم و مہربان! اپنے کرم سے یہ ناچیز خدمت ہم سب سے قبول فرمالے اور اسے ہماری معاد اور روز جزا کا ذخیرہ قرار دے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۱۰، ص ۵۷۱

۲۔ ”المیزان“ جلد ۲۰، ص ۵۵۷

فہرست

۳	 مقدمہ
۵	 یہ کوشش کب شروع ہوئی اور کہاں تک پہنچی
۶	 ایک خطرناک غلطی
۶	 تقاضے اور احتیاج
۸	 کس تفسیر کا مطالعہ کرنا بہتر ہے
۱۱	 گفتار مترجم
۱۳	 اس تفسیر کی خصوصیات
۱۵	 سورہ تکویر
۱۵	 سورہ تکویر کے مضامین
۱۵	 اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت
۱۷	 آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹
۱۸	 جس دن کائنات کے دفتر کو لپیٹ دیا جائے گا
۲۳	 ۱۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا
۲۳	 اس جرم کے مختلف اسباب و عوامل تھے
۲۵	 آیات ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴
۲۵	 اس دن معلوم ہو گا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں -
۲۷	 ۱۔ نظم آیات
۲۸	 ۲۔ کیا نظام شمسی ختم ہو جائے گا اور ستاروں کے چراغ گل ہو جائیں گے؟

- آیات ۲۵، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵..... ۳۰
- وحی الہی اس پر نازل ہوئی..... ۳۱
- رسول کی شائستگی کی شرطیں رسول کی شائستگی کی شرطیں..... ۳۹
- آیات ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶..... ۳۰
- اے غافلوا! کہا جا رہے ہو؟..... ۳۰
- سورہ انفطار..... ۳۳
- سورہ انفطار کے مضامین..... ۳۳
- اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت..... ۳۳
- آیات ۵، ۴، ۳، ۲، ۱..... ۳۳
- جس وقت جہان کا نظام زیر و زبر ہو جائے گا۔..... ۳۳
- وہ آثار جو انسان کے بعد باقی رہ جاتے ہیں..... ۳۸
- آیات ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶..... ۵۰
- اے انسان تجھے کس چیز نے مغرور کر دیا ہے؟..... ۵۰
- ثبت اعمال کے مامورین..... ۵۹
- آیات ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳..... ۶۲
- سب امور اللہ سے مخصوص ہیں۔..... ۶۲
- سورہ مطففین..... ۶۷
- سورہ مطففین کے مضامین کا دائرہ..... ۶۷
- اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت..... ۶۷
- آیات ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱..... ۶۹

- ۶۹ شان نزول
- ۷۰ کم تولنے والوں پر وائے ہے
- ۷۵ کم تولنا فساد فی الارض کا ایک سبب ہے
- ۷۸ آیات ۷، ۸، ۹، ۱۰
- ۷۸ تو کیا جانے سچین کیا ہے؟
- ۸۳ آیات ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷
- ۸۳ گناہ دلوں کا زنگ ہے
- ۸۸ ۱۔ دل کے لئے گناہ کیوں زنگ ہے
- ۸۹ ۲۔ روح و جان کے چہرہ پر عذاب
- ۹۱ آیات ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸
- ۹۲ علیین ابرار کے انتظار میں ہے
- ۹۸ چند نکات
- ۹۸ ابرار اور مقربین کون لوگ ہیں؟
- ۹۹ ۲۔ جنت کی شراہیں
- ۱۰۱ آیات ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶
- ۱۰۱ شال نزول
- ۱۰۲ اس دن وہ مومنین کا مذاق اڑاتے تھے لیکن آج
- ۱۰۷ ایک نکتہ
- ۱۰۷ دشمنانِ حق کا مذاق اڑانے کا بزدلانہ حربہ
- ۱۰۸ سورہ الشقاق

- سورہ انشقاق کے مضامین ۱۰۸
- تلاوت کی فضیلت ۱۰۸
- آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹ ۱۰۹
- کمالِ مطلق کی طرف رنج آمیز سعی و کوشش ۱۱۰
- چند نکات ۱۱۵
- ۱۔ ایسی حدیث جس میں اعجاز ہے ۱۱۵
- ۲۔ دنیا رنج و تکلیف اور دکھ درد کا گھر ہے ۱۱۶
- آیات ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵ ۱۱۷
- وہ جو شرم و حیا کے باعث اپنا نامہ اعمال پشت کی طرف سے لیں گے ۱۱۷
- آیات ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵ ۱۲۱
- تم ہمیشہ دگرگوں ہوتے رہتے ہو ۱۲۲
- ایک نکتہ ۱۲۷
- سورہ بروج ۱۲۹
- سورہ بروج کے مضامین اور اس کی فضیلت ۱۲۹
- آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹ ۱۳۲
- مومنین انسانوں کو جلانے والی بھٹیوں کے سامنے ۱۳۳
- ۱۔ اصحابِ اخدود کون لوگ تھے؟ ۱۳۰
- ۲۔ حفظِ ایمان کے سلسلہ میں استقامت ۱۳۳
- آیات ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶ ۱۳۵
- تشدد کرنے والے عذابِ الہی کے سامنے ۱۳۵

آیات ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷	۱۵۰
تو نے دیکھا کہ خدا نے فرعون و ثمود کے لشکروں کے ساتھ کیا کیا؟	۱۵۰
سورہ طارق	۱۵۳
سورہ طارق کے مضامین اور ان کی فضیلت	۱۵۳
اس سورہ کی فضیلت	۱۵۳
آیات ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	۱۵۶
اے انسان دیکھ کہ تو کس چیز سے پیدا ہوا ہے	۱۵۷
آیات ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱	۱۶۶
میں دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہوں	۱۶۶
سورہ اعلیٰ	۱۷۲
سورہ اعلیٰ کے مضامین اور ان کی فضیلت	۱۷۲
تلاوت کی فضیلت	۱۷۲
آیات ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	۱۷۵
خداوند عظیم کی تسبیح کر	۱۷۵
ایک نکتہ	۱۷۹
آیات ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶	۱۸۲
ہم تجھے ہر اچھے کام کے لئے آمادہ کریں گے	۱۸۲
آیات ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴	۱۸۹
وہ دستور العمل جو تمام آسمانی کتب میں آیا ہے	۱۸۹
حب الدنيا رأس کل خطیئة کی تحلیل	۱۹۳

۱۹۶	سورہ غاشیہ.....
۱۹۶	سورہ غاشیہ کی مشتملات اور اس کی فضیلت.....
۱۹۶	اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت.....
۱۹۶	آیات ۱، ۲، ۳، ۳، ۵، ۶، ۷.....
۱۹۷	بد نصیب تھکے ماندے.....
۲۰۱	آیات ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۳، ۱۵، ۱۶.....
۲۰۱	بہشت کی روح پرور نعمتوں کے مناظر.....
۲۰۶	آیات ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۳، ۲۵، ۲۶.....
۲۰۶	اونٹ کی طرف دیکھو جو خود ایک آیت ہے.....
۲۱۳	سورہ فجر.....
۲۱۳	سورہ فجر کے مشمولات.....
۲۱۳	اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت.....
۲۱۳	آیات ۱، ۲، ۳، ۳، ۵.....
۲۱۵	تمہاری صبح کی سفیدی کی قسم.....
۲۲۲	آیات ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۳.....
۲۲۲	تیرا پروردگار ظالموں کی گھات میں ہے.....
۲۳۰	آیات ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰.....
۲۳۰	نہ اس کی نعمت کے ملنے پر غرور کرو اور نہ سلب نعمت پر مایوس ہو.....
۲۳۶	آیات ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۳، ۲۵، ۲۶.....
۲۳۱	آیات ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰.....

۲۳۱ اے صاحب نفس مطمئنہ!

۲۳۳ سورہ بلد

۲۳۳ سورہ بلد کی فضیلت اور اس کا مضمون

۲۳۳ سورہ بلد کی فضیلت

۲۳۵ آیات ۱، ۲، ۳، ۳، ۵، ۶، ۷

۲۳۵ اس شہر مقدس کی قسم

۲۵۲ آنکھ، زبان اور ہدایت کی نعمت

۲۵۵ ۱۔ آنکھ کی حیرت انگیزیاں

۲۵۹ ۲۔ زبان کی حیرت انگیزیاں

۲۵۹ ۳۔ نجدین کی طرف ہدایت

۲۶۱ آیات ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰

۲۶۱ دشوار گزار گھاٹی

۲۶۳ چند قابل توجہ نکات

۲۶۹ سورہ الشمس

۲۶۹ سورہ الشمس اور اس کی فضیلت

۲۶۹ فضیلت تلاوت

۲۷۱ آیات ۱، ۲، ۳، ۳، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰

۲۷۱ تہذیب نفس کے بغیر نجات ممکن نہیں

۲۸۱ ۱۔ قرآنی قسموں کا ان کے نتائج کے ساتھ ربط

۲۸۱ ۲۔ سورج کا عالم حیات میں نقش و اثر

۲۸۳	آیات ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵
۲۸۳	سرکشوں کا ہلاکت خیز انجام
۲۸۹	۱۔ قوم ثمود کی سرگزشت کا خلاصہ
۲۹۰	۲۔ اشقی الاولین و اشقی الآخرین
۲۹۱	۳۔ تہذیب نفس ایک عظیم خدائی وظیفہ ہے
۲۹۳	سورہ اللیل
۲۹۳	سورہ ”اللیل“ کے مضامین
۲۹۳	اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت
۲۹۳	آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱
۲۹۳	سورہ ”واللیل کا شان نزول
۲۹۶	تقویٰ اور خدائی ادا دیں
۳۰۲	آیات ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱
۳۰۲	انفاق اور جہنم کی آگ سے دوری
۳۰۷	سورہ واللیل کے شان نزول کے بارے میں ایک بات
۳۱۰	۲۔ انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت
۳۱۲	سورہ ضحیٰ
۳۱۲	سورہ ”الضحیٰ“ کے مضامین اور اس کی فضیلت
۳۱۲	اس سورہ کی فضیلت
۳۱۳	آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵
۳۱۳	شان نزول

۳۱۵	تجھے اس قدر عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا.....
۳۱۹	انقطاع وحی کا فلسفہ.....
۳۱۹	آیات ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱.....
۳۱۹	ان تمام نعمتوں کے شکر ادا کرنے میں جو خدا نے تجھے دی ہیں.....
۳۲۷	۱۔ مصائب و آرام کے درمیان سے مبعوث ہونے والا پیغمبر.....
۳۲۹	۲۔ یتیموں پر نوازش و شفقت.....
۳۳۲	۳۔ نعمتوں کو بیان کرنا.....
۳۳۳	سورہ الم نشرح.....
۳۳۳	سورہ ”الم نشرح“ کے مضامین.....
۳۳۵	اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت.....
۳۳۵	آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸.....
۳۳۶	ہم نے تجھے انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کی ہیں،.....
۳۳۳	چند نکات.....
۳۳۷	سورہ التین.....
۳۳۷	سورہ ”التین“ مطالب اور فضیلت.....
۳۳۷	اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت.....
۳۳۷	آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸.....
۳۳۸	ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔.....
۳۵۱	انجیر اور زیتون کا فائدہ.....
۳۵۶	سورہ العلق.....

- سورہ علق کے مطالب اور فضیلت ۳۵۶
- اس سورہ کی قرات کی فضیلت ۳۵۶
- آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ ۳۵۷
- شانِ نزول ۳۵۷
- اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ ۳۶۰
- ۱۔ وحی کا آغاز ایک حرکت علمی کے آغاز کے ساتھ ہوا۔ ۳۶۳
- ۲۔ ہر حال میں ذکرِ خدا ۳۶۳
- آیات ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ ۳۶۷
- کیا تجھے معلوم نہیں کہ خدا تیرے تمام اعمال کو دیکھتا ہے؟ ۳۶۷
- عالم ہستی محض خدا میں ہے ۳۷۰
- آیات ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹ ۳۷۲
- سجدہ کر اور تقرب حاصل کر! ۳۷۲
- سرکشی اور بے نیازی کا احساس ۳۷۷
- اس جہل و نادانی، اور اس بے خبری اور خیرہ سری سے خدا کی پناہ ۳۷۷
- سورہ القدر ۳۷۹
- سورہ قدر کے مطالب ۳۷۹
- اس سورہ کی فضیلت ۳۸۰
- آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ ۳۸۰
- شب قدر نزولِ قرآن کی رات ۳۸۱
- ۱۔ شب قدر میں کون سے امور مقدر ہوتے ہیں؟ ۳۸۶

- ۲۔ شب قدر کون سی رات ہے؟ ۳۸۷
- ۳۔ شب قدر مخفی کیوں رکھی گئی؟ ۳۸۹
- ۴۔ کیا گزشتہ امتوں میں بھی شب قدر تھی؟ ۳۸۹
- ۵۔ شب قدر ہزار ماہ سے کیسے برتر ہے؟ ۳۹۰
- ۶۔ قرآن شب قدر میں کیوں نازل ہوا؟ ۳۹۰
- ۷۔ کیا مختلف علاقوں میں ایک ہی شب قدر ہوتی ہے؟ ۳۹۱
- سورہ بینۃ ۳۹۲
- سورہ بینہ کے مطالب ۳۹۲
- اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت ۳۹۲
- آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ ۳۹۳
- یہ جاودانی دین ہے ۳۹۵
- آیات ۶، ۷، ۸ ۳۹۹
- بہترین اور بدترین مخلوق ۴۰۱
- ۱۔ علی علیہ السلام اور ان کے شیعہ خیر البریہ ہیں ۴۰۳
- ۲۔ عبادت میں خلوص نیت لازم ہے ۴۰۸
- ۳۔ انسان کی عجیب قویں صعودی و نزولی ۴۰۸
- سورہ الزلزال ۴۰۹
- سورہ زلزلہ کے مطالب اور فضیلت ۴۰۹
- اس سورہ کی فضیلت ۴۱۰
- آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸ ۴۱۰

- جس دن انسان اپنے تمام اعمال دیکھے گا..... ۳۱۲
- ۱: قیامت کے حساب و کتاب میں دقت اور سخت گیری..... ۳۱۸
- ۲۔ ایک سوال کا جواب..... ۳۱۸
- ۳۔ قرآن کی سب سے زیادہ جامع آیات..... ۳۱۹
- سورہ الغدیت..... ۳۲۱
- سورہ والعادیات کے مطالب..... ۳۲۱
- اور اس کی فضیلت..... ۳۲۲
- آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱..... ۳۲۲
- شان نزول..... ۳۲۳
- بیدار مجاہدین کی قسم..... ۳۲۵
- اس سورہ کی قسموں اور اس کے ہدف کے درمیان ربط..... ۳۳۵
- ۲۔ کیا انسان طبعاً ناشکر اور بخیل ہے؟..... ۳۳۵
- ۳۔ جہاد کی عظمت..... ۳۳۷
- سورہ القارعة..... ۳۳۹
- سورہ قارعة کے مطالب اور اس کی فضیلت..... ۳۳۹
- اس سورہ کی فضیلت..... ۳۳۹
- آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱..... ۳۴۰
- چھبنے والا حادثہ..... ۳۴۰
- البتہ دونوں کا نتیجہ ایک ہے، لیکن دو مختلف راستوں سے۔..... ۳۴۶
- میزان اعمال کی سنگینی کے اسباب..... ۳۴۶

۳۳۹	سورہ التکاثر.....
۳۳۹	سورہ تکاثر کے مطالب اور اس کی فضیلت.....
۳۳۹	اس سورہ کی فضیلت.....
۳۵۰	آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸.....
۳۵۰	شان نزول.....
۳۵۲	تکاثر و تفاخر کی مصیبت.....
۳۵۳	تکاثر و تفاخر کی مصیبت.....
۳۵۸	۱۔ تفاخر کا سرچشمہ.....
۳۶۱	۲۔ یقین اور اس کے مراحل.....
۳۶۳	۳۔ سب لوگ دوزخ کا مشاہدہ کریں گے.....
۳۶۳	۴۔ قیامت میں کونسی نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا؟.....
۳۶۶	سورہ والعصر.....
۳۶۶	سورہ والعصر کے مطالب.....
۳۶۶	اس سورہ کی فضیلت.....
۳۶۸	آیات ۱، ۲، ۳.....
۳۶۸	نجات کی صرف ایک راہ.....
۳۷۳	خوش بختی کا چار نکاتی پروگرام.....
۳۷۸	سورہ ہمزہ.....
۳۷۸	سورہ ہمزہ کے مطالب اور فضیلت.....
۳۷۸	اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت.....

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹	۳۷۹
شان نزول	۳۷۹
۱۔ کبر و غرور بڑے برے گناہوں کا سرچشمہ ہے	۳۸۸
۲۔ مال جمع کرنے کی حرص	۳۸۸
سورہ فیل	۳۹۳
سورہ فیل کے مطالب	۳۹۳
اور اس کی فضیلت	۳۹۳
آیات ۱، ۲، ۳، ۴	۳۹۳
شان نزول	۳۹۳
اصحاب فیل کی داستان	۳۹۶
تفسیر	۵۰۱
ابرہہ سے کہہ دو کہ وہ آنے میں جلدی نہ کرے	۵۰۱
۱۔ ایک بے نظیر معجزہ (اس گھر کا ایک مالک ہے)	۵۰۳
۲۔ معمولی وسیلہ سے سخت ترین سزا	۵۰۶
۳۔ داستانِ فیل کے اہداف	۵۰۶
۴۔ ایک مسلم تاریخی رویداد	۵۰۸
سورہ قریش	۵۰۹
سورہ قریش کے مطالب	۵۰۹
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۵۱۰
آیات ۱، ۲، ۳، ۴	۵۱۱

- اس گھر کے پروردگار کی عبادت کرنی چاہیئے۔ ۵۱۱
- سورۃ الماعون ۵۱۶
- سورہ ماعون کے مطالب ۵۱۶
- اس سورہ کی فضیلت ۵۱۶
- آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷ ۵۱۷
- معاد کے انکار کے اثراتِ بد ۵۱۷
- ۱۔ سورہ ماعون کے مباحث کی جمع بندی ۵۲۲
- ۲۔ تظاہر و ریا ایک بہت بڑی اجتماعی مصیبت ہے۔ ۵۲۲
- آمین یا رب العالمین۔ ۵۲۳
- سورہ الکوثر ۵۲۵
- سورہ کوثر کے مطالب اور اس کی فضیلت ۵۲۵
- اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت ۵۲۶
- آیات ۱، ۲، ۳ ۵۲۶
- ہم نے تجھے فراواں خیر و برکت دی ۵۲۷
- ۱۔ حضرت فاطمہ اور ”کوثر“ ۵۳۰
- ۲۔ اس سورہ کا اعجاز ۵۳۱
- ۳۔ خدا کے لیے جمع کی ضمیر کس لیے ہے؟ ۵۳۱
- سورہ کافرون ۵۳۲
- سورہ کافرون کے مطالب اور اس کی فضیلت ۵۳۲
- اس سورہ کی فضیلت ۵۳۳

۵۳۳	آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶.....
۵۳۵	شانِ نزول.....
۵۳۵	بت پرست کے ساتھ ہرگز مصالحت نہیں ہو سکتی.....
۵۳۷	۲۔ کیا بت پرست خدا کے منکر تھے؟.....
۵۳۸	۳۔ یہ تکرار کس لیے ہے؟.....
۵۳۹	۴۔ کیا ”﴿لکم دینکم﴾۔۔۔۔۔“ کی آیت کا مفہوم بت پرستی کا جواز ہے؟.....
۵۴۰	۵۔ آپ نے ایک لمحہ کے لیے بھی شرک سے مصالحت نہیں کی۔.....
۵۴۲	سورہ نصر.....
۵۴۲	سورہ نصر کے مطالب اور اس کی فضیلت.....
۵۴۳	اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت.....
۵۴۳	آیات ۱، ۲، ۳.....
۵۴۳	جب اصلی کامیابی آن پہنچے.....
۵۴۸	فتح مکہ میں اسلام کی عظیم ترین فتح:.....
۵۴۹	فتح مکہ تین مراحل میں انجام پائی:-.....
۵۵۵	سورہ اللہب (تبت).....
۵۵۵	سورہ لہب (تبت) کے مطالب اور اس کی فضیلت.....
۵۵۵	اور اس کی فضیلت.....
۵۵۵	شانِ نزول.....
۵۵۷	آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵.....
۵۵۷	ابو لہب کا ہاتھ کٹ جائے.....

۵۶۳	۱۔ قرآن کے اعجاز کی ایک اور نشانی.....
۵۶۳	۲۔ ایک اور سوال کا جواب.....
۵۶۳	۳۔ بے بصیرت رشتہ دار ہمیشہ دور ہوتے ہیں۔.....
۵۶۵	سورہ اخلاص.....
۵۶۵	سورہ اخلاص “ کے مطالب.....
۵۶۵	اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت.....
۵۶۹	آیات ۱، ۲، ۳.....
۵۷۰	اللہ “ خدا کا اسم خاص ہے.....
۵۷۱	لفظ ” احد.....
۵۷۹	۱۔ توحید کے دلائل.....
۵۸۱	توحید کی اقسام.....
۵۸۱	۱۔ توحید ذات :.....
۵۸۱	۲۔ توحید صفات :.....
۵۸۱	۳۔ توحید افعالی :.....
۵۸۲	۴۔ توحید در عبادت :.....
۵۸۳	۳۔ توحید افعال کی اقسام.....
۵۸۳	۱۔ توحید خالقیت :.....
۵۸۳	۲۔ توحید ربوبیت :.....
۵۸۳	۳۔ توحید تشریع و قانون گزاری :.....
۵۸۳	۴۔ توحید در مالکیت :.....

- ۵۔ توحید حاکمیت ۵۸۳
- ۶۔ توحید اطاعت ۵۸۳
- سورہ الفلق ۵۸۶
- سورہ ”فلق“ کے مطالب ۵۸۶
- اس سورہ کی فضیلت ۵۸۷
- آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ ۵۸۸
- میں سپید صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔ ۵۸۸
- ۱۔ شروفساد کے اہم ترین سرچشمے ۵۹۳
- ۲۔ آیات کا تناسب ۵۹۳
- ۳۔ جادو کی تاثیر ۵۹۳
- ۴۔ حاسدوں کا شر ۵۹۳
- سورہ الناس ۵۹۶
- سورہ الناس ” کے مطالب ۵۹۶
- اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت ۵۹۶
- آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ ۵۹۸
- لوگوں کی پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں ۵۹۸
- ۱۔ ہم خدا کی پناہ کیوں مانگتے ہیں؟ ۶۰۲